

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
فروری 2013
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

جلد43 • شمارہ02 فروری2013 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

نظر آنا

جون ایلیا

اس دور کا سب سے نمایاں رجحان یہ ہے کہ جو تم ہو وہ نظر نہ آؤ۔ یہ معاشرے کا دباؤ ہے جو ہمیں اس بے معنی اداکاری پر مجبور کرتا ہے۔ ہم باہر سے بہت ثابت و سالم اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں لیکن اندر سے ریزہ ریزہ اور اذیت زدہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہم نے معاشرے کے اس ظالمانہ دباؤ کو کیوں قبول کر رکھا ہے۔

آپ ہرگز خوش حال نہیں ہیں مگر آپ کی یہ مجال نہیں کہ خوش حال نظر نہ آئیں۔ تین مہینے سے آپ نے گھر کا کرایہ ادا نہیں کیا، قرض پر آپ کا مدار ہے لیکن آپ کے خیالات اور نظریات اور ایک خوش حال آدمی کے خیالات اور نظریات میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کا سیاسی نقطہ نظر بالکل وہی ہے جو دولت مند لوگوں کا نقطہ نظر ہوتا ہے۔ آپ اتنے محروم آدمی ہیں کہ احساسِ محرومی سے بھی محروم ہیں۔ حقیقتِ حال سے اس درجہ انکار! ذات اور ذہن پر معاشرے کا اتنا دباؤ۔

آپ اور آپ کی بیوی، جنہیں آپ خود اپنی زبان سے بیگم کہتے ہیں۔ جبکہ آپ کا اپنی بیوی کو بیگم کہنا آدابِ گفتگو کے قطعاً خلاف ہے اور ایک غیر مہذبانہ حرکت ہے۔ یہ دوسروں کا فرض ہے کہ وہ آپ کی بیوی کو بیگم کہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد خوش نظر آرہے ہیں جبکہ دونوں ایک دوسرے سے بری طرح تپے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں کا بس نہیں چل رہا کہ ایک دوسرے کا منہ نوچ لیں مگر نہ جانے آپ کو دوسروں کا اتنا خیال کیوں ہے کہ مثالی شوہر اور بیوی نظر آنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہر حال میں مثالی شوہر اور مثالی بیوی نظر آنا آخر کس نظام اخلاق اور کس نظام تہذیب کی رو سے لازمی اور ضروری ہے۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر آپ بالکل بجا طور پر اپنی بیگم کی چوٹی کھینچ لیں اور وہ آپ کا گریبان، تو کیا قیامت آجائے گی۔

"مگر لوگ کیا کہیں گے!"

لوگ کیا کہیں گے؟ کچھ بھی کہیں، انہیں کہنے دیجیے۔ حد سے حد یہی تو کہیں گے کہ دونوں نے شادی کی تھی جو ناکام ہوگئی۔ چلیے قصہ پاک ہوا مگر آپ ہیں کہ معاشرے سے بے تکان جھوٹ بولے چلے جا رہے ہیں۔

جناب آپ کل سے جس بددلی اور بیزاری میں مبتلا ہیں کیا اس کے ہوتے ہوئے آج آپ کو ڈاڑھی بنانا زیب دیتا تھا اور آپ نے ڈاڑھی ہی نہیں بنائی بال بھی سنوارے ہیں اور خوشبو بھی لگائی ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے اپنی خاطر اور اپنی بددلی اور بیزاری کو دور کرنے کے لیے کیا ہو مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ آپ نے یہ سب کچھ لوگوں کے لحاظ میں کیا ہے تاکہ وہ آپ کو ایک شائستہ اور نستعلیق آدمی سمجھیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر آپ بددل اور بیزار ہیں اور بددل اور بیزار نظر بھی آرہے ہیں تو اس میں عیب کی کیا بات ہے؟ شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرہ آپ کا بددل اور بیزار نظر آنا پسند نہیں کرے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہے اور جب ایسا ہی ہے تو اس بے حس اور ناہنجار معاشرے پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے جس نے آپ کو ایک اداکار بنا کر رکھ دیا ہے۔ آپ مجھ پر شبہ نہ کریں۔ میں آپ کو بہکانے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں خود پیچ و تاب میں مبتلا ہوں۔ خود میں بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہوں جس سے آپ دوچار ہیں۔ ہوسکتا ہے میری کیفیت آپ سے زیادہ اذیت ناک ہو اور مجھ میں آپ سے زیادہ دوغلا پن پایا جاتا ہو۔ یہ دوغلا پن ہی تو ہے کہ ہماری کیفیت ہو کچھ اور ہم ظاہر کچھ اور کریں۔ یہ ساری حرکتیں محض اس لیے کی جاتی ہیں کہ آدمی شائستہ اور بردبار نظر آئے۔ گویا شائستگی اور بردباری کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر لمحہ اپنے آپ سے جھوٹ بولے اور ایسا نظر آئے جیسا ہو نہیں۔ اگر شائستگی یہی ہے تو کیا اس کے ایک انتہائی بیہودہ شے ہونے میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے۔

میں شاید یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اصل اور بے ساختہ آدمی کی اس معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ اپنی اصل حالتوں اور کیفیتوں کے اظہار کے ساتھ اس معاشرے میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ میرے خیال میں پہلے صورتِ حال اتنی شدید نہیں تھی اور شائستگی اور بے ساختگی کے ساتھ زندگی گزارنے کا امکان کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ معاشرے کی خاطر ہم ویسے نظر آئیں جیسے ہوں نہیں۔ وہی نظر آنا، نظر آنا، نظر آنا۔ لعنت ہے اس نظر آنے پر۔

عزیز قارئین!

السلام علیکم!

فروری 2013ء کا شمارہ زیر نظر ہے۔ ماہ جنوری کے آخر میں اسلامی ماہ مبارک ربیع الاول کی وہ مبارک ساعتیں ہیں جب ہمارے آقا ئے دوجہاں رحمت اللعالمین حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے۔ ہمارے قارئین کو یہ جشنِ ولادتِ رسول ﷺ مبارک ہو۔ یہ جشن مناتے ہوئے ہمیں اور خاص طور پر ہمارے نوجوانوں کو اسوۂ حسنہ اور تعلیماتِ نبویؐ پر کاربند ہونے کا عزم کرلینا چاہیے۔ اخوت، مساوات، صلۂ رحمی، حصول علم، امانت، دیانت...... یہ سب وہ رہنما اصول ہیں جو ہادیٔ برحقؐ نے ہمیشہ کے لیے طے کردیے ہیں۔ اگر نوجوان نسل ان اصولوں کو اپنالے تو ہمارے ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ جدید سہولتوں سے استفادہ کرتے ہوئے خودغرضی، فرقہ پرستی اور دہشت گردی سے گریز ہی ہماری کامرانی کی کلید ہے نوجوان اکثریت کی راست روی یوں بھی زیادہ اہم ہے کہ یہ الیکشن کا سال ہے...... اگر نمائندوں اور رہنماؤں کے انتخاب میں اس بھاری اکثریت نے مثالی رویہ اپنایا تو آنے والے دنوں میں پاکستان کی تقدیر پلٹ سکتی ہے...... اور اب اپنے خیالات سے نکلتے ہوئے ذرا اپنی محفل یاراں کی جانب بھی نظر ڈالیے۔

☩ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے شریک محفل ہیں ”سال نو کا پہلا شمارہ 20 دسمبر کو موصول ہوا۔ سرورق پر اے۔ ایم چودھری اپنے خط کے شائع ہونے کی خوشی میں دانت نکالے موجود تھیں۔ اداریہ میں نظام تعلیم کی اصلاح کا مطالبہ بجا ہے لیکن یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب والدین، اساتذہ اور ماہرین تعلیم کو پالیسی بنانے کے عمل میں شامل کیا جائے نہ کہ غیرملکی ماہرین سے پالیسی سازی کروائی جائے (بالکل درست فرمایا) پہلا تبصرہ ابن مقبول کا تھا۔ کرسیٔ صدارت کی مبارک قبول کریں۔ آپ نے جن لوگوں کو پرسوز صدا سے پکارا ہے ان سے درخواست ہے کہ آجائیں۔ طاہر عباس بھی ابن مقبول کی طرح کافی عرصے سے سسپنس کے قاری رہنے کے بعد محفل میں وارد ہوئے ہیں، ویلکم۔ ڈاکٹر صاحب، تصویر العین کو کلمن لگاتے نظر آئے سالگرہ مبارک ہو، آپ سے روزہ سالگرہ منالیں تو 24 دسمبر کو ہماری بھی شادی کی سالگرہ ہوگی کیسا؟ (اپنی محفل میں بس انہی باتوں کا مزہ ہے۔ مبارکاں بھئی) تنویر آصف، رضوان ملتانی سمیت تمام نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ کبیل طارق! اگر بھائی آپ کو کرارا سا جواب مل گیا اس لیے ہم خاموش ہیں۔ شیر علی خان! شاید آپ PIA کے حالات سے واقف نہیں، جو اداروں کو مشورہ دے رہے ہیں۔ ہمایوں سعید! کوئی لڑکی آپ کو بھائی بنائے بھی تو کیسے کہ بھابی کی تلاش کا ناممکن ٹاسک اس کے گلے پڑجائے گا اور گلے پڑا ڈھول تو بجانا ہی پڑتا ہے۔ تصویر العین عورت کی پناہ بھی کسی بلیک ہول سے کم نہیں اس سے تو اچھا تھا کہ قیصر اقبال بریک نہ لگاتے، روز روز کے جھگڑے سے تو بچ جاتے۔ حمیرا رضا اللہ آپ کو اور تمام بیماروں کو شفا دے۔ حقیقت ہے کہ شادی کے بعد عورت کی ذمے داریاں اسے وقت نہیں دیتیں۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی، پڑھتے ہوئے سوچا کہ یہ آخری قسط کیوں نہیں ہے؟ شیخ حامد یقیناً زندہ ہے جو کہانی کو چلایا جارہا ہے۔ مسافر نے اس بار بہت مایوس کیا۔ خاص طور پر کہانی کے آخری صفحات پر میڈم کی حرکتوں نے کوفت میں مبتلا کردیا۔ نواب صاحب کی آشوب وفا یہودیت کا پردہ چاک کرتی چشم کشا تحریر ہے۔ جلالت اسرار کا کردار نواب صاحب کے فرہاد علی تیمور کی یاد دلا گیا۔ کاشف زبیر اندر کی آگ کے ساتھ تشریف لائے۔ آتشی کھمبوں کے بارے میں پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ تنویر ریاض کا جھوٹ کسی کو اس کے دشمن سے بچانے کے لیے بولا گیا جو مستحسن اقدام ہے۔ گرہ میں سارجنٹ فلیچر نے نامی کو خوب بےوقوف بنایا۔ بغیر تشدد کے قتل کا مجرم ہاتھ لگ گیا، پاکستانی پولیس تو پتھر کی زبان کے علاوہ کچھ نہیں بولتی اور ہاتھی سے بھی اعتراف کروالیتی ہے کہ ”ہاں میں ہرن ہوں۔“ آئینۂ ایام معاشرے میں پھیلتی ہوئی بےحسی کی عکاس تحریر تھی۔ والدین بھی حاکمانہ رویے کے بجائے اولاد سے دوستانہ ربط وضبط رکھیں تاکہ احترام صرف خوف کی وجہ سے نہ ہو۔ منظر امام کی ہم نشیں نے رونگٹے کھڑے کردیے انسان کی توقیر ہمارے معاشرے میں حقیقتاً اس کے ظاہر کی وجہ سے ہی کی جاتی ہے۔ باقی کچھ نہیں دیکھا جاتا۔ محمد الیاس کی بلّلا اس محاورے کو سچ کرتی دکھائی دی کہ پاؤں کے نیچے آنے پر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ تمام ناروا سلوک سہنے کے باوجود جب بلّلا کی محبت پر ڈاکا پڑا تو اس نے انتہائی قدم اٹھا ڈالا۔ محفل شعروسخن میں یاسر محمود، جہلم اور رحیمہ سرور، لاہور کا انتخاب اچھا لگا۔“

☩ **احسان سحر**، ہنستے ہوئے، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئی ہیں ”سال نو کا خوب صورت اور تازہ شمارہ 16 کی ڈھلتی اور خنک شام کو ملا...... خوب صورت صنف نازک کا مسکراتا چہرہ شرارتی تتلی کی طرح محسوس ہوا اور ساتھ جلتی اور ختم ہوتی ہوئی موم بتی دیکھ کر ایسا لگا جیسے یہ موم بتی 2013ء کی آمد کی خوشی میں جلائی گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح جون ایلیا مرحوم کا خوب صورت انشائیہ ”نیا سال“ پڑھ کر بہت سکون محسوس کیا، پتا نہیں اب آگے کیا ہوگا......؟ سال نو کے نئے تبصروں کا مطالعہ کرنے کے لیے محفل زعفران میں گئے...... جہاں پر ابن جاوید احمد صدیقی کو ایک ماہ تک کرسی صدارت دے دی گئی، بہت بہت مبارک ہو جی۔ پروفیسر ہمایوں سعید لیکچر دیتے نظر آئے اور خود عمل نہیں کرنا صرف ہمارے حکمرانوں کی طرح لوگوں کو ستاتے رہو...... تصویر العین جی شعر پسند کرنے کا شکریہ...... بلّلی لے کر ہمایوں سعید کا منہ بند کریں جی اور سارہ جی اس بار شاید ڈر کر آپ نے تبصرہ مختصر لکھا......؟ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ کا تبصرہ اچھا لگا...... ایسا کوئی مشورہ دو ہمایوں سعید کو بھی کہ وہ بھی ایسا تبصرہ لکھے...... کہانیوں کا آغاز ”فلک تک چل“ سے کیا، حیدر علی واقعی ایک نڈر اور طاقت ور حکمران تھا، قرآن پاک سے محبت کرنے والا۔ اندر کی آگ عجیب کہانی لگی اور پڑھ کر مزہ بھی آیا۔ کشکول بہت ہی شاندار قسط لگی، ایک ہی نشست میں پڑھ کر ختم کردی۔ جھوٹ گزارہ لائق تھی، جزائے سزا میں بیگ صاحب نے کمال ہوشیاری سے سلمٰی اور شاہدہ کی سازش کو ناکام کیا۔ منظر امام کی کاوش نے کافی متاثر کیا...... جانور اور انسان کے فرق کو اجاگر کرتی حساس کہانی تھی۔ محمد الیاس آپ کی کہانی کافی دلچسپ لگی، شروع سے اینڈ تک گرفت مضبوط رہی آپ کی۔ ایمان کو روشنی سے منور کرتا سلسلہ پڑھ کر کافی سکون ملا اور مسافر اب نئی ڈگر پر گامزن تمام تر دلچسپیاں اور دلچسپیوں کو برقرار رکھتے ہوئے اب میڈم کے گرد گھومنا شروع ہوگئی ہے۔ آخری صفحات پر چھا پا گیا نواب صاحب کے شاہکار آشوب وفا

کا پہلا حصہ کافی شاندار لگا۔ پراسراریت، تجسس سب کوٹ کوٹ کر شامل کیا گیا اور یہودی قوم کا کریہہ چہرہ سامنے آیا۔“

☩ **ابرار وارث**، کوکرم شاہ، سندیلیانوالی سے تشریف لائے ہیں ”دسمبر کی ٹھٹھری شام یعنی رخصت ہوتے دسمبر کی 20 تاریخ کو سالگرہ نمبر بہت انتظار کے بعد ملا۔ سرورق پر حسینہ ماہ جبینہ کچھ دیکھی دیکھی لگی۔ سب سے پہلے بزم یاراں میں پہنچے۔ سب کے خط پڑھے، پسند آئے پر اپنا تبصرہ مسلسل دوسری ماہ بھی ندارد (اب تو خوش ہیں ناں) سب سے پہلے مسافر کے درشن کیے جہاں پچھلا موضوع بند اور نیا موضوع شروع ہوگیا ہے پتا نہیں شہریار کی میڈم سے جان کب چھوٹے گی۔ پچھلے تمام کردار پتا نہیں کہاں گئے اور ہر دفعہ ملک صاحب نئے لوگوں کو انٹر کررہے ہیں۔ آخری صفحات پر من پسند لکھاری کو دیکھا، دل خوش ہوگیا لیکن نہ جانے اس دفعہ محی الدین نواب ان ہیکل کے سورماؤں کو کیوں اٹھا لائے ہیں؟ ہاں فلسطینیوں کا جہاد کرتا تو اچھی بات تھی لیکن یہ سورما لوگ تو پتا نہیں کیا کیا چن چڑھا رہے ہیں۔ مجھے تو یہ ہنجاسن والا سورما بالکل نقلی لگا تھا۔ ہم تو کوئی بہت پیاری، رشتوں محبتوں اور وفاؤں والی کہانی کے منتظر تھے لیکن یہاں...... خیر سالگرہ نمبر میں مجھے کاشف زبیر کی کاوش پسند آئی۔ کیسی انوکھی تحریر تھی، وی کوائے نے ملکہ کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو قربان کردیا۔ دوسری سچی تحریر نوشہ گنج بخش پڑھی، ضیا تسنیم بلگرامی! اللہ آپ کو چار چاند لگائے۔ واقعی اس ولی کی تو پیدائش سے پہلے ہی دھوم مچی ہوئی تھی۔ منظر امام ”ہم نشین“ لائے۔ کہیں مسکراہٹ اور کہیں تلخ حقیقت، کہیں مجبوری دبے بسی۔ عبرت انگیز تحریر تھی باقی سب گزارے لائق تھیں۔ محفل شعروسخن میں محمد کمال انور، عبدالغفور خان، جنید احمد ملک، رضوان تنولی کریڑوی، تنویر آصف، طاہر عباس اور ڈاکٹر ایچ لطیف کے علاوہ سارہ فرام کراچی اور قدرت اللہ خان نیازی کے شعر پسند آئے۔“

☩ **قیصر اعوان**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے چلے آرہے ہیں ”اس دفعہ جنوری کا سسپنس بہت کرب ناک انتظار کے بعد 24 دسمبر کو ملا۔ اصل میں ایک تو میں قیدی سزائے موت کا ہوں اور دوسرا پھر جیل میں دیرسویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ چلیں خیر اس ماہ کا ٹائٹل بھی کسی حد تک اچھا ہے۔ حسینہ نئے سال کی شاید نوید سنارہی ہے، اللہ کرے یہ نیا سال امت مسلمہ خاص طور پر پاکستان کے لیے اچھا ثابت ہو۔ سب سے پہلے جون ایلیا انکل کا انشائیہ ”نیا سال“ سرسری دیکھا، وہ بھی نئے سال کے ساتھ نئے پاکستان کا چہرہ شاید دکھانے کی کوشش کررہے تھے۔ خیر اس کے بعد ڈائریکٹ انٹری ماری اپنی محفل یاراں میں، کرسی صدارت پر ابن مقبول جاوید صدیقی صاحب کو براجمان پایا۔ مبارکاں بھیا جی۔ طاہر عباس کوٹلی آزاد کشمیر بھیا ویلکم ٹو محفل یاراں۔ بھیا نوید انجم بٹ، گھمیاں گجرات خوش آمدید۔ محفل میں آتے رہیے گا۔ بھائی قدرت اللہ نیازی آپ شاید قیصر اقبال کلول سے اس لیے خفا ہیں کہ انہوں نے آپ کے پاس پناہ کیوں نہیں لی تو بھیا پناہ تو بندہ دیکھ کے لی جاتی ہے ناں؟ میری پیاری بہن سارہ فرام کراچی آپ کا نام اچھا ہے مگر تصویر العین بہناں نے مذاق میں کہا، آپ برا منا گئیں؟ اس طرح نہیں کرتے بھائی ہمایوں سعید صاحب آپ نے بھی غور کیا کہ کوئی لڑکی آپ کو بھائی کیوں نہیں بناتی؟ انکل تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ ہم کو اپنے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس دفعہ آپ نے نہایت پرتکلف اور شاندار قربانی کی؟ وہ بھی ایک عدد بٹیر کی؟ خیر کوئی بات نہیں، قربانی تو قربانی ہوتی ہے۔ سسٹر تصویر العین یہ تین عورتیں تین کہانیاں تو سنا تھا یہ تین بھائی تین کہانیاں کیا آپ نے لکھی ہے؟ اور بہن حمیرا رضا کیا آپ اس بھائی کے لیے بھی دعا گو ہوسکتی ہیں جیسے حسنین کے لیے تھیں کہ اللہ ہماری مشکل آسان کرے۔ سعدیہ بخاری بہناں یہ آپ سب صنف وجاہت کو آلو کیوں کہہ رہی ہیں، جس سے تکرار ہو ڈائریکٹ اس کو ہٹ کریں۔ بہناں طاہرہ گلزار مایوس یا ناراض ہونے کے بجائے کوشش کرتی رہا کریں، کامیابی مل ہی جاتی ہے۔ باقی تمام دوستوں سے التماس ہے کہ دعاؤں میں مجھ ناچیز اور میرے دوسرے دوست جو سزائے موت کی قید کاٹ رہے ہیں یاد رکھیں۔ سسٹر ماہا ایمان آپ کہاں غائب ہیں۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی، اس دفعہ بھی شیخ حامد کو منہ کی کھانی پڑی۔ مسافر میں شہریار کی مہم جوئیاں ابھی جاری ہیں۔ خیر میڈم کا ساتھ اس کے لیے غنیمت ہے۔ کاشف زبیر کی اندر کی آگ پڑھی جس میں کائی منک نے بڑی خطرناک سازش کی مگر کی کوائے کی ذہانت نے اسے ناکام کردیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی فلک تک چل، مرزا امجد بیگ کی جزائے سزا، ضیا تسنیم بلگرامی کی نوشہ گنج بخش اور آخری صفحات پر محی الدین نواب کی آشوب وفا ایک منفرد کہانی تھی۔ یہ سب کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ اشعار میں عبدالغفور خٹک، حافظ محمد عرفان، سرگودھا اور سارہ، کراچی کے اشعار پسند آئے۔ تمام قارئین اور ادارے سے التماس ہے کہ وہ ہمارے قیدی بھائی عمران حیدر بلوچ کے لیے خصوصی دعا کریں، وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑرہا ہے۔ اس کے گردے خطرناک حد تک خراب ہوگئے ہیں۔“ (اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے)

☩ **ماریہ فاروق**، چمن سے یکشت دو پرچوں پر تبصرہ کررہی ہیں ”نیا سال سب کو مبارک ہو اور اللہ کرے کہ 2013ء ہم سب کے لیے پرمسرت ثابت ہو۔ معراج انکل کی بہت شکرگزار ہوں کہ اکتوبر سے میرے خطوط شائع ہورہے ہیں (آپ کی رائے کے ساتھ ساتھ خط کی سجاوٹ ہی ایسی ہوتی ہے) دسمبر کے شمارے میں ریاض شاہد بھائی کا سن کر دل بہت خوش ہوا کہ آپ کو سزائے موت سے بری کردیا گیا ہے، بہت بہت مبارک ہو اور عمران حیدر بلوچ کا سن کے دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت یابی سے نوازے تاکہ وہ اہل محفل میں شریک ہوکے محفل کو جما سکیں۔ احمد خان تو حیدی صاحب! آپ نے ماہ دسمبر میں یہ بات کہہ کر شاید غلطی کی ہے کسی کی عمر کے بارے میں پوچھنا کوئی گناہ نہیں ہے جو آپ نے انگلی میں انگوٹھی ڈالنے کی بات کی ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب اگر میں واویلا نہ کروں تو اور کیا کروں ذرا بتایئے بھی! مجھے جہاں سسپنس رسالہ ملتا ہے وہاں سے پرانا اس لیے نہیں ملتا کیونکہ وہ کوئی بک اسٹال نہیں ہے ایک عام پرچون کی دکان ہے۔ یہ ایک پسماندہ علاقہ ہے۔ طاہرہ گلزار سسٹر...... آپ کو دسمبر میں نہ پایا البتہ حاضری رجسٹر میں پا کے خوشی ہوئی کہ کم سے کم آپ کا نام تو دل کو خوش کرگیا ہے۔ باقی تمام اہل محفل کے تبصرے بھی اچھے تھے، خطوط پڑھ کے تو اکثر یہی لگتا ہے کہ بعض تو صرف لڑنے آتے ہیں، بھئی آپ لوگ ایک دوسرے پر الفاظ کے بم گرانے کے بجائے دوستانہ ماحول بنائیں نا...... منظر امام کی ہر کہانی مختصر لیکن زبردست ہوتی ہے، کمائی دمائی ان کی تحریر پڑھ کے ان معصوم لوگوں پر ترس آیا جو بہت جلد کسی پر اعتبار کرتے ہیں۔ مریم کے خان کم لکھتی ہیں پر اچھا لکھنے کی کوشش کررہی ہیں۔ ان کی کوشش کا اندازہ پیش عقل تحریر سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ ناصر ملک کی مسافر بھی اچھی جارہی ہے، پڑھ کے اگلی قسط کا انتظار سروا دیتا ہے۔ ہم سرگزشت بھی ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ ان رائٹروں سے ہمیں ملوا دیجیے، مجھے اپنے فیورٹ رائٹرز کے بارے میں جنون کی حد تک شوق ہے (آپ کی فرمائش سرگزشت کے ایڈیٹر صاحب کو بھجوا دی ہے) تنویر ریاض کی گوشۂ عافیت بھی اچھی

تحریر تھی۔ جنوری کے شمارے میں اپنا خط نہ پاکر بہت مایوس ہوئی (مایوس ہونے کے بجائے مجبوری سمجھ لیا کریں) منظر امام کی ہم نشین، محی الدین نواب کی آشوب وفا، تنویر ریاض کی جھوٹ بہت ہی زبردست کہانیاں تھیں، واقعی آشوب وفا کو انوکھی داستان کہا جاسکتا ہے۔ مسافر بھی اچھی جارہی ہے۔ محمد الیاس کی بلِلا اچھی تو تھی مگر شروع میں تھوڑی پیچیدہ لگی بعد میں اچھی ثابت ہوئی۔ طاہرہ گلزار باجی! آپ کا گلہ واقعی اپنی جگہ بجا ہے انکل کو ہر دفعہ آپ کے خطوط بلیک لسٹ نہیں کرنا چاہیے۔ آپ کے خطوط بہت اچھے ہیں آپ جلدی پوسٹ کیا کریں نا...... ایم۔ اے چودھری! بابر عباس کسی گارڈن کا آلو نہیں بلکہ کریلا ہے اور وہ بھی تلخ، ہی ہی ہی! باقی تمام اہل محفل سے گزارش ہے کہ میرے لیے تہ دل سے دعا کریں تاکہ میں F.S.C. میں اچھے مارکس سے کامیابی حاصل کرسکوں، امتحانات دے چکی ہوں۔" (اللہ آپ کی مراد پوری کرے! آمین)

✠ سید علی رضا بخاری، نارووال سے تبصرہ کر رہے ہیں "محی الدین نواب کا بہت زیادہ فین ہوں۔ ان کی تحریریں ہمیشہ منفرد اور حقیقت سے قریب تر ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے انشائیہ پڑھا اور پڑھ کر گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے ہم آگے کی طرف بڑھے اور خطوط کی محفل میں پہنچے۔ سب ساتھیوں کے خطوط مختصر طور پر پڑھے اور دل میں خواہش جاگی کہ ہم بھی ان میں شامل ہوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر فلک تک چل، واقعی حیدر علی اپنے دور کا ایک عظیم حکمران اور دلیر سپہ سالار تھا جس نے انگریزوں کے دانت کھٹے کردیے۔ کاشف زبیر کی تحریر اندر کی آگ، ہمیشہ کی طرح یہ بھی ایڈونچر اور سسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ کشکول میں انوار صدیقی نے معاشرے کے ناسوروں کو بے نقاب کیا۔ تنویر ریاض کی جھوٹ تقریباً ٹھیک تھی۔ مرزا صاحب کی جزائے سزا کے سسپنس سے لطف اندوز ہوئے۔ پھر اصلی نقلی سے ہوتے ہوئے گرہ تک پہنچے۔ یہ دونوں تحریریں گزارے لائق تھیں اور پھر سید خلیق احمد کی آئینۂ ایام پڑھی اور مسافر میں...... Well done ملک صاحب! زبردست! مسافر کی بچھلی قسطوں کی طرح یہ قسط بھی زبردست رہی۔ اپنے من پسند مصنف منظر امام کی تحریر ہم نشین ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی وہ دلوں کو چھو جانے والا موضوع لے کر آئے۔ پھر توشۂ گنج بخش پڑھی اور اپنے ایمان کو منور کیا۔ اس کے بعد محمد الیاس کی بلِلا پڑھی اور معاشرے کی بے راہ روی پر دیر تک غور کرتے رہے۔ اس کے بعد سب سے بہترین کہانی یعنی آشوب وفا پڑھی اور اش اش کراٹھے۔ بلاشبہ اس میں نواب صاحب نے یہودیوں کے مکروہ عزائم کی دھجیاں بکھیر دیں۔ جلالت اسرار بلاشبہ عظیم مرد مجاہد ہے۔ اس کا سورما کا کردار بہت جاندار ہے۔ دوسری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔"

✠ تصویر العین، اوکاڑہ سٹی سے محفل کی زینت بنی ہیں "اس دفعہ ٹائٹل بہت پیارا تھا دوشیزہ کے بال اور آنکھیں بہت ہی اچھی تھیں۔ تمام دوستوں کو سال نو بہت بہت مبارک ہو۔ پہلے نمبر پر ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کا تبصرہ تھا، مبارک ہو۔ اس دفعہ ہم ڈبل ہوگئے ہیں، پچھلی بار تین تھیں تو اب چھ ہیں۔ بے شک گنتی کرلیجیے گا۔ ڈاکٹر وسیم میری طرف سے آپ کو گزری ہوئی سالگرہ مبارک ہو۔ اے۔ ایم چودھری آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ۔ رضوان ملغانی اور تنویر آصف چودھری آپ نے اتنے عرصے خط کیوں نہیں لکھا بہرحال خوش آمدید۔ نورین صبا آپ خوش ہوجائیں کہ جنوری 2013ء کا سسپنس واقعی زبردست آیا ہے۔ سہیل طارق آپ نے پنجابی میں خط لکھ کر میرا دل خوش کردیا۔ محمد قدرت اللہ نیازی مجھے دنیا میں آئے ہوئے 500 صدیاں گزر چکی ہیں اور چونکہ میں نے آب حیات پی رکھا ہے اس لیے مجھے موت بھی نہیں آتی۔ سارہ آپ نے یہ لکھ کر میرا دل بڑھا دیا، آپ کو کیا معلوم مجھے اپنا نام کتنا عزیز ہے۔ محمد ہمایوں سعید میں نے آپ کو دعائیں دی ہیں، بددعائیں تو نہیں۔ آپ کے ساتھ تو کوئی آپ کے جیسی ہی بچے گی نا۔ حمیرا رضا خدا آپ کو کلی صحت وتندرستی عطا فرمائے۔ کاشف زبیر کی اندر کی آگ کہانی اچھی تھی مگر مجھے کم کی موت نے افسردہ کردیا۔ اس دفعہ کشکول کی قسط اتنی خاص نہیں لگی۔ ناصر ملک کی مسافر بہت اچھی رہی۔ شہریار اور میڈم کے ایکشن پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ناصر ملک سے گزارش ہے کہ اگر آپ نے شہریار کے ساتھ ہیروئن رکھنی ہے تو پلیز میڈم کو ہیروئن مت رکھیے گا۔ منظر امام کی ہم نشین پڑھ کر فوراً ذہن میں صرف ایک ہی بات آئی کہ کتے انسانوں سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ محی الدین نواب کی آشوب وفا بہت اچھی کہانی ہے جب پڑھنے بیٹھی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ محفل شعر وسخن میں احمد خان توحیدی، محمد قدرت اللہ نیازی، زوہیب احمد ملک کی چوائس اچھی لگی۔"

✠ ریاض بٹ، حسن ابدال سے تبصرہ کر رہے ہیں "سال نو 2013ء کا پہلا پرچہ اس بار اٹھارہ دسمبر کو بے قرار اور بے تاب نگاہوں کے سامنے آیا۔ اپنے پیارے اور من پسند پرچے کی سالگرہ سب کو مبارک ہو۔ اس موقع پر دعائیں لبوں سے آزاد ہوکر لفظوں کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھر گئی ہے کہ خدا ہمارے پرچے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے اور ہمارے پوتے، نواسے اور ان کی اولاد اس کو پڑھے (آمین) جون ایلیا اس بار نیا سال کے متعلق تحریر لے کر آئے ہیں۔ کتنے انمول اور نادر خیالات ہیں۔ ان کی تحریریں آنکھوں کے راستے سیدھی دل میں اتر جاتی ہیں۔ اس بار راولپنڈی کے ابن مقبول، جاوید احمد صدیقی صاحب پہلا نمبر لے گئے ہیں۔ خوب صورت لفظوں اور بہترین انداز تحریر کی وجہ سے واقعی یہ خط پہلے نمبر کا ہی مستحق تھا۔ آپ نے مجھے یاد کیا اور غیر حاضر قارئین کو محفل میں آنے کے لیے کہا، اچھا لگا...... طاہر عباس کا مختصر مگر جامع تبصرہ تھا۔ ڈاکٹر وسیم فائق صاحب اللہ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) سہیل طارق کا پنجابی وچ تبصرہ وددیا اے۔ بڑا چنگاں لگا اے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخ کے اوراق سے کشید کرکے لکھی گئی کہانی فلک تک چل، حیدر علی کے متعلق تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا یہ خاصا ہے کہ وہ ہمیں لفظوں کی کشتی میں بٹھا کر کشاں کشاں ماضی میں لے جاتے ہیں۔ حیدر علی کی جرات، شجاعت اور فن سپاہ گری سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس کی فتوحات اس بات کی گواہ ہیں۔ اس بار کاشف زبیر اندر کی آگ لے کر آئے۔ سطر سطر اور لمحہ لمحہ سسپنس اور تحیر لیے ہوئے یہ کہانی بھی تاریخ کا ایک حصہ ہی تھی۔ کشکول بھی کافی تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی ہے۔ مسافر کی اس بار قسط کافی سنسنی خیز تھی۔ واقعات برق رفتاری سے گزرتے گئے۔ جزائے سزا مرزا امجد بیگ صاحب کی منفرد کہانی ہے۔ انہوں نے بڑی مہارت اور ذہانت سے سلمیٰ بیگم اور شاہدہ کو چاروں خانے چت کیا۔ سلیم انور کی کہانی اصلی نقلی بھی ایک زبردست کہانی شائع ہوئی۔ باربرا لاکھ شاطر، چالباز تھی لیکن مائیکل کے معاملے میں وہ میرے خیال میں مات کھا گئی۔ محی الدین نواب آخری صفحات کے لیے آشوب وفا لے کر آئے۔ ابھی اس پر اپنی رائے کو محفوظ ہی رکھوں گا۔ محمد ہمایوں تنولی، یاسر محمود، محمد قدرت اللہ نیازی، رانا محمد عامر شاد اور سید بابر عباس کے اشعار نمبر لے گئے۔ باقی انتخاب بھی بہت اچھا تھا۔"

✠ ایم ایس خان، چیچہ وطنی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "السلام علیکم! چالیس سال پرانا قاری ہوں، ریٹائرڈ فوجی ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ

برائے مہربانی نواب صاحب کی کہانی مکمل شائع کیا کریں اور ناصر ملک سے گزارش ہے کہ مسافر کو اتنا امتحان میں نہ ڈالیں۔ کشکول نے نیا رخ اختیار کیا، اچھا لگا اور محمد الیاس صاحب کی بلِلا اچھی لگی۔ سسپنس کی یہ بات اچھی ہے کہ وقت سے پہلے ہی مل جاتا ہے اور ایک ہفتے میں ختم کرکے اگلے ماہ کا انتظار کرنا شروع۔ جب سے کشکول شروع ہوئی متواتر پڑھ رہا ہوں، پہلے باقاعدگی سے نہیں پڑھا۔ امید ہے کہ کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں گے۔"

✠ شیر علی نیازی، راولپنڈی سے محفل میں شریک ہیں "اگر اس دفعہ کوئی سسپنس کے سرورق پر اچھا تبصرہ نہیں کرے گا تو وہ کنجوسی سے کام لے گا۔ لڑکی کا سائنس کے انداز میں ہنسنا بہت بھلا لگا ہے۔ اس مہینے دو آنکھوں دیکھے ایکسیڈنٹ اور ہاتھوں میں ایک بندے کی موت نے سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ سڑک پر راہی بے پروائی نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیوں کے چراغ گل کردیتی ہے (درست فرمایا آپ نے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ کسی بھی کام میں جلد بازی ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے اور خصوصاً سڑک پر۔ تیز رفتاری سے گاڑی چلا کر کوئی بھی پانچ یا دس منٹ سے زیادہ نہیں بچا سکتا اور سوائے نہایت ایمرجنسی کی صورت میں جبکہ کسی کی جان بچانا مقصود ہو پانچ دس منٹ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اور ساتھ ہی اپنی اور دوسروں کی زندگی کو بھی خطرہ نہیں ہوتا) مقبول صدیقی کا عام الفاظ میں سرفہرست تبصرہ پسند آیا۔ مقبول صاحب آپ کو میں دس فیصد والے مردوں میں شامل کروں یا نوے فیصد والوں میں؟ طاہرہ گلزار جتنی بھی کوشش کریں اور پکڑ پکڑ کر لڑکیوں کو لائیں لڑکوں کا پلڑا بھاری ہی رہے گا۔ مس کھرل آف احمد پور شرقیہ پلر کے ساتھ کھڑی میری یاد میں کھوئی کھوئی سی نظر آرہی ہیں۔ سہیل طارق پنجابی دی بجائے اردو وچ لکھیا کرو۔ ہمایوں سعید مجھے پاکیزہ حسن کی وضاحت درکار ہے۔۔۔ ؟ اگر آپ نے نہیں بتایا تو باتونی ڈکشنری (سعدیہ بخاری) سے معلوم کرنا پڑے گا۔ ویسے اب ماہا ایمان کی اصلیت جاننے کے لیے کچھ ساتھی کسی نہ کسی بزرگ قاری کا دروازہ کھٹکھٹانے والے ہیں۔ تصویر العین آپ کا شہریار کے بارے میں تبصرہ اچھا لگا۔ حمیرا رضا میری دعا ہے کہ یہ دنیا آپ کے لیے روشن ہی رہے (آمین) میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ وہ فلک تک چل جیسی تحریر لے کے آئے۔ اس دفعہ کشکول میں عمومی رنگ چھایا رہا مگر مسافر نے ساری کسر پوری کردی۔ چالاکیوں کے مختلف روپ اختیار کرنے کے باوجود قانون اپنا گھیرا تنگ کرتا جاتا ہے۔ محفل شعر وسخن میں سعدیہ بخاری، رحیمہ مسرور نیازی صاحبہ کے اشعار پسند آئے۔ لوگ گزرے پل کو یاد کرکے کھو جاتے ہیں۔ خلیق احمد نے بھی ہمیں یہی سبق دیا ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی زندگی کے اچھے ساتھی بنیں اور ان کی دعائیں لیں۔ مسافر میڈیم اور شہریار کی رومانس سے بھرپور اٹھکیلیوں سے پُر رہی۔ مسافر کے ہر صفحے پر ایک نئی داستان ہے۔"

✠ طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے تبصرہ کر رہے ہیں "اسیران قید سے آزاد ہونے والے کے لیے دل سے دعا، اللہ ان پر نور کی برسات کرے اور جو اندر ہیں انہیں رب کریم جلد از جلد رہائی نصیب کرے، آمین۔ ماہا ایمان آج کل جاسوسی میں نظر آتی ہیں۔ صدیقی صاحب اپنے اچھے تبصرہ کے ساتھ جس کے لیے اول ہیں، خوب رہے۔ بت شکن کے بعد فلک تک چل ڈاکٹر صاحب کی معلوماتی تحریر بہت خوب رہی۔ حیدر علی مسلم قوم کا ایک نڈر جانباز تھا جس نے گھوڑے پر اپنی زندگی زخم زدہ کردی، سرنگا پٹم کا یہ جانباز جب اس دنیا سے رخصت ہوا جس نے انگریزوں اور مرہٹوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا تو اپنے پیچھے ایک لاجواب بیٹا اور بہادر چھوڑ گیا جسے ہم سب ٹیپو سلطان کے نام سے جانتے ہیں۔ کہانیاں دلچسپ اور کچھ پراسرار جیسے اندر کی آگ، یہ آگ کیسی تھی جسے پڑھنے کے بعد مزہ آتا ہے۔ کشکول میں شیخ حامد کا کردار بڑا پراسرار ثابت ہوا کہ شبنم حیران اور پریشان، ایس پی اورنگ زیب بھی حیران اور ہم پڑھنے والے بڑے بے چین کہ شبنم سے فون پر بات کرنے والا کون تھا۔ جھوٹ تنویر ریاض صاحب کا خوب صورت جھوٹ تھا۔ ادھر بیگ صاحب جزائے سزا میں بھرپور انداز میں تیاری کرکے مجرم کی گردن ناپنے میں مصروف رہے۔ سلیم انور صاحب نے چالباز میں خوب صورت بدیسی کہانی کو اپنے انداز سے لکھا۔ بابر نعیم کے گواہ نے لیفٹیننٹ کو خوب چکر دیے مگر کب تک۔ مسافر بھی آہستہ آہستہ کبھی بہت تیز اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے۔ منظر امام صاحب ہم نشین کے ساتھ آئے اور خوب ہی آئے۔ جب بھی منظر امام کا نام آتا ہے آنکھوں میں معین اختر (مرحوم) بے اختیار گھوم جاتے ہیں۔ اسرائیل اور فلسطین کے پس منظر میں محترم نواب صاحب آشوب وفا اپنے منفرد انداز میں چھا گئے۔"

✠ ڈاکٹر وسیم خالق گھمیاں، گجرات سے محفل میں تشریف لائے ہیں "اس بار ماہنامہ سسپنس کے سرورق پر ڈاکر انکل نے طاہرہ گلزار کو جا سجایا جو اپنی زندگی کی نفتی لگانے کے بعد انتہائی خوش تھیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی اس بار محفل یاراں میں کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئے، مبارکاں جی۔ کراچی سے رمضان پاشا صاحب آپ شادی کو گلے میں ڈھول لٹکانا سمجھتے ہیں جبکہ ہم شادی کو سنت نبوی سمجھتے ہیں۔ اوکاڑہ سے تفسیر عباس شاید آپ نے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ بابر عباس کو میڈم شکیلہ سے اور شہریار کے رومانس سے بوریت محسوس نہیں ہوتی بلکہ انہیں اپنے ہی ہم عمر شیخ حامد کے روز روز حسینائیں بدلنے سے چڑ ہے۔ ایک سے سعدیہ بخاری، جو عمل کسی نقصان کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو اسے شرارت ہی کہتے ہیں نہ کہ دھوکا۔ نوید انجم بٹ جی واقعی راجا ثاقب اور نعمان پیارے آج کل کم ہیں جیسے رضا دوی گریٹ اور جعفر حسین چنیوٹ وغیرہ۔ سب سے پہلے محی الدین نواب کی کہانی آشوب وفا پڑھی جس میں جلالت خان کی مجاہدانہ زندگی اور یہودیوں کے عقیدے اور پل پل بدلتی صورت حال نے پہلی سطر سے لے کر آخر تک اپنے حصار میں رکھا۔ ناصر ملک کی کہانی مسافر کی اگلی قسط میں لگتا ہے یقیناً میڈم شکیلہ کے ماضی سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ انوار صدیقی کی سلسلہ وار کہانی کشکول، عورت ایک پہیلی ہی کی طرح ایک نا سمجھ میں آنے والا معما بنی ہوئی ہے۔ مرزا امجد بیگ کی جزائے سزا میں شاہدہ اور سلمیٰ اگر عقل مندی سے کام لیتیں تو کبھی رسوا نہ ہوتیں۔"

✠ ادریس احمد خان، ناظم کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں "سب سے پہلے سسپنس کے دوستوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نیا سال مبارک۔ یہ سال ہر انسان کی زندگی میں خوشیاں وکامرانیاں لائے۔ سرورق کی حسینہ بھی مسکراتے ہوئے نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ انشائیہ بھی حکمت و دانائی کے موتیوں سے سجا تھا۔ جاوید احمد صدیقی کو مبارکباد، دیگر دوستوں کے ناموں کے ساتھ اپنا بھی نام نظر آرہا تھا، شکریہ۔ اس کے بعد مسافر کی سنگت اختیار

کی اور پیچ وخم سے گزرتے مسافر کے سنگ سنگ چلے۔ مسافر پہلے دن سے دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ دوسرا مقبول عام سلسلہ کشکول تھا۔ کشکول نے بھی ابھی تک اچھا تاثر دیا ہے اور شروع سے آخر تک یہ سلسلہ بھی دلچسپی سے پڑھا گیا۔ تاریخ کے جھروکوں سے مزین ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر فلک تک چل نے عظیم مجاہد حیدر علی کی مجاہدانہ زندگی سے آشکار کیا جس نے انگریزوں کے دانت کھٹے کردیے تھے۔ کاشف زبیر کی اندر کی آگ نے بھی بہت متاثر کیا۔ تنویر ریاض کی جھوٹ نے بھی مزہ دیا۔ اصلی نقلی اور گرہ نے بھی دلچسپی برقرار رکھی۔ شعروسخن میں بھی تمام شعر اچھے تھے۔ ہم نشین میں انسان کو انسان ہونے کا اچھا سبق ملا۔ ولیوں کے حالات وواقعات میں نوشہ گنج بخش کے رموز زندگی سے آگہی حاصل ہوئی۔ بلا بھی سبق آموز ثابت ہوئی۔ آخری صفحے کی بہترین کہانی محی الدین نواب کی آشوب وفا، امید ہے کہ سابقہ تحاریر کی طرح اچھی بلکہ بہت اچھی ہوگی۔"

رمضان پاشا، گلشن اقبال کراچی سے تبصرہ کررہے ہیں "سب سے پہلے آپ کو اور محلے کے تمام افراد کو نیا سال مبارک ہو۔ یوں تو سالگرہ نمبر عام شمارے جیسا تھا، مگر تھا بھرپور۔ سرورق جاذب نظر اور دلکش تھا۔ نئے سال کا پہلا انشائیہ برمحل اور حسب حال تھا۔ خطوط کی محفل میں ابن مقبول جاوید صدیقی پہلے نمبر پر نظر آئے۔ جتنا طویل ان کا نام ہے تبصرہ بھی ان کا طویل ہے مگر لائق تحسین ہے۔ ڈاکٹر وسیم خالق صاحب مجھے ٹریجڈی مناظر اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ ان کے پس پشت ایک گہرا مقصد پنہاں ہے اسے ڈاکٹر صاحبان نہیں سمجھ پائیں گے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ قیامت تو 21 دسمبر کو گزر گئی اب کیوں میری ناک کے پیچھے پڑی ہیں، تصویر العین صاحبہ مجھے افسوس ہے کہ ٹائٹل پر میرا تبصرہ آپ کو برا لگا۔ اشعار کی محفل میں مانسہرہ والے محمد ہمایوں تحولی کا انتخاب پسند آیا۔ جہلم والے یاسر محمود کا چناؤ بھی اچھا تھا، حاجی محمد اقبال زرگر کا قطع بھی دل کو بھایا۔ "فلک تک چل" اس تاریخی کہانی میں وہ لطف نہیں جو گزشتہ تحاریر میں ہم پہنچایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا یہ کسی تاریخ دان کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ چینی کہانی اندر کی آگ نے بہت متاثر کیا، اس کہانی میں ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ انسانی ہڈیوں میں موجود فاسفورس آگ پکڑ لیتی ہے اور مجسم انسان کو جلا کر بھسم کردیتی ہے۔ کشکول اور مسافر کی یہ قسطیں بڑی جاندار تھیں، دونوں کا اختتام دل دہلانے والا تھا۔ جھوٹ بولنا اخلاقی جرم ضرور ہے لیکن کسی کی جان بچ جائے تو یہی جھوٹ جائز بھی بن جاتا ہے۔ جزائے سزا اس بار بٹ صاحب نے بہت ہی وننگ کیس کا احوال پڑھنے کو دیا، عدالتی کارروائی میں مزہ آگیا۔ اصلی نقلی کیا خوب ہیر پھیر والی کہانی تھی، لطف آگیا۔ گرہ بھی اچھی کہانی تھی۔ ہم نشین، منظر امام صاحب کو اس کہانی پر داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ بلا ایسی منفرد اور دھانسو قسم کی کہانی پہلے کبھی نہیں پڑھی۔ آشوب وفا ابھی تو پہلی قسط ہے، ابھی سے معلوم ہورہا ہے کہ یہ کہانی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستند دستاویزی حیثیت کی حامل تحریر ہے۔"

ماہا ایمان، حافظ آباد سے محفل میں شرکت کررہی ہیں "کبھی ہم میں تم میں بھی قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، پچھلے دو ماہ سے گھر کے مرد حضرات کے ترلے منتیں کرکے خط پوسٹ کروا رہی ہوں لیکن خط تو دور رسید تک نہیں مل رہی، پتا نہیں کون ظالم اس ظلم پر اتر آیا ہے، خیر پھر حاضر ہوں...... امید ہے کہ صنف مخالف کی امیدوں پر سوڈا واٹر پھرے گا (شاباش...... ہمت نسواں......) روشن پیشانی، غزالی آنکھوں، شہابی گردن، ماہتابی چہرے میں تمام حسن و کشش کے استعارے سمیٹے مسکراتی ہوئی حسینہ معصومیت کا پیکر نظر آئی۔ ہر سال، سال نو کی مبارک شمع سے ہی کیوں پھوٹتی نظر آتی ہے۔ جون ایلیا کی سوچیں انشائیہ میں ہماری منتظر تھیں۔ ان سے حساب بے باق کیا۔ اداریے میں آپ نے اس بار بھی خوب لکھا اور اس کا ننھا سا ٹمٹماتا دیا پکڑا کر اندھیروں کو مٹانے کی اپنی سی سعی کیا خوب کی۔ لیڈر آف دی ہاؤس اس بار ابن مقبول جاوید احمد صدیقی ٹھہرے جو کہ حساب دوستاں کرنے میں مصروف تھے۔ جناب یہی تو المیہ ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر کسی کو نظر نہیں آتا لیکن دوسرے کی آنکھ کا بال بھی نظر آجاتا ہے جیسا کہ ہمایوں سعید کو نظر آتا ہے۔ اے ایم چودھری تنصیر انکل کو انکل کہہ کر تم نے دل خوش کردیا لیکن صوبیہ تنصیر سسٹر اور تنصیر عباس انکل یہ کیا غضب کیا، مخالفوں کو پکڑائی نہیں دیا کرتے۔ رمضان پاشا بھائی لڈو کھا کے پچھتانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ سارہ آپ نے خوب مخالفوں کی کلیاں اکھاڑی ہیں ویلڈن سعدیہ بخاری کا بھی پینترے بدل بدل کر جوابی حملے کرنا بہت پسند آیا۔ عمران بلوچ کے لیے ڈھیروں دعائیں، اللہ انہیں صحت دے۔ ہمایوں سعید راج کتنے سیانے ہوگئے ہو تم۔ طاہرہ گلزار سوئی میں یہ تین میں نہ تیرہ میں۔ مجھے خوشی یا دکھ کیوں ہونے لگا۔ تنصیر انکل آپ کا اور بابر عباس انکل کا درد مشترک ہے سو مجھے آپ دونوں سے گوڈے گوڈے ہمدردی ہے۔ تصویر العین اور حمیرا رضا کی آمد بھی اچھی لگی۔ دل نشین اور طاہرہ یاسمین سے بھی واپسی کی التجا ہے۔ قدرت اللہ نیازی اپنی جستجو اپنے گھر تک ہی محدود رکھو۔ عدنان یوسف خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، ذرا خربوزے کی صنف پر غور کرنا۔ بہت ہی معتبر نام محی الدین نواب کے شامل ہوتے ہوئے کہیں اور جانے کی گستاخی تو ہم ہرگز نہیں کرسکتے تھے۔ سوفزہ کی صورت حال کے تناظر میں لکھی گئی آشوب وفا نے مسمرائز کردیا۔ مسافر میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ میڈم شکیلا اپنے کردار کی بنا پر میرے ناپسندیدہ لوگوں میں شمار ہونے لگی ہے۔ کشکول اپنی تیز رفتاری کے باعث پسندیدگی کی سند پا چکی ہے حالانکہ کرداروں کے مقابلے میں خاصی پیچیدگی کا شکار ہے۔ کاشف صاحب حسب معمول خاصے کی شے خاص وقت پر لائے۔ دلیلوں کے ہتھیار کے ساتھ میدان میں اترنے والے امجد بیگ اپنے ماہرانہ انداز میں جزائے سزا لائے۔ محفل شعروسخن میں محمد اظہر کراچی کا شعر قابل تحسین لگا۔ انکل معراج رسول کی صحت وتندرستی کے لیے ڈھیروں دعائیں اور اللہ کراچی کو بھی دوبارہ سے امن و آشتی کا گہوارا بنائے۔"

توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی سے محفل میں شامل ہوئے ہیں "خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کررہا ہوں۔ امید ہے کہ میری پہلی کوشش کی ملاقات ردی کی ٹوکری سے بالکل بھی نہیں ہوگی (دیکھیے نہیں ہوئی، خوش آمدید) ملک صفدر حیات، مرزا امجد بیگ اور محی الدین نواب صاحب میرے پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ لیکن آج کل میں جس کی کمی سب سے زیادہ محسوس کررہا ہوں وہ ہیں جناب ہمایوں بلگرامی صاحب۔ اس کے علاوہ قارئین کا ایک دوسرے کے خطوط پر تبصرہ بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ مدت ہوئی ہے کہ تاریخی کہانی میں محبت کی داستان پڑھنے کو نہیں ملی۔ ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ براہ کرم کوئی مدتوں یاد رہنے والی داستان محبت لے کر آئیں۔ مجھے شدت سے انتظار رہے گا (آپ کی فرمائش ڈاکٹر صاحب تک پہنچادی ہے) دسمبر کے شمارے کا سرورق سادہ مگر انتہائی جاذب نظر تھا جسے میں اپنے پاس محفوظ رکھنا چاہوں گا۔ جبکہ تاریخی کہانی بت شکن میری انتہائی پرزور فرمائش تھی۔ لیکن شکر ہے کہ کرنے سے پہلے ہی پوری ہوگئی (اسی لیے کہتے ہیں کہ

ہمیشہ مثبت سوچیے پتا نہیں ہمارے دل کی کون سی بات پوری ہوجائے) جنوری کے شمارے میں سہیل طارق صاحب پنجابی فرما رہے تھے۔ واہ جی واہ...... تاریخی کہانی فلک تک چل کچھ خاص پسند نہیں آئی کیونکہ مجھے انگریزوں کی آمد سے قبل کے ہندوستان کی تاریخ پڑھنے میں بے حد مزہ آتا ہے۔ کترنوں میں صفحہ نمبر 219 پر ریاض بٹ صاحب کی دائیں بائیں کے تو بس کیا کہنے...... تھوڑی دیر کے لیے تو ہم نے بھی کچھ پریکٹس کی۔"

طاہرہ یاسمین، سرگودھا سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ "طویل غیر حاضری کے بعد آج پھر حاضر ہیں۔ اس دفعہ شمارہ 17 دسمبر کی شام کو ملا تو کھانا چھوڑ کر رسالے پر ٹوٹ پڑے (ارے رے رے ذرا تحمل) سرورق کی چڑیل دیکھ کر تو ڈر کے مارے رسالہ ہی نیچے گر پڑا۔ اگر موم بتی سے لکھا گیا سال نو مبارک بہت پیارا لگا۔ ہم محفل سے غیر حاضر کیا ہوئے سب دوستوں نے مڑ کر بھی یاد تک نہ کیا۔ ڈاکٹر وسیم صاحب آپ بہت اچھے انسان ہو آپ کے خط اچھے لگتے ہیں۔ حبیب احمر کرک سے خوش آمدید محفل میں۔ آپ نے یہ کیا بے تکا سوال پوچھا کہ مسافر کی کتنی اقساط باقی ہیں۔ ہمایوں سعید آپ نے کہا کہ کسی لڑکی نے آج تک آپ کو بھائی بنانے کی بے وقوفی نہیں کی۔ اب پہلے سے ہی بے وقوف کو اور کیا بنائے کوئی بھائی جان جی، سب سے پہلے تو پڑھی مسافر کیونکہ انتظار تھا کہ شہریار کے گھر کے کاغذات پر کس کا نام تھا۔ اس بار بھی کہانی کا اینڈ بڑی سنسنی خیز جگہ ہوا۔ کشکول بھی بہت اچھی جارہی ہے، لیاقت حسین کا کردار بہت اچھا ہے۔ اصل ہیرو تو وہی ہے نا۔ تاریخی کہانیاں پڑھ کر بہت سی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ کہانی بہت شاندار تھی۔ نوشہ گنج بخش پڑھ کر دل کو سکون آگیا۔ آئینہ ایام اور جزائے سزا بھی بہت اچھی تحریریں تھیں۔"

قیصر اقبال کلول، بھکر سے تبصرہ کررہے ہیں "سالگرہ نمبر کے سرورق پر موجود حسینہ کی مسکراہٹ دیکھ کر یہ اندازہ قائم کیا کہ محترمہ لازماً نئے سال کی آمد کو اپنی خوب صورت مسکراہٹ سے ویلکم کہہ رہی ہیں۔ جون ایلیا کا نیا سال کے نام سے لکھا گیا انشائیہ جو انسان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردینے کے لیے کافی ہے اور ہم ان شاء اللہ امیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبوں کو ماند نہیں پڑنے دیں گے۔ ابن مقبول، جاوید، احمد، صدیقی چار ناموں میں سمایا ہوا بندہ ایک ہی ہے۔ بھئی تو اس قدر پھول کر بیٹھا ہوا ہے۔ تبصرہ اچھا تھا مبارک باد لیکن اپنے خط میں آپ نے سسپنس 5 تاریخ کو آنے کا کہہ کر نالائقوں والی بات کردی۔ شاید یہ عمر کا تقاضا تھا کہ آپ کی زبان پھسل گئی۔ صدیقی صاحب نے طاہر عباس کو اپنا وزیر نامزد کیا۔ ڈاکٹر وسیم محفل میں حاضری دیتے رہنا۔ اے ایم چودھری صاحب کیا ہی اچھا ہو کہ آپ کا اگلا خط آپ کے مکمل نام کے ساتھ ہو۔ نوید انجم بٹ صاحب، کیا کرکٹرز، کیا امپائرز اور کیا کمنٹیٹرز، کوئی بھی اس وقت تک زیر عتاب نہیں آتا جب تک اس کی اصلی شخصیت پر کوئی دھبا نہ لگ جائے۔ رمضان پاشا بھائی، یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ آپ ڈھول گلے میں ہی لٹکائیں، سہیل طارق، صاحب، تساں خط وچ ساڈا ذکر کیتا، بے حد پچھوتے ساتوں وڈی خوشی ہوئی اے۔ قدرت اللہ برادر، صنف اوئی اوئی کے پاس مجبوری میں پناہ لی، باقی تو آپ خود سمجھ دار ہیں۔ ہمایوں ڈیئر، اس محفل میں خط زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ سعدیہ بخاری نے جس مرغی کی قربانی کی تھی، وہ اس کا گوشت بھی نہ کھاسکی کیونکہ وہ مرغی...... سمجھ تو گئے ہوں گے آپ۔ تصویر العین، اگر ہم بلیک ہول میں گرتے تو آپ کو بھی ساتھ لے کر جاتے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ، اپنی ہم جولیوں کو دل کھول کر آوازیں دیں۔ شاید کوئی کسی کونے سے اٹھ کر آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اور اپنی عینک درست کرکے لاٹھی ٹیکتی ہوئی محفل میں آہی جائے۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد فلک تک چل لے کر آئے اور ہمیں حیدر علی کے حالات زندگی سے آگاہی دلائی۔ کاشف زبیر کی اندر کی آگ میں کم تو اپنی جان ہار گئی لیکن لی لوائے نے فینگ من کی موت سے پردہ ہٹا کر ملکہ ماشی زو کے خلاف سازش کو ناکام بنادیا۔ کشکول کی یہ قسط انتہائی تیز رفتار تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شیخ حامد سمندر کی تہ سے کس روپ میں نکلتا ہے۔ تنویر ریاض کی جھوٹ میں سارجنٹ گلبرٹ نے ڈیم کی موت پر خاموشی اختیار کرکے فلورا کے حق میں اچھا ہی کیا۔ جزائے سزا میں بیگ صاحب نے سلطی کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر کر اصل مجرم قادر عرف صفدر کو بے نقاب کیا اور ریحان کو باعزت بری کرالیا۔ سلیم انور کی اصلی نقلی میں مائیکل تو فائدے میں رہا لیکن بار بار ہیرا پھیری سے جمع کی ہوئی رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ بابر تسنیم کی گرہ میں فلچر نے ایک خوب صورت جال میں نائی کو اس طرح پھنسایا کہ وہ اپنے گلے میں خود ہی پھندا ڈال بیٹھا۔ آئینہ ایام بوڑھے والدین کی جوان اولاد کے لیے ایک سبق ہے۔ مسافر کی اس قسط کو ایک ہی نشست میں ختم کیا۔ انسان اور کتے کا موازنہ کرتی تحریر ہم نشیں میں منظر امام نے کئی انسانوں کے ضمیر کو جھنجوڑا ہوگا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی نوشہ گنج بخش میں بی بی جیونی کے بطن سے جنم لینے والے حاجی محمد جو شاہ سلیمان قادری صاحب سے فیض یاب ہوکر نوشہ گنج بخش کے منصب پر فائز ہوا، کے واقعات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ محمد الیاس کی بلا میں خان بہادر کا بیٹا تخی بہادر اپنے بھائی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ آخری صفحات پر آشوب وفا محی الدین نواب کے قلم کی گہرائی کا منہ بولتا ثبوت اور انمول تحریر جس کے مزید سورماؤں کی آمد کا شدت سے انتظار ہے۔ محفل شعروسخن میں قدرت اللہ نیازی کا انتخاب پسند آیا۔ مراسلے گو کہ اس دفعہ کم تھے مگر معیاری تھے۔"

بابر عباس، بھگیانہ روڈ کھاریاں سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سرجی، نئے سال کا نیا شمارہ یکم جنوری کی شکل میں ہاتھوں میں ہے مگر افسوس نئے سال کے نئے شمارے میں یعنی ہمارے پیارے اور خوب صورت سسپنس میں جو کہ مکمل طور پر ایک مردانہ ڈائجسٹ ہے سرورق سے غائب ہے۔ یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہے۔ سرورق کی چڑیل دل کو ذرا اچھی نہیں لگی۔ (ہاہاہا...... بہت خوب) اشتہارات کو بالکل اسی طرح نظر انداز کیا جس طرح ہمارے حکمران عوام کے مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں، سیدھا پہنچا اپنے پیارے سے جون ایلیا صاحب کے انشائیہ نیا سال پر حسب معمول اور حسب حال زبردست انشائیہ تھا خدائے بزرگ و برتر جون ایلیا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین) سب دوستوں کو سال نو مبارک ہو۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ آنے والا نیا سال آپ لوگوں کے لیے بہت ساری خوشیاں لے کر آئے (آمین)۔ کہانیاں حسب معمول ساری ہی اچھی تھیں، آشوب وفا کا شدت سے انتظار رہے گا۔"

زیب حسن، اچھرہ، لاہور سے حاضر ہوئے ہیں "نئے سال کے آغاز میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کی طرح آپ کے ادارے کو ترقیوں اور بلندیوں کی طرف گامزن رکھے۔ (آمین) غالباً 17 دسمبر کی شام اچھرہ بازار کے ایک ہوٹل سے کھانا کھا کے چہل قدمی کرتا ہوا ایک بک اسٹال کے سامنے سے گزرا

By Chance تو اسٹال میں سجے سسپنس پر نظر گئی۔ گھر میں تھا میرا سسپنس تھا۔ رات کافی خنک تھی۔ الیکٹرک کیٹل پہ چائے بنائی اور رضائی میں دبک کر سسپنس پڑھنا شروع کیا۔ (واہ واہ...... کیا زبردست ماحول ہوگا) سرورق کی حسینہ کی دلکش مسکراہٹ دیکھ کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ مسافر پڑھی، بہت زبردست واقعات کا تسلسل، ماحول کی منظر کشی اور جاندار اسٹوری کے باعث مسافر پہلے نمبر پہ جارہی ہے۔ خطوط کی محفل میں ابن مقبول چھائے ہوئے تھے۔ باقی خطوط کا بھی سرسری جائزہ لیا اور پسند آئے۔ فلک تک چل زبردست اور حقیقت پر مبنی تحریر تھی، امید ہے اگلے پرچے میں ٹیپو سلطان شہید کے بارے میں بھی پڑھنے کو ملے گا۔ (گویا آپ تسلسل سے سسپنس کا مطالعہ نہیں کررہے) چھوٹی کہانیوں میں بلا زبردست کاوش تھی۔ بنی بہادر جیسے خود غرض انسان کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اندر کی آگ ایک چھپی ظلم کی ہو بہو کاپی تھی۔ ہم نشین سبق آموز اور دل ہلا دینے والی تحریر تھی۔ کشکول میں شیخ حامد کے گرد آخر کار گھیرا تنگ ہوگیا لیکن اس کی موت شبہات کی زد میں۔ آپ سے گزارش ہے کہ احمد اقبال صاحب سے کوئی قسط وار کہانی شروع کروائیں۔ (آپ کی فرمائش جلدی پوری ہونے والی ہے) محی الدین نواب صاحب کا نام ہی کافی ہوتا ہے اور آشوب وفا واقعی سسپنس سے بھرپور کہانی تھی۔ دوسرے حصے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ توشہ گنج بخش پڑھ کے ایمان تازہ ہوگیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ کے بارے میں تفصیلی مضمون شائع کریں۔ آخری صفحات پر محبتوں کے سفیر طاہر جاوید مغل صاحب کی حاضری لگوائیں۔" (آپ کی فرمائش پہنچادی گئی ہے)

✠ **ابن مقبول جاوید احمد صدیقی**، راولپنڈی سے تشریف لائے ہیں "سالگرہ نمبر ملا۔ خوب صورت ہلکے رنگوں کے امتزاج نے انتہائی خوشگوار تاثر چھوڑا۔ جون ایلیا کا انشائیہ دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔ آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ کے خط میں مسند صدارت میرے حوالے کی گئی، شکریہ۔ اس دفعہ صنف نازک کی شراکت بھی 3 سے بڑھ کر 7 ہوگئی۔ بلکہ بہترین تبصرہ بھی اسی صنف کی اے ایم چودھری کا ہی میری نظر میں ٹھہرا، مبارک باد! ہاں نورین صاحبہ آپ کو کس طرح احمد اقبال کی چار سمت ایک چوراہا ایک قصہ چہار درویش کی جدت لگی۔ کچھ خدا کا خوف کریں۔ سہیل طارق کا پنجابی تبصرہ زبان کا مزہ تبدیل کرنے کو تھا۔ انجم فاروق ساحلی آپ اتنا اچھا لکھتے ہیں۔ پھر آپ ایسی بہکانا بات کیوں پوچھتے ہیں؟ محمد ہمایوں سعید خوب تبصرہ تھا اور زبردست چھیڑ چھاڑ بھی، مزہ آگیا پڑھ کر...... محترمہ تصویر العین نے قیصر اقبال کلول کے تبصرے پر اس ماہ کا بہترین تبصرہ کیا کہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اب دیکھتے ہیں محترمہ ہمارے لیے کیا حکم دے رہی ہیں؟ محی الدین نواب کی پہلی قسط 60 صفحوں پر محیط تھی اور یہ 60 صفحے ایسے پڑھے اور حیران ہوا کہ اتنی جلدی، کیا نواب صاحب کی کہانیاں جادو اثر رکھتی ہیں۔ انتہائی گہرائی لیے اور ایک ایک پہلو کو اجاگر کرتی یہ کہانی زبردست تاثر چھوڑ گئی۔ دوسرے کشکول شروع سے آخر تک اور پہلی قسط سے اس 18 ویں قسط تک ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے صبح آج ہی شروع کی ہے۔ اتنی بھرپور تحریر، اتنی زبردست پلاننگ صرف انہی کی تحریروں میں ہی ملتی ہے۔"

✠ **محمد جاوید**، تحصیل علی پور سے تبصرہ کررہے ہیں "جون ایلیا نے ماضی حال مستقبل کو محض ایک لفظ زمانہ میں مقید کرکے اپنی بے مثل دانائی کا ناقابلِ تردید ثبوت دیا۔ سسپنس کے سیپ، قیمتی موتی ابن مقبول جاوید صدیقی قرار پائے۔ معمر ترین کنواروں کے صدر رمضان پاشا ہمیں آپ کے ادھورے پن کی خبر پڑھ کر بے انتہا حیرت ہوئی کیونکہ اپریل 1986ء کے سسپنس ڈائجسٹ میں آپ کا تبصرہ اب بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ نیازی صاحب چوری شدہ کی تلاش و بسیار کے لیے ہمایوں سعید کی بطور کھوجی خدمت مستعار لیں۔ حمیرا رضا ہمیں آپ کی ضعف بصارت پڑھ کر گہرا دکھ ہوا۔ علاج معالجے کے ساتھ ساتھ قدرتی خوب صورت نظارے، حسین چہروں کو دلچسپی سے دیکھنے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔ گزشتہ شمارے میں ماہا ایمان کے جواب میں ہمایوں سعید نے خود سری لنکن کرکٹر مرلی دھرن کا عکس ثابت کرنے کے لیے پُرزور دلائل دے کر ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ہمایوں سعید، بے تحاشا غصے سے مغلوب شخص عقل سے یکسر بیگانہ ہوجاتا ہے۔ پس آپ کو حماقت خیز اعتراض سے تو کچھ وصول نہ ہوا مگر ہمیں سسپنس گیر شہرت ضرور حاصل ہوئی۔ سعدیہ بخاری پوری بات جانے بنا رائے دینا ناقص العقل ہونے کی غماز اور تصدیق کی مہر ثبت کرتا ہے۔ جویریہ صاحبہ آپ سے نام کا مطلب کیا پوچھا مطلب کے ساتھ آپ بھی گم شدہ ہوگئیں۔ نئے نئے سسپنس کی ریڈرز کی خوش کن آمد سے اپنے بے ربط تبصرے کو بلیک لسٹ کے لپیٹے میں دیکھ کر کوئی دکھ نہیں ہوا، نئے دوستوں کی آمد سسپنس کی کامیابی کی مربوط و مضبوط دلیل ہے۔ منظر امام نے خوب سچ بیانی کے تحریری تازیانے برسائے جو اپنے اردگرد بکھرے مفلوک الحال مایوسی کی آخری حدوں کو چھونے والے انسانوں کے دلی کرب کو باشعور اور عقل مندی کے دعوے دار ہونے کے باوجود سمجھ نہیں پاتے۔ ہم نشیں کے دردناک انجام سے روح جھنجھنا اٹھی۔ محترم اور بزرگ رشتوں سے دانستہ و نادانستگی میں ہوجانے والی غفلتوں کی نشان دہی کرتی ہوئی شیشہ تحریر آئینہ ایام بے وفا شجر اولاد کے سوئے ہوئے ضمیر پر ضرب کاری تھی۔ آئینہ ایام بے حد پسند آئی۔ نفیس محبتوں سنگین جرائم گہری سازشیں، قانون کے شکنجے اور کالی قوتوں کا حسین و سنگین امتزاج گہرائی سے رقم کی ہوئی انوار صدیقی کی مایہ ناز کشکول مسلسل کامیاب جارہی ہے۔ ناصر ملک صاحب رومانس کے سحر انگیز ماحول میں ڈوب کر ہمیں خود کو ایک کردار ہونے کا گماں ہونے لگتا ہے۔ آشوب وفا کی اگلی قسط پڑھ کر ہی کوئی رائے قائم کی جاسکے گی۔ مرزا امجد بیگ کا حل شدہ کیس جزائے سزا انتہائی سنسنی خیز رہا۔"

✠ **مزمل اسلم**، لیہ سے تشریف لا رہے ہیں "کافی عرصے کے بعد محفل دوستاں میں شرکت کررہا ہوں۔ امید ہے محفل میں جگہ دی جائے گی (خوش آمدید) ان دنوں میں تعلیم کے سلسلے میں میانوالی سے لیہ منتقل ہوچکا ہوں۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ میری کامیابی کے لیے دعا گو ہوں (اللہ آپ کو کامیاب کرے، آمین) 2012ء آخر کار کچھ مسکراہٹیں اور کچھ آنسو دے کر رخصت ہوگیا۔ لیکن ہمارے ملک کے حالات جوں کے توں ہیں۔ کبھی کہیں بم دھماکا، کبھی کہیں کوئی قتل، کہیں کوئی عورت بیوہ تو کہیں کوئی بچہ یتیم ہوجاتا ہے۔ بیروزگاری اور مہنگائی آئے روز بڑھتی جارہی ہے۔ ٹائٹل پر انکل ذاکر جی کے ہاتھوں کا شاہکار ایک لڑکی مستقبل کے لیے اچھی مسکراہٹ چہرے پر سجائے کھڑی تھی۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ ہمیشہ کی طرح تبصرے سے معذرت۔ محفل دوستاں میں وارد ہوئے۔

ابن جاوید مقبول احمد صدیقی کو کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ مبارکاں بادشاہو مبارکاں۔ طاہر عباس صاحب ٹھیک فرمارہے ہیں کہ سسپنس ایک سحر ہے جس سے نکلنا مشکل ہے۔ مبارک ہو، اے ایم چودھری صنف کرخت کو تاڑتی ہوئی نظر آئیں، بری بات ہے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی، شہریار اور میڈم میں بلی چوہے کا کھیل چل رہا ہے۔ شہریار اپنے ماں باپ کے قاتلوں کے قریب پہنچ رہا ہے۔ کشکول میں آکٹوپس کے گرد بڑا مضبوط جال بنا گیا۔ اصلی نقلی میں آخر سیر کو سوا سیر ٹکرا گیا۔ بلا دوست کے گرد گھومتی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ آئینہ ایام میں بتایا گیا کہ تنہائی کا عذاب سہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اندر کی آگ کاشف زبیر کی ایک زبردست تحریر تھی۔ جزائے سزا میں بیگ صاحب نے اپنے دلائل سے مخالف کو چاروں شانے چت کردیا۔ سسپنس مکمل طور پر اچھا ہے۔ بندہ ایک دفعہ اس کو پڑھنا شروع کردے تو اس میں گم ہوکر ہی رہ جاتا ہے۔" (بہت شکریہ جناب)

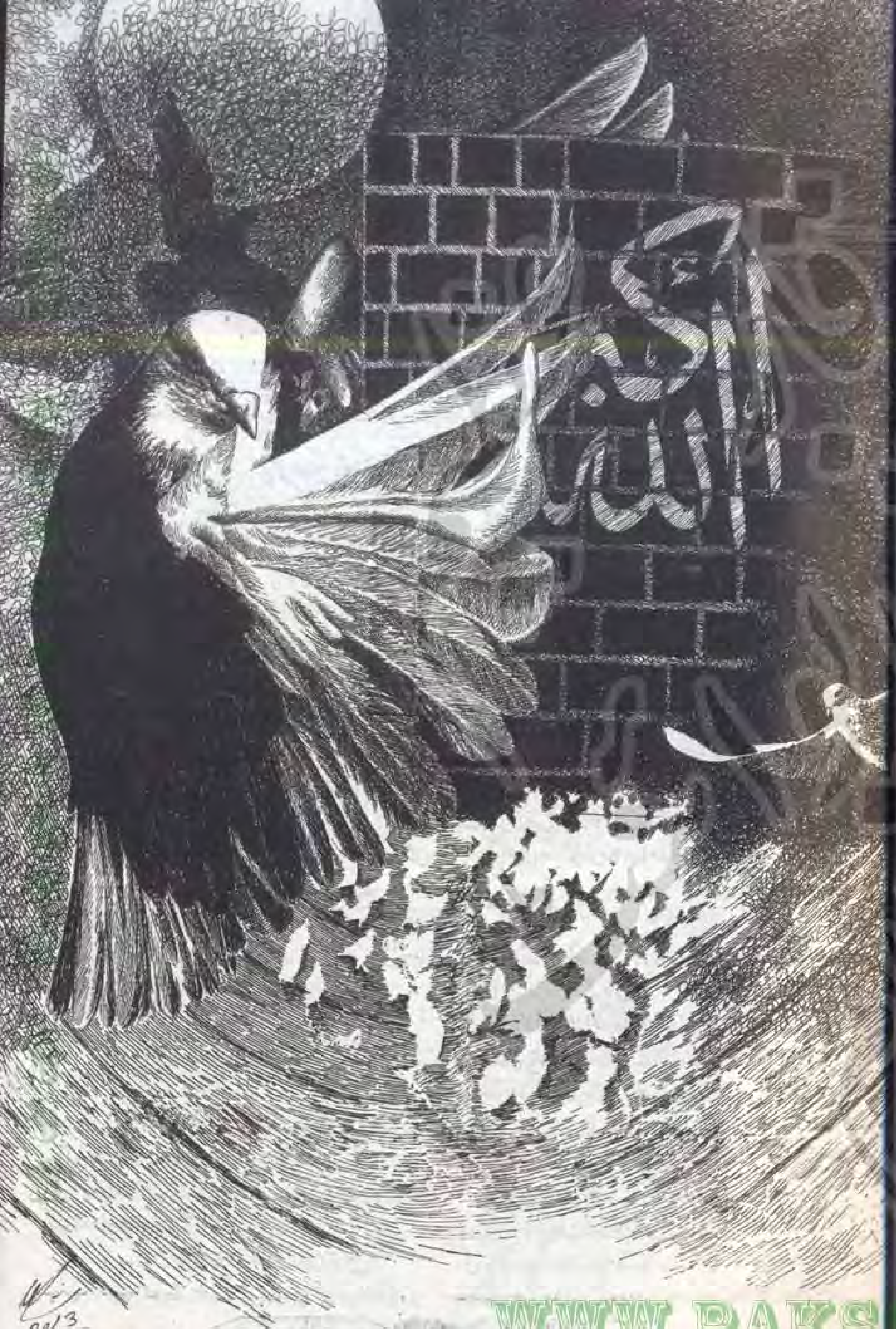
✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے محفل میں چلے آرہے ہیں "ذاکر انکل نے اب کی بار سرورق کو اشوریا کے حسین مکھڑے، جادوئی مسکراہٹ اور جھیل جیسی ساحر آنکھوں سے سجا کے سالگرہ نمبر کا حق ادا کیا۔ بے شک یہ انکل، آنٹی اور تمام ٹیم کی انتھک محنت اور بے لوث محبت ہے کہ آج جاسوسی اور سسپنس اپنے اعلیٰ معیار کے سبب پوری دنیا میں پاکستان اور اردو زبان کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں۔ ابن مقبول صاحب ہم نے صنف نازک کی عمومی محبت کا ذکر کیا تھا۔ باقی ان کے بقول آپ کے معمولی شکل مرد کے ساتھ نظر آنا ان کی اخلاقی، معاشرتی اور شرعی مجبوری ہے۔ ڈاکٹر وسیم صاحب! ہم اپنے پیچھے پڑنے والوں سے خود ہی نمٹ لیں گے۔ اے ایم چودھری صاحب! ہم محبتیں ضرور نبھائیں گے مگر پہلے وہ شاعرانہ علامات تو ظاہر ہوں۔ قدرت برادر! ٹھیک ہے آپ پر گھریلو پریشر ہے مگر سعدیہ کو بطور تحفہ دی ہوئی بھینس واپس مانگنا نہایت غیر مردانہ فعل ہے۔ سارہ صاحبہ! بے شمار سال پہلے دنیا میں آکر سب کو تو پیچھے چھوڑ ہی چکی ہو۔ تفسیر صاحب! ٹھیک فرمایا سعدیہ نے مرغی کی قربانی دی تھی مگر کھال تو صرف ملاقات کا بہانہ تھا۔ تصویر العین صاحبہ! ایلفی جوڑنے کا کام کرتی ہے اور سعدیہ بھی یقیناً اس سے اپنے ریزہ ریزہ دل کو سمیٹ کر جوڑنے کی سعی کرے گی۔ مسافر سے شروعات کی۔ اف ملک صاحب نے ایک بار پھر خطرناک ترین رومانٹک سین دے کر ہماری دھڑکنوں کی رفتار روک دی۔ کاشف زبیر کی کہانی اندر کی آگ لاجواب رہی۔ مرزا صاحب بلاشبہ مشکل ترین اور شاندار کیس لیے حاضر ہوئے۔ منظر امام نے حسب معمول معاشرتی تلخ سچائیوں پر مبنی سبق آموز کہانی تحریر کی۔ بے شک انسان اشرف المخلوقات ہے مگر احساسِ برتری، تکبر، فخر، ضد، کینہ، بغض، حسد اور نہ جانے کون کون سی برائیوں نے مل کر اس کا یہ شرف چھین لیا ہے۔ بلا میں بڑے بھائی کے کردار میں چھپے بھیڑیے نے بہت غصہ دلایا۔ سلیم انور کی اصلی نقلی بھی خوب رہی۔ گرو بھی خوب رہی۔ جھوٹ اثر چھوڑنے میں ناکام رہی۔ آخری صفحات پر سجی آشوب وفا شروع سے آخر تک سحر قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔ بلاشبہ یہ نواب صاحب کی ایک اور ناقابلِ فراموش کہانی ثابت ہوگی۔"

✠ **عدنان یوسف**، بنوں سے حاضر محفل ہیں "سرورق پر موجود ٹائٹل گرل، کھلے بال، نیلی آنکھیں، گلابی ہونٹ اور معصوم مسکراہٹ کے ساتھ براجمان تھی جس کو دیکھنے کے بعد ساری رات نیند آنکھوں سے دور رہی۔ پہلے نمبر ابن مقبول صاحب کا تبصرہ موجود تھا جو کہ اچھا تبصرہ تھا۔ محمد قدرت اللہ نیازی آپ نے بجا فرمایا۔ بے شک نوک جھوک محفل میں جتنی زیادہ ہو، اتنا مزہ دیتی ہے۔ محمد ہمایوں سعید! ماشاء اللہ سے میرے دل کے تار ابھی فریش ہیں، وہ اتنی جلد ستیاناس نہیں ہونے والے۔ تصویر العین خوش قسمتی سے ابھی تک میری کوئی محبوبہ نہیں اور آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ میری محبوبہ کی صورت ٹائٹل گرل سے ملتی تھی۔ حمیرا رضا بہت عرصے بعد محفل میں نظر آئیں۔ حمیرا رضا باجی نظر عمر کے ساتھ ساتھ کم ہوتی ہے، اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔ طاہرہ گلزار جب ہمایوں سعید، سعدیہ کے گھر کے سامنے قربانی کے گوشت کی آس میں بیٹھا تھا تو جاوید بلوچ ان کی جاسوسی کررہا تھا۔ مسافر میں میڈم شکیلہ کی شوخیاں اور ایکشن بہت مزہ دے رہی ہیں۔ اب شاید اس کے والدین بھی انٹر ہوجائیں کہانی میں...... مسافر سسپنس کی جان ہے، ویلڈن ناصر ملک صاحب...... کشکول بالکل آخری اسٹیج پر ہے، آکٹوپس پانی میں گرگیا ہے لیکن وہ اتنی آسانی سے مرنے والا انسان نہیں۔ ہمارے نانا صاحب جو کہ ایک عالم دین تھے، وہ اس دنیا فانی سے رخصت ہوگئے، اس لیے ابھی تک باقی رسالہ نہیں پڑھا۔" (اللہ آپ کو صبر اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین)

✠ **نوید انجم**، گجرات سے محفل میں چلے آرہے ہیں "ذاکر انکل نے اس بار سرورق پر 70ء کی دہائی کی ہیروئن کو جدید طرز کے میک اپ سے موجودہ دور کی ہیروئنوں کی حتمی شکل دے ڈالی۔ محفل یاراں میں لمبے چوڑے نام کے ساتھی ابن مقبول جاوید صدیقی، وزارت عظمٰی پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ کراچی سے سارہ آتے ہی محفل یاراں میں اپنی دھاک بٹھانے کی ناکام کوشش میں مصروف نظر آئیں۔ محمد ہمایوں سعید کا بابر عباس کو دیا گیا مشورہ کافی پسند آیا۔ حسنین عباس بلوچ صاحب اجیل کی سلاخوں سے رہا ہونے کے بعد جلد سے جلد محفل یاراں میں حاضر ہوکر اسے رونق بخشیں۔ طاہرہ گلزار نے شاید ٹرین چھوٹنے کے ڈر سے خط جلدی جلدی لکھ دیا۔ سعدیہ بخاری صاحبہ محفل یاراں میں کرسی صدارت انکل جی نے صرف صنف کرخت کے لیے ہی مخصوص نہیں کر رکھی بلکہ پہلے آیئے اور پہلے پایئے کی بنیاد پر عمل کرکے آپ بھی اس کی حق دار بن کر حسد جیسے موذی امراض سے چھٹکارا پاسکتی ہیں۔ ڈاکٹر وسیم خالق ہماری طرف سے آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ مرزا امجد بیگ کی جزائے سزا پر نظر ڈالی جس میں سلمٰی اور شاہدہ نے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ کشکول میں شیخ حامد کی موت کی خبر سے کہانی کا ذائقہ کرکرا ہوجائے گا۔ مسافر کا مزہ تب ہی دوبالا ہوگا جب شہریار میڈم کے لیے کٹھ پتلی جیسے کردار سے عمل کرنے سے انکار کردے گا۔ محی الدین نواب کی آخری صفحات پر کہانی آشوب وفا اپنی مثل تھی۔ آخر میں جاری ہے کا بورڈ دیکھ کر ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ محفل شعر و سخن کے تمام اشعار اچھے تھے، باقی محفل یاراں میں طاہرہ یاسمین اور ماہا ایمان کا نام لینا ایک فیشن کی شکل اختیار کرچکا ہے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

سنسان دل، جودھپور، کبیروالا۔ محمد اقبال سلفی، کوٹری۔ محمد افضل خان، پشاور۔ سباحت فاروق، راولپنڈی۔ عاشی نذیر، سمندری۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ حبیب احمد، کرک۔ ناصر حسین ہرل پٹھانکوٹی، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ چودھری احمد خان، راولپنڈی۔ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی۔





سود و زیاں

ڈاکٹر ساجد امجد

یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ اختیارات کے قلم سے سطر بہ سطر لکھی جاتی ہے... اعمال اور مقاصدِ حیات اس کے رنگوں کو واضح کرتے ہیں... حجاج بن یوسف کا نام بھی انہی رنگوں کا ایک حصہ ہے، پیدائش کے وقت ہی جس کی گھٹی میں خونریزی شامل کردی گئی تھی اور اسی جوش میں مبتلا وہ صدیق اکبرؓ کے نواسہ، والیِ مکہ پر حملہ کر بیٹھا تو گویا سناٹے نے چادر تان لی۔ حکمرانوں کی نادانیاں کیسے کیسے تاب دار گوہروں کو مٹی میں ملا دیتی ہیں۔ کشور کشائی کی چاہ... سلطنت کی توسیع اور تادیر شاہی تخت کا راج... ہر حکمران کا اولین خواب ہوتا ہے... اور اس خواب کو حقیقت کا روپ دیتے دیتے بالآخر وہ ایک دن فنا ہو جاتا ہے... کائنات کا نظام یونہی چلتا رہتا ہے۔ مؤرخین صحیح کہتے ہیں، اگر حجاج بن یوسف کو سپہ سالار کا عہدہ نہ ملا ہوتا تو تاریخ میں بنو امیہ کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔ جبکہ عہد ماضی کے اوراق انہی نشانات سے ترتیب پاتے ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

طائف سے دمشق تک کا راستہ اس کے لیے اجنبی بھی تھا اور دشوار گزار بھی ثابت ہو رہا تھا۔ اجنبی اس لیے تھا کہ اس کی غربت نے اسے کبھی طائف سے باہر نکلنے ہی نہیں دیا تھا حالانکہ وہ سنتا رہا تھا کہ خلیفہ بنو امیہ عبدالملک بن مروان نے شام کی امارت سنبھالتے ہی دمشق کو علوم و فنون کا مرکز بنا دیا ہے۔ جگہ جگہ مدارس کھل گئے ہیں اور عرب کے دوسرے علاقوں سے لوگ جوق در جوق دمشق کی جانب کھنچے چلے آرہے ہیں۔

یہ راستہ دشوار گزار اس لیے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ نہایت معمولی گھوڑے پر سوار تھا جو چند فرسنگ دوڑنے کے بعد دوڑنا بھول گیا تھا، صرف چل رہا تھا۔ مسافر کو اب پچھتاوے کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ ماں کے اکسانے پر دمشق کی جانب کیوں چل دیا۔ طائف کی مدرسی کیا بُری تھی۔ وہیں پڑا رہتا۔ اسی وقت اس کے گھوڑے کو ایک ٹھوکر سی لگی۔ غریب کا گھوڑا بھی غریب ہی ہوتا ہے۔ مسافر کے منہ سے بے اختیار نکلا لیکن غربت کا خیال آتے ہی اسے ماں کی

نصیحت درست معلوم ہونے لگی۔ طائف کے چھوٹے سے مدرسے کی مدرسی پر کب تک گزارہ کرتا۔ دمشق کا دروازہ اس پر ترقی کے دروازے کھول دے گا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے نہ جانے کیوں وہ بزرگ آدمی یاد آ گیا جس نے اس کے بچپن میں اس کی ماں کو بتایا تھا کہ بنوامیہ کے گھروں میں چراغ اس کے دم سے جلیں گے۔ یہ عجیب وغریب جملہ اس کی ماں کو یاد رہا ہو تو رہا ہو لیکن وہ بھول چکا تھا اور اب اس وقت یاد آیا تھا جب دمشق کچھ فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ہوسکتا ہے میری ترقی دمشق سے وابستہ ہو۔ اس نے اپنے گھوڑے پر بری طرح کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ گھوڑے کی رفتار میں قدرے اضافہ ہوگیا۔

بنوامیہ کے گھروں میں چراغ اس کے دم سے جلیں گے، یہ خیال ہی اس کے لیے خوش کن تھا۔ وہ خود بنی امیہ سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ان گھروں میں اس کا گھر بھی تو شامل تھا۔

راستے میں کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں اس کے استقبال کے لیے سر جھکائے کھڑی تھیں لیکن اسے دمشق پہنچنے کی جلدی تھی۔ دن چھپنے سے پہلے پہلے وہ دمشق پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے گھوڑے پر غصہ... آ رہا تھا لیکن اب اسے اس پر پیار آنے لگا کیونکہ وہ اسے بہرحال دمشق تک لے آیا تھا۔ قریب سے گزرنے والے ایک کارواں کے لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ دمشق محض چند فرسنگ رہ گیا ہے۔

اس خوش خبری کے باوجود اس نے دمشق میں قدم رکھا تو دن چھپ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں مغرب کی اذانیں بلند ہونے لگیں۔ وہ ایک اذان کا پیچھا کرتے ہوئے مسجد تک پہنچ گیا۔ گھوڑے کو باہر باندھا اور جوتے اتار کر مسجد میں داخل ہوگیا۔ جماعت تیار تھی۔ اس نے نماز پڑھی۔

نمازیوں کے ساتھ وہ بھی باہر نکلا اور مسجد کے باہر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ایک آدمی اس کے پاس آیا۔

''مسافر معلوم ہوتے ہو؟''

''ہاں، طائف سے آیا ہوں۔''

''کہاں ٹھہرے ہو؟''

''تم ہی بتا دو کہاں ٹھہروں، اس شہر میں کوئی سرائے ہے؟ یا پھر مسجد ہی میں رات گزاروں گا۔''

''رات بھر کے لیے میرا گھر حاضر ہے۔ دن نکلے تو کوئی بندوبست کر لینا۔''

''آپ کیوں میری خاطر تکلیف اٹھاتے ہیں؟''

''عرب ہوتے ہوئے عربوں کی مہمان نوازی کو تکلیف کہتے ہو۔''

وہ شخص اسے اپنے گھر لے گیا۔ نہایت ہی عزت سے دیوان خانے میں ٹھہرایا۔

دسترخوان اٹھ چکا تو قہوے کی پیالیوں کے درمیان باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ صاحب خانہ کو جب معلوم ہوا کہ اجنبی طائف کے ایک مدرسے میں بچوں کو پڑھاتا رہا ہے اور ترقی کی آرزو لے کر دمشق آیا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی کیونکہ وہ بھی مدرس تھا۔

''قدرت نے تمہیں بالکل صحیح جگہ بھیج دیا ہے۔ میں بھی معلم ہوں۔ کسی بڑے مدرسے میں تمہاری ملازمت کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ ابھی نوجوان ہو۔ خوب ترقی کرو گے۔''

مشرق سے سورج ابھرا۔ کرنیں نمودار ہوئیں۔ دمشق کی سڑکوں پر چہل پہل بڑھنے لگی۔ مسافر کے میزبان نے اسے اپنے ساتھ لیا اور اس مدرسے میں پہنچ گیا جہاں وہ معلمی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ مدرسے کے منتظمین سے اس نوجوان کی اچھے لفظوں میں تعریف کی۔ اس کے علم وفضل کو ایسا بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ اسے فوراً تدریس کے شعبے میں جگہ مل گئی۔ مسافر نے خدا کا اور اپنے میزبان کا شکریہ ادا کیا۔

دمشق میں رہ کر وہ مدرسوں سے باہر دوسری دنیا کا بھی مشاہدہ کر رہا تھا۔ امویوں کو اپنے استحکام کے لیے فوجی جوانوں کی ضرورت تھی۔ بھرتی کے لیے اعلانات ہو رہے تھے۔ اس اجنبی کے لہو نے جوش مارا اور وہ خلیفہ عبدالملک کے وزیر روح بن زنباغ کے فوجی دستے میں شامل ہوگیا اور جلد ہی اپنی صلاحیتوں کا ایسا مظاہرہ کیا کہ وزیر کی نگاہوں میں آ گیا۔

❀❀❀

خلیفہ عبدالملک چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ سازشوں کے جال چاروں طرف بچھے ہوئے تھے۔ خارجیوں کا زور ایسا بندھا ہوا تھا کہ اس کے لشکر ایک ایک کر کے پسپا ہو رہے تھے۔ یہ فتنہ خوارج حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور کی پیداوار تھے اور اسلام کو طرح طرح سے نقصان پہنچا رہے تھے۔ اب ان کے حریف بنوامیہ تھے۔

عبدالملک اپنی ناکامیوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کی فوج میں نظم وضبط کی کمی ہے۔ اس کے حکم سے نہ تو فوج پڑاؤ ڈالتی ہے نہ روانہ ہوتی ہے۔ اس کے حکم میں تاخیر کی جاتی ہے۔ جب یہ صورت حال اس کے لیے برداشت سے باہر ہوگئی تو اس نے وزیر روح بن زنباغ کو طلب کیا۔

روح بن زنباغ اس کے دربار میں داخل ہوا تو اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ اس سے کیا باتیں کی جائیں گی۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ سوچ سکتا تھا کہ خوارج نے پھر کوئی فتنہ بپا کیا ہوگا جس کے استحصال کے لیے لشکر کشی کی ضرورت پڑ رہی ہوگی۔

وہ خلیفہ کے روبرو پہنچا تو اسے غصے میں بھرا ہوا دیکھا لہٰذا مناسب یہی سمجھا کہ بیٹھنے کے بجائے اس کے روبرو ہاتھ باندھ کر کھڑا رہے۔ عبدالملک نے کچھ دیر تو مطلق توجہ نہ کی تاکہ اپنی ناراضی کا اظہار کر سکے پھر اس کی گرج دار آواز نے روح بن زنباغ کو متوجہ کیا۔

''کیا میں یہ تصور کر لوں کہ بنوامیہ کی سلطنت کا چراغ بھڑک کر بجھنے کے قریب ہے۔''

''خلیفہ مکرم، ہماری جانیں آپ پر قربان ہوں۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔''

''تم کیسے وزیر اور مشیر ہو کہ فوج کا نظم ونسق تک درست کرنے سے قاصر رہے ہو۔ لشکر کوچ کرنے کو ہوتا ہے اور خود تمہارے لشکر کے لوگ تاخیر کرتے ہیں۔''

''خلیفہ مکرم، مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرے خلیفہ کو مجھ سے کیا شکایت ہے۔ میں اسے دور کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''میں اب تم پر مزید بھروسا نہیں کر سکتا اور پھر تم پر دوسرے سرکاری کاموں کا بھی بوجھ ہے۔ مجھے تو کوئی ایسا آدمی درکار ہے جو بہتر منتظم بھی ہو اور سخت گیر بھی، تاکہ سرکش سپاہیوں کا دماغ ٹھکانے لگے۔''

''میرے لشکر میں ایک ایسا سپاہی بھرتی ہوا ہے جس کی صلاحیتوں پر اب غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اگر لشکر کا نظم ونسق اس کے سپرد کر دیا جائے تو وہ یقیناً کامیاب ہوگا۔''

''کون ہے یہ سپاہی؟''

''حضور، وہ طائف سے آ کر دمشق کے ایک مدرسے میں معلم ہوگیا تھا۔ یہ اس کا شوق جانبازی ہے کہ اس مقدس پیشے کو چھوڑ کر میرے لشکر میں آ گیا ہے۔ اس کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ سپاہیوں کو مدرسے کے بچوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور ان سے ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہے۔ اگر اسے اختیارات مل جائیں تو وہ اسی طرح لشکر کو سیدھا کر دے گا جیسے معلم اپنے شاگردوں پر رعب رکھتا ہے۔''

''اس نوجوان کو فوراً حاضر کرو۔''

روح بن زنباغ نے بہت دیر کی رکی ہوئی سانس کو باہر نکالا اور شکر بھیجا کہ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اب بھی اگر لشکر کی حالت درست نہ ہوئی تو الزام اس نوجوان پر آئے گا، مجھ پر نہیں۔

آپ کی خدمت میں

☆ شوہر کی قدر کب ہوتی ہے؟
☒ پانچ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ کا انعامی بانڈ نکل آنے پر۔
☆ جوتیوں میں دال کب بٹتی ہے؟
☒ جب میاں بیوی کی لڑائی میں پلیٹیں ٹوٹ جاتی ہیں۔
☆ میں بی اے پاس ہوں، کیا کروں؟
☒ میں ایم اے پاس ہوں پہلے تم بتاؤ، میں کیا کروں۔
☆ دنیا میں سب سے خطرناک پولیس کون سی ہے؟
☒ بینڈ باجے والوں کی۔ ان کا قید کروایا ہوا ساری عمر رہائی کو ترس جاتا ہے۔
☆ بیوی کے سر پر بھوت کب سوار ہوتا ہے؟
☒ جب شوہر کے سر پر کسی پری کا سایہ دیکھ لے۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

روح بن زنباغ نے لشکر میں منادی کرائی اور اس نوجوان کو خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا۔ عبدالملک نے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس نوجوان کے چہرے پر ایسا رعب تھا جو عموماً حکمرانوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔ یہ بات خلیفہ کے لیے تعجب انگیز تھی۔

''نوجوان تیرا نام کیا ہے؟''

''میرا نام حجاج بن یوسف ہے۔ میں طائف کا رہنے والا ہوں۔ میرا باپ یوسف گزر معاش کے لیے معمار کا کام کرتا تھا۔ میں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر دمشق چلا آیا۔ معلمی کا پیشہ باعزت سہی لیکن میں شاگردوں کے سر قلم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ موقع مجھے لشکر کی ملازمت سے حاصل ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں سپاہی بن گیا۔''

''نوجوان تیری باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ اس وقت تو میں نے تجھے ایک خاص کام سے بلایا ہے۔''

''آپ حکم فرمائیں۔''

''ہماری فوج نظم ونسق سے عاری ہے۔ ہم فوج کا نظم ونسق تیرے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ شاید تیرا کوڑا بگڑے ہوئے سپاہیوں کو درست کر دے۔ ہم چاہتے ہیں جیسے ہی ہماری سواری روانہ ہوا کرے تو ساری فوج کو کوچ کرنا چاہیے۔''

''امیر المومنین کے حکم کی تعمیل ہوگی۔''

احکامات جاری کر دیے گئے کہ حجاج بن یوسف کو

فوج کا منتظم بنایا جاتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد اور بہترین عہدہ تھا۔

حجاج یہ احکامات لے کر روانہ ہوا تو وزیر روح بن زنباغ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عبدالملک نے حجاج کی بھی تعریف کی اور وزیر کی بھی کہ اس کی قیافہ شناسی نے بہترین آدمی کا انتخاب کیا۔

"امیرالمومنین، میں نے اس کے بارے میں کچھ اور دلچسپ معلومات بھی حاصل کی ہیں۔ آپ سننا پسند فرمائیں تو بیان کروں۔"

"بیان کر۔"

"کہا جاتا ہے کہ پیدائش کے بعد اس نے ماں کا یا کسی اور عورت کا دودھ پینے سے انکار کر دیا تھا۔ تب کسی نے مشورہ دیا۔ بعض کے نزدیک یہ شیطان تھا جو انسان کے روپ میں آیا تھا۔ بہرحال مشورہ یہ تھا کہ کالا بکرا ذبح کر کے اسے چٹاؤ۔ پھر دوسرا کالا بکرا ذبح کر کے اس کے خون میں اسے ڈال دو اور اس کے چہرے پر چار دن تک اس خون کی مالش کرتے رہو تو یہ ماں کا دودھ پینے لگے گا' چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو اس نے ماں کا دودھ پینا شروع کر دیا۔ خون چونکہ اس کی گھٹی میں پڑ چکا ہے اس لیے اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ خوں ریزی میں پیچھے نہیں رہے گا۔ آپ کے لیے دشمنوں کے خون کی ندیاں بہا دے گا۔"

"اس کے چہرے پر میں نے بھی کچھ ایسی ہی تحریریں پڑھی ہیں۔"

خلیفہ کا حکم نافذ ہوتے ہی حجاج معمولی سپاہی سے ترقی کر کے فوج کا منتظم بن گیا۔ اس کے ساتھی اسے رشک و حسد سے دیکھ رہے تھے بلکہ بعض تو اسے اپنی حق تلفی سمجھتے ہوئے برملا کہہ رہے تھے کہ وہ اس کا حکم ماننے کو تیار نہیں۔

ایک مرتبہ عبدالملک پا بہ رکاب ہوا تو لشکر والے بھی تیار ہو گئے لیکن روح بن زنباغ کا لشکر تاخیر کرتا رہا۔ حجاج جائزہ لے رہا تھا کہ لشکر کی تیاری کو دیکھے۔ اس کا گزر روح بن زنباغ کے لشکر کی طرف ہوا۔ یہ لشکر سوار تو کیا ہوتا بلکہ کھانا کھانے میں ہی مصروف رہا۔

حجاج نے بہ آوازِ بلند پکارا۔ "تم ابھی تک سوار نہیں ہوئے جبکہ امیرالمومنین کی سواری تیار کھڑی ہے کیا یہی تمہارا نظم و ضبط ہے؟"

وہ کچھ دن پہلے تک انہی لوگوں کے ساتھ سپاہی تھا اس لیے وہ سب اس سے بے تکلف بھی تھے اور اب اس کی ترقی سے جلنے لگے تھے۔ انہوں نے اس کی بات قہقہوں میں اڑا دی۔

"کیسا خلیفہ' کہاں کی سواری ہے' تم بھی آج منتظم کیا بنے گئے تو ہمیں نصیحت کرنے لگے۔ یہ ٹرٹر بند کرو اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا' اس کے ساتھیوں کو اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ حجاج نے کوڑا اٹھایا اور ہر ایک کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ لشکریوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ حجاج نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خیموں کو آگ لگوا دی گھوڑوں کو بدکا دیا۔ بعض لوگوں کو قتل بھی کر دیا۔ سفاکی کا مظاہرہ کیا جو کرنے والے دشمن سے بھی نہیں کرتے۔

جب روح بن زنباغ اپنے عملے میں واپس آیا تو خیموں اور عملے کی حالتِ زار دیکھ کر سخت متاسف ہوا اور جا کر عبدالملک سے شکایت کی۔ خلیفہ نے حجاج کو فوراً بلوالیا۔

"تمہارا بُرا ہو تم نے اپنے بڑے روح بن زنباغ کے ساتھ کیا کیا؟"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"اگر تُو نے کچھ نہیں کیا تو خیموں کو آگ کس نے لگائی اور لشکریوں کی پیٹھ پر کوڑے کس نے برسائے ہیں؟"

"امیرالمومنین، یہ سب تو آپ نے کیا ہے۔" حجاج نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"کیا؟ یہ سب میں نے کیا ہے؟"

"بے شک! آپ وہاں موجود نہیں تھے لیکن میری قوت آپ کی قوت ہے۔ میرا کوڑا آپ کا کوڑا ہے۔ میرا ہاتھ میرا نہیں' آپ کا ہے۔ میں نے جو کیا' آپ کے حکم سے کیا۔"

عبدالملک فرطِ مسرت سے چیخ اٹھا۔ "بخدا مجھے ایسا ہی آدمی چاہیے تھا۔ اب کس میں ہمت ہے جو میری حکم عدولی کرے۔"

اس واقعے کے بعد تو حجاج کی ترقی کو پر لگ گئے اور جلد ہی وہ دن بھی آ گیا کہ خلیفہ کی پسندیدگی نے اسے خلیفہ کی فوج کا سپاہ سالارِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔

مورخین صحیح کہتے ہیں کہ اگر حجاج بن یوسف کو یہ عہدہ نہ ملا ہوتا تو تاریخ میں بنوامیہ کا نام و نشان بھی باقی نہ ہوتا۔

❁❁❁

عبدالملک بن مروان کی دانش مندی اور اس کے لشکر کی بہادری نے کئی سال کی محنت کے بعد اپنے حریفوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ صرف ایک حریف باقی تھا اور وہ تھے عبداللہ بن زبیر والیٔ مکہ۔ عبدالملک کو ان کی قوت کا بھی اندازہ تھا اور مکہ شہر کے تقدس و عظمت کا خیال بھی۔ اسے معلوم تھا کہ کعبۃ اللہ کی حرمت ہر مسلمان کا ایمان ہے لہٰذا کوئی مکہ پر حملہ کرنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود اس نے آخری کوشش کے طور پر اپنے خاندان کے اصحاب رائے کو جمع کیا اور انہیں خطرے سے آگاہ کیا۔

"ابنِ زبیر والیٔ مکہ کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب تمہارے گھر پر ان کی فوج کشی کا خطرہ ہے۔ اس سے بچنے کے لیے تم لوگ کیا رائے دیتے ہو؟"

اس سوال پر تمام لوگوں نے بہ اتفاق مشورہ دیا کہ عبداللہ بن زبیر سے مقابلہ کیا جائے۔ اس مشورے کے بعد عبدالملک نے اپنے سرداروں کے نام فرمان جاری کر دیے کہ تمام چھاؤنیوں کی فوجیں شام کی سرحد پر جمع ہوں۔

خلیفہ کا حکم موصول ہوتے ہی شامی فوجوں کا انبوہِ عظیم جمع ہو گیا۔ عبدالملک نے سرداروں کو اپنے حضور طلب کیا' خود منبر پر چڑھا اور انہیں مخاطب کیا۔

"تم میں سے کون ہے جو مکہ پر حملہ آور ہونے اور ابنِ زبیر کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔"

یہ سوال ایسا تھا کہ سناٹے نے چادر تان لی۔ ہونٹوں پر تالے پڑ گئے۔ قتل ابنِ زبیر کا اور خانۂ خدا درمیان میں۔ کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ عبدالملک کا دل دھڑکا کہ کہیں اس کے خلاف بغاوت ہی نہ اٹھ کھڑی ہو۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اس خطرے سے آگاہ کیا جو ابنِ زبیر کی جانب سے امویوں کو ہو سکتا تھا۔ ابنِ زبیر کے بھائی مصعب بن زبیر بصرہ اور عراق پر قابض تھے۔ عبدالملک نے ان سرداروں کو یہ لالچ بھی دیا کہ اس معرکے میں مصعب سے عراق چھین لیا جائے گا جس سے امویوں کا ستارہ عروج روشنی میں نہا جائے گا۔

اس طویل تقریر کا بھی ان لوگوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عبدالملک نے تیسری مرتبہ اپنا سوال دہرایا۔

"تم میں سے کون ہے جو ابنِ زبیر کے قتل کا بیڑا اٹھاتا ہے؟"

حجاج اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنا نام پیش کیا۔ عبدالملک نے تین مرتبہ یہ سوال دہرایا اور تینوں مرتبہ حجاج ہی نے اپنا نام پیش کیا۔

عبداللہ بن زبیر کوئی معمولی شخصیت نہیں تھے۔ امام حسینؓ کی طرح انہوں نے بھی مرتے دم تک یزید کی بیعت نہیں کی پھر اس کی موت کے بعد بھی اس کے جانشینوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ عراق و حجاز کے لوگوں نے متفقہ طور پر انہیں اپنا خلیفہ منتخب کر لیا۔ وہ بنوامیہ کی قاہر قوت کا پامردی سے مقابلہ کرتے رہے تھے اور جب عبدالملک بن مروان مسندِ حکومت پر بیٹھا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ان کی خلافت کو ختم کر کے رہے گا اور اب حجاج بن یوسف ایک زبردست فوج لے کر مکہ کی طرف رواں دواں تھا۔

حجاج بن یوسف نے سب سے پہلے عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب کے خلاف فتح حاصل کی۔ بعد میں مصعب کو قتل کر دیا گیا۔

مصعب کے قتل سے عبداللہ بن زبیر کا بازو بالکل ٹوٹ گیا۔ دوسری طرف عراق کا علاقہ نکل جانے سے ابنِ زبیر کی آمدنی میں کمی ہو گئی تھی۔ اب انہیں زیر کر لینا بہت آسان ہو گیا تھا۔

اموی ہر طرف پھیلتے جا رہے تھے اور اب مکہ معظمہ تک آ گئے تھے۔

حجاج بن یوسف نے ایک زبردست فوج کے ساتھ 72 ہجری میں مکہ معظمہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ مکہ میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن عبداللہ بن زبیر کے پائے استقامت میں ذرا بھی لرزش نہیں آئی۔ مسلسل چھ مہینے کے محاصرے کے بعد رسد کی قلت کی وجہ سے مکہ میں عام قحط پڑ گیا۔ لوگ سواری کے گھوڑے ذبح کر کے کھانے لگے۔ عبداللہ بن زبیر برابر اس کے مقابلے پر تھے لیکن حجاج نے جبل ابوقبیس پر قبضہ کر کے منجنیق نصب کر دی۔ اس پہاڑی سے بیت اللہ کو بہ آسانی نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔

عبداللہ بن زبیر اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ حجاج بیت اللہ پر پتھر برسانے کی جسارت نہیں کرے گا لیکن اس نے سنگ باری شروع کر دی۔ ایک پتھر خانہ کعبہ کی چھت پر آ کر گرا۔ اس پتھر کے آتے ہی آسمان سے ایک سخت کڑک کی آواز آئی۔ بجلی چمکی اور آسمان پر تاریکی چھا گئی۔ حجاج کی فوج ایسی خوف زدہ ہوئی کہ پتھر پھینکنے بند کر دیے۔ یہ تاریکی دو روز تک چھائی رہی۔

عبداللہ بن زبیر نے یہ کرشمۂ قدرت دیکھ کر نیت باندھ لی۔ اس انہماک سے نماز پڑھی کہ کبوتر ان کے کندھوں اور سروں پر آ کر بیٹھ گئے۔

حجاج نے پتھر پھینکنے بند کر دیے تھے لیکن محاصرہ اسی طرح جاری رکھا۔ ہر کوئی عبداللہ بن زبیر نہیں تھا۔ حجاج کی سنگ باری سے لوگ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ بھوک کا خوف الگ تھا۔ خود عبداللہ بن زبیر کے ساتھیوں میں چہ میگوئیاں

شروع ہوگئیں۔
"ابنِ زبیر اگر ضد پر اڑے رہے تو حجاج اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔"
"ابنِ زبیر ہتھیار پھینک کیوں نہیں دیتے تاکہ ہمیں امان ملے۔"
"اب بنوامیہ سے لڑنے کی طاقت ہم میں نہیں۔"
عبداللہ بن زبیر کے لشکر میں یہ باتیں عام ہو رہی تھیں۔ اس کی بھنک عبداللہ بن زبیر کے کانوں میں بھی پہنچ رہی تھی لیکن وہ تو بنوامیہ کے اقتدار کو تسلیم نہ کرنے کا حلف اٹھا چکے تھے۔
"اگر محاصرے کی شدت یہی رہی تو آپ کے اکثر ساتھی آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔" کسی نے آکر آپ کی خدمت میں عرض کیا۔
"کیا وہ حسینؓ کے خون سے بے وفائی کریں گے؟"
"اس وقت کسی کو یہ خیال نہیں۔"
"کسی کو نہ ہو، مجھے تو ہے۔ میں کبھی عبدالملک کی بیعت کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔"
"آپ اکیلے رہ جائیں گے۔"
"مجھے پھر بھی بیعت قبول نہیں ہوگی۔"
"لوگ حجاج کے پاس جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔"
"میں کوشش کروں گا کہ وہ نہ جائیں لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلا جاؤں۔"
وقت گزرتا رہا۔ چھ مہینے کے محاصرے نے اچھے اچھوں کی کمر توڑ دی۔ جب کھانے کو کچھ نہیں رہا تو عبداللہ بن زبیر کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کی پناہ میں آنے لگے۔ انہیں چھوڑ کر جانے والوں میں ان کے فرزند بھی شامل تھے۔
مکہ تیزی سے خالی ہو رہا تھا۔ دس ہزار اہلِ مکہ حجاج کی پناہ میں چلے گئے تھے۔ اب گنتی کے جانباز تھے جو عبداللہ بن زبیر کے ساتھ تھے۔
حجاج کے لشکر میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ بیشتر کا حال یہ تھا کہ مکہ پر حملہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ حجاج نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے عبدالملک کو خط لکھا۔
"گفت و شنید کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مجھے مکہ معظمہ کو... بہ زورِ شمشیر فتح کرنے کی اجازت دی جائے اور کچھ کمک بھی روانہ کی جائے۔"
عبدالملک کی کوشش یہ تھی کہ خوں ریزی کے بغیر مکہ معظمہ پر قبضہ ہوجائے لیکن جب حجاج کا خط ملا تو اس نے قدرے پس و پیش کے بعد اجازت دے دی اور کچھ فوج بھی بہ طور کمک بھیج دی۔
عبدالملک کا یہ خط اس نے اپنے لشکر کو دکھایا اور یہ تاثر دیا کہ خلیفہ خود یہ چاہتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر کو قتل کر دیا جائے۔
عبداللہ بن زبیر کو یہ خبریں برابر مل رہی تھیں۔ ان خبروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ حجاج محاصرے سے تنگ آچکا ہے اور وہ عنقریب مکہ میں داخل ہوجائے گا۔ لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا البتہ مصالحت کا راستہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ انہیں کیا کرنا چاہیے؟ مشورہ کرنے کے لیے وہ والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
"اماں، میرے تمام ساتھی ایک ایک کر کے مجھ سے الگ ہوگئے ہیں۔ چند جاں نثار ہیں اور میں ہوں۔ شکست کے سوا کوئی راہ نہیں۔ اگر میں ہتھیار ڈال دوں تو ممکن ہے مجھے اور میرے ساتھیوں کو امان مل جائے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ آپ مجھے کیا مشورہ دیں گی؟"
"بیٹا، جنگ و جدال مردوں کا کام ہے۔ میں تمہیں کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ حق پر ہو اور حق کے لیے لڑتے ہو تو مردوں کی طرح لڑ کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہوجاؤ اور کسی قسم کی ذلت برداشت نہ کرو۔ اگر تم دنیا طلبی کے لیے لڑتے تو تم سے برا کون اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوگا کہ خود کو بھی ہلاکت میں ڈالا اور اپنے ساتھ کتنوں کو ہلاک کیا۔ اگر عذر یہ ہے کہ اپنے مددگاروں کی وجہ سے مجبور ہوگئے تو یاد رکھو کہ شریفوں اور دین داروں کا یہ شیوہ نہیں۔ تمہیں کب تک دنیا میں رہنا ہے۔ خدا کی قسم! عزت کے ساتھ تلوار کھا کر مرجانا اس سے بہتر ہے کہ ذلت کے ساتھ کوڑے کی مار برداشت کی جائے۔"
"اماں جان، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ صرف اس سے ڈرتا ہوں کہ میری موت کے بعد دشمن میری لاش کو سولی پر لٹکائیں گے۔ بے حرمتی کریں گے جس سے آپ کو رنج ہوگا۔"
"بیٹا، جب بکری ذبح کر ڈالی جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے کیے جائیں، اسے کیا پروا۔ تم اللہ پر بھروسا کر کے اپنا کام کیے جاؤ۔ راہِ حق میں تلواروں سے قیمہ ہونا گمراہیوں کی غلامی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ رہی یہ بات کہ مجھے تکلیف ہوگی تو بیٹا میں تمہارا انجام دیکھ کر مرنا چاہتی ہوں تاکہ اگر تمہیں شہادت نصیب ہو تو اپنے ہاتھوں سے تمہارا کفن دفن کروں اور اگر تم فتح پاؤ تو میرا دل ٹھنڈا ہو۔"
عظیم ماں کے حوصلہ افزا کلمات سن کر ابنِ زبیر پر رقت طاری ہوگئی۔
"اماں جان! میرا بھی یہی خیال تھا کہ راہِ حق میں لڑتے ہوئے جان دے دوں لیکن آپ سے مشورہ ضروری تھا۔ شکر ہے خدا کا کہ میں نے آپ کو اپنے سے بڑھ کر ثابت قدم پایا۔ اب میں میدانِ جنگ سے پیچھے قدم نہیں ہٹاؤں گا۔ اللہ کی رضا کے سوا مجھے کچھ مطلوب نہیں۔"
"بیٹے! تم اللہ کی راہ میں جان دے دو۔ میں انشاءاللہ صابر و شاکر رہوں گی۔" آگے بڑھیں اور لختِ جگر کو سینے سے لگالیا اور پھر زرہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لیے نکلتے ہو اور ان عارضی چیزوں کا سہارا لیتے ہو۔"
عبداللہ بن زبیر نے اسی وقت زرہ اتار پھینکی۔ سر پر سفید رومال باندھ لیا۔
"اب میں خوش ہوں۔ جاؤ اللہ کے راستے میں لڑو اور اس کے ہاں اسی لباس میں جاؤ۔"
عبداللہ بن زبیرؓ ماں سے رخصت ہوئے اور اپنی معمولی سی جمعیت کے ساتھ بڑی بہادری کے ساتھ لڑنے لگے۔ ان کے صف شکن حملوں کو دیکھ کر حجاج گھبرا گیا لیکن جنگجو تھا، شاطر بھی تھا اور مدبر بھی۔ بڑی چالاکی سے شامیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ انہیں طرح طرح کے لالچ دے کر بھرپور قوت کے ساتھ زوردار حملہ کرنے پر آمادہ کرلیا اور لڑتے ہوئے، اہلِ مکہ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے حرم کے پھاٹک تک پہنچ گیا۔
عبداللہ بن زبیر کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی رہ گئے تھے۔ وہ شامیوں کے ریلے کی تاب نہ لاسکے۔ کچھ قتل ہوئے کچھ نے فرار میں عافیت جانی۔ عبداللہ بن زبیر لڑتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور آخر زخموں سے چور ہو کر صدیق اکبرؓ کا یہ نواسہ اور حضرت اسما کا لختِ جگر زخموں کی تاب نہ لاکر زمین پر گر پڑا۔
جنگ کا خاتمہ ہوا۔ تلواریں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ کچھ خوف سے اور کچھ اس لیے کہ اب ضرورت بھی کیا تھی، حجاج نے شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا اور حکم دیا کہ لاش کو سولی پر لٹکا دیا جائے۔
حضرت اسما کو جب معلوم ہوا تو آپ نے ایک کنیز کو حجاج کے پاس بھیجا۔ "خدا تجھے غارت کرے۔ تو نے میرے لختِ جگر کی لاش کو دار پر کیوں لٹکایا؟"
حجاج نے کہلا بھیجا۔ "میں لوگوں کو ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ کے انجام سے عبرت دلانا چاہتا ہوں۔"
حضرت اسما نے کنیز کو پھر بھیجا۔ "میرے بچے کی لاش میرے حوالے کر دو تاکہ میں اس کی تجہیز و تکفین کرسکوں۔"
حجاج نے انکار کر دیا۔
شہادت کو تین دن ہوچکے تھے۔ لاش ابھی تک ایک مقام پر لٹکی ہوئی تھی۔ لوگوں نے دیکھا حضرت اسما ایک کنیز کا سہارا لیے ہوئے اس مقام کی طرف آرہی ہیں۔ لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے تھے کہ حجاج کی آمد کا شور بلند ہوا۔ وہ بھی گشت کرتا ہوا اسی طرف آرہا تھا۔ اس کے خوف سے بھیڑ چھٹ گئی۔
حضرت اسما نے حجاج کو دیکھ کر کہا۔ "کیا اس سوار کے اترنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟"
حجاج نے کہا۔ "وہ ملحد تھا، اس کی یہی سزا ہے۔"
"خدا کی قسم وہ ملحد نہ تھا بلکہ نماز گزار اور متقی تھا۔"
حضرت اسما تڑپ اٹھیں۔
حجاج نے جھلا کر کہا۔ "یہاں سے چلی جاؤ۔ تمہاری عقل سٹھیا گئی ہے۔"
حضرت اسما نے بڑی بے باکی سے کہا۔
"میری عقل نہیں سٹھیا گئی ہے۔ خدا کی قسم! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ بنو ثقیف میں ایک کذاب اور ایک ظالم پیدا ہوگا۔ کذاب کو تو ہم نے دیکھ لیا کہ وہ مختار بن ابو عبید تھا اور ظالم تو ہے۔"
حجاج اس پر بھی شرمندہ نہ ہوا بلکہ حضرت اسما کے قریب آکر دل آزاری کا آخری تیر پھینکا۔
"اے ذات النطاقین، سچ کہنا خدا کے دشمن کا انجام کیسا ہوا۔"
حضرت اسما نے فرمایا۔
"ہاں تو نے میرے فرزند کی دنیا خراب کی لیکن اس نے تیری آخرت برباد کردی۔ میں نے سنا ہے تو میرے بیٹے کو طنزاً ابن ذات النطاقین کہتا تھا تو خدا کی قسم میں ذات النطاقین ہوں۔ میں نے ہی رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا توشہ دان اپنے نطاق (کمربند) سے باندھا تھا۔"
حجاج نے یہ گفتگو سنی تو کوئی جواب نہ سوجھا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ لاش اب بھی سولی پہ لٹک رہی تھی۔
حضرت اسما اب حجاج کی طرف سے بالکل مایوس ہوچکی تھیں۔
ابنِ زبیر کے بھائی عروہ بن زبیر محاصرۂ مکہ کے دوران میں عبداللہ بن زبیر کے ساتھ تھے۔ جب عبداللہ شہید ہوگئے اور حجاج نے ان کی لاش سولی پر لٹکوادی تو وہ مکہ سے پوشیدہ طور پر عبدالملک کے پاس دمشق پہنچے اور اس سے

درخواست کی کہ عبداللہ بن زبیر کی لاش ان کی والدہ کے حوالے کی جائے۔ عبدالملک کو حجاج کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اسی وقت حجاج کو خط لکھا اور حکم دیا کہ ابنِ زبیر کی لاش فوراً حضرت اسما کے حوالے کی جائے۔

حجاج نے ابنِ زبیر کی لاش حضرت اسما کے حوالے کردی۔

حضرت اسما فرمایا کرتی تھیں کہ الٰہی مجھے اس وقت تک زندہ رکھنا جب تک میں اپنے فرزند کو دفنا کر مطمئن نہ ہوجاؤں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جب ابنِ زبیرؓ کو دفنا دیا گیا تو اس کے پانچویں روز حضرت اسما کا بھی انتقال ہوگیا۔

اس کامیابی کے صلے میں خلیفہ عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو حجاز، یمن اور یمامہ کا حاکم بنا دیا۔

طارق بن عمرو، حضرت عثمانؓ کا غلام مدینہ کا گورنر تھا۔ عبدالملک نے طارق بن عمرو کو مدینہ طیبہ کی ولایت سے معزول کرکے اس کی جگہ حجاج کو مقرر کردیا۔ حجاج مدینہ آگیا۔

امارت کی شان بڑھی تو اس کی سفاکی میں بھی اضافہ ہوا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ''خون بہانے اور سفاکانہ افعال کا ارتکاب کرنے میں مجھے وہ لذت ملتی ہے جسے صرف میں ہی محسوس کرسکتا ہوں۔''

اختیارات ہاتھ میں آئے تو سفاکی نے بھی ہاتھ پھیلائے۔ اس کے مظالم سے اصحاب رسول ﷺ بھی نہ بچے۔ چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ کے ماتھے میں داغ لگائے اور حضرت انس بن مالک کی گردن میں داغ لگائے۔ اس سے مقصد ان کی توہین و تذلیل تھی۔

وہ اموی تھا لہٰذا حضرت عثمانؓ کے قتل کے انتقام کی آگ بھی اس کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ اس نے حضرت سہیل بن سعد کو بلوایا اور کہا کہ تم نے کیوں حضرت عثمانؓ کی مدد نہیں کی۔ اس نے ہرچند کہا کہ مدد کی تھی لیکن حجاج نے انہیں جھوٹا قرار دیا اور پھر سیسہ گرم کرکے ان کی گردن پر ڈال دیا۔

جلیل القدر صحابیوں کو محض اس لیے مشکیں کس کر کوڑے لگوائے جاتے تھے کہ وہ حضرات راست گو تھے اور حجاج کو خوف تھا کہ ان کی راست گوئی کہیں امویوں کے خلاف کوئی طوفان کھڑا نہ کردے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو مکہ میں بے حد محترم ہستی کے مالک تھے ایک اموی کے ذریعے ان پر اس وقت حملہ کر دیا جب وہ خانۂ کعبہ میں طواف کررہے تھے۔ برچھا ان کے پاؤں کو چھیدتا ہوا زمین میں دھنس گیا۔ اسی زخم سے ان کی موت واقع ہوئی۔

ان مظالم کی اسے خلیفہ عبدالملک کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ یہ تو اس کے ذاتی افعال تھے جن کا وہ ارتکاب کررہا تھا۔ جب کبھی عبدالملک کے علم میں کوئی واقعہ آتا تو وہ حجاج کی سرزنش بھی کرتا تھا لیکن حجاج اس کی سلطنت کو وسعت دے رہا تھا اس لیے وہ اسے معزول بھی نہیں کرسکتا تھا۔

حضرت انس بن مالکؓ حجاج کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا قیام بصرہ میں تھا۔ حجاج کی نظروں میں وہ بھی باغی تھے۔ حجاج نے انہیں طلب کیا اور ان سے بازپرس کی۔ حجاج نے پوچھا۔ ''یہ دورنگی کہ کبھی مختار کے ساتھ تو کبھی ابن اشعث کے ساتھ۔''

حضرت انسؓ نے پوچھا۔ ''امیر، یہ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟''

حجاج نے کہا۔ ''خدا تم کو بُرا کرے۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں۔'' حجاج نے غصے میں آکر آپ کی گردن پر مہر لگوادی۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی شکایت عبدالملک سے کی تو اس نے اسی وقت حجاج کو غضب آلود خط لکھا۔

''تم اپنی اوقات اس قدر بھول گئے اور تمہاری یہ جرأت ہے کہ تم خادم رسولؐ سے گستاخی کرتے ہو۔ میرا خط پاتے ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کی رضامندی حاصل کرو ورنہ تم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

یہ خط پاتے ہی حجاج اتنا گھبرایا کہ سوچنے کی مہلت کو بھی خیرباد کہا اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر معافی کا خواستگار ہوا اور ان کی خوشنودی کا خط لے کر عبدالملک کے پاس بھیجا۔

❁❁❁

خلیفہ عبدالملک ابھی حجاز کی فتح کا جشن ہی منا رہا تھا کہ خارجیوں نے ایک مرتبہ پھر فتنہ انگیزی پر کمر باندھی اور کوفہ کے گردونواح کو اپنا مرکز بناتے ہوئے خلیفہ عبدالملک کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا۔ عبدالملک کے لیے یہ خبر پریشان کن تھی۔ وہ اس سے پہلے کئی جرنیلوں کو آزما چکا تھا۔ خارجیوں کا فتنہ وقتی طور پر دب جاتا تھا لیکن پھر شورش برپا کرتا تھا۔

اس مرتبہ مصیبت یہ تھی کہ حجاج دور تھا۔ کوئی اور اس مہم پر جانے کا اہل نہیں تھا۔ حجاج کی قسمت ایک مرتبہ پھر چمکنے والی تھی۔ اسے موقع مل رہا تھا کہ وہ خلیفہ کی نظروں میں مزید بلند مقام و مرتبہ حاصل کرے۔ عبدالملک کی مردم شناس نظروں نے حجاج کا انتخاب کیا۔ سرداران شام سے

مشورہ کیا اور حجاج کو لکھ بھیجا۔

''بارہ سو سواروں کو لے کر فوراً کوفہ پہنچو اور وہاں کا نظم و نسق سنبھال کر خارجیوں کے خلاف بھرپور کارروائی کرو اور ان کا مکمل خاتمہ کردو۔''

حجاج کو عراق کا گورنر مقرر کیا جارہا تھا۔ یہ اس کے لیے بڑا اعزاز تھا۔

حجاج کو عراق بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ عبدالملک نے خارجیوں کی بیخ کنی کے لیے اپنے ایک جرنیل مہلب بن صفرا کو روانہ کیا تھا۔ جب وہ دجلہ پار کرگیا تو اس نے عبدالملک کو لکھا کہ میرے پاس ان سے لڑنے کے لیے آدمی نہیں۔ پس تو میری طرف آدمی بھیج۔ اہلِ عراق اور اہلِ بصرہ مہلب کی طرف روانہ ہونے میں پس و پیش... کررہے تھے۔ حجاج کو عراق بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی سخت گیری سے اہلِ عراق کو مجبور کرے کہ وہ مہلب کا ساتھ دیں۔

جب حجاج قادسیہ پہنچا تو اس نے فوج کو حکم دیا کہ وہ اس کے آگے اور پیچھے چلے اور اس نے ایک اونٹ منگوایا۔ اس پر بغیر کسی گدی اور زین کے بیٹھ گیا اور خط کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ سفری لباس پہن لیا اور اپنا عمامہ باندھ لیا اس نے فوج کو پیچھے چھوڑ دیا اور اکیلا ہی کوفے میں داخل ہوگیا۔ خلقِ خدا اس کے آنے سے بے خبر تھی۔ جامع مسجد میں جمعے کی نماز ہونے والی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کے ایک رومال سے اپنا منہ ڈھانپا، اپنی کمان کندھے پر رکھی اور اس حالت میں منبر پر چڑھ کر بیٹھ گیا کہ اس کا انگوٹھا اس کے منہ میں تھا اور وہ خاموش تھا۔

چاروں اطراف سے مختلف آوازیں ابھریں۔

''یہ آدمی کیا گونگا ہے جو بات کرنے کی قدرت نہیں رکھتا؟''

''شاید کوئی بدو ہے کہ بات کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں سوجھ رہی ہے۔''

''اسے سنگریزے مارو تاکہ یہ یہاں سے اترے۔''

مسجد میں ایک تماشا سا ہوگیا۔ لوگ آتے رہے اور مسجد بھر گئی۔ اتنے میں محمد بن عمیر الدارمی اپنے غلاموں کے ساتھ مسجد میں آیا۔ اس نے حجاج کو منبر پر بیٹھے دیکھا کہ نہ وہ ایک طرف ہوتا ہے نہ بولتا ہے۔ وہ شاید پہچان گیا تھا یا فقط یہ سمجھا کہ بنو امیہ نے کسی کو عراق کا حکمران بنا کر بھیجا ہے۔ اسی لیے وہ زور سے چیخا۔

''اللہ تعالیٰ بنو امیہ پر لعنت کرے جو اس قسم کے آدمیوں کو عراق کا حکمران بناتے ہیں اور اللہ تعالیٰ عراق کو برباد کرے جو اس قسم کا آدمی اس کا حکمران ہو۔''

اس نے سنگریزے مارنے کے لیے مسجد کے فرش پر ہاتھ مارا لیکن اسی کے خاندان کے ایک آدمی نے اسے روک دیا۔

''اس آدمی کو مارنے سے باز رہو تاکہ ہم اس کی بات کو سن سکیں۔''

حجاج نے جب دیکھا کہ ماحول بہت گرم ہونے لگا ہے۔ انجانے میں کوئی بدمزگی نہ ہوجائے اس لیے چہرے پر بندھا ہوا نقاب اتار دیا۔ کھڑا ہوا اور عمامہ بھی سر سے اتار دیا۔ خدا کی حمد و ثنا کی، حضرت نبی کریم ﷺ پر درود پڑھا اور ایک شعر سے اپنی تقریر کا آغاز کردیا۔

''میں صبح کا بیٹا ہوں اور گھاٹیوں پر چڑھ جانے والا ہوں اور جب میں اپنا عمامہ اتار چکا ہوں تو تم مجھے پہچان چکے ہوگے۔''

اسے دیکھتے ہی لوگوں کے ہاتھوں سے سنگریزے چھوٹ گئے اور جب تقریر شروع کی تو لفظوں کے تیور ہی ایسے تھے کہ لوگ سہم گئے۔

''اے عراق کے منافقو، بداخلاقی کے مظہرو، اے بداندیش کوفیو، میری دلی تمنا تھی کہ تم سے میرا کسی صورت واسطہ پڑے۔ کل میرا کوڑا گم ہوگیا لہٰذا اس کے عوض یہ تلوار میرا کوڑا ہے۔

''بخدا میں احمق ہوتی نگاہوں اور تنی گردنوں اور پکے ہوئے سروں کو دیکھ رہا ہوں جن کے توڑنے کا وقت آگیا ہے اور میں ہی ان سروں کو توڑنے والا ہوں اور میں اس خون کو بھی دیکھ رہا ہوں جو عماموں اور ڈاڑھیوں کے درمیاں ٹپکتا ہے۔

''میں اونٹوں اور بکریوں کا چرواہا نہیں اور نہ ہی تختے پر گوشت کاٹنے والا قصاب ہوں۔ امیرالمومنین نے اپنے ترکش کو جھاڑا تو اس نے مجھے سب سے زیادہ تلخ مزہ، تیز دھار اور مضبوط چوٹ لگانے والا پایا۔ پس اگر تم ٹھیک رہے تو تمہارے امور ٹھیک رہیں گے اور اگر تم نے میرے لیے چھوٹے چھوٹے راستوں کو اختیار کیا تو تم مجھے ہر گھات میں موجود پاؤ گے۔ خدا کی قسم میں تمہاری کسی لغزش کو قبول نہیں کروں گا۔''

لوگ سہمے ہوئے اس کی باتوں کو سن رہے تھے، انہوں نے حجاج کے متعلق جیسا سنا تھا ویسا ہی وہ دیکھ رہے تھے۔

حجاج کہہ رہا تھا۔ ''اے اہلِ عراق! مجھے انجیر کی طرح ٹھوکا نہیں لگایا جاسکتا اور نہ میں کسی حادثے سے پریشان ہوتا ہوں۔ خدا کی قسم! میں تمہیں لکڑی کی طرح

چھیل کر رکھ دوں گا اور تم کو پتھروں سے زخمی کرنے کی طرح زخمی کردوں گا۔ اے اہلِ عراق! تم نے بہت دفعہ ذلالت اختیار کرنے کی کوشش کی ہے اور تم ہلاکت کے راستے پر چلے ہو اور تم نے برے طریقوں کو اختیار کیا ہے۔ اے ڈنڈے کے غلامو اور لونڈیوں کے بچو! میں حجاج بن یوسف ہوں۔ جو وعدہ کرتا ہوں اسے پورا کرتا ہوں۔

''اے کمینی عورتوں کے بچو! ہر آدمی اپنے بارے میں غور کرے اور میرا شکار بننے سے احتیاط کرے۔ لہٰذا جلدی کرو اور سیدھے ہو جاؤ۔ اگر تم حق پر نہ آئے تو میری تلوار عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کردے گی۔

''آگاہ رہو کہ امیر المومنین نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں دشمن کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیجوں۔ اب میں تمہیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر اس کے بعد کوئی شخص واپس نہ گیا اور میدان میں نظر نہ آیا تو اسے قتل کردوں گا اور اس کا مال لوٹ لوں گا۔''

یہ تقریر ہی کیا کم تھی کہ اس نے اپنے غلام کو حکم دیا۔ ''اے غلام! امیر المومنین کا خط پڑھ کر انہیں سنا دو۔''

غلام نے خط پڑھنا شروع کیا۔ ''امیر المومنین عبدالملک بن مروان کی طرف سے عراق کے مسلمان مومنوں کی طرف۔ تم پر سلامتی ہو اور میں تمہارے ساتھ اس خدا کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

غلام یہیں تک پہنچا تھا کہ حجاج نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور اہلِ عراق سے مخاطب ہوا۔

''اے اہلِ نفاق، برے اخلاق کے حاملو، تفرقہ بازو اور گمراہو! امیر المومنین تمہیں سلام کہتے ہیں اور تم انہیں سلام کا جواب نہیں دیتے۔ خدا کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو تمہیں لکڑی کی طرح چھیل کر رکھ دوں گا۔'' اس کے بعد اس نے غلام کو حکم دیا کہ وہ خط کو ابتدا سے پڑھے۔

غلام نے خط پڑھنا شروع کیا اور جب وہ سلام کے الفاظ پر پہنچا تو حاضرینِ مسجد نے سلام کا جواب بہ آوازِ بلند دیا۔ حجاج منبر سے نیچے اتر آیا۔

حجاج کا اعلان سنتے ہی وہ لوگ جو مہلب سے غداری کرکے بھاگ آئے تھے، دوبارہ مہلب کے لشکر میں شامل ہونے کے لیے توشہ دان کا انتظار کیے بغیر دوڑ پڑے کہ دیر ہوگئی تو حجاج کی تلوار سے کون بچائے گا۔

یہ بات ثابت ہوگئی کہ سرکش ظلم و تعدی کے بغیر نہیں مانتے۔

حجاج ایک مقام پر بیٹھ گیا اور لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ کہہ چکا تھا کہ تین دن گزرنے کے بعد جو رہ گیا میں اس کا سر قلم کردوں گا لہٰذا ہر شخص ڈرا ہوا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ پیچھے رہ جائے۔ اسی بھیڑ بھاڑ میں ایک ضعیف العمر آدمی حجاج کے پاس آیا۔

''اللہ تعالیٰ امیر کا بھلا کرے۔ میں ایک علیل و ضعیف آدمی ہوں۔ جنگ کے قابل نہیں۔ میرے کئی لڑکے ہیں۔ میری جگہ ان میں سے جو اچھا شہسوار ہو، امیر اسے منتخب کرلیں۔''

''بوڑھے کی جگہ جوان آدمی کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔''

بوڑھا یہ سن کر خوشی خوشی واپس ہوگیا۔ جب وہ کچھ دور چلا گیا تو قریب کھڑے لوگوں میں سے کسی نے اس بوڑھے کی طرف حجاج کی توجہ دلائی۔

''اس شخص کو پہچانتے؟''

''نہیں تو۔''

''اس کا نام عمیر بن ضابی تمیمی ہے۔ یہی وہ ہے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقتول ہونے کی حالت میں ان کی پسلی توڑ دی تھی۔''

''تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔ اسے پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔''

جب وہ شخص آگیا تو حجاج نے اس سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''عمیر بن ضابی۔''

''کیا تو وہ نہیں جس نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کے بعد ان پر حملہ کرکے ان کی پسلی توڑ دی تھی؟''

''ہاں میں وہی ہوں۔''

''تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟''

''حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میرے بوڑھے باپ کو بلاقصور قید کردیا تھا۔''

''تو نے امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے ساتھ خود جنگ کی اور اب دوسرے آدمی بھیجتا ہے۔''

''اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔''

''تو قتل نہیں کرسکتا قتل ہو تو سکتا ہے۔'' حجاج نے کہا اور اسی وقت اسے قتل کرادیا۔

اس کے قتل نے سب کو سراسیمہ کردیا۔ اب تو لوگ بے تحاشا مہلب کی طرف دوڑ پڑے۔ مہلب کی تلاش میں جدھر منہ آیا اُدھر نکل گئے اور پُل پر اس قدر ہجوم ہوگیا کہ لوگ دریائے فرات میں گر پڑے۔

کوفہ سے فارغ ہونے کے بعد حجاج بصرہ پہنچا اور وہاں بھی اسی قسم کی تقریر کی۔ ایک شخص شریک بن عمرو اس کے پاس آیا اور کہا۔ ''اے امیر! میں بیمار ہوں، سابق امیر نے مجھے فوجی خدمت سے معذور رکھا تھا۔ میری آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔'' حجاج نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔

یہ سختی دیکھی تو اہلِ کوفہ کی طرح اہلِ بصرہ بھی مہلب کی فوج میں شریک ہونے کے لیے جوق در جوق روانہ ہونے لگے۔

جب لوگ کثرت سے مہلب کے پاس پہنچنے لگے تو اس نے پوچھا۔ ''عراق پر کس کو عامل مقرر کیا گیا ہے۔ خدا کی قسم! یہ کوئی مرد ہے اور اب بخدا دشمن کے لیے ہلاکت ہوگی۔''

مہلب کے یہ الفاظ ضائع نہیں گئے۔ حجاج کی دلیری اور دانش مندی نے مہلب کی طاقت اتنی بڑھا دی کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے خوارج پر قابو پالیا اور ایک ناممکن کام ممکن ہوگیا۔

خلیفہ عبدالملک اس کی اس کارگزاری سے ایسا خوش ہوا کہ اس نے فوری طور پر اسے نئی ذمے داریاں سونپتے ہوئے اسے خراسان، ایران اور سندھ کا جس قدر علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا اس کے سپرد کردیا۔

خارجیوں کا فتنہ کم ضرور کیا تھا لیکن ختم نہیں ہوا۔ نئے نئے لوگ سامنے آرہے تھے اور امویوں کو پریشان کررہے تھے۔ کوفہ شہر طرح طرح کی سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ کوفہ کے لوگ چونکہ بنیادی طور پر شرپسند تھے جس کا مظاہرہ حجاج کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ اہلِ کوفہ ہی نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آزار پہنچایا۔ پھر اہلِ کوفہ ہی نے خونِ علی کا مطالبہ کیا اور خلافت حسینؓ کے لیے آمادہ ہوئے۔ اہلِ کوفہ ہی شہادت حسینؓ کا باعث بنے اور پھر محبت حسینؓ کے نام پر تحریکیں چلا کر سیاست کرتے رہے۔ یہ لوگ عجیب متضاد کیفیات کے حامل تھے۔ جس نے مشتعل کرنا چاہا مشتعل ہوگئے، جس نے رضامند کیا رضامند ہوگئے، کبھی بے وفا تو کبھی وفادار۔ کبھی حلیف کبھی مخالف۔ کبھی بہادر کبھی بزدل۔ مجموعی طور پر شہر کا مزاج متلون تھا۔

حجاج نے اہلِ کوفہ کے شر سے بچنے اور اپنی فوجی کارگزاریوں کو بہ سہولت انجام دینے کے لیے کوفہ اور بصرہ کے درمیان ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی اور ایک نیا شہر ''واسط'' بسانے کا حکم دیا۔ کوفہ کے بجائے واسط کو اس نے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس شہر میں اس نے ایک بہترین شامی لشکر مقیم کیا تاکہ کوفہ اور بصرہ میں سے جس جگہ بھی کوئی بغاوت اٹھ کھڑی ہو تو ''واسط'' میں مقیم فوج کی مدد سے اسے کچلا جاسکے۔

اس شہر میں اس نے اپنے لیے ایک عالی شان محل تعمیر کرایا۔ جب اس کی تعمیر مکمل ہوگئی تو اس نے افتتاحی تقریب میں لوگوں کو دعوتِ عام دی تاکہ وہ اس عظیم الشان محل کو دیکھیں اور تعریف کریں۔

حجاج بذاتِ خود متضاد کیفیات کا حامل تھا۔ وہ بہترین منتظم تھا۔ بلند پایہ خطیب تھا۔ ماہر سیاست داں تھا۔ بہادر تھا تو دوسری جانب نہایت شقی القلب اور سفاک بھی تھا۔ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا حامل تھا جس میں انسان دوسروں کو اذیت دے کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ جہاں کوڑوں سے کام چل سکتا تھا، وہاں وہ تلوار اٹھاتا تھا۔ اس کے ظلم و ستم سے سب نالاں تھے لیکن اس کے سامنے بولنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ اس کے ظلم و جبر سے اصحابِ رسول ﷺ بھی محفوظ نہیں رہے تھے تو عام آدمی کی کیا حیثیت۔ اس کا قید خانہ بے قصور قیدیوں سے بھرا ہوا تھا۔

اس کے دور میں مشہور صوفی بزرگ حضرت حسن بصریؒ بھی موجود تھے۔ انہوں نے حجاج کے عالی شان محل کی تعریف سنی تو وہ بھی اسے دیکھنے گئے اور اس نیت سے گئے کہ وہاں جمع ہونے والے لوگوں کو نصیحت کریں گے اور انہیں دنیاوی مال و متاع سے بے رغبتی اختیار کرنے کا درس دیں گے۔

جب آپ شہر واسط پہنچے تو دیکھا کہ لوگ اس محل کے چاروں طرف جمع ہیں۔ کلمہ ہائے تحسین بلند ہو رہے ہیں، اس کی خوب صورتی پر دل فریفتہ اس کی وسعت پر انگشت بدنداں ہیں۔

آپ نے لوگوں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ فرعون نے اس سے زیادہ مضبوط، خوب صورت اور عالی شان محلات تعمیر کیے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کردیا اور اس کے محلات تباہ ہوگئے۔ کاش! حجاج کو یہ معلوم ہوجائے کہ آسمان والے اس سے ناراض ہیں اور زمین والوں نے اسے دھوکے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ ظالم ہے مگر کوئی اس کے منہ پر کہنے کو تیار نہیں۔ اس کے شر سے خوف زدہ ہیں۔ وہ نادان اتنا نہیں جانتا کہ حقیقی عزت یہ نہیں ہوتی۔ پیٹھ موڑتے ہی لوگ اسے برا کہنے لگتے ہیں، مر گیا تو کس نام سے یاد رکھیں گے۔ اس سے کہو محلات زمین پر نہیں لوگوں کے دلوں میں تعمیر کرے۔ حسن سلوک سے دل خریدے۔ خلقِ خدا کا خون بہانے سے باز رہے......''

وہ بے خطر ہو کر حجاج کے خلاف بول رہے تھے۔ مجمع دم بخود تھا کہ نہ جانے حسن بصریؒ پر کیا بیت جائے، حجاج ان کا کیا حشر کرے۔ آخر ایک ہمدرد سے رہا نہیں گیا۔ اس نے

ظاہر کہ آپ کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔

''حضرت، بس اتنا ہی کافی ہے۔ حجاج تک یہ باتیں پہنچیں تو اس کی انتقامی فطرت نہ جانے کیا رنگ دکھائے۔''

حسن بصریؒ نے اس آواز کی طرف گردن اٹھائی۔ اب ان کی آواز اس شخص کا تعاقب کر رہی تھی۔

''اے نیک دل شخص! تو ہرگز خوف زدہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اہل علم سے یہ پیمان لیا ہے کہ وہ ظالم کے منہ پر بغیر کسی خوف کے حق بات کا پرچار کرتے رہیں گے۔ یہی ہمیشہ حق والوں کا وتیرہ رہا ہے۔ یہی فریضہ آج میں ادا کر رہا ہوں۔''

یہ مجمع صرف عوام کا مجمع نہیں تھا۔ حجاج کے سیکڑوں سپاہی بھی یہاں موجود تھے۔ کسی کو یہ جرأت تو نہیں ہوئی کہ حسن بصریؒ کو ٹوکتا لیکن حجاج تک یہ باتیں پہنچا ضرور دیں۔

حجاج یہ سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

''لعنت ہے تمہارے وجود پر۔ بزدلو، میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ بصرہ کا ایک غلام مجمع عام میں جو جی میں آتا ہے میرے خلاف کہہ جاتا ہے اور تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کی زبان کو روک سکتا۔ اے گروہ بزدلاں کان کھول کر سن لو۔ اللہ کی قسم اب میں اس کا خوف تمہیں دلا کر رہوں گا۔ اسے ایسی سزا دوں گا کہ دنیا دیکھے گی۔''

اس نے تلوار اور چمڑے کی چادر منگوائی۔ یہ دونوں چیزیں فوراً اس کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ جلاد کو بلایا۔ وہ بھی حاضر ہو گیا۔

سپاہیوں کو حکم دیا کہ حسن بصریؒ کو گرفتار کر کے لایا جائے۔

قصرِ عالی شان میں حجاج بن یوسف اپنے تخت کے گرد ٹہل رہا تھا۔ اسے بے چینی سے انتظار تھا کہ کب حسن بصریؒ آتے ہیں، دربان نے آکر اطلاع دی۔ ''ابو سعید حسن بصریؒ حاضر ہیں۔''

حجاج نے معنی خیز مسکراہٹ سے جلاد کی طرف دیکھا اور حضرت حسن بصریؒ کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

شہر میں ہر طرف دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شخص کا دل کانپ رہا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں کیا خبر آنے والی ہے۔

حسن بصریؒ کے ہونٹ مسلسل حرکت میں تھے۔ وہ زیرلب کچھ پڑھ رہے تھے۔ اسی حالت میں وہ حجاج کے سامنے پہنچ گئے۔ حجاج ان کے قتل کا ارادہ کر چکا تھا لیکن جیسے ہی وہ سامنے آئے، حجاج پر ہیبت طاری ہو گئی۔ غصہ کافور ہو گیا۔ آواز میں ایسی نرمی آگئی جو اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھی تھی۔

''ابو سعید حسن بصریؒ! میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آئیے تشریف رکھیے۔ میرے قریب بیٹھیں۔'' حجاج نے انہیں اپنے ساتھ تخت پر بٹھالیا۔ جب حسن بصریؒ اطمینان سے بیٹھ گئے تو حجاج نے ان سے باز پرس کرنے کے بجائے دینی مسائل دریافت کرنے شروع کر دیے۔ ہر جواب کے بعد کلمۂ تحسین ادا کرتا تھا۔ ''میرے لیے دعا کریں کہ خارجیوں کے مقابلے میں کامیابی ہو۔''

''آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ بے قصوروں کا خون بہانے سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔''

''حضرت، انتظامی معاملات سخت گیری سے چلتے ہیں۔''

''میں نے تم سے بے قصوروں کے خون کی بات کی ہے۔''

''میں کوشش کروں گا کہ معاملات کی اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد احکام صادر کروں۔''

''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔''

حجاج نے قیمتی عطر منگوایا اور حسن بصریؒ کی ڈاڑھی میں محبت بھرے انداز میں لگا کر الوداع کہا۔

جب حسن بصریؒ دربار سے نکلے تو حجاج کا دربان بھی ان کے پیچھے ہولیا۔

''حضرت، حجاج نے آپ کو قتل کے ارادے سے بلوایا تھا لیکن آپ کو دیکھتے ہی اس نے ارادہ بدل دیا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں تلوار، جلاد اور چمڑے کی چادر دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔''

''حضرت، ایک بات تو بتائیں۔ آپ جب دربار میں آئے تو آپ کے ہونٹ مسلسل حرکت کر رہے تھے۔ وہ کیا تھا جو آپ پڑھ رہے تھے؟''

''میں نے اس وقت یہ دعا کی تھی کہ الٰہی تو مجھ پر کی گئی نعمتوں کا والی ہے۔ ہر مصیبت کے وقت میرا مددگار ہے۔ الٰہی ساری مخلوق کے دل تیرے قبضے میں ہیں۔ الٰہی حجاج کے غصے کو میرے لیے ٹھنڈا اور سلامتی والا کر دے جس طرح تو نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام پر آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ میری دعا کو اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اور حجاج کا غصہ محبت میں تبدیل کر دیا۔''

○○○

بجستان یا سیستان کے نواح میں ایک ترک فرماں روا رتبیل مسلمانوں کا باج گزار تھا لیکن مسلمانوں کی خانہ جنگی کی

وجہ سے اس کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ اس نے خراج دینا بند کر دیا۔ حجاج نے اس کی باغیانہ روش کو کچلنے کے لیے لشکر اس کی طرف روانہ کیا۔ بجستان کے عامل کو اس کے ساتھ لشکر کا نگراں بنایا کہ جب تک رتبیل کے علاقے کو پامال، اس کے قلعوں کو مسمار، اس کی فوج کو تہ تیغ اور اس کے متعلقین کو لونڈی غلام نہ بنالو واپس نہ آنا۔

بجستان کا عامل عبیداللہ لشکر کو لے کر رتبیل کے علاقے میں گھس گیا۔ قلعوں اور قلعہ بند شہروں کو گرا دیا۔ رتبیل کے کئی علاقے اس کے قبضے میں آگئے۔ رتبیل نے صلح کی کوشش کی لیکن عبیداللہ نے اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اب ترکوں نے ایک کامیاب چال چلی۔ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں مسلسل پیچھے ہٹتے چلے گئے اور علاقے پر علاقہ خالی کرتے چلے گئے۔ مسلمان فتح کے نشے میں آگے بڑھتے گئے۔ ترکوں کا دارالحکومت صرف اٹھارہ فرسخ کے فاصلے پر تھا کہ ترکوں نے مسلمانوں کو پہاڑوں کی پُرپیچ گھاٹیوں میں گھیر لیا۔ اب مسلمانوں کو احساس ہوا کہ وہ ان پہاڑوں میں پھنس چکے ہیں۔ واپسی کے راستوں کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں کیا تھا۔ ترک فوج واپسی کے راستوں پر پھیل چکی تھی۔ مسلمان آگے جا سکتے تھے نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ عبیداللہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے رتبیل سے راستہ چھوڑنے کی درخواست کرنا پڑی۔ عبیداللہ کو سات لاکھ درہم دے کر جان چھڑانی پڑی۔

اس نے تو یہ صلح کر لی تھی لیکن کوفہ کی جماعت کے سردار شریح بن ہانی کو یہ ننگ گوارا نہ ہوا۔ اس نے اس صلح کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی جماعت کو جنگ جاری رکھنے پر آمادہ کر لیا۔

''میرے لیے اب زندگی کا کوئی مزہ باقی نہیں رہا۔ جو گھڑی پیش آتی ہے میں خیال کرتا ہوں کہ یہ ہی میری آخری گھڑی ہے۔ میں کافی عرصے سے شہادت کا طالب ہوں۔ اگر آج کے دن بھی مجھے شہادت نصیب نہیں ہوئی تو میں سمجھوں گا کہ پھر یہ درجہ حاصل نہ ہوگا۔''

اس کے بعد اس نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے للکارا۔ کچھ رضاکار، کچھ سوار اور کچھ غیرت مند لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ وہ رتبیل کی فوج پر ٹوٹ پڑے لیکن پہاڑوں میں گھرے ہوئے تھے۔ دشمن غالب آیا اور تقریباً تمام مسلمان شہید ہو گئے شریح بن ہانی بھی اس معرکے میں شہید ہو گئے۔

حجاج کو ان واقعات کی اطلاع پہنچی تو اس نے عبدالملک کو خط لکھا۔

''جناب والا کو مطلع کرتا ہوں کہ آپ کی جس قدر فوج بجستان میں تھی وہ سب تباہ ہو گئی۔ دشمن کو جو فتح حاصل ہوئی اس کی وجہ سے اس کے حوصلے مسلمانوں کے خلاف بہت بڑھ گئے ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اہل بصرہ اور کوفہ کی ایک زبردست فوج اس کی سرکوبی کے لیے بھیجوں مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے جناب والا کی رائے معلوم ہو جائے۔''

عبدالملک نے اس خط کا جواب یوں دیا۔

''میرے پاس تمہارا خط پہنچا جس میں تم نے مسلمانوں کی تباہی کی اطلاع دی ہے اور تم نے اس علاقے کی طرف مزید فوج بھیجنے کے متعلق جو میری رائے پوچھی ہے اس کے متعلق مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے کہ تم ضرور بھیجو۔''

عبدالملک نے اس معرکے کی سربراہی کے لیے آزمودہ کار سپہ سالار عبدالرحمٰن بن اشعث کا نام تجویز کیا۔ حجاج کے خیالات ابن اشعث کے بارے میں اچھے نہیں تھے بلکہ ملکِ عراق میں سب سے زیادہ ابن اشعث ہی سے دشمنی رکھتا تھا۔ وہ اس انتخاب پر قطعی خوش نہیں تھا لیکن خلیفہ کے حکم سے مجبور تھا پھر اس نے اپنے بعض ساتھیوں سے یہ بھی کہا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ اس معرکے میں کام آجائے، اسی لیے میں اسے بھیجنے پر تیار ہو گیا ہوں۔

حجاج اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ابن اشعث فوج کی تیاریوں کے بارے میں معلومات لینے کے لیے وہاں آگیا۔ حجاج کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی، بے اختیار کہنے لگا۔ ''میں اس کی چال کو دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے قتل کر ڈالوں۔''

حجاج کے قریب ایک شخص نمیر بھی بیٹھا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازے کے باہر ابن اشعث کے انتظار میں کھڑا رہا۔ جب ابن اشعث باہر نکلا تو وہ اس سے مخاطب ہوا۔

''جب تم کمرے میں داخل ہوئے تو معلوم ہے حجاج نے تمہارے بارے میں کیا کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا؟''

''پہلے آپ یہ وعدہ کریں کہ جب تک حجاج زندہ ہے آپ اس کا کہیں تذکرہ نہیں کریں گے۔''

''بہتر ہے، آپ فرمائیں۔''

''جب آپ داخل ہوئے تو اس نے کہا تھا کہ میں اس کی یعنی آپ کی چال کو دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں اسے قتل کردوں۔''

''اچھا ہوا آپ نے مجھے آگاہ کر دیا۔ جب تک میں اور حجاج زندہ ہیں، اسے تباہ کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔''

بات آئی گئی ہوگئی لیکن ابنِ اشعث کے دل میں گرہ پڑ گئی۔

عبدالرحمٰن بیس ہزار کا لشکر لے کر جستان روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سب لوگوں کو جمع کیا اور انہیں مخاطب کر کے ایک زوردار تقریر کی۔

''اے لوگو! حجاج نے مجھے تمہارے سرحدی علاقوں کی حفاظت اور تمہارے دشمنوں سے جنہوں نے تمہارے شہروں کو لوٹا، جہاد کرنے کے لیے مقرر کیا ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ آپ لوگوں میں سے کوئی بھی اہلِ فوج پیچھے نہ رہ جائے ورنہ وہ سزا کا مستحق ہوگا۔''

جنگ کی تیاری شروع ہوگئی۔

رتبیل کو اطلاع ہوئی تو اس نے خوف زدہ ہوکر عبدالرحمٰن کو خط لکھا کہ مسلمانوں نے مجھے جنگ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں صلح کی درخواست کرتا ہوں اور خراج دینے پر تیار ہوں۔

عبدالرحمٰن نے صلح کے پیغام کو ٹھکرا دیا اور رتبیل کے علاقے پر دھاوا بول دیا۔ رتبیل نے انہیں بھی اسی جال میں پھانسنا چاہا جس جال میں اس نے عبیداللہ کو پھانسا تھا یعنی علاقے خالی کرتا گیا اور ابنِ اشعث کو آگے بڑھنے کا موقع دیتا رہا لیکن ابنِ اشعث تجربہ کار سپاہ سالار تھا۔ اس نے رتبیل کی چال کو مات دے دی وہ جتنا علاقہ فتح کرتا تھا اس کی حفاظت اور واپسی کا پورا انتظام کر کے آگے بڑھتا تھا۔

ایک جگہ پہنچ کر جب پہاڑی علاقہ شروع ہوگیا اور یہ راستہ دشوار ثابت ہوا تو اس نے مقبوضہ علاقے کا انتظام کرنے اور فوجوں کو آرام دینے کی غرض سے یہ مہم آئندہ کے لیے ملتوی کردی اور حجاج کو اس کی اطلاع دے دی۔

حجاج کو موقع مل گیا۔ اس نے نہایت طعن آمیز جواب بھیجا۔

''تمہارا خط راحت پسند اور آرام طلب آدمی کا خط ہے۔ ایک دشمن کے مقابلے میں جس کے ہاتھوں مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے آرام کرنا چاہتے ہو؟ میرا خط دیکھتے ہی فوراً پیش قدمی شروع کردو۔ اگر تم سے اس کی تعمیل نہیں ہوسکتی تو فوج کی کمان اپنے بھائی اسحٰق بن محمد کے ہاتھ میں دے کر تم الگ ہوجاؤ۔''

اس خط کو پڑھ کر ابنِ اشعث غصے کی سرخی سے لال ہوگیا اور بے اختیار کہہ اٹھا، میں خود ہی اسحٰق کے بوجھ کو اٹھاؤں گا۔ اس کے بعد اس نے فوج کو ایک جگہ جمع کیا اور ان سے یوں مخاطب ہوا۔

''آپ لوگ واقف ہیں کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ ایسا کام کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے آپ کو [فائدہ] پہنچے گا۔

''میں نے فوج کو آرام دینے کی غرض سے کچھ دن کے لیے مہم کو مؤخر کیا تھا اور آپ کی رضا بھی لے لی تھی لیکن حجاج نے مجھے بزدلی کے طعنے دیے اور حکم دیا کہ فوراً آپ لوگوں کو لے کر دشمن کے ملک میں بڑھتا چلا جاؤں۔ یہ وہی علاقہ ہے جس میں ابھی حال میں آپ کے دوسرے بھائی تباہ ہو چکے ہیں مگر پھر بھی چونکہ میں آپ ہی لوگوں کا ایک فرد ہوں اس لیے آپ ... اس حکم پر عمل کرنا چاہتے ہوں تو میں تیار ہوں اور اگر آپ اس پر عمل پیرا نہیں ہونا چاہتے تو بھی میں آپ کا شریکِ حال ہوں۔''

اس تقریر کے بعد تمام لوگ چاروں طرف سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم ہرگز پیش نہیں ہوں گے ہم حجاج کو دشمنِ خدا سمجھتے ہیں۔ اس کی اطاعت کے لیے تیار نہیں۔

اس کے بعد مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔

''اے اللہ کے بندو! خوب سمجھ لو اگر تم نے حجاج کے حکم کی تعمیل کی تو وہ حکم دے گا تم اسی علاقے کو اپنا وطن سمجھو اور جس طرح فرعون نے فوجوں کو دشمن کے علاقے میں عرصے تک مقیم رکھا تھا اسی طرح یہ بھی تمہیں یہیں رکھے گا۔

''حجاج ذرہ برابر بھی تمہاری پروا نہیں کرتا اس وجہ سے اس نے تمہیں ایسے پُرخطر ممالک میں بھیجا ہے۔ اگر تمہیں فتح حاصل ہوئی تو مالِ غنیمت تو تم حاصل کرو گے مگر اس علاقے کی آمدنی ساری اس کی ہوگی۔ اس طرح اس کی طاقت میں مزید اضافہ ہوگا اور اگر دشمن نے تم پر فتح پائی تو بس اس وقت حجاج کے نزدیک تم ایسے قابلِ عداوت دشمن ہوجاؤ گے جن کی تکالیف کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا اور جس پر مطلق رحم بھی نہیں کھایا جاتا۔

''اس لیے آپ لوگ دشمنِ خدا حجاج کو چھوڑ دیجیے اور عبدالرحمٰن بن اشعث کو اپنا امیر بنا لیجیے۔ میں اس کی ابتدا کرتا ہوں اور آپ سب کو اس پر گواہ بناتا ہوں۔''

ان تقاریر کے بعد لوگ اتنے بپھر گئے کہ ہر طرف سے صدائیں آنے لگیں۔ ''ہم دشمنِ خدا حجاج کو چھوڑنے پر تیار ہیں۔''

عبدالرحمٰن بن اشعث نے کہا۔ ''آپ لوگ میرے ہاتھ پر اس مقصد کے حصول کے لیے بیعت کیجیے کہ ہمارا دشمنِ خدا حجاج سے کوئی تعلق نہیں اور اس کے مقابلے میں آپ لوگ میری امداد وحمایت کریں تاکہ ہم اسے سرزمینِ عراق سے [نک]ال دیں۔''

اب تو یہ حال ہوا کہ چاروں طرف سے لوگ بیعت [کے] لیے ٹوٹ پڑے۔ بغاوت کی بھٹی گرم ہوچکی تھی۔ فوج [کے] غصے کی حالت یہ تھی کہ اگر حجاج سامنے ہوتا تو اس کے [ٹکڑے ٹک]ڑے ہوجاتے۔

فوج جستان سے اس طرح روانہ ہوئی جیسے سیلاب [کا] پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ ایک مقام پر رک کر ابنِ [ا]شعث نے رتبیل کے پاس صلح کے لیے سفیر بھیجا اور اس [شر]ط پر دونوں میں صلح ہوگئی کہ اگر اس کشمکش میں ابنِ اشعث [کا]میاب ہوں تو رتبیل آئندہ سے خراج نہ دے اور اگر ابنِ [ا]شعث کو شکست ہوئی اور رتبیل کے پاس آجائے تو وہ اسے [پ]ناہ دے گا۔

ابنِ اشعث عراق کی طرف روانہ ہوا۔

جب یہ فوجیں سرزمینِ فارس میں داخل ہوگئیں تو [ل]وگوں نے آپس میں مشورہ کرنا شروع کیا اور یہ مطالبہ عام ہوگیا کہ جب حجاج کے خلاف ہم نے علمِ بغاوت بلند کردیا ہے تو خلیفہ عبدالملک کے خلاف بھی بغاوت کر دینی چاہیے۔ ان کے کچھ سربرآوردہ لوگ عبدالرحمٰن کے پاس جمع ہوئے اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ عبدالرحمٰن نے بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر کہا۔ ''میں جس طرح اپنا کُرتہ اتارے ڈالتا ہوں اسی طرح میں نے آج سے عبدالملک کی اطاعت کو اپنی گردن سے اتار دیا۔''

ایک مرتبہ پھر لوگوں نے ابنِ اشعث کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ اطلاعات حجاج تک پہنچیں تو اس نے ابنِ اشعث کے باغیانہ طرزِ عمل کی شکایت عبدالملک سے کی اور درخواست کی کہ آپ فوراً میری امداد کے لیے فوج روانہ فرمائیں۔

جب حجاج کا خط عبدالملک کے پاس پہنچا تو اس قدر تشویش ہوئی کہ تخت سے اتر گیا۔ وزرا جو قریب کھڑے تھے مشوروں سے نوازنے لگے۔

''حضور یہ فتنہ اگر جستان کی سمت سے رونما ہوا ہے تو آپ ہرگز فکر نہ کریں البتہ یہ فتنہ اگر خراسان سے اٹھا ہوتا تو آپ کے لیے تشویش کا باعث ہوتا۔''

خلیفہ عبدالملک قصرِ امارت سے باہر آیا۔ منادی کردی گئی تھی کہ رعایا قصرِ امارت کے سامنے پہنچ جائے۔ دمشق کی سڑکیں سنسان تھیں۔ اہلِ دمشق قصرِ امارت کے سامنے جمع تھے۔ عبدالملک کی آواز گونجی۔

''معلوم ہوا ہے اہلِ عراق پر میری زندگی دوبھر ہوگئی ہے۔ انہوں نے میری طاقت کا اندازہ لگانے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ میں ان پر بہت جلد اہلِ شام کی تلواروں کو مسلط کردوں گا۔''

حجاج نے عراق چھوڑ کر بصرہ میں قیام کرلیا تھا۔ وہ اب ابنِ اشعث سے مقابلے کی تیاری کر رہا تھا۔ عبدالملک کی طرف سے اس کے پاس روزانہ سو سو پچاس پچاس کی تعداد میں شہ سوار پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔ ہر روز یوں لگتا تھا کہ جنگ کا طبل بجنے کو ہے۔

ایک سوار بصرہ کی حدود میں داخل ہوا اور بازاروں سے گزرتا ہوا حجاج کے محل کے سامنے پہنچ گیا۔ دربانوں نے ضروری پوچھ گچھ کے بعد اسے حجاج کے پاس پہنچا دیا۔

''اے سوار، تُو نے یہ مشقت کس لیے اٹھائی؟''

''اے امیر، مجھے مہلب بن ابی صفرا نے ایک خط دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' سوار نے کہا اور خط اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تو خود ہی اس خط کو پڑھ کر سنا دے تاکہ میرے قریب بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اسے سن لیں۔'' سوار نے خط پڑھنا شروع کیا۔

''اہلِ عراق آپ کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ان کی مثال ایک ایسے سیلاب کی ہے جو بلندی سے پستی کی طرف آرہا ہو اور جب تک وہ ہموار سطح تک نہیں پہنچ جاتا کوئی شے اس کی روانی کو روک نہیں سکتی۔ یہی مثال اہلِ عراق کی ہے۔ کارروائی کی ابتدا میں ان میں بہت زیادہ جوش وخروش ہوتا ہے اور اپنے اہل وعیال سے ملنے کا جنون ان کے سروں پر سوار ہوتا ہے۔ اس جوش کی حالت میں کوئی چیز انہیں روک نہیں سکتی البتہ جب وہ اپنے اہل وعیال میں پہنچ جائیں اور ان میں گھل مل جائیں، اس وقت آپ ان کے خلاف کارروائی کریں اور انشاء اللہ ایسی صورت میں اللہ آپ کو ان پر فتح دینے والا ہے۔''

حجاج نے خط کے مضمون کو بہ غور سنا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مہلب کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کا اظہار اس نے اپنے اصحاب کے سامنے کر بھی دیا۔

''اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ میں مہلب بن ابی صفرا کا ہم خیال تو نہیں ہوسکتا مگر میں ان کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ ان کا مشورہ خیر خواہانہ ہے۔''

حجاج نے مہلب کی رائے ٹھکرا کر اپنی رائے پر فیصلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے شامی فوج کو ساتھ لیا اور مقام

تستر آیا۔ اس مقام پر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ حجاج کو شکست ہوئی اور وہ بصرہ کی طرف لوٹ گیا۔ اہلِ عراق اس کے تعاقب میں تھے لیکن حجاج پر نہ خوف طاری تھا نہ گھبراہٹ۔ وہ سیدھا بصرہ کی طرف چلا جارہا تھا۔ بصرہ پہنچنے کے بعد اس نے حکم دیا کہ تاجروں کے پاس جس قدر غلہ ہے اس پر قبضہ کرلیا جائے۔ اس کے آدمی اس غلے کو ''زاویہ'' لے آئے اور بصرہ اہلِ عراق کے لیے چھوڑ دیا۔

اس دوران میں ابنِ اشعث سے اس کی متعدد جھڑپیں ہوئیں۔ ابنِ اشعث کو تمام معرکوں میں فتح نصیب ہوئی۔ ابنِ اشعث کا بصرہ پر قبضہ ہوگیا۔

ابنِ اشعث نے پھر حجاج کا مقابلہ کیا اور ایک معرکے میں ابنِ اشعث کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس خونیں معرکے میں ابنِ اشعث کے بہت سے سپاہی کام آگئے۔

اس شکست کے بعد ابنِ اشعث کوفہ چلا گیا۔

جب ابنِ اشعث کوفہ کے قریب پہنچا تو اہلِ کوفہ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ یہاں اموی حاکم عبدالرحمٰن بن عباس حجاج کے نائب کے طور پر کام کررہا تھا۔ ابنِ اشعث نے اسے نکال دیا۔ حجاج بھی ابنِ اشعث کے پیچھے پیچھے کوفہ پہنچا۔ اس وقت تک ابنِ اشعث کی قوت مجتمع ہوچکی تھی۔ وہ حجاج کے مقابلے کے لیے نکلے اور دونوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی جھڑپوں کا آغاز ہوگیا۔

ابنِ اشعث کی گرم بازاری بڑھتی جارہی تھی۔ علما، فقیہ، زاہد و عابد سب نے ابنِ اشعث کو اپنا امیر تسلیم کرلیا اور اس کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ ان میں سب سے نامور اور اہم شخصیت حضرت سعید بن جبیرؒ کی تھی۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ صرف قرآن، حدیث، فقہ، کلام اور زہد و تقویٰ میں ہی نمایاں نہیں تھے بلکہ مصلح اور مجاہد بھی تھے۔ وہ کچھ دن مدینہ میں رہے اور کچھ دن عراق کے مختلف شہروں میں رہ کر علم و عرفان کی بارشیں کرتے رہے۔ پھر کوفہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ حجاج ان کا بڑا قدردان تھا۔ حجاج نے انہیں جامع کوفہ کا امام بنادیا تھا۔

حجاج کو جب معلوم ہوا کہ دوسرے علما کے ساتھ سعید بن جبیرؒ بھی ابنِ اشعث کا ساتھ دے رہے ہیں تو اسے سخت تعجب ہوا۔ وہ طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا داہنا ہاتھ نیام تک چلا گیا تھا۔

''مجھے سعید بن جبیر سے یہ امید نہیں تھی، میں قسم کھاتا ہوں وہ جب بھی میری گرفت میں آئے میں ان کا سر ان کی گردن پر نہیں رہنے دوں گا۔''

حجاج اور ابنِ اشعث کی فوجوں کے درمیان خون ریز جھڑپیں جاری تھیں۔ کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ جھڑپوں میں ابنِ اشعث کا پلڑا بھاری دیکھ کر عبدالملک کو اپنی خلافت کی فکر ہونے لگی تھی۔ اسے اور اس کے درباریوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ بغاوت یونہی پھیلتی رہی تو کہیں عراق ہاتھ سے نہ چلا جائے۔ رائے عامہ تیزی سے عبدالملک کے خلاف ہورہی تھی۔ معرکہ آرائیوں سے آگ بجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ضروری ہوگیا تھا کہ کسی طرح یہ آگ بجھائی جائے۔

اہلِ قریش اور اہلِ شام کے سربرآوردہ لوگ عبدالملک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ اس ایک تجویز کو سب نے پسند کیا۔

''اگر حجاج کو برطرف کرنے سے اہلِ عراق خوش ہوجائیں تو ہمارے خیال میں حجاج کو برطرف کردینا چاہیے۔ حجاج کو برطرف کرنا ابنِ اشعث سے لڑنے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ اس لیے جناب والا حجاج کو عراق کی گورنری سے برطرف کردیں۔ اہلِ عراق پھر پہلے کی طرح آپ کے مطیع ہوجائیں گے اور یوں ہم سب کی جانیں بھی سلامت رہیں گی۔''

عبدالملک نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ اس نے اپنے بیٹے عبداللہ کو بلایا اور اپنے بھائی محمد بن مروان کو خط لکھ دیا جو اس وقت موصل میں تھا۔

یہ دونوں اپنی اپنی جماعتوں کے ساتھ دربارِ شاہی میں حاضر ہوئے۔

''تم دونوں جاؤ اور اہلِ عراق کے سامنے یہ بات پیش کرو کہ ہم حجاج کو برطرف کرتے ہیں۔ تمہارے سروں سے ظلم و جبر کے بادل ہٹاتے ہیں۔

''ابنِ اشعث عراق کے جس شہر کو پسند کریں، وہاں چلے جائیں۔ وہ اس شہر کے حاکم رہیں گے۔''

عبدالملک نے اپنے بیٹے اور بھائی کو ہدایت کی کہ اگر اہلِ عراق ان شرائط کو قبول کرلیں تو حجاج کو موقوف کرکے محمد مروان کو عراق کا گورنر مقرر کردو۔ اگر عراقی ان مراعات کو نامنظور کردیں تو پھر حجاج ہی اہلِ شام کی جماعت کا افسر رہے اور وہی جنگی مہمات کا ناظمِ اعلیٰ رہے۔ تم دونوں بھی اسی کے ماتحت رہو گے۔

حجاج کی زندگی میں اس سے زیادہ نازک موقع اور کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کی قسمت کا فیصلہ اہلِ عراق کو کرنا تھا۔

اگر اہلِ عراق ان تجاویز سے اتفاق کرلیتے تو حجاج عراق کا گورنر نہیں رہ سکتا تھا۔ اہلِ عراق تو اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک عبدالملک ہی تھا جس سے وہ اپنی سفارش خود کرسکتا تھا۔ اس نے عبدالملک کو خط لکھا۔ اپنی خدمات کا ذکر کرنے کے بعد اس نے عبدالملک کو مشورہ دیا۔

''اگر آپ نے میری برطرفی کا معاملہ اہلِ عراق کے سپرد کردیا تو یہ اس وقت تو خاموش ہوجائیں گے مگر میرا کانٹا نکلنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد پھر آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہوجائیں گے۔ یہ ان کی فطرت میں شامل ہے۔ آپ کے خلاف کارروائی کرنے میں انہیں زیادہ وقت ہوگی۔ آپ یہ خوب سمجھ لیں کہ میں ہی وہ فولاد ہوں جو اس لوہے کو نرم کرسکتا ہے۔''

عبدالملک فیصلہ کرچکا تھا لہٰذا اس خط کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہا۔

عبدالملک کا بیٹا اور بھائی عراق پہنچے اور عبدالملک کا پیغام ان تک پہنچایا۔ اس وقت ایک بڑے میدان میں اہلِ عراق جمع تھے۔ ان سب نے ان سہولتوں کو غور سے سنا جو عبدالملک کی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔

عراقیوں نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ اپنی رضامندی یا ناراضی بھی ظاہر نہیں کی بلکہ ایک دن کی مہلت طلب کرکے رخصت ہوگئے۔

تمام اہلِ عراق ابنِ اشعث کے پاس ان شرائط پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ ابنِ اشعث نے ان شرائط سے پوری طرح اتفاق کیا۔

''تمہیں آج ایک ایسا موقع ملا ہے کہ فوراً اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اگر یہ زریں موقع ہاتھ سے نکال دیا تو افسوس کے سوا تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

اہلِ عراق کی شرپسندی نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا۔ ابنِ اشعث کی تقریر ختم ہوئی تو چاروں جانب سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اللہ تعالیٰ نے اہلِ شام کو تباہ و برباد کردیا ہے۔ قحط، تنگی، افلاس، بھوک، قلت سامان خوراک اور ذلت ان کے ساتھ ہے۔ ہم تعداد میں زیادہ اور خوش حال ہیں۔ ہمارے پاس سامانِ خوراک کثرت سے ہے۔ ہم کبھی ان شرائط کو قبول نہیں کریں گے۔''

اس طرح انہوں نے عبدالملک سے دوبارہ بغاوت کا اعلان کردیا۔ اہلِ عراق نے اپنی شرپسندی کی بدولت حجاج کو اپنے اوپر مسلط رہنے کا موقع دے دیا۔

اہلِ عراق کی جانب سے شرائط کی نامنظوری کے بعد حجاج کو موقع مل گیا کہ وہ جس طرح چاہے اہلِ عراق کو کچل دے۔ اب وہ بہ حکم عبدالملک جنگی حکمت عملی کا مختار و مالک تھا۔

جنگ کا آغاز پھر ہوگیا۔ دونوں جانب سے فریقین آگے بڑھے۔ دونوں میں جنگ کا آغاز ہوگیا۔

عراقیوں کو کوفہ اور اس کے مضافات سے تمام ضروریاتِ زندگی برابر پہنچ رہی تھیں۔ بصرہ سے بھی ان کو امداد پہنچ رہی تھی جبکہ شامیوں کا حال بُرا تھا۔ سامانِ خوراک کی قلت تھی اور گوشت تو بالکل ہی مفقود ہوگیا تھا۔ ان تکالیف کے باوجود اہلِ شام نہایت ثابت قدمی سے مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے۔

کئی خوں ریز معرکوں کے بعد 83 ہجری میں عراقیوں کو نہایت فاش شکست ہوئی۔ ابنِ اشعث شکست کھا کر بصرہ چلا گیا اور حجاج نے کوفہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کی تلوار نے ہر اس شخص کو قتل کیا جس نے اس کی بیعت سے انکار کیا۔ ایک شخص مصقلہ کو اپنے برابر بٹھالیا اور اس سے کہا تم ہر اس شخص پر لعن طعن کرو اور اس کی ناشکری بیان کرو اور اس پر ملامت کرو جس کے ساتھ ہم نے احسان کیا اور پھر اس نے ہماری مخالفت کی۔

حجاج نے بیعت کا انوکھا انداز اختیار کیا تھا۔ جو بیعت کے لیے آگے بڑھتا حجاج اس سے کہتا تم اقرار کرو کہ میں کافر ہوں کیونکہ تم نے امیرالمومنین سے بیعت توڑ کر کفر کا ارتکاب کیا ہے۔

یہ ایسی اندوہناک صورتِ حال تھی جس کا سامنا سب کو تھا۔ خوف و ہراس میں مبتلا لوگ قتل سے بچاؤ کی خاطر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کفر کا اعتراف کرلیتے۔ جو لوگ کفر کا اعتراف نہ کرتے انہیں اپنی گردن کا نذرانہ دینا پڑتا۔ انہی میں قبیلہ خثعم کا ایک عمر رسیدہ بزرگ دونوں گروہوں سے الگ تھلگ دریائے فرات کے کنارے بیٹھا تھا۔ حجاج کے سپاہی اسے پکڑ کر حجاج کے دربار میں لے آئے۔

اس نے کہا۔ ''جب سے لڑائی کی آگ بھڑکی ہے میں سب سے الگ تھلگ ہوں۔ مجھے کسی سے کیا سروکار۔''

حجاج یہ سن کر بھڑک اٹھا۔ ''تیرا قصور یہ ہے کہ تو نے امیر کی قیادت میں لڑائی کیوں نہیں کی۔ پس تو نے کفر کیا۔ کیا تو اپنے کفر کا اقرار کرتا ہے؟''

بوڑھے نے کہا۔ ''میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہا اور اس کے بعد کیا میں کفر کا اقرار کرلوں؟''

''اگر اعتراف نہیں کرو گے تو میں تمہیں قتل کردوں گا۔'' حجاج نے کہا۔

''جو جی میں آئے کرو، میں کفر کا قطعاً اعتراف نہیں

کروں گا۔"

حجاج نے اسی وقت جلاد کو حکم دیا کہ اس بوڑھے کی گردن اڑا دو۔ جلاد نے حکم کی تعمیل کی اور چشمِ زدن میں گردن اڑا دی۔

یہ شخص نہایت بوڑھا تھا اور بے قصور بھی۔ حجاج کے قریب بیٹھے ہوئے اس کے ہم نوا بھی یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھے۔

اس ذبح خانے کی داستانیں پورے ملک میں پھیل رہی تھیں۔ ہزاروں آدمی بے دریغ قتل کر دیے گئے تھے۔ صرف چند آدمی تھے جو بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان میں سعید بن جبیرؒ بھی تھے۔

❀❀❀

سعید بن جبیرؒ کو یقین تھا کہ اگر انہیں حجاج کے سامنے پیش کیا گیا تو دو صورتوں میں ایک یقینی ہے یا تو ان کی گردن اتاری جائے گی یا انہیں کافر ہونے کا اقرار کرنا پڑے گا۔ کفر کا ارتکاب ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے جان بچانے کے لیے کوفہ چھوڑ دیا۔ اس وقت یہ بھی ممکن نہیں تھا لیکن ان کے ہمدردوں نے کسی نہ کسی طرح انہیں نکلنے میں مدد دی۔ وہ اللہ کی سرزمین میں حجاج کے کارندوں سے آنکھ بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ چھپتے چھپاتے دور دراز کا سفر طے کرتے ہوئے مکہ معظمہ کے قریب ایک بستی میں پناہ لے لی۔

حجاج نے ان کے فرار کا قصہ سنا تو ہاتھ ملتا رہ گیا لیکن غضب کی آگ جو اس کے دل میں جل رہی تھی، بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ وہ ان کی تلاش میں کوشش کرتا رہا۔ اس کے آدمی انہیں جگہ جگہ تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اس بستی کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا جہاں وہ روپوش تھے۔ یہاں بھی انہوں نے ایک حلقۂ احباب جمع کر لیا تھا جنہیں قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سعید ہیں۔ جنہیں معلوم تھا، وہ ان کے ہمدرد تھے۔ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔

کئی سال گزر گئے۔ ان کا ایک شاگرد مکہ معظمہ کسی کام سے گیا۔ اس کے ملنے والے اس کے علم و فضل سے متاثر ہوئے۔ جواب میں اس نے اپنے استاد کی شان میں زمین آسمان ایک کر دیے۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ اس چھوٹی سی بستی میں اس معیار کا عالم کیونکر ہے۔ اس کو دربارِ شاہی میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ خبر لوگوں سے چلی اور خالد بن عبداللہ تک پہنچ گئی جو بنو امیہ کی طرف سے گورنر مقرر ہو کر آیا تھا۔ اسے بعض نشانیوں سے یہ شبہ ہوا کہ یہ یقیناً سعید بن جبیرؒ ہیں جو حجاج کے خوف سے روپوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نے کچھ لوگوں کو اس بستی کی طرف بھیجا جو ان کا حلقۂ درس دیکھ کر اور بعض معلومات لے کر واپس آ گئے۔ پھر ایک شخص ان کی شاگردی اختیار کرنے کے لیے ان سے ملاقات کی۔ خود کو مکہ معظمہ کا نہیں بلکہ قریب کی ایک بستی کا فرد ظاہر کیا۔ سعید بن جبیر اس شخص کی ذہانت سے متاثر بھی بہت ہوئے۔ انہوں نے اسے حلقۂ درس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

یہ شخص دراصل خالد بن عبداللہ کے لیے جاسوسی کر رہا تھا۔ کچھ لوگوں کو اس پر شک ہوا۔ یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ وہ مکہ معظمہ کا رہنے والا ہے۔

"حضرت، ہمیں اس شخص پر شبہ ہے۔ یہ کسی بستی کا نہیں خاص مکہ شہر کا رہنے والا ہے۔ پھر اس نے اپنے وطن کو کیوں چھپایا؟"

"اس بے چارے کی کوئی مصلحت ہوگی۔ تم لوگ اتنا تردد کیوں کرتے ہو؟"

"ہمیں شک ہے کہ اسے خالد بن عبداللہ نے بھیجا ہے۔"

"اگر ایسا بھی ہے تو مجھے غم کیوں ہو؟"

"ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اس بستی سے کہیں اور چلے جائیں۔ ہمیں شک ہے کہ آپ کو پہچان لیا گیا ہے۔ آپ کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔" ساتھیوں نے کہا۔

"میں عراق سے بھاگ کر وہاں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ یہ بھی میری غلطی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ وہیں رہ کر حالات کا مقابلہ کرتا۔ میں اپنی اس بشری کمزوری پر آج تک شرمسار ہوں۔ اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ یہیں رہوں گا۔ جو سامنے آئے گا خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔"

ساتھی سمجھاتے رہے لیکن آپ نے فرار کی نہیں سوچی۔

خالد بن عبداللہ کے سپاہیوں کی اس بستی میں آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک دن سپاہیوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔

ان کے ایک خادم نے باہر جھانک کر دیکھا اور آپ کو باخبر کر دیا۔ اس خادم نے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ خفیہ راستے سے انہیں باہر لے جا سکتا ہے لیکن آپ نہ مانے۔ رات کا وقت تھا۔ گھر کے لوگ سو رہے تھے۔ صرف ایک بیٹی تھی جو جاگ گئی تھی، وہ ان سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بیٹی! اپنی امی کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اب ان سے ان شاء اللہ جنت میں ملاقات ہوگی۔" آپ نے کہا اور گرفتاری دینے کے لیے گھر سے باہر نکل گئے۔

ان لوگوں نے انہیں گرفتار کر لیا اور ان کے پوچھنے پر

یہ بھی بتا دیا گیا کہ انہیں شہر ''واسط'' لے جایا جا رہا ہے جہاں انہیں حجاج بن یوسف کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

''گویا اس کے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں ایک کا اور اضافہ ہونے والا ہے۔''

سعید بن جبیرؒ کے لیے نہ کوفہ نیا تھا نہ واسط۔ حجاج بھی غیر نہیں تھا اور وہ محل بھی اجنبی نہیں تھا جہاں حجاج دربار کیا کرتا تھا۔

سپاہیوں نے انہیں دربار تک پہنچا دیا۔ اس وقت وہ امام جامع مسجد یا قاضی کوفہ نہیں تھے۔ حجاج کے قیدی تھے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' حجاج نے عجیب سوال کیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کون ہیں۔

''سعید بن جبیر۔''

''نہیں بلکہ تمہارا نام شقی بن کسیر ہے۔'' حجاج نے ان کی تذلیل کی۔

''معاف فرمائیے میری ماں آپ سے زیادہ میرے نام سے واقف تھیں۔ دنیا مجھے اسی نام سے جانتی ہے اور قیامت تک جانے گی۔''

''تمہاری ماں بھی بدبخت تھی اور تم بھی بدبخت ہو۔''

''غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے۔''

''میں تمہاری دنیا کو دہکتی ہوئی آگ سے بدل دوں گا۔''

''اگر آپ کے اختیار میں یہ سب کچھ ہوتا تو میں آپ کو اپنا معبود بنا لیتا۔''

''محمد ﷺ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' حجاج نے پوچھا۔

''وہ امامِ ہدیٰ اور نبی رحمت ہیں۔''

''تم حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو۔ وہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟''

''اگر میں جنت اور دوزخ میں گیا ہوتا تو اس سوال کا جواب دے سکتا تھا۔''

''خلفا کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''میں ان کا وکیل نہیں ہوں۔''

''اچھا تم ان میں سے کسے زیادہ پسند کرتے ہو؟''

''جو میرے خالق کے نزدیک زیادہ پسندیدہ تھا۔''

''خالق کے نزدیک کون زیادہ پسندیدہ تھا؟''

''اس کا علم خدا ہی کو ہے۔''

''عبدالملک کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''تم ایسے شخص کے بارے میں کیا پوچھتے ہو جس کے گناہوں میں سے ایک گناہ تمہارا وجود ہے۔''

''تم ہنستے کیوں نہیں؟''

''وہ کیسے ہنس سکتا ہے جو مٹی سے پیدا ہوا ہے اور مٹی کو آگ کھا جاتی ہے۔''

''اگر یہ بات ہے تو ہم تفریحی مشاغل سے ہنستے کیوں ہیں؟''

''سب کے دل یکساں نہیں ہوتے۔''

''تم نے کبھی تفریح کا سامان دیکھا بھی ہے؟''

اس کے بعد حجاج نے حکم دیا کہ فنکاروں کو حاضر کیا جائے۔ وہ عود اور بانسری بجائیں۔ فنکار فوراً حاضر ہو گئے اور ساز چھیڑ دیے۔ ابن جبیر زار و قطار رونے لگے۔

''یہ رونے کا کون سا موقع ہے؟'' حجاج نے کہا۔ ''موسیقی سن کر تم روئے کیوں؟''

''بانسری کی پھونک نے مجھے وہ دن یاد دلایا جس دن صور پھونکا جائے گا۔ عود ایک کاٹے ہوئے درخت کی لکڑی ہے جو ممکن ہے ناحق کاٹی گئی ہو اور اس کے تار بکریوں کے پٹھوں کے ہیں جو ان کے ساتھ قیامت کے دن اٹھائی جائیں گی۔''

اب حجاج نے ان احسانات کا تذکرہ کیا جو اس نے ابنِ جبیر پر کیے تھے۔

''کیا میں نے تمہیں کوفہ کا امام نہیں بنایا تھا؟''

''بے شک بنایا تھا۔''

''کیا میں نے عہدۂ قضا دے کر سرفراز نہیں کیا تھا؟''

''آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا تھا۔''

''کیا میں نے تمہیں ایک مرتبہ ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم محتاجوں میں تقسیم کرنے کے لیے نہیں دی تھی اور پھر اس کا کوئی حساب کتاب بھی نہیں مانگا تھا؟''

''یہ بھی درست ہے۔''

''جب تمہیں میرے ان احسانات کا اقرار ہے تو پھر میری مخالفت پر کیوں آمادہ ہوئے؟''

''میں ابنِ اشعث کی بیعت کر چکا تھا۔''

''تمہیں اس دشمنِ خدا کی بیعت کی فکر تھی اور امیرالمومنین کی بیعت کا خیال نہیں کیا۔'' حجاج نے کہا اور پھر کچھ دیر توقف کے بعد بولا۔ ''خدا کی قسم میں تمہیں قتل کیے بغیر یہاں سے نہیں اٹھوں گا۔ یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم کس طرح قتل ہونا پسند کرو گے۔''

''تم مجھے قتل کر دو مگر یہ سمجھ لو، جس طرح تم مجھے دنیا میں قتل کرو گے خدا تعالیٰ تم کو آخرت میں قتل کرے گا۔''

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں معاف کر دوں؟''

''اگر تم معاف کر دو گے تو وہ تمہاری طرف سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی جانب سے ہوگا۔''

''اگر میں تمہیں قتل کر دوں؟''

''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا وقت مقرر کر دیا ہے۔ یہ بھی اللہ کی مرضی سے ہوگا ورنہ تمہاری کیا مجال کہ مجھے قتل کر سکو۔ تم میں تو اتنی طاقت بھی نہیں کہ ایک چیونٹی مار دو۔''

حجاج نے اپنے سامنے ہی قتل کا چمڑا بچھانے کا حکم دیا۔ جب چمڑا بچھ گیا تو قتل کا حکم دے دیا۔

ooo

حجاج سے شکست کھانے کے بعد ابنِ اشعث اپنے شکست خوردہ ساتھیوں کو لے کر کرمان کی طرف نکل گیا۔ جنگلوں کی خاک چھانتا ہوا وہ سجستان کے شہر زرنج پہنچ گیا۔ یہاں کے عامل نے انہیں داخلے سے روک دیا۔ دروازہ بند تھا اور ابنِ اشعث ساتھیوں سمیت اس امید پر صحرا میں پڑا تھا کہ .... شاید دروازہ کھل جائے۔ ابنِ اشعث اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد ایک مقام ''بست'' پہنچا۔ یہاں کے عامل نے ابنِ اشعث کا استقبال کیا۔ ابنِ اشعث نے اس کے پاس قیام کر لیا۔

چونکہ اس شخص کی نیت میں فتور تھا۔ چاہتا تھا کہ ابن اشعث کو گرفتار کر کے حجاج کی نظروں میں سرخرو ہو جائے۔ یہ شخص جس کا نام عیاض تھا، موقع کا منتظر رہا۔ جب ابنِ اشعث کے ساتھی اسے چھوڑ کر اِدھر اُدھر ہو گئے تو عیاض نے اسے گرفتار کر لیا۔

حجاج سے انعام و اکرام کی آرزو لے کر اس نے ایک قاصد کو حجاج کے پاس بھیجا لیکن وہ قاصد راستے ہی میں پکڑا گیا۔ اس کے پاس سے جو خط پکڑا گیا اس سے رتبیل کو معلوم ہو گیا کہ ابنِ اشعث عیاض کی قید میں ہے۔ رتبیل، ابنِ اشعث سے معاہدہ کر چکا تھا کہ وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ وہ آگے بڑھا اور بست کا محاصرہ کر لیا اور عیاض کو کہلا بھیجا۔

''اگر ابنِ اشعث کا بال بھی بیکا ہوا تو تمہاری خیر نہیں پھر میں اس وقت تک محاصرہ نہیں اٹھاؤں گا جب تک تجھ پر قابو نہیں پا لوں۔''

رتبیل ایک طاقتور سردار تھا۔ اس کی دھمکی سے عیاض ڈر گیا۔ اس نے پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرے جان و مال کے لیے وعدہ فرمائیں تو میں ابنِ اشعث کو اس کے تمام مال سمیت آپ کے سپرد کر دوں گا۔

اب ابنِ اشعث رتبیل کی پناہ میں تھا۔

اس کی پناہ گزینی حجاج سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے رتبیل کو دھمکی دی کہ ابنِ اشعث کو میرے پاس بھیج دو ورنہ میں تمہارا ملک پامال کر ڈالوں گا۔

رتبیل کی عزت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ دھمکی سے مرعوب ہو کر ابنِ اشعث کو اس کے حوالے کر دے۔ رتبیل نے مردانگی کا مظاہرہ کیا اور ابنِ اشعث کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور اس سلسلے میں اپنے ایک آدمی عبید بن ابی سبیع کو حجاج کے پاس بھیجا۔ اس کے ذریعے حجاج کو کہلوا دیا کہ چونکہ وہ ابنِ اشعث کو پناہ دے چکا ہے اس لیے اس کی مجبوری کو سمجھا جائے۔

عبید نے راستے ہی میں سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ حجاج کے پاس گیا۔

''اگر آپ میرے مالک رتبیل سے جنگ نہ کرنے اور سات سال تک خراج کی رقم معاف کرنے کا وعدہ کریں تو میں ابنِ اشعث کا سر آپ کے پاس بھیجنے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔''

حجاج کو ابنِ اشعث کے قتل کی اتنی جلدی تھی کہ ان شرائط کو فوراً مان لیا۔ اب عبید نے اپنے انعام کی بات کی۔

''میری خدمات کا صلہ مجھے کیا ملے گا؟''

''حجاج کی فیاضی تجھے مالا مال کر دے گی۔''

انعام کا وعدہ لے کر عبید، رتبیل کے پاس آیا۔

''اگر میں رتبیل سے یہ شرط منوا لوں کہ وہ آپ سے جنگ نہیں کرے گا اور سات سال تک آپ اسے خراج دینے کے پابند نہیں ہوں گے تو آپ ابنِ اشعث کو اس کے حوالے کر دیں گے؟''

یہ سن کر رتبیل کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا کہ اگر ایسا کرو گے تو جو مانگو گے پاؤ گے۔ عبید نے دونوں طرف سے انعام کا وعدہ لے لیا۔

رتبیل نے ابنِ اشعث کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس بھیج دیا۔ ابنِ اشعث کے خاندان کے تیس افراد کے سر بھی حجاج کے پاس روانہ کیے گئے۔

یہ روایت بھی ملتی ہے کہ ابنِ اشعث کا انتقال ہو گیا تھا۔ رتبیل نے مردہ ابنِ اشعث کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے خاندان کے اٹھارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا تھا اور اس کی اطلاع حجاج کو بھجوا دی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابنِ اشعث نے خودکشی کر لی تھی۔

۞۞۞

ابن اشعث کی موت کے بعد عراق میں ہر طرف سکون تھا۔ حجاج نے خاندان کے خاندان صفحۂ ہستی سے مٹا دیے تھے۔ جتنے مخالفین تھے سب کی گردنیں اتار دی تھیں۔ اب صرف یزید بن مہلب ایک ایسا شخص تھا جو کانٹے کی طرح حجاج کے دل میں پیوست تھا۔ اس کا خاندان اور بصرہ وکوفہ کے جو لوگ اس کے ہمراہ خراسان میں تھے، وہی اس کے پنجے سے اب تک محفوظ تھے۔ یزید بن مہلب خراسان کا گورنر تھا۔ وہ یزید کو برطرف کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔

حجاج نے سفر کیا اور عبدالملک کے پاس پہنچ گیا اور یزید کو برطرف کرنے کے لیے بات چیت کی۔

''یزید آلِ زبیر کے طرف دار ہیں۔ ان کی اطاعت پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے معزول کر دیا جائے۔''

عبدالملک اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوا۔ ''یزید کی شکایت تم صرف اس وجہ سے نہیں کر سکتے کہ وہ اور اس کا خاندان آلِ زبیر کا حامی اور خیر خواہ ہے بلکہ یہ تو ان میں ایک ایسا جوہر ہے کہ اسی باعث انہیں ہم سے عقیدت و ارادت ہے۔''

حجاج، عبدالملک سے مل کر واپس آرہا تھا کہ ایک کلیسا میں آکر قیام کیا۔ لوگوں نے بیان کیا کہ یہاں ایک نہایت مدبر اور فاضل عیسائی راہب رہتا ہے۔ حجاج کو اس سے شوقِ ملاقات ہوا اور اسے بلا بھیجا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد حجاج کو یقین ہوگیا کہ راہب نہایت دور اندیش اور اہلِ کتاب کی کتابوں کا حافظ ہے۔

حجاج نے اس سے پوچھا۔ ''کیا آپ کی کتابوں میں ان حالات کا ذکر ہے کہ جس سے اس وقت ہم اور آپ گزر رہے ہیں؟''

راہب نے کہا۔ ''جی ہاں جو واقعات آپ پر گزر چکے ہیں، گزر رہے ہیں اور گزرنے والے ہیں وہ سب مذکور ہیں۔ کہیے تو بیان کروں؟''

''یہ بتایئے ہمارے موجودہ امیر المومنین کی کیا خصوصیات ہیں؟''

''ہم اپنے زمانے میں انہیں ایک نہایت ہی مدبر بادشاہ جانتے ہیں۔''

''ان کے بعد کون ہوگا؟''

''ولید بن عبدالملک۔''

''ان کے بعد؟''

''ایک ایسا شخص جس کا نام ایک نبی کا نام ہے۔''

''اچھا یہ بتایئے میرے بعد عراق کا والی کو[ن] ہوگا؟''

''یزید نامی ایک شخص۔''

''میری زندگی میں یا میرے بعد؟''

''مجھے یہ نہیں معلوم۔'' راہب نے کہا۔

''اس کی کچھ خصوصیات بتایئے تاکہ میں کچھ اندازہ کروں۔''

''وہ ایک وعدہ خلافی کرے گا۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا۔''

حجاج اس کلیسا سے روانہ ہوا تو یزید بن مہلب کے ... اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ یزید ہی اس ... قاتل ہوگا۔ اسے جلد سے جلد معزول کر کے راستے سے ... دیا جائے۔

یزید نام کے کئی لوگ اسے یاد آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کا قاتل نہیں ہوسکتا تھا۔ ان لوگوں میں سے کوئی بھی عراق میں نہیں تھا اور نہ انہیں اس کا کوئی موقع حاصل ... کہ اسے قتل کرتے۔

حجاج نے ایک مرتبہ پھر عبدالملک کو خط لکھا اور ز... دے کر کہا کہ یہ لوگ ضرور بے وفائی کریں گے۔ اس خ... کے جواب میں عبدالملک نے لکھا۔

''اگر تمہیں یزید اتنا ہی ناپسند ہے تو کوئی ایسا نام پیش کرو جو خراسان کی گورنری کا اہل ہو۔'' حجاج نے قتیبہ بن مسلم کا نام پیش کیا۔ عبدالملک نے اسے منظور کرلیا۔

عبدالملک کی اجازت کے بعد بھی حجاج نے ... مناسب نہ سمجھا کہ یزید کو صاف لفظوں میں معزولی کا پروا[نہ] بھیجے۔ اسے ڈر تھا کہ معزولی کا سن کر یزید بغاوت کر بیٹھے گا۔ اس نے خط میں صرف اتنا لکھا کہ اپنے بھائی مفضل کو اپنی جگہ اپنا نائب بنا کر تم میرے پاس چلے آؤ۔

اس خط کے ملنے کے بعد اسے یقین ہوگیا تھا کہ اسے معزول کیا جارہا ہے۔ اس نے مشیروں کو طلب کیا۔ مشیروں نے مشورہ دیا کہ آپ نہ جائیں اور کوئی بہانہ کر دیں۔ حجاج کی نیت اچھی نہیں لیکن عبدالملک آپ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے۔ اگر آپ نے روانگی میں دیر کی تو عین ممکن ہے عبدالملک آپ ہی کو برقرار رکھے۔ ابھی خراسان میں ... کر حالات دیکھیے۔

یزید نے کہا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو حکم عدولی ہوگی۔ مجھے طلب کیا گیا ہے تو مجھے جانا چاہیے کیونکہ مجھے جو ترقی حاصل ہوئی ہے وہ حجاج کی بدولت ہوئی ہے۔ میری نیک نامی میری فرماں برداری میں ہے۔''

اسی دوران میں حجاج کا ایک اور حکم نامہ موصول ہوگیا۔ یہ خط یزید کے بھائی مفضل کے نام تھا۔ اس خط کے ذریعے مفضل کو خراسان کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ مطلب یہی تھا کہ اگر یزید نہ بھی آنا چاہے تو مفضل زبردستی اسے روانہ کردے اور واقعی یہی ہوا۔ اب مفضل نے یزید سے خود اصرار کرنا شروع کر دیا۔

یزید تیار بیٹھا تھا، روانہ ہوگیا۔ حجاج نے اسے قید کر دیا۔

اس واقعے کے نو ماہ بعد ہی یزید کے بھائی مفضل کو بھی اس کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور قتیبہ بن مسلم کو خراسان کا گورنر بنایا گیا۔

86 ہجری میں عبدالملک کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا ولید تخت پر بیٹھا۔

حجاج بہ دستور عراق پر حکومت کر رہا تھا۔

۞۞۞

خریم بن عمر نامی ایک ماہر کھوجی اس وقت چوری ہونے والے جانوروں کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ابوفضہ بھی تھا جس کے جانور چوری ہوئے تھے۔ خریم بن عمر جانوروں کے کھروں کے نشانات کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دریا کے کنارے تک آگیا۔ وہ دریا کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ اب اس کی رفتار تیز ہوگئی تھی کیونکہ اس نے کھرے کو خوب اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ چلتے چلتے وہ وادی تبل تک آگیا اور اس مکان کے سامنے پہنچ کر رک گیا جو بستی سے باہر الگ تھلگ تھا۔

''چوری ہونے والے جانور اس مکان کے اندر ہیں۔''

ابوفضہ نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر کی طرف بھاگا۔ ابوفضہ جانوروں کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا۔

''یہ میرے جانور ہیں۔ یہی میرے جانور ہیں۔''

اسی وقت چند مسلح نوجوان اندر سے نکل آئے۔

''جانتے ہو یہ حویلی بنو علاف کے سردار سلیمان کی ہے۔ یہ جانور بھی اسی کے ہیں اور اس کی رسائی حجاج بن یوسف تک ہے۔ اگر تم نے ان جانوروں پر دعویٰ کیا تو یاد رکھو سردار سلیمان کے آدمی تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''جانوروں کا مالک اپنے جانور پہچان چکا ہے۔ یہ جانور چوری کیے گئے ہیں۔ ہم انہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔''

''ہم تمہیں بتا چکے ہیں کہ سردار سلیمان کے حجاج بن یوسف سے برادرانہ تعلقات ہیں۔ اگر تم نے ایسی ویسی کوئی حرکت کی تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''مجھے یقین ہے وہ چوروں کا ساتھ کبھی نہیں دے گا۔'' خریم بن عمر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں سے کہا، ان مسلح جوانوں کو گرفتار کرلو اور جانور اپنے ساتھ لے چلو۔

مسلح نوجوانوں نے مزاحمت کے لیے تلواریں سونت لیں۔ خریم بن عمر صرف کھوجی ہی نہیں تھا بلکہ ماہر شمشیر زن بھی تھا۔ اس نے بصرہ کے ایک اسکول سے شمشیر زنی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ان مسلح جوانوں کے سامنے آگیا۔ اس کے ساتھیوں نے تلواریں بے نیام کرلیں۔

کچھ دیر کے مقابلے کے بعد ان مسلح نوجوانوں پر قابو پالیا گیا۔ رسیوں سے باندھ کر اونٹوں پر بٹھا دیا گیا۔ ابوفضہ نے اپنے جانور کھول لیے۔

ابوفضہ اپنی بستی کی طرف چلا گیا۔ خریم بن عمر نے تمام قیدیوں کو بستی کے سردار ہارون نمری کی تحویل میں دے دیا کہ وہ ان سے ضروری پوچھ گچھ کرلے۔

یہ واقعہ دن کے وقت پیش آیا تھا۔ رات خیریت سے گزر گئی لیکن صبح ہوتے ہی حجاج کے سپاہی بستی میں داخل ہوئے اور خریم... کو گرفتار کر کے لے گئے۔

سردار ہارون نمری کو جیسے ہی اس حادثے کی اطلاع ہوئی، اس نے بھی کوفہ جانے کے لیے گھوڑے پر زین کس لی۔

کوفہ شہر میں ایک بہت بڑے کمرے کے اندر حجاج بن یوسف کروفر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ایک طرف اس کا رفیقِ کار سردار سلیمان تھا، دوسری جانب قتیبہ بن مسلم تھا۔ حجاج کا بیٹا عبداللہ اور سردار مجاعہ تمیمی بھی موجود تھے۔ ان سب کو یقیناً خریم بن عمر کا انتظار تھا جسے گرفتار کر کے لایا جارہا تھا۔

یہ گھڑیاں زیادہ طویل نہیں ہوئیں۔ ایک مسلح جوان خریم بن عمر کو اندر لایا... اسے دیکھتے ہی سردار سلیمان نے حجاج کو مخاطب کیا۔

''امیر محترم! یہی وہ نوجوان ہے۔ خریم بن عمر اس کا نام ہے۔ کھوجی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن دراصل معمولی سا چرواہا ہے۔ اس نے کسی سے رقم لے کر کسی کے جانور چرائے اور الزام مجھ پر رکھ دیا۔ بھلا میں ایسا کام کرسکتا ہوں۔ یہ آپ کے سامنے ہے آپ خود اس سے پوچھ لیں۔''

اس سے پہلے کہ حجاج اس سے کچھ پوچھتا خریم بن عمر خود بول پڑا۔

"امیر محترم! جب میں اندر آرہا تھا تو سردار سلیمان کے دو مسلح جوانوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں اندر جا کر سلیمان کے خلاف آواز نہ اٹھاؤں ورنہ زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اگر اس کا ضمیر مجرم نہیں تو مجھے دھمکی کیوں دیتا ہے۔ قسم خدا کی اگر مجھے امیر حجاج کا پاس و ادب نہ ہوتا تو جس طرح تو نے مجھے چروایا کہہ کر میری تذلیل کرنے کی کوشش کی ہے اور تیرے آدمیوں نے مجھے دھمکی دی ہے، میں اپنی تلوار بے نیام کرتا۔ تمہارے دو مسلح جوانوں سے کہتا وہ بھی آئیں اور سلیمان کو بھی ساتھ ملا لیں۔ میں تینوں سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوتا۔

"تم نے میرے خلاف شکایت کی جبکہ شکایت تو مجھے کرنی چاہیے تھی۔"

وہ یہیں تک کہہ پایا تھا کہ حجاج نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ وہ خریم بن عمر کی بے باکی و دلیری سے بہت متاثر ہوا کیونکہ اس کی دلیری سچے آدمی کی شناخت کرا رہی تھی۔

"سلیمان کے محافظوں کو اندر بلاؤ۔"

تھوڑی دیر میں دونوں محافظ اندر آگئے۔

"تم دونوں نے خریم بن عمر کو دھمکی دی تھی؟" حجاج نے پوچھا۔ ان دونوں نے بے اختیار سلیمان کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں اب کیا کہنا ہے۔ حجاج نے انہیں ڈانٹا۔ "سلیمان کی طرف مت دیکھو، میری بات کا جواب دو۔"

ان دونوں میں اب بولنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ صرف اتنا کر سکے کہ اثبات میں گردن ہلا دی۔

"دونوں اپنی تلواریں بے نیام کرو۔ تمہارا اس شخص سے مقابلہ ہوگا جسے تم نے دھمکی دی تھی۔" حجاج نے ان دونوں سے کہا اور پھر خریم بن عمر سے مخاطب ہوا۔ "کیا تم ان دونوں سے بہ یک وقت مقابلہ کرنے کو تیار ہو؟"

"یہ تو صرف دو ہیں اگر سلیمان بھی ان کے ساتھ مل جائے تو میں مقابلے کو تیار ہوں۔" خریم نے اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں اس سے مقابلہ کرو۔ مقابلے کا منصف میں خود ہوں گا۔"

اس حکم کے ساتھ ہی وہ دونوں خریم بن عمر پر حملہ آور ہوگئے۔ خریم بن عمر نے دونوں کی تلواروں کو اپنی تلوار پر روکا اور انہیں پیچھے دھکیل کر ان پر حملہ آور ہوگیا۔

حجاج اس مقابلے کو غور سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں خریم بن عمر کے حملوں کی داد دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شفقت آمیز چمک تھی جو یقیناً خریم بن عمر کے لیے تھی۔

حجاج بن یوسف کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مقابلے کی طرف سے غافل ہوگیا تھا۔ بس اتنی دیر بہت تھی۔ وہ اچانک خیالوں کی دنیا سے باہر آیا تو اس نے دیکھا ایک نوجوان کی تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری ہے۔ وہ سہما ہوا دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ دوسرا معمولی سا زخمی ہوا ہے اور دیوار کے ساتھ لیٹ گیا ہے۔ پھر اس نے دیکھا خریم بن عمر سلیمان کے سامنے کھڑا ہے۔

"بنو علاف کے سردار! تیرے دونوں محافظوں کو میں نے اپنے سامنے زیر کر دیا ہے۔ میری کامیابی کا فیصلہ میرے امیر حجاج کریں گے۔ اگر تمہیں شک ہے تو میں تم سے بھی مقابلے کے لیے تیار ہوں۔"

حجاج نے اسے مخاطب کیا۔ "سن خریم! پہلے تو اپنے حالات کہہ پھر اس شکایت کی وضاحت کر جو سلیمان نے تیرے خلاف کی ہے تاکہ فیصلہ سنانے میں مجھے آسانی ہو۔"

"امیر محترم! میں یہ کہنے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتا کہ میرا تعلق انتہائی غریب گھرانے سے ہے۔ میں ریوڑ چرا کر گزر بسر کا سامان مہیا کرتا ہوں۔ شمشیر زنی کی تعلیم بصرہ کے ایک اسکول سے حاصل کی ہے۔ جہاں تک سلیمان کا تعلق ہے اس پر چوری کا الزام ہے۔"

اور پھر تمام واقعات سنا ڈالے۔

"غریب گھر کی اولاد!" سلیمان چیخا۔ "تُو مجھ پر چوری کا الزام ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تیرے پاس ثبوت کیا ہے؟"

اس سوال پر خریم بن عمر بوکھلا گیا تھا لیکن خدا نے عین موقع پر اس کی مدد کی۔ سردار ہارون نمری اسی وقت کمرے میں داخل ہوا۔ ہارون نمری کو حجاج ہی نے کرخ کا سردار نامزد کیا تھا اور اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ اس کا آنا غیر معمولی نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے انہیں دیکھ کر سلیمان کا رنگ اڑ گیا۔

"امیر محترم! یہ وہ لوگ ہیں جن سے جانور برآمد کیے گئے تھے۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے سلیمان کے کہنے پر جانور چرائے تھے۔ آپ ان سے پوچھیں یہ خود گواہی دیں گے۔"

کہنے کی دیر تھی کہ ان لوگوں نے نہ صرف اس چوری کے خلاف گواہی دی بلکہ سلیمان کے کئی اور سیاہ کارنامے وضاحت سے بیان کر دیے۔ سلیمان کہتا رہ گیا کہ سردار ہارون نے ان لوگوں کو خرید لیا ہے اسی لیے یہ میرے خلاف ہوگئے ہیں لیکن حجاج کی شعلہ باز نگاہوں نے اس کا خون خشک کر دیا۔

"سلیمان! تمہارے خلاف جرم ثابت ہوگیا ہے لہٰذا اب تم میرے پہلو میں بیٹھنے کے لائق نہیں رہے۔ ایک مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں سزا تجویز کروں۔"

سلیمان کو تاب انکار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور خریم بن عمر کے پہلو میں کھڑا ہوگیا۔

"خریم بن عمر!" حجاج کی آواز میں نرمی کے باوجود کڑک تھی۔ "اپنی جھکی ہوئی گردن سیدھی کر۔ اپنی جگہ سے جنبش کر اور میرے پہلو میں اس نشست پر آ کر بیٹھ جہاں سلیمان بیٹھا تھا۔ تیری بہادری اور بے گناہی کا تقاضا ہے کہ میں تیرے لیے کسی عہدے کا انتخاب کروں۔"

خریم بن عمر نے گردن سیدھی کی۔ ایک نظر سلیمان کی طرف دیکھا اور جھجکتے ہوئے اس نشست پر بیٹھ گیا جہاں سے سلیمان اٹھا تھا۔

جب خریم بن عمر بیٹھ چکا تو حجاج نے سلیمان سے خطاب کیا۔

"سلیمان! یہ تیری دوسری غلطی ہے۔ پہلی غلطی تُو نے اس وقت کی تھی جب سعید بن اسلم کلابی کو میں نے مکران کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس وقت بھی تُو نے اس کے خلاف ایک سازش کی تھی۔ میں نے تجھے معاف کر دیا تھا۔ تیری دوسری غلطی پر بھی میں تجھے معاف کرتا ہوں لیکن یاد رکھ آئندہ تجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا تو میں تیری گردن کاٹ دوں گا۔ اب تو جا سکتا ہے۔"

حجاج کسی کو معاف کر دے یہ اس کی خوش قسمتی ہی کہلائی جا سکتی تھی۔ سلیمان کو معافی مل گئی تھی یہی اس کے لیے غنیمت تھا۔ اس سے پہلے کہ حجاج کی نیت بدل جائے اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا۔ وہ فی الفور کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی حجاج نے ایک مرتبہ پھر خریم بن عمر کو مخاطب کیا۔

"خدا نے تجھے ایک خاص مقصد کے تحت میرے پاس بھیجا ہے۔ میں مجاعہ تمیمی کو مکران کی طرف روانہ کرنے والا تھا تاکہ یہ وہاں سعید بن اسلم کلابی کا نائب بن کر رہے۔ مجھے ایک ایسے شخص کا نام تجویز کرنا تھا جو مجاعہ کے ساتھ جائے اور وہاں لشکر کی نمائندگی کے فرائض انجام دے۔ اب میں تمہارا نام تجویز کرتا ہوں۔ میں تمہیں مکران میں اپنے لشکریوں کا سالار مقرر کر چکا ہوں۔ کیا تم اس عہدے کو قبول کرتے ہو؟"

خریم بن عمر نے اثبات میں گردن ہلا دی اور کچھ دیر توقف کے بعد زبان سے بھی اقرار کیا۔

"میں تمہیں کرمان اور مکران کے تھوڑے سے حالات بتا دوں جو تمہاری راہنمائی کریں گے، باقی حالات وہاں جا کر تمہیں خود معلوم ہو جائیں گے۔"

"میں تم پر واضح کر دوں کہ سندھ کا علاقہ عراق سے نزدیک تر ہے اور ایرانی سرحد سندھ سے ملتی ہے۔ سندھ میں ایرانیوں کی کثرت ہے کیونکہ جس زمانے میں ایرانیوں اور مسلمانوں کی جنگیں ہو رہی تھیں اور اسلامی فتوحات بڑھ رہی تھیں تو فتنہ پرور ایرانی، سندھ جا کر پناہ لیتے تھے۔ وقت آگے بڑھا تو حالات مزید تبدیل ہوئے۔ سندھ کے موجودہ راجا داہر نے کوشش کی کہ ایرانی سلطنت کسی طرح قائم رہے۔ وہ مسلمانوں اور ایرانیوں کے مختلف معرکوں میں ایرانیوں کی مدد بھی کرتا رہا لیکن جب ایران کی سلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو راجا نے سرحدی ایرانی صوبوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور ایرانیوں نے بھی کرمان اور بلوچستان کے صوبوں کو سندھ کے راجا کے سپرد کر دیا تاکہ مسلمان ان پر قبضہ نہ کر سکیں۔

"اب جو تم مکران جا رہے ہو تو جان رکھو کہ وہاں تمہیں تین قوتوں کا سامنا ہوگا۔ ایک باغی ایرانی۔ دوسرے بحری قزاق ہیں جو مکران سے کاٹھیاوار کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ تیسری بڑی قوت جو مکران اور کرمان میں مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے وہ سندھ کا راجا داہر ہے۔ اس نے بے شمار مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔

"ان مسلمانوں کی راجا داہر سے ملنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب اسلم کلابی مکران کا حاکم بن کر گیا تو وہاں ایک مسلمان شخص الہامی نامی نے خوب طاقت پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے کلابی کو اس شخص کے نام ایک خط دیا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ غیر مسلم قوتوں کے خلاف سعید کی مدد کرے لیکن اس نے میرے حکم کی پروا نہیں کی اور اس نے کسی بھی طور تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ تب سعید نے پہلے اس شخص کو قید کیا اور سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ پھر بھی باز نہیں آیا تو اس نے الہامی کو قتل کرا دیا اور سر میری طرف بھیجا۔

"مرنے والا یہ شخص سلیمان کے قبیلے علاف کا رشتہ دار یا جاننے والا تھا۔ مکران میں قبیلہ علاف کے ہزاروں آدمی آباد تھے۔ اس قتل کے بعد علافیوں کا سردار بغاوت پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے دو بیٹے معاویہ اور محمد اپنے ہزاروں

ساتھیوں کو لے کر راجا داہر کی طرف چلے گئے۔ راجا داہر نے ان باغیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہیں اپنی سرحد پر آباد کیا۔ ان لوگوں نے چھاپا مار کارروائیاں شروع کی ہوئی ہیں۔ ان دنوں ہی وہ سعید بن اسلم کلابی کے خلاف حرکت میں آئے ہوئے ہیں۔ میں ان کی سرکوبی کے لیے ہی مجاعہ تمیمی کو بھیج رہا ہوں اور تم اس کے ساتھ جاؤ گے۔''

دو دن قیام کرنے کے بعد خریم بن عمر، مجاعہ تمیمی کے ساتھ مکران کی طرف کوچ کر گیا۔

❁❁❁

''خریم بن عمر اور مجاعہ تمیمی اپنے چند محافظوں کے ساتھ مکران میں داخل ہوئے اور سعید کلابی کی حویلی تک پہنچ گئے۔ سعید کلابی کو جب ان کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے حویلی سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا اور حویلی میں لے جا کر ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا۔

''مجھے آپ لوگوں کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ مجاعہ کو میرا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے اور تمہاری بہادری کا کارنامہ بھی میرے علم میں آچکا ہے۔'' اسلم کلابی نے خریم بن عمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے، یہ سب معلومات ہم سے پہلے ہی آپ تک پہنچ چکی ہیں۔''

''امیر حجاج نے ڈاک کا نظام بہت عمدہ کر دیا ہے۔ اب یہاں سے کوفہ زیادہ دور نہیں رہا۔ اب تم دونوں میرے شریک کار ہو اس لیے مناسب ہے کہ تمہیں یہاں کے حالات سے باخبر کر دوں تاکہ تمہیں نظم و نسق چلانے میں آسانی ہو۔''

اسلم کلابی یہاں کے حالات بتانے لگا۔

❁❁❁

وہ ایک سیاہ دن تھا جب سعید بن اسلم کلابی مکران کے نواحی علاقوں سے خراج وصول کرنے نکلا تھا۔ حارث علافی کے بیٹے معاویہ اور محمد اپنے مخبروں کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے تھے۔ وہ دریائے دشت کے اس پار رک گئے۔ جونہی سعید بن اسلم اپنے دستے کے ساتھ وہاں سے گزرا معاویہ اور محمد کے لشکر نے اس پر حملہ کر دیا۔ سعید کا چھوٹا سا دستہ زیادہ دیر تک اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ دشمن نے دستے کا صفایا کر دیا۔ سعید بن اسلم کلابی بھی مارا گیا پھر انہوں نے اس لشکر کو بھی ساتھ لیا جو راجا داہر نے انہیں مہیا کیا تھا اور مکران کے اندرونی علاقوں کا رخ کیا۔ جو چیز راستے میں آئی اسے تباہ کرتے چلے گئے۔

ان لوگوں کو ابھی یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ سعید کلابی کا نائب عراق سے مکران آچکا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور شخص (خریم) بھی ہے۔ وہ تو یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ سعید کے بعد اب کوئی ایسا نہیں جو ان کا راستہ روکے۔ انہیں تو ہوش اس وقت آیا جب انہیں مسلمانوں کے لشکر کی پیش قدمی کی خبریں ملیں۔ معاویہ اور محمد کے لشکر نے دریائے دشت کے بائیں کنارے پر پڑاؤ کر لیا۔

خریم اپنے لشکر کے ساتھ دوسرے کنارے پر تھا۔

اس نے دریا عبور کیا۔

صحرائے مکران میں دونوں لشکر ٹکرائے۔

❁❁❁

عبدالملک نے اپنی رعایا سے یکے بعد دیگرے اپنے بیٹے ولید اور سلیمان کی ولی عہدی کی بیعت لی۔ عبدالملک کا بھائی عبدالعزیز بھی جانشینی کا دعویدار تھا۔ اس نے اس نامزدگی کو مسترد کر دیا۔ یہ جھگڑا ممکن ہے بڑھ جاتا لیکن عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا اور ولی عہد کا یہ جھگڑا ابھی ختم ہوا۔

کچھ عرصے بعد ہی عبدالملک بھی اچانک بیمار پڑ گیا۔ طبیبوں نے بہت علاج کیا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اس کی وصیت کے مطابق ولید بن عبدالملک کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ دوسرے بیٹے سلیمان بن عبدالملک کو فلسطین کی ولایت مل گئی۔

یزید بن مہلب ابھی تک حجاج کی قید میں تھا۔ اس کا بھائی مفضل بھی اس کی قید میں تھا۔ حجاج ان دونوں بھائیوں کی اس حد تک نگرانی کر رہا تھا کہ کسی مہم پر جاتا تو انہیں اپنے ساتھ لے کر جاتا۔

علاقہ فارس پر کردوں نے لوٹ مار اور غارت گری کر رکھی تھی۔ ان کی سرکوبی کے لیے ایک مہم بھیجنے کے لیے حجاج کوفے سے استقباز آیا تو یزید اور اس کے بھائی کو بھی قید سے نکال کر اپنے ساتھ لے آیا۔ انہیں لشکر گاہ میں رکھا اور ان کے چاروں طرف خندق کھدوا دی تاکہ یہ بھاگ نہ جائیں اور اپنے حجرے کے قریب ہی ایک چھوٹے سے خیمے میں انہیں قید کر دیا اور ان پر شامیوں کا پہرا بٹھا دیا۔

یزید بن مہلب مسلسل اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح جیل سے فرار ہوجائے۔ استقباز آ کر اسے یہ موقع مل گیا۔ ایک مرتبہ یزید نے اپنے محافظوں کی دعوت کی اور خوب شراب پلا دی۔ یہ لوگ نشے میں دھت ہو کر مے نوشی کے مزے اڑاتے رہے۔ یزید نے اپنے باورچی کے کپڑے پہنے۔ اپنی ڈاڑھی پر ایک سفید ڈاڑھی لگائی اور قید خانے سے نکلا۔ کسی نے کہا بھی کہ یہ تو یزید کی چال لگتی ہے لیکن

جونہی سفید ڈاڑھی پر نظر پڑی سمجھے کوئی اور ہے۔ یزید کی ڈاڑھی تو کالی تھی۔

مفضل بھی اس کے بعد ہی نکل آیا۔ اسے بھی کوئی نہ پہچان سکا۔ یہ دونوں دریا پر پہنچے اور کشتی میں بیٹھ گئے۔ بصرہ تک کا فاصلہ اٹھارہ فرسخ سے زیادہ تھا۔ رات بھر چلتے رہے۔

اس رات کی صبح ہوئی تو پہرے داروں کو ان کے فرار کا علم ہوا۔ جب حجاج تک یہ بات پہنچی تو اس کی پریشانی لازمی تھی۔ اس نے فوراً کاتب کو بلوایا اور قتیبہ بن مسلم والیِ خراسان کے نام خط لکھوانے لگا۔

''یزید بن مہلب میری قید سے فرار ہو گیا ہے۔ وہ یقیناً خراسان کی طرف بھاگا ہوگا اور خراسان کی ولایت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لہٰذا تم اس سے مقابلے کے لیے تیار رہو۔''

حجاج نے دوسرے اضلاع اور قلعہ داروں کو ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے احکام جاری کر دیے۔ ہر طرف ہرکارے دوڑا دیے کہ وہ جہاں کہیں نظر آئیں، انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ ولید کی طرف بھی ہرکارے دوڑا دیے کہ وہ اسے یزید کے فرار کی اطلاع پہنچا دیں۔

زنداں سے فرار ہونے کے بعد یزید اور اس کے بھائی کچھ دور تک کشتیوں میں گئے اور پھر خچروں پر سوار ہو کر شام کی جانب دوڑ گئے۔

ایک شخص نے حجاج کو اطلاع کی، اس نے انہیں فلسطین کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ حجاج نے ان کے پیچھے دستے روانہ کیے تاہم وہ فلسطین پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور سلیمان بن عبدالملک کے پاس پہنچ کر اس سے پناہ حاصل کر لی۔

حجاج نے ولید بن عبدالملک سے شکایت کی۔

''مہلب کے بیٹوں نے اللہ کے مال میں خیانت کی ہے اور مجھ سے بھاگ کر سلیمان کے پاس پناہ لی ہے۔ ان کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے۔''

ولید نے اپنے بھائی سلیمان کو لکھا۔

''یزید نے تیرے پاس آکر پناہ لی ہے۔ اس پر حجاج کے تیس لاکھ درہم واجب الادا ہیں اس لیے تم اسے حکومت کے حوالے کر دو۔''

سلیمان نے اس خط کے جواب میں لکھا۔

''اے امیر المومنین! میں نے یزید اور مفضل کو پناہ دی ہے۔ اب میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں اسے آپ کے حوالے کر دوں۔ اس کے ذمے جو رقم ہے میں وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر پھر بھی آپ کا اصرار ہوا تو یزید کو تنہا نہیں بھیجوں گا میں خود بھی اس کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ مجھے امید ہے آپ مجھے رسوا نہیں کریں گے۔''

ولید نے صاف لکھ دیا۔

''اگر تم ان کے ساتھ آؤ گے تو بھی انہیں معاف نہیں کروں گا۔''

سلیمان عبدالملک اب مزید اصرار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یزید اور اس کے بھائی کے گلے میں طوق ڈال کر اپنے بیٹے ایوب کے ہمراہ اس حالت میں بھیجا کہ ایوب کے گلے میں بھی طوق ڈال دیا تاکہ ولید اپنے بھتیجے کے گلے میں طوق دیکھ کر پگھل جائے۔

ولید نے جب اپنے بھتیجے کو اس حالت میں دیکھا تو بڑھ کر گلے لگا لیا۔

''تم نے کیا قصور کیا تھا جو اس حالت میں آئے؟''

''ابا حضور کا یہی حکم تھا۔''

''میرے بھائی سلیمان نے انتہا کر دی۔''

''ابا حضور نے یہ خط آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔'' ولید نے وہ خط پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''اے امیر المومنین! میں آپ پر قربان ہو جاؤں کہ آپ اس عہد کی حفاظت کریں گے جو میرے باپ نے یزید بن مہلب سے کیا تھا اور آپ اس شخص کی امیدوں کو خاک میں نہ ملائیں گے۔ اس نے صرف ہمارے اور آپ کے تعلقات ہی کی وجہ سے ہماری پناہ لی ہے۔

''اس نے اور اس کے باپ نے اور اس کے تمام خاندان نے اسلام کی خدمت میں وہ کام انجام دیے ہیں جنہیں سب جانتے ہیں۔ میں نے اسے آپ کی خدمت میں بھیج دیا ہے کہ جو وعدۂ امان میں نے اپنے سر لیا ہے اسے توڑ ڈالیں اور مجھے اس طرح سخت رنج پہنچائیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ ہرگز تعلقات منقطع نہ کریں۔

''میرے حقوق کی عزت کرنا چاہتے ہیں تو میری طرف سے یزید کو معاف کر دیجیے اور جو کچھ اس پر مطالبہ ہے میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

خط پڑھنے کے بعد ولید کا دل پگھل گیا۔ اس نے یزید اور اپنے بھتیجے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں نے یزید کو معاف کیا اور اس کی بیڑیاں کھولنے کا حکم دیتا ہوں۔''

اس کے حکم کے مطابق یزید اور اس کے بھائی کو سلیمان کے پاس واپس بھجوا دیا۔

حجاج کو لکھا۔

''چونکہ یزید اور اس کے خاندان والے سلیمان کے پاس ہیں اس لیے میں ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا اور تم بھی ان کو چھوڑ دو۔ آئندہ ان کے بارے میں کوئی خط نہ لکھنا۔''

حجاج بھی خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

❁❁❁

مکران میں مجاعہ تمیمی اسلامی فتوحات کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ باغیوں کی سرکوبی کر رہا تھا۔ اس نے اس فتح یابی کی رو میں بلادِ سندھ پر بھی تخت و تاراج شروع کر دی۔ ہر طرف لوٹ مار کی۔ قنذابیل کے قبائل پر فتح یاب ہوا۔ ایک سال کی قلیل مدت میں اس نے باغیوں کو کچل کر رکھ دیا تھا لیکن اس سے زیادہ اسے موقع نہیں ملا۔ فرشتۂ اجل آن پہنچا۔ وہ پیوندِ خاک ہو گیا۔

حجاج بن یوسف اس وقت اپنی رہائش گاہ کے ایک کمرے میں بیٹھا ملک کے مختلف حصوں سے آئی ہوئی ڈاک کو دیکھ رہا تھا۔ خریم بن عمر کی بستی کا سردار محمد بن ہارون نمری (عبدالحلیم شرر نے اس کا نام محمد بن ہراون لکھا ہے) بھی بیٹھا تھا کہ حجاج کو مکران کے قاصد کی آمد کی اطلاع دی گئی۔

''اے آنے والے قاصد! میرے لیے اچھی خبر ہے یا بُری؟''

''امیر محترم گورنر مکران مجاعہ تمیمی اللہ کو پیارے ہو گئے۔''

''کسی دشمن کی تلوار قصوروار ہے؟''

''نہیں۔ وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے۔''

حجاج نے گردن جھکا لی۔ مجاعہ کی موت کا اسے شدید صدمہ ہوا تھا جو اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔ اس نے کئی مرتبہ ابنِ ہارون کی طرف گردن اٹھا اٹھا کر دیکھا اور پھر گردن جھکا لی۔ ابنِ ہارون، مجاعہ کے اوصاف بیان کر رہا تھا کہ حجاج کو تعزیت کا یہی انداز پسند تھا۔

حجاج کے سفید چہرے پر اچانک شادابی سی آ گئی۔

''ابنِ ہارون! میں نے تمہارے متعلق ایک بڑا فیصلہ کیا ہے۔''

''غلام حاضر ہے۔''

''مجاعہ تمیمی کی جگہ تم لے سکتے ہو۔ اس وقت مکران کو والی کی اشد ضرورت ہے۔ ابنِ ہارون میں تمہیں مکران کا والی مقرر کرتا ہوں۔ وہاں خریم بن عمر بھی موجود ہے۔ تم دونوں مل کر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہو۔''

''امیر محترم! میں اس قابل کہاں کہ آپ کی حکم عدولی کروں۔ میں مکران کے والی کی حیثیت سے مکران جانے کو تیار ہوں۔''

وہ اپنی بستی سے مکران کی طرف روانہ ہو گیا۔

حجاج نے محمد بن ہارون کو ہدایت کی تھی کہ جہاں تک اس کے امکان میں ہو، علافی خاندان والوں کو ماخوذ کرے اور اس کی جستجو میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کرے تاکہ سعید کلابی کے خون کا پورا پورا انتقام ہو جائے۔

ابنِ ہارون نے ایک علافی شخص کو پکڑا جو خلیفہ کے حکم سے قتل کیا گیا اور اس کا سر حجاج کے پاس روانہ کیا۔

ابنِ ہارون پانچ برس تک جنگلوں اور وادیوں کو فتح اور مغلوب کرنے میں مشغول رہا۔

ولید بن عبدالملک کی فتوحات نے اسلامی حکومت کی دھاک دور دور تک بٹھا دی تھی۔ اس وقت کے فرماں روا اور شاہانِ وقت خلیفہ سے دوستی کی تمنا رکھتے تھے۔ سراندیپ کے راجا کی بھی خواہش تھی کہ وہ ولید سے دوستانہ تعلقات استوار کرے۔ اس کی قلم رو میں عربی تاجروں کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ اکثر مسلمان تاجر مع اہل و عیال وہاں سکونت پذیر تھے۔ کچھ تاجر اس کے علاقے میں پیوندِ خاک ہوئے جن کی یتیم لڑکیاں بے ولی وارث وہاں پڑی تھیں۔ راجا کو حجاج کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کا عمدہ موقع ملا۔ اس نے ان لڑکیوں کو عزت سے سوار کر کے کوفے کی طرف روانہ کیا۔ حجاج کے لیے انواع و اقسام کے موتی، جواہر، کنیزیں اور غلام بھی ان کے ساتھ کر دیے۔ یہ آٹھ جہاز تھے جو مال و دولت اور عورتوں سے لدے ہوئے تھے۔

جہاز ان دنوں طوفان وغیرہ کے خوف سے کنارے کنارے خشکی سے ملے ہوئے جایا کرتے تھے۔ یہ جہاز بھی کچھوے کی چال سے چلتے ہوئے کنارے کنارے رواں دواں تھے۔ جب یہ جہاز ساحل سندھ پر پہنچے تو بحری قزاقوں نے جو ''مید'' کہلاتے تھے، چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر ان جہازوں کو گھیر لیا۔ تمام مال و اسباب لوٹ لیا اور عورتوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

ان میں سے ایک عورت نہایت جفاکش اور مضبوط تھی۔ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا جا رہا تھا لیکن وہ کسی صورت ان لٹیروں کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔ بالآخر جب وہ مجبور ہو گئی تو اس نے نہایت دردناک آواز میں صدا بلند کی۔

''یا حجاج، یا حجاج اغثنی'' (اے حجاج، اے حجاج، میری مدد کو پہنچ)۔

اس آواز میں ایسا درد تھا کہ حجاج بھی تڑپ اٹھا۔ یہ آواز کوفہ تک پہنچی۔

اس جہاز پر کچھ حاجی بھی سوار تھے۔ وہ اپنی جان بچا کر جھاڑیوں میں چھپ گئے اور بعد میں ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی طرح بچتے بچاتے مکران کے ساحل پر پہنچے پھر وہاں سے خشکی کے راستے جنگلات، میدانوں اور دشوار گزار پہاڑی سلسلوں کو عبور کرتے ہوئے شیراز پہنچ گئے۔ یہاں چند روز قیام کرنے کے بعد بصرہ پہنچ گئے، یہاں آ کر معلوم ہوا کہ حجاج بن یوسف بصرہ میں قیام پذیر ہے۔ یہ لٹے پٹے مسافر حجاج کے دربار میں باریاب ہوئے۔ ان لوگوں نے رو رو کر اپنی بپتا سنائی۔ جب وہ اپنی سرگزشت کے اس مقام پر پہنچے جہاں ایک عورت حجاج کو مدد کے لیے پکار رہی تھی تو حجاج کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''لبیک یا بنتِ قوم لبیک۔'' اس فقرے کو اس نے تین مرتبہ دہرایا اور جوشِ غضب سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے ابھی جانے کے لیے تیار ہو۔ پھر وہ کسی خیال سے بیٹھ گیا۔ حاجیوں کو مہمان خانے میں ٹھہرایا اور کاتب کو طلب کر کے راجا داہر کے نام خط لکھوانے لگا۔

''ہمارے ملک کے لوگ جو تمہارے علاقے میں قید کر لیے گئے ہیں ان کو باعزت طریقے سے واپس کرو اور مال و اسباب کا جو کچھ نقصان ہوا ہے اس کا تاوان ادا کرو۔''

دوسرا خط ابنِ ہارون کے نام لکھوایا۔

''میں ایک خط داہر کے نام اپنے خصوصی قاصد کے ذریعے بھیج رہا ہوں۔ جب یہ قاصد تمہارے پاس پہنچے، تم اپنے کسی معتبر افسر کو اس قاصد کے ساتھ داہر کے پاس بھیجو جو اس سے کہے کہ وہ ان تحائف کو جو خلیفہ کے لیے لنکا کے راجا نے بھیجے تھے، واپس کرے اور بیواؤں، یتیموں اور حاجیوں کو آزاد کر دے جنہیں دیبل کی بندرگاہ پر قید کر لیا گیا ہے۔''

راجا داہر کے نام خط جس قدر معقول انداز میں لکھا گیا تھا، اس کا جواب بھی اسی قدر معقول ہونا چاہیے تھا لیکن راجا داہر نے خط کا جواب نہایت بے پروائی اور فریب سے دیا اور لکھا۔ ''یہ کام بحری قزاقوں کا ہے جن پر میرا کوئی زور نہیں۔ مجھ سے آپ کوئی امید نہ رکھیں۔ یہ قوم اتنی طاقتور ہے کہ آپ بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

خط کے مفہوم سے ظاہر ہو رہا تھا کہ داہر بھی اس لوٹ مار میں برابر کا شریک ہے۔

حجاج کے غصے کی انتہا نہیں رہی۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی لشکر لے کر جائے اور سندھ کی زمین تہس نہس کر کے رکھ دے لیکن اتنی بڑی مہم خلیفہ کی اجازت کے بغیر سر نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے تمام حالات لکھ کر ولید کے پاس بھیجے اور سندھ پر حملے کی اجازت طلب کی لیکن ولید نے اس کی اجازت نہیں دی اور جواب دیا کہ یہ مہم بہت بڑی ہے۔ مصارف بہت زیادہ ہوں گے اور میں مسلمانوں کی جانیں خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

حجاج کو مایوسی تو ہوئی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جوشِ غضب تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اجازت کے بغیر ہی سندھ کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جائے۔ اس نے دوسری عرضی پھر بھیجی۔

''میرا خیال ہے کہ امیر المومنین نے کثیر اخراجات کی وجہ سے سندھ پر حملے کی اجازت نہیں دی لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مہم پر جو رقم شاہی خزانے سے خرچ ہو گی، میں اس کی دگنی رقم شاہی خزانے میں داخل کروں گا۔''

یہ عرضی ایک ایسے آدمی کے ہاتھ بھیجی جو نہایت... بے باک، شوخ اور بلا کا خوشامدی تھا۔ مطلب نکلوانا اور باتیں بنانا خوب جانتا تھا۔

یہ آدمی اس وقت دمشق پہنچا جب خلیفہ اپنی فوج کے حلقے میں گھوڑے پر سوار تھا۔ اس آدمی نے آگے بڑھ کر رکاب پکڑ لی اور عرضی پیش کر کے جواب کی درخواست کی۔ اپنی جانب سے بھی کچھ ایسی باتیں کیں کہ ولید کا دل پگھل گیا۔

ولید نے یہ سوچ کر کہ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، حجاج کو سندھ پر حملے کی اجازت دے دی۔ شاہی فرمان جاری کیا۔

''بعد حمد و صلوٰۃ کے واضح ہو کہ تمہارا عریضہ پہنچا۔ سراندیپ کے قید ہو جانے والے مسلمانوں کی خبر سن کر سخت مضطرب ہوں، تم کو اجازت دی جاتی ہے کہ تم فوراً سندھ پر لشکر کشی کر دو لیکن سندھ بہت دور ہے لہٰذا معمولی مہم نہ بھیجی جائے اور نہ ہی معمولی لوگوں کو بھرتی کیا جائے بلکہ تجربہ کار اور پُرجوش مجاہدین کو بھیجا جائے۔

''اگرچہ میں اور دمشق کے لوگ مجاہدین سے دور ہوں گے مگر ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہوں گی۔ آج سے یہ حکم دے دیا گیا ہے کہ ہر مسجد میں مسلمانوں کی عافیت اور فتح یابی کی دعا کی جائے۔''

ولید بن عبدالملک کی اجازت ملتے ہی حجاج نے عبداللہ بن نبہان کی سپاہ سالاری میں ایک لشکر دیبل کی طرف روانہ کیا۔ عبداللہ بن نبہان اور راجا داہر کے لشکر کے

درمیان خوفناک جنگ ہوئی۔ عبداللہ اس قدر جوشیلا تھا کہ اس نے فوج سے کام لینے کی جگہ خود اپنی شجاعت سے اس قدر کام لیا کہ عین معرکۂ جنگ میں شہید ہوگیا۔

مسلمان اپنا مقصد حاصل نہ کرسکے۔

اس مہم کی ناکامی کے بعد حجاج نے بدیل بن طہفہ کی سرکردگی میں فوج کو دیبل پہنچنے کا حکم دیا جو اس وقت عمان میں تھا۔ مکران کے والی ابنِ ہارون کے نام بھی فرمان جاری کیا کہ جیسے ہی بدیل پہنچے اس کی امداد کے لیے فوراً تین ہزار لشکر کا انتظام کرو۔

بدیل حجاج کا حکم ملتے ہی تین سو سپاہیوں کے ساتھ مکران پہنچے اور ابنِ ہارون سے تین ہزار جنگجو لے کر دیبل کی طرف روانہ ہوئے۔

دیبل میں جو فوج تھی اس نے فوراً راجا داہر کے پاس آدمی دوڑائے جو اس وقت اروڑ (دارالخلافہ) میں تھا، داہر نے جیسے ہی قاصد کی زبانی مسلمانوں کی آمد کی خبر سنی اپنے لڑکے جیسیہ کو طلب کیا۔

''مسلمان کتنے لشکر کے ساتھ آئے ہیں؟'' داہر نے قاصد سے پوچھا۔

''تین ہزار کا لشکر ہے۔''

''دیبل میں اس وقت کتنی حفاظتی فوج ہے؟''

''چند سو سے زیادہ نہیں۔''

''کیا وہ ہمارے پہنچنے تک مقابلہ کرسکیں گے؟''

''مسلمانوں کو دیبل تک پہنچنے میں ایک دن لگے گا۔ یہی ہمارے مخبروں کی اطلاع ہے۔''

داہر نے اپنے لڑکے جیسیہ کو چار ہزار سواروں کے ساتھ جو گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار تھے دیبل روانہ کیا۔

جیسیہ کی آمد سے قبل ہی بدیل اپنے لشکر کے ساتھ دیبل پہنچ گئے۔ دیبل کے نواح میں ان کا ٹکراؤ دیبل کی حفاظتی فوج سے ہوا۔ بدیل نے دیبل کے سپاہ سالار کو بدترین شکست دی اور وہ شکست کھا کر شہر میں محصور ہوگیا۔

اتنی دیر میں راجا داہر کا بیٹا اپنے لشکر کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ دیبل میں جو لشکر محصور تھا وہ بھی نکل آیا۔ دونوں مل کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مرتبہ پھر گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔

طرفین بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے کہ اچانک بدیل کا گھوڑا ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکا اور بدیل گھوڑے سے زمین پر گر پڑے۔ داہر کے لشکری دوڑ پڑے اور انہوں نے بدیل کو قتل کردیا۔

حجاج کے لیے یہ بڑا صدمہ تھا کہ بدیل جیسا بہادر سپاہ سالار اس کے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ اس کے بہادرانہ کارناموں کی تفصیل اس تک پہنچ چکی تھی۔ اب اس پر فرض ہوگیا تھا کہ وہ اس کا انتقام لے۔ وہ اپنے درباریوں کے سامنے اکثر اظہار کیا کرتا تھا کہ مجھے بدیل جیسے سپاہ سالار کی شہادت کا بے حد غم ہے۔ ہر لمحہ اس کے انتقام کی آوازیں میرے دل کے کانوں میں آتی رہتی ہیں اور میں انہیں جواب دیتا رہتا ہوں کہ خدا کی قسم عراق کی جو دولت میرے قبضے میں ہے، میں اسے اس مہم پر خرچ کرنے کے لیے پورے طور پر تیار ہوں۔ بدیل کے انتقام کا شعلہ کبھی نہیں بجھے گا جب تک میں اس کا بدلہ نہ لے لوں۔

اس نے موذن سے کہہ دیا تھا کہ جب تم اذان دو تو ہر اذان کے بعد مجھے بدیل کا نام یاد دلا دیا کرو تاکہ میں اس کے لیے اس وقت تک دعا کرتا رہوں جب تک اس کا بدلہ نہ لے لوں۔

❁❁❁

مسلمان ایک نہیں دو مرتبہ شکست سے دوچار ہوچکے تھے لیکن ان کی دھاک کم نہیں ہوئی تھی۔ سندھ کے راجاؤں پر اب بھی مسلمانوں کی ہیبت طاری تھی۔ خاص طور پر نیرون کا راجا سندرداس بڑا فکرمند تھا۔ بدیل کی شہادت کے بعد اس کی فکر میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مسلمان اس کا انتقام ضرور لیں گے لہٰذا اس نے مشیروں کو طلب کرکے مشورہ کیا۔

''تم دیکھ رہے ہو کہ مسلمانوں کا سپاہ سالار بدیل راجا داہر کے سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ مسلمان اس قتل کا بدلہ ضرور لیں گے۔ میری معلومات کے مطابق حجاج بڑے پیمانے پر تیاری کررہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس مرتبہ وہ خود آئے۔ آپ لوگوں سے مشورہ یہ کرنا تھا کہ اگر اس وقت ان کی اطاعت قبول کرلی جائے تو ہمارا شہر بربادی سے محفوظ رہے گا۔''

یہ سندرداس کا بہترین فیصلہ تھا۔ اس کے مشیروں نے بھی اس کی تائید کی۔ سندرداس نے راجا داہر کو بتائے بغیر ایک وفد حجاج بن یوسف کے پاس بھیجا اور جزیہ قبول کرتے ہوئے امن کا طالب ہوا۔ حجاج نے اس وفد کا خیر مقدم کیا اور سندرداس کی عرض داشت قبول کرتے ہوئے کہا۔ ''جب ہم تمہاری سرزمینوں پر حملہ آور ہوں گے تو تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔''

بدیل کی شہادت کے بعد حجاج کو ایک ضد سی ہوگئی تھی کہ وہ سندھ پر ضرور قبضہ کرے گا۔ اس نے بڑی تیزی سے

لشکر جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ اسے دو مرتبہ کی ناکامیوں کے بعد یقین ہوگیا تھا کہ سندھ فتح کرنے کے لیے نہایت تربیت یافتہ لشکر کی ضرورت ہوگی۔ اس نے ایک خوب تربیت یافتہ لشکر کا انتخاب کیا۔ اس نے چھ ہزار دلیر اور بہادر شامی لشکر میں سے منتخب کیے اور بہ کثرت جوان مرد دوسرے لشکروں سے چنے، چھ ہزار تیز رفتار گھوڑے ان بہادروں کی سواری کے لیے منتخب کیے۔ اس کے علاوہ کئی ہزار اونٹ بوجھ اٹھانے کے لیے منتخب کیے۔

وہ برابر اس فکر میں تھا کہ اس لشکر کی سپاہ سالاری کس کے سپرد کی جائے۔ کئی لوگوں نے از خود اپنے نام پیش کیے لیکن وہ اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

❁❁❁

حجاج کے پاس اس وقت ایک خوبرو نوجوان بیٹھا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی، پیشانی کشادہ، چوڑی کلائیاں، ابھرا ہوا بدن، گلابی رنگ، سترہ سال سے کچھ زیادہ عمر ہوگی۔ حجاج اس نوجوان کی بہادری سے اس وقت واقف ہوا تھا جب اس نے علاقہ فارس میں کردوں کے خلاف شاندار کارنامہ انجام دیا تھا اور حجاج کے قدموں میں مالِ غنیمت کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ اس نوجوان کا نام محمد بن قاسم تھا۔ وہ حجاج کے چچا کا لڑکا تھا اور بعض روایات کے مطابق اس کا داماد بھی تھا۔

محمد بن قاسم بھی حجاج کی طرح طائف میں پیدا ہوا تھا۔ جب حجاج عراق کا گورنر مقرر ہوا تھا تو اس نے.... اپنے خاندان کے لوگوں کو عراق بلا کر مختلف عہدوں پر نامزد کردیا تھا۔ انہی میں محمد بن قاسم کے والد بھی تھے جنہیں حجاج نے بصرہ کا گورنر مقرر کیا تھا جو محمد بن قاسم کے بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے۔ محمد بن قاسم کی عمر پانچ سال تھی کہ اس کے اندر ذہانت کے جوہر دیکھ کر حجاج نے اسے بصرہ کے حربی اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے فوج میں اعلیٰ عہدہ حاصل کیا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں حجاج نے اسے کردوں کی بغاوت فرو کرنے کے لیے سپاہ سالار بنا کر ایران کی طرف بھیجا۔ اس نے کردوں کو شکست دی۔ اصطخر اور دوسرے علاقے فتح کرتے ہوئے جرجان کی طرف پیش قدمی کی اور شہر شیراز کی بنیاد ڈالی۔ سترہ سال کی عمر تھی کہ اسے شیراز کا گورنر مقرر کردیا۔

کردوں نے پھر سر اٹھایا تھا۔ حجاج نے محمد بن قاسم کو کوفہ طلب کیا تاکہ وہ اس نئی مہم کے لیے حجاج سے ہدایات حاصل کرلے۔

''بیٹے، تمہیں معلوم ہوگا کہ کردوں نے بغاوت کردی ہے اور اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے یہ ذمے داری میں تم پر ڈالتا ہوں، کیا تمہیں منظور ہے؟''

''اے امیر، اگر معمولی سے قاصد کے ذریعے بھی آپ مجھے حکم پہنچاتے تو میں جان کی بازی لگا دیتا۔ بہرحال میں اب بھی حاضر ہوں۔''

''بیٹے، یہ ایک مشکل مہم تھی۔ میں تمہیں وہاں بھیجنے سے پہلے ایک نظر تمہیں دیکھ لینا چاہتا تھا۔''

''آپ کی یہ محبت ہی مجھے دشمن پر غالب کرتی ہے۔''

''اب تم شیراز پہنچ کر ''رے'' پر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔''

اس کے چلے جانے کے بعد حجاج کچھ دیر کے لیے مطمئن ہوگیا کہ کردوں کا معاملہ تو حل ہوا لیکن سندھ کا معاملہ ابھی تک حل نہیں ہوا تھا۔ اسی وقت مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اذان ختم ہوئی تو موذن حاضرِ خدمت ہوا اور اسے بدیل بن طہفہ کا نام یاد دلایا۔ جس دن سے بدیل کی شہادت ہوئی تھی حجاج کے حکم کے مطابق موذن ہر اذان کے بعد حجاج کو بدیل کا نام یاد دلاتا تھا تاکہ وہ اس کے حق میں دعا کرے لیکن اس دن موذن اطلاع دینے کے بعد ٹھہرا رہا۔

''کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''جی امیر محترم۔''

''کہو کیا کہنا ہے؟''

''میرا یہ منصب تو نہیں لیکن پھر بھی قومی خدمت مجھے مجبور کررہی ہے کہ میں کچھ عرض کروں۔ محترم امیر ان دنوں پریشان ہیں کہ سندھ کی مہم پر کسے روانہ کیا جائے۔ میرے خیال میں تو یہ مہم محمد بن قاسم کے سپرد کی جائے۔ وہ جب یہاں تشریف لائے تھے تو میں یہی سمجھا تھا کہ آپ نے انہیں اسی مہم کے لیے طلب کیا ہے لیکن وہ تو واپس شیراز چلے گئے۔''

''تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ علاقہ ''رے'' میں کردوں کی بغاوت کچلنے کے لیے محمد بن قاسم ہی موزوں تھے۔ میں نے انہیں اس طرف روانہ کیا ہے۔''

''امیر کی جیسی مرضی۔''

موذن کے چلے جانے کے بعد حجاج نماز کی تیاری کرنے لگا۔

نماز ادا کرنے کے بعد اس نے بدیل کے لیے دعائے مغفرت کی اور اس کی روح سے عہد کیا کہ وہ اس کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے جلد لشکر بھیجے گا۔

اس دعا کے بعد اس کے کانوں میں موذن کے ا

گونجنے لگے۔ ’’سندھ کی مہم محمد بن قاسم کے سپرد کی جائے۔‘‘ وہ مصلے سے اٹھا اور اپنے بستر پر آ گیا۔ اسی وقت اس کا بیٹا عبداللہ حاضر ہوا۔

’’بیٹا عبداللہ، قتیبہ بن مسلم کی فتوحات کو میں بڑے شوق سے سن رہا ہوں لیکن سندھ کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں کسی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر ہو رہا ہوں۔ کسی نے مشورہ دیا ہے کہ محمد بن قاسم کو اس مہم پر روانہ کروں۔ تم کیا کہتے ہو؟‘‘

’’امیر محترم! محمد بن قاسم کی بہادری میں کوئی شک نہیں لیکن وہ ابھی نوعمر ہے۔ سندھ پر مہم کشی کے لیے نہایت تجربہ کار آدمی کی ضرورت ہے۔‘‘

’’کیا تم اس کی صلاحیتوں سے واقف نہیں؟‘‘

’’اگر امیر محترم فیصلہ کر چکے ہیں تو مجھے اس فیصلے سے اتفاق ہے۔‘‘

’’اب تم جاؤ۔ ہم تخلیہ چاہتے ہیں۔ کوئی ہمارے پاس نہ آئے۔‘‘

حجاج اس رات بڑی دیر تک جاگتا اور سوچتا رہا تھا۔ دوسرا دن بھی اس نے کسی فیصلے تک پہنچنے میں گزار دیا۔ وقت ہاتھ سے نکلے جا رہا تھا۔ وہ محمد بن قاسم کو ’’رے‘‘ کی طرف جانے کا حکم دے چکا تھا۔ وہ اگر کردوں سے مصروفِ جنگ ہو گیا تو پھر کچھ نہیں کیا جا سکے گا۔ اس سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ اس کی دور اندیش نگاہوں نے اسے قائل کر لیا کہ وہ محمد بن قاسم کو ’’رے‘‘ کے بجائے سندھ کی مہم پر بھیجے۔ اس نے فیصلہ کرتے ہی ایک تیز رفتار قاصد شیراز کی طرف بھیج دیا۔

محمد بن قاسم ابھی شیراز میں تھا اور ’’رے‘‘ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اچانک حجاج کا حکم اس تک پہنچا کہ تم ’’رے‘‘ کے بجائے سندھ جاؤ اور اس فوج کا انتظار کرو جو میں تمہارے لیے خشکی کی راہ سے بھیج رہا ہوں۔

اس حکم کے سنتے ہی اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور شیراز میں رہ کر فوج کا انتظار کرنے لگا۔

ایک طویل انتظار کے بعد حجاج کی طرف سے بھیجا ہوا لشکر شیراز پہنچ گیا۔ اس لشکر کے پہنچنے کے بعد محمد بن قاسم نے فارس سے خیمے اکھڑوائے اور مکران کی راہ لی۔

مکران کی سرحد پر ابنِ ہارون اور خریم بن عمر اسی لشکر کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ لشکر نے ایک بڑے میدان میں خیمے ڈالے اور محمد بن قاسم، ابنِ ہارون کے ساتھ اس کی حویلی میں آ گیا۔ ان کے ہمراہ محمد بن قاسم کے چیدہ چیدہ سالار بھی تھے۔

’’یہ میرا بہترین دوست جہم بن زحر ہے۔ بصرہ کے مکتب میں میرے ساتھ پڑھتا بھی رہا ہے۔ اس کے ساتھ ذکوان بن علوان ہے۔ تیسرے نمبر پر عطا بن ملاک قلبی ہے اور یہ صارم بن صارم ہے۔ یہ سب نایاب سالار ہیں۔ آنے والی جنگوں میں ان سے بڑی امیدیں ہیں۔‘‘

اپنے چند ساتھیوں کا تعارف کرانے کے بعد محمد بن قاسم خریم بن عمر سے مخاطب ہوا۔

’’ابن عمر! تم مکران میں لشکریوں کے سالارِ اعلیٰ ہو۔ اب جبکہ میں بھی ایک لشکر کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہوں تو تمہاری حیثیت پورے لشکر میں میرے نائب کی سی ہوگی۔ تم یہاں پہلے سے رہ رہے ہو لہٰذا میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ ہمیں کب اور کس سمت سے اپنے کام کی ابتدا کرنی چاہیے۔‘‘

خریم بن عمر نے اس شکر گزاری کے بعد کہ محمد بن قاسم نے اس پر اعتماد کیا، لب کشائی کی۔

’’یہاں سے نکل کر ہمیں قنز پور (پنجگور) کا رخ کرنا چاہیے۔ پنجگور میں شہر کی حفاظت کے لیے خاصا بڑا لشکر ہے۔ اس شہر پر قبضہ کرنے کے بعد مزید پیش قدمی کرتے ہوئے ہمیں ارمن بیلہ کا رخ کرنا ہوگا۔ ان دو شہروں پر قبضے کے بعد ہمیں دیبل کی طرف بڑھنا ہوگا۔ مکران کی حفاظت بھی ہمارے پیشِ نظر ہے لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ محمد بن ہارون نمری چند دستوں کے ساتھ مکران میں قیام کریں۔ باقی لشکر ہم اپنے ساتھ لے جائیں۔‘‘

ابنِ ہارون وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے خریم کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

’’فرزندِ من! مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں بذاتِ خود جنگوں میں حصہ لوں۔ میں مکران کے قیام سے اختلاف کرتا ہوں۔ مکران میں چند دستے کسی کماندار کی نگرانی میں چھوڑے جا سکتے ہیں۔ مکران کی حفاظت کے لیے یہی بہت ہے۔ مکران کو اب کسی طرف سے خطرہ نہیں۔‘‘

کسی کو اب کچھ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ محمد بن قاسم نے ابنِ ہارون کے جذبے کی تعریف کی۔

تجویز کے مطابق فوج کے چند دستوں کو مکران میں چھوڑا گیا اور دو روز بعد لشکر نے پوری تیاری کے ساتھ پنجگور کا رخ کیا۔

کئی مہینے کی نبرد آزمائی کے بعد یہ شہر فتح ہو گیا لیکن ابنِ ہارون کے اچانک بیمار پڑ جانے سے سب کو فکر ہوئی۔ سب نے اصرار کیا کہ وہ مکران لوٹ جائے۔ کچھ دن آرام

کرے۔ اگر طبیعت ٹھیک ہو جاتی ہے تو کسی مقام پر لشکر سے آ ملے لیکن وہ مجاہد جنگ میں شامل ہونے پر اصرار کرتا رہا لہٰذا اسی بیماری کی حالت میں اسے ساتھ لے کر محمد بن قاسم ارمن بیلہ کی طرف روانہ ہوا۔

یہ شہر کسی مزاحمت کے بغیر ہی فتح ہو گیا۔

ابنِ ہارون کی حالت بہت نازک ہو گئی تھی۔ لشکر میں جو طبیب تھے وہ برابر علاج میں مشغول تھے لیکن وہ اب اس قابل نہیں رہا تھا کہ لشکر کے ساتھ سفر کر سکے۔ محمد بن قاسم نے یہی فیصلہ کیا کہ کچھ دن ارمن بیلہ میں قیام کرے۔ اس طرح لشکر کو بھی آرام مل جائے گا اور ابنِ ہارون کی صحت یابی کا بھی موقع ملے گا۔

ابنِ ہارون کی حالت روز بروز مخدوش ہوتی جا رہی تھی۔ طبیبوں کی کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس نے ارمن بیلہ میں وفات پائی اور اسے وہیں دفن کر دیا گیا۔

حجاج بن یوسف سندھ کی لشکر کشی پر برابر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ قدم قدم پر محمد بن قاسم کی رہنمائی کر رہا تھا۔ محمد بن قاسم اس کی ہدایات کے مطابق ہی آگے بڑھ رہا تھا بلکہ وہ تو یہ کہتا تھا کہ یہ ہدایات اسی تواتر سے مل رہی ہیں جیسے حجاج خود یہاں موجود ہے۔ جب اس نے حجاج کو یہ بتایا کہ وہ ارمن بیلہ سے دیبل جائے گا تو حجاج کا خط اس تک پہنچا۔

’’جب تمہیں دیبل نظر آنے لگے تو تم اپنی قیام گاہوں کے متعلق بہت احتیاط کرنا۔ جہاں اترو، اپنی قیام گاہ کے گرد خندق کھود دو۔ رات کا زیادہ حصہ جاگتے رہو۔ جو لوگ قرآن پڑھ سکتے ہیں، وہ قرآن کی تلاوت کرتے رہیں۔ خدا کا ذکر ہر وقت زبان پر جاری رکھو۔

’’جب تم دیبل کے گرد و نواح میں پہنچو تو ایک خندق بارہ گز لمبی اور چھ گز گہری کھود دو۔ جب تم دشمن کے مقابل ہو تو خاموش رہو اور اس وقت تک مستقل جنگ شروع مت کرو جب تک میں تمہیں نہ لکھوں اور جو ہدایات میں تمہیں دوں اس پر حرف بہ حرف عمل کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو انشاء اللہ تمہاری کامیابی یقینی ہے۔‘‘

ارمن بیلہ میں ایک مہینے کے قیام کے بعد محمد بن قاسم نے خیمے اکھاڑے اور مسلسل کوچ کرتا چلا گیا یہاں تک کہ خاص دیبل کی دیواروں کے نیچے پہنچ کر دم لیا۔

دیبل مشہور و معروف شہروں میں تھا۔ مغربی ہند کا مرجع عام تھا اور اس کے عظیم الشان مندر کی نہایت وقعت مانی جاتی تھی۔ دور دور سے لوگ آ کر اس کے آگے سر جھکاتے تھے۔ اس مندر کی چوٹی سطحِ زمین سے چالیس گز اونچی تھی۔

خریم بن عمر اور محمد بن قاسم نے گھوم پھر کر دیکھا تو مندر کے اوپر ریشم کا ایک سرخ پرچم نظر آیا جو ایک لمبے بانس کے ساتھ باندھا گیا تھا۔

یہ جھنڈا ایسی حکمت سے بنایا گیا تھا کہ جب ہوا چلتی تو چاروں طرف گھومنے لگتا تھا۔ اس مندر میں سات سو خدام تھے جو دیوتاؤں کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

محمد بن قاسم جس روز دیبل کے سامنے خیمہ زن ہوا جمعے کا دن تھا اور خوش نصیبی سے اسی روز وہ جہاز بھی سمندر میں پہنچ گئے جو سامانِ جنگ سے لاد کر حجاج نے بھیجے تھے۔ ان جہازوں میں سامانِ رسد کے علاوہ قلعہ کشائی کے آلات اور منجنیقیں بھی تھیں جو بڑے بڑے عالی شان قلعوں کی دیواریں منہدم کرنے کے لیے کافی خیال کی جا سکتی تھیں۔

محمد بن قاسم جیسے ہی دیبل پہنچا دیبل کی فوجیں اس کی آمد کی خبر سن کر شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئیں۔ محمد بن قاسم نے ایک مرتبہ پھر حجاج بن یوسف کے اس خط کو نکالا جو اسے ارمن بیلہ کے قیام کے دوران ملا تھا۔ اس نے اس خط میں لکھی گئی ہدایات پر عمل کرنا شروع کیا۔ فوج کو حکم دیا کہ بارہ گز لمبی اور چھ گز گہری خندق کھودیں۔ خندق کی دوسری جانب خیمے گاڑنے کا حکم دیا۔ منجنیقیں سب طرف قائم کر دی گئیں۔ ایک طرف وہ عظیم الشان منجنیق نصب ہوئی جس کا نام عروس تھا اور جسے پانچ سو آدمی مل کر کھینچ سکتے تھے۔

خیمے نصب ہو گئے۔ مورچے قائم ہو گئے۔ گویا محاصرہ شروع ہو گیا۔

دیبل کے لشکری کبھی کبھی شہرِ پناہ سے نکل کر حملہ آور ہوتے اور پھر شہرِ پناہ کے دروازے بند کر لیتے لیکن چونکہ ابھی تک حجاج کی جانب سے جنگ کی اجازت نہیں ملی تھی اس لیے اسلامی لشکر ان حملوں کو برداشت کر رہا تھا اور کسی جوابی کارروائی سے گریزاں تھا۔

اسی کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا کہ آٹھویں دن حجاج کا حکم پہنچا کہ جنگ شروع کر دی جائے۔

محمد بن قاسم نے جنگ کا نقارہ بجا دیا۔ منجنیقیں حرکت میں آئیں اور شہرِ پناہ کی دیوار پر بڑے بڑے پتھر برسائے جانے لگے۔ کئی دن کی کوششوں کے بعد بھی دیوار میں شگاف نہ ڈالا جا سکا۔

اس دوران میں حجاج بن یوسف کی طرف سے ہدایات برابر مل رہی تھیں۔ ڈاک کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ ہر تیسرے روز ایک خط حجاج لکھتا تھا اور اسی طرح محمد بن

قاسم بھی مفصل حالات لکھ کر بھیجتا رہا۔ دیبل اور بصرہ میں ہزار ہا کوس کا فاصلہ ہونے کے باوجود ساتویں روز خط بصرہ سے دیبل اور دیبل سے بصرہ پہنچ جاتا تھا۔ حجاج کو اس لڑائی سے یہاں تک تعلق خاطر تھا کہ محمد بن قاسم کے خطوط کی بنا پر میدانِ جنگ کا جو نقشہ اس کے خیال میں قائم ہوتا تھا اس پر غور کرتا رہتا تھا۔ لڑائی نے جب طول کھینچا اور کئی مہینے ہوگئے تو حجاج نے اس خیالی نقشے کو پیشِ نظر رکھا اور سوچنے لگا کہ شہر والے کس طرح باہر نکلنے پر مجبور ہو سکتے ہیں۔ آخر خوب سوچ سمجھ کر اس نے محمد بن قاسم کو ہدایات تحریر کیں۔

''منجنیق کو مشرق کی طرف لے جا کے قائم کرو۔ ایک پایہ کم کر کے موجودہ حالت سے اس کا رخ نیچا کرو اور نشانہ انداز کو حکم دو کہ بت خانے کا مستطیل گنبد جس کا حال تم مجھے لکھ چکے ہو اس پر نشانہ بنا کر سنگ باری کریں۔''

حجاج نے یہ تدبیر محض اس خیال سے بتائی تھی کہ اگر بت خانہ منہدم ہوگیا تو اہلِ شہر مذہبی بے حرمتی سے جوش کھا کر باہر نکل پڑیں گے لیکن اس تدبیر نے مسلمانوں کو ایک اور ہی فائدہ پہنچایا۔ اہلِ دیبل کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ مندر نہ ڈھایا جائے گا اس وقت تک شہر فتح نہیں ہو سکتا اسی لیے اہلِ دیبل مطمئن تھے اور فوج شہر سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھی۔

محمد بن قاسم کے نشانہ بازوں نے حجاج کی ہدایت کے مطابق بت خانے پر پتھر برسائے جن کی ضربوں سے اس کی چوٹی ٹوٹ کر گر پڑی۔ اہلِ شہر نے جب یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر باہر نکل آئے۔ صرف باہر ہی نہیں نکلے بلکہ مایوسی کے ساتھ لڑے کیونکہ انہیں یقین ہوگیا کہ شکست یقینی ہے۔ مسلمان سپاہیوں نے باہر نکلتے ہی انہیں تلوار پر رکھ لیا۔ اہلِ دیبل کچھ دیر تو لڑے لیکن پھر پسپا ہوتے ہوئے ایک مرتبہ پھر شہر میں پناہ گزیں ہوگئے۔

محمد بن قاسم نے شہر پر یورش کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں میں اس وقت ایسا جوش تھا کہ اپنی ٹکروں سے پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے جنبش کرنے پر مجبور کر دیتے۔

مسلمانوں نے یہ حکم پاتے ہی دیوارِ شہر پر سیڑھیاں لگائیں اور ہر طرف سے فصیل پر چڑھنے لگے۔ فصیل پر ایک طرف اسلامی پرچم لہرا دیا۔ اب تو جوش و خروش دیدنی تھا۔ ہر طرف سے اللہ اکبر کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ دیواروں پر چڑھنے والوں نے اندر کود کر شہر پناہ کے دروازے کھول دیے۔ لشکرِ عرب شہر میں داخل ہوگیا۔

اہلِ شہر باہر سے شکست کھا کر آئے تھے۔ ابھی تھکن بھی نہیں اتری تھی کہ یہ افتاد آگئی۔ مقابلے کی تاب کس کو تھی۔

ہتھیار چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ کچھ بھاگ گئے کچھ قتل ہوئے۔

تین دن کی قتل و غارت گری کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے سپاہیوں کو خون بہانے سے روک دیا۔ اہلِ شہر نے پناہ مانگی۔ مسلمانوں کے سپاہ سالار نے انہیں پناہ دی۔

اب شہر مسلمانوں کے سپرد تھا۔

محمد بن قاسم ابھی دیبل ہی میں تھا کہ اسے راجا داہر کا خط ملا۔

''تم سے پہلے بھی کچھ لوگوں کے دماغ خراب ہوئے تھے اور انہوں نے سندھ و ہند کو فتح کرنے کی ناپاک کوشش کی تھی۔ اب تم نے یہ لعنت بھرا کام کیا ہے اور ہمارا مندر گرایا ہے۔ یہاں کے لوگ کاروباری ہیں اور لڑنے کا تجربہ نہیں رکھتے اس لیے تمہیں فتح حاصل ہوگئی۔

''تمہیں میرے لڑکے جیسیہ سے واسطہ نہیں پڑا جس کے خون سے بڑے بڑے مہاراجے گھبراتے ہیں۔ یاد رکھو آگے بڑھے تو تمہارا مقابلہ اس سے ہوگا۔ بہت جلد تمہارا بھی وہی حال ہونے والا ہے جو تمہارے سابقہ سپاہ سالار بدیل کا ہوا تھا۔''

یہ خط ایسا تضحیک آمیز تھا کہ محمد بن قاسم کا جوان خون کھول اٹھا۔ اس نے اسی زبان میں اس خط کا جواب دیا۔

اس خط کی زبان وہی تھی جو ایک مغرور راجا کے لیے ہونی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر داہر کو مصالحت کا پیغام بھی دیا تھا۔

''اب بھی تمہارے لیے یہ بہتر ہے کہ ان مسلمان قیدیوں کو رہا کرو اور سراندیپ کے جہازوں سے جو سامان لوٹا ہے وہ بھی مع تاوان لوٹا دو۔ اس کے ساتھ تم آئندہ کے لیے ایسی حرکتوں سے باز رہنے کی یاد دہانی کے ساتھ اطاعت امیر المومنین کا اقرار کرو تو تمہاری سلطنت کا شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رہے گا۔''

حجاج کو جب اس جوابی خط سے آگاہی ہوئی تو اس نے محمد بن قاسم کو سرزنش کی۔

''میں اس بات کو سن کر خوش نہیں ہوا کہ تم نے راجا داہر کو مصالحت کا خط لکھا۔ تم نے اپنی جانب سے نیک دلی سے یہ قدم اٹھایا ہے لیکن داہر اس کو تمہاری کمزوری گردانے گا۔

''میں تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ اگر کوئی خود مصالحت کی درخواست کرے تو اس سے فوراً صلح کر لو۔ اپنی طرف سے کوئی بھی قدم صلح کے لیے مت اٹھاؤ۔ جب دریائے سندھ پر پہنچو تو اس کا ایک نقشہ میرے پاس بھیج دینا اور میری طرف سے سب کو سلام کہہ دینا۔''

دیبل کے جیل خانے میں سراندیپ کے وہ مسلمان قید تھے جو بحری قزاقوں نے جہاز کو لوٹنے کے بعد گرفتار کیے تھے۔ یہ صرف قزاقوں کا کام نہیں تھا بلکہ راجا داہر بھی اس میں شامل تھا اسی لیے انہیں سرکاری طور پر دیبل میں رکھا گیا تھا اور داہر نے فریب کاری سے کہا تھا کہ بحری قزاقوں پر اس کا کوئی زور نہیں۔

محمد بن قاسم نے جیل کے داروغہ کو بلوایا جس کا نام قبلہ تھا۔

''جیل خانے میں کتنے مسلمان قیدی ہیں؟''

''صرف دو۔''

''باقی کہاں ہیں؟''

''اروڑ میں راجا داہر کے پاس۔''

''اب تو بتا میں تیرے ساتھ کیا سلوک کروں۔ ان قیدی مسلمانوں کو جو ایذا تو نے پہنچائی ہوگی اس کا جواب تو یہ ہے کہ تجھے قتل کر دیا جائے۔''

''اکثر فاتح اپنے مفتوحین سے یہی سلوک کرتے ہیں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ آپ مسلمان قیدیوں کو بلا کر پوچھ لیں کہ میرا سلوک ان کے ساتھ کیسا رہا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیجیے گا۔''

محمد بن قاسم کے حکم پر ان قیدیوں کو لایا گیا۔

''داروغہ جیل کا تمہارے ساتھ کیا سلوک رہا ہے؟''

''ہم داروغہ جیل کے شکر گزار ہیں کہ اس کا برتاؤ ہمارے ساتھ شریفانہ تھا۔ یہ ہمیں ہر وقت تسلی دیتا رہتا تھا کہ جلد ہی اسلامی لشکر یہاں آئے گا اور تم اس مصیبت سے نجات حاصل کر لو گے۔ ہم سفارش کریں گے کہ اس شخص کو قتل نہ کیا جائے بلکہ قتل کے حق دار تو وہ ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھی مسلمانوں کو جن میں عورتیں بھی ہیں اروڑ میں رکھا ہے۔ قبلہ کو قتل کرنے کے بجائے ان سے انتقام لیجیے۔ ان مسلمانوں کی رہائی کا بندوبست کیجیے۔''

محمد بن قاسم قیدیوں کی اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور داروغہ جیل کا شکریہ بذاتِ خود ادا کرتے ہوئے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔

محمد بن قاسم نے اسے دیبل کی نیابت پر مقرر کیا اور اس شخص کو حکم دیا جسے اس نے والیِ دیبل تعینات کیا تھا کہ موجودہ داروغہ جیل سے تمام معاملات میں مشورہ لے اور آمد و خرچ کے حساب کی توثیق اس سے کرائے۔

اس والیِ دیبل کا نام حمید بن وداع نجدی تھا۔

شہر میں ایک خوب صورت مسجد تعمیر کرائی۔ یہ سندھ میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد تھی۔

دیبل کے فتح ہونے کی خبر جونہی راجا داہر تک پہنچی، اس نے اپنے لڑکے جیسیہ کو ایک خط لکھا جو نیرون کا حاکم تھا۔ اس خط میں داہر نے اسے حکم دیا کہ اس خط کے ملتے ہی وہ دریائے سندھ عبور کر کے برہمن آباد چلا جائے۔

کوئی بات چھپی کہاں رہتی ہے خصوصاً اس ماحول میں کہ حجاج کی ہدایت کے مطابق محمد بن قاسم نے ہر طرف مخبروں کا جال بچھا رکھا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات فوراً آگئی کہ داہر نے اپنے لڑکے کو برہمن آباد چلے جانے کا حکم دیا ہے۔ اب وہ نیرون میں نہیں ہے بلکہ وہاں نیرون کا راجا سندر داس ہے جو پہلے ہی اطاعت قبول کر چکا تھا۔

دیبل کے انتظامات سے فارغ ہوتے ہی قاسم نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ بھاری جنگی ساز و سامان جہازوں پر لدوایا اور حکم دیا کہ دریائے سندھ کے دہانے سے ہو کے چڑھاؤ پر شہرِ نیرون کی طرف روانہ ہو جائے۔ وہ خود براستہ خشکی نیرون کی جانب چل دیا۔ چھ دن تک وہ برابر کوچ کرتا چلا گیا اور ساتویں دن ایک ترائی میں اترا جو بلہار کے نام سے مشہور تھی۔

گرمیوں کے دن تھے اور یہاں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ دریائے سندھ اس قدر فاصلے پر تھا کہ وہاں سے پانی لایا نہیں جا سکتا تھا۔

لشکر کی تکلیف کو دیکھتے ہوئے محمد بن قاسم نے حکم دیا کہ نمازِ استسقا ادا کی جائے۔ سب نے مل کر نمازِ استسقا ادا کی اور گڑگڑا کر دعا کی۔

خدا نے مجاہدین کی دعاؤں کو قبول کیا۔ خوب بارش ہوئی، ہر طرف جل تھل ہوگیا۔

بلہار سے روانہ ہو کر لشکرِ اسلامی نیرون پہنچا۔ نیرون کا راجا پہلے ہی حجاج کی خدمت میں وفد بھیج کر امان طلب کر چکا تھا لیکن اس نے اس امان کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ اہلِ شہر کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ جب محمد بن قاسم نیرون پہنچا تو راجا شہر میں نہیں تھا۔ اسے داہر نے مشورے کے لیے اپنے پاس بلوایا ہوا تھا۔ اہلِ شہر نے گھبرا کر دروازے بند کر لیے۔ محمد بن قاسم نے اہلِ شہر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ شہر کے باہر پڑاؤ ڈال کر راجا کا انتظار کرنے لگا کہ اگر راجا نے اطاعت کی پاسداری کی تو ٹھیک ورنہ وہ حملہ کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔

دیبل میں امن و امان اور نظم و ضبط قائم کرنے کے بعد محمد بن قاسم نیرون کی طرف بڑھا۔ (دیبل سے تین دن کی مسافت پر موجودہ حیدر آباد کے جنوب میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع تھا)۔

لشکرِ اسلامی میں اذانِ فجر بلند کی جاچکی تھی اور باجماعت نماز کی تیاری کی جارہی تھی کہ خریم بن عمر کہیں سے نمودار ہوا اور محمد بن قاسم سے سرگوشی میں کہا۔

”نیرون کا راجا، داہر سے ملاقات کے بعد واپس آگیا ہے۔ آپ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔ میں نے اسے خیمہ گاہ میں بٹھا دیا ہے۔ میں نے غلطی تو نہیں کی؟ آپ کیا فرماتے ہیں؟“

”تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ ان سے کہو نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم ان سے ملاقات کریں گے۔“

نماز سے فارغ ہونے کے بعد محمد بن قاسم اس خیمے میں گیا جہاں نیرون کا راجا بیٹھا تھا۔ اس کے محافظ اور چند ساتھی بھی وہاں موجود تھے۔

محمد بن قاسم اور خریم بن عمر نے راجا سے مصافحہ کیا۔

”میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں آپ نے میری رعایا سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس بات کی معذرت بھی کرتا ہوں کہ آپ پر شہر کے دروازے بند ہوئے۔“

”حجاج بن یوسف کی طرف سے آپ کو امان دی جاچکی ہے۔ آپ شہر میں جاکر منادی کرادیں کہ کسی سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔“

محمد بن قاسم اپنی خیمہ گاہ ہی میں رہا لیکن شہر کے دروازے اس پر کھل چکے تھے۔ اہلِ نیرون نے نہ صرف تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے بلکہ لشکرِ اسلامی کے لیے سامانِ رسد کا بھی بندوبست کردیا۔ نیرون پہنچ کر محمد بن قاسم نے حجاج کو اپنی فتوحات اور اہلِ نیرون کے حالات سے آگاہ کیا اور آگے بڑھنے کی اجازت طلب کی۔ جن دنوں محمد بن قاسم سندھ پر حملہ آور تھا اور ہندوستان کے شہروں کی طرف بڑھتا جارہا تھا انہی دنوں حجاج کا ایک دوسرا سپہ سالار قتیبہ بن مسلم ترکستان اور منگولیا کے میدانوں میں شمشیرِ آبدار کے جوہر دکھا رہا تھا۔

حجاج نے محمد بن قاسم کے خط کے جواب میں قتیبہ بن مسلم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا۔

”تم دونوں کی رفتار چین پر جاکے ختم ہوتی ہے۔ دونوں اللہ کا نام لے کر برابر بڑھتے چلے جاؤ۔ جو پہلے مملکت چین میں داخل ہوگا اسے اپنے تمام مفتوحہ بلاد اور نیز اپنے رقیب پر حکومت وبالادستی دی جائے گی۔“

اس پیش کش نے محمد بن قاسم کے اسپ تازی کو ضرب لگائی اور وہ ہندوستان کے زرخیز وشاداب علاقوں کی طرف دوڑنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ اس کا مہربان میزبان راجا اسے کچھ دن اور رکنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ اس نے اس فرصت کا فائدہ اٹھا کر نیرون میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ ایک دن راجا نیرون اس کے پاس آیا اور اسے راجا داہر کے عزائم سے واقف کیا۔

”میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں اس لیے آپ کو بتا رہا ہوں کہ داہر نے پوری جنگی تیاری کر رکھی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کی مدد سے جنگی تیاریوں کو عروج پر پہنچا دیا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔ اسی لیے میں سیوستان (سہون) کی طرف جارہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جب میں سہون کو فتح کرلوں گا تو راجا اپنے شہر اروڑ سے باہر نکل کر ہمارے مقابلے پر ضرور آئے گا۔“

”مہاراج! ایک التجا کروں۔ آپ نیرون میں اپنا کوئی والی مقرر کردیں اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کی آگیا (اجازت) دیں۔ کیونکہ اس علاقے میں بدھ لوگ آباد ہیں۔ بدھ ہونے کے ناتے وہ میرا احترام کریں گے اور میری وجہ سے آپ کے ساتھ بھی شانتی سے پیش آئیں گے اور دوسرے میں آپ کے لیے رسد کا بھی انتظام کردوں گا۔“

محمد بن قاسم نے اس کی درخواست قبول کرلی اور اسے اپنے ساتھ لے کر نیرون سے کوچ کرگیا۔ جاتے ہوئے اپنا ایک آدمی نیرون کی ولایت کے لیے مقرر کردیا کیونکہ راجا اس کے ساتھ تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک دریا کے کنارے پہنچا جس نے دریائے سندھ سے پہلے اس کا راستہ روکا۔ کسی میں اس کو روکنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ دریا سے اتر آیا۔ ادھر اترنا تھا کہ سارے ہندوستان میں تہلکہ پڑگیا اور کم قوت حکام حاضر ہوہو کے سرِ اطاعت جھکانے لگے۔ سندھ اس وقت ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا چھوٹے چھوٹے راجا حکومت کررہے تھے۔ قاسم سے لڑنے کی ان میں ہمت کہاں تھی۔ زیادہ تعداد بدھ مذہب کے پیروکاروں کی تھی جو داہر کے باج گزار ضرور تھے لیکن اس سے خوش نہیں تھے۔ کسی بیرونی قوت کی آمد کے منتظر تھے۔

وہ راجا نیرون کی راہبری میں برابر پڑاؤ ڈالتا چلا جارہا تھا کہ راستے میں ببہرج نام کے ایک مقام پر گزر ہوا۔ یہ شہر سیوستان کے ماتحت تھا جس پر راجا داہر کا ایک بھتیجا بجے رائے حکومت کررہا تھا۔

جب مسلمانوں نے ببہرج سے متصل ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا تو شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ حاکم شہر نے فوراً اکابرین کو

جمع کیا اور یہ لوگ سوچنے بیٹھ گئے کہ مسلمانوں سے بچاؤ کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے۔ کچھ لوگ لڑنے پر زور دے رہے تھے جبکہ زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو مصالحت پر زور دے رہے تھے۔ اس مجلس میں بدھ راہب بھی موجود تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں سے مصالحت تو کرنی پڑے گی کیونکہ ہم ان سے نہیں لڑسکتے لیکن اس سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ہم بجے رائے کے پاس قاصد بھیج کر اپنا ارادہ اس پر ظاہر کردیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد ہم بجے رائے کے عتاب کا نشانہ بن جائیں۔

ان لوگوں نے قاصد کے ذریعے پیغام بجھوا دیا۔

”ہمارا مذہب صلح وخاموشی کا ہے۔ لڑنا اور خوں ریزی کرنا ہمارے مذہب (بدھ مذہب) میں حرام ہے۔ اس کے علاوہ آپ ایک محفوظ مقام پر ہیں اور ہم کھلے میدان میں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے ہاتھ میں حجاج کا یہ فرمان ہے کہ جو کوئی امان مانگے اسے فوراً امان دو۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری اس مجبوری کو آپ قبول کریں گے اور ہمیں امان طلب کرنے کی اجازت دیں گے۔“

راجا نیرون بدھ مذہب سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اس علاقے میں اسے سب جانتے تھے۔ وہ یہاں کئی راہبوں کو جانتا تھا۔ ان کے ذریعے وہ شہر میں داخل ہوا اور اس مجلس میں پہنچ گیا جہاں مشورے کیے جارہے تھے۔ اسے وہاں دیکھ کر سب حیران ہوئے..... اس سے زیادہ حیرت اس وقت ہوئی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ محمد بن قاسم کے ساتھ آیا ہے۔

”میں اس لیے مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ ہوں کہ اپنے ہم مذہبوں کو مسلمانوں کے غضب سے بچاسکوں۔ تم لوگ بھی مسلمانوں کی اطاعت کرلو اور میری طرح محفوظ ہوجاؤ۔ عرب لوگ دیانت دار ہیں اور اپنے عہد ناموں کی پوری پابندی کرتے ہیں۔“

”ہم نے بجے رائے کی طرف قاصد بھیجا ہے۔“

”اچھا ہے اس کی اجازت سے اطاعت کرلو ورنہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ وہ اگر اجازت نہ بھی دے تو بھی اپنی جانیں گنوانے سے گریز کرو۔“

راجا نیرون نے محمد بن قاسم کے سامنے تمام کیفیت بیان کردی اور اس سے وعدہ لے لیا کہ قاصد کے واپس آنے تک ببہرج کے لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔

قاصد کا انتظار تھا۔

بجے رائے نے قاصد کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا اور جنگ کی تیاریاں کرتا رہا۔ اہلِ ببہرج تو تیار ہی بیٹھے تھے وہ گروہ در گروہ باہر نکل آئے اور محمد بن قاسم سے اطاعت کے طلب گار ہوئے۔

لڑائی کے بغیر ببہرج پر قبضہ ہوگیا۔

محمد بن قاسم یہاں سے روانہ ہوکر سیوستان پہنچا (سہون)۔

بجے رائے ہندو تھا جبکہ شہریوں میں کثرت بدھ مذہب کے لوگوں کی تھی جو لڑائی سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے بجے رائے پر بھی زور دیا کہ لڑائی سے ہاتھ اٹھالے لیکن وہ نہ مانا اور قلعہ بند ہوگیا تاکہ لڑائی کو طول دیا جاسکے۔

محمد بن قاسم نے اپنے جاسوس روانہ کیے جنہوں نے اطلاع دی کہ شہر کے لوگ تو لڑنے کے لیے تیار نہیں البتہ فوجی آمادۂ جنگ ہیں۔ بجے رائے قلعہ بند ہوگیا ہے۔

محمد بن قاسم نے قلعے کا محاصرہ کرکے منجنیقوں سے سنگ باری شروع کردی۔ اس سنگ باری سے اہلِ شہر پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ شہریوں کا ایک وفد محمد بن قاسم کے پاس آیا اور اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

”اہلِ شہر لڑائی نہیں چاہتے۔ ہمیں لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم لوگ حاکمِ شہر بجے رائے سے متنفر ہیں۔ کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ اس کے پاس اتنی فوج بھی نہیں کہ آپ کا مقابلہ کرسکے۔“

محمد بن قاسم نے ان لوگوں کو یقین دلایا کہ ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس نے جنگ کو اور تیز کردیا۔ ایک ہفتے تک مسلسل جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ سہون کی فوج ہمت ہار بیٹھی۔ بجے رائے نے یہ رنگ دیکھا تو سمجھ گیا کہ اب جنگ فضول ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں قلعے کے شمالی دروازے سے نکل بھاگا اور دریائے سندھ عبور کرگیا۔

سہون فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے بجے رائے کا تعاقب کرنے کے لیے سیسم کا رخ کیا۔ بجے رائے سیسم کے قلعے میں تھا۔ دو روز تک سخت خوں ریز جنگ ہوئی جس میں بجے رائے اور اس کے سردار مارے گئے۔

سیسم کی فتح کے بعد قاسم نے اس علاقے پر خراج قائم کیا اور اپنے آدمی کو حاکم مقرر کردیا۔ وہ ابھی سیسم میں تھا کہ اسے حجاج بن یوسف کا خط ملا۔

”اب تم آگے بڑھنے کا خیال چھوڑ دو اور نیرون لوٹ جاؤ اور دریائے سندھ عبور کرکے داہر سے مقابلہ کرو۔“

اس نے اس حکم پر سر جھکا دیا اور نیرون لوٹ آیا۔

یہاں پہنچ کر بھی حجاج سے اس کی خط وکتابت ہوتی رہی۔

دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کی تیاری کا کام

شروع ہوگیا۔ راجا داہر کو یقین تھا اور نہ جانے کیوں تھا کہ محمد بن قاسم واپس چلا جائے گا۔ اس نے مدافعت کی بھی کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

محمد بن قاسم نے کمال عجلت سے دریا پر کشتیوں کا ایک پُل باندھ کر اپنی پوری فوج کو مع سازوسامان پار اتار دیا۔ اس سے پریشان ہوکر راجا داہر اروڑ یا راوڑ سے نکلا۔ کوہ پیکر ہاتھیوں کی ایک زبردست اور ہیبت ناک صف آگے آگے تھی۔ ہاتھیوں کے پیچھے دس ہزار مسلح اور زرہ پوش سواروں کا پہرا تھا۔ سواروں کے بعد تیس ہزار پیدل جاں نثار تھے۔ ان سب کے درمیان راجا کا سفید ہاتھی تھا۔ عماری پر راجا داہر جلوہ افروز تھا۔ ادھر ادھر حور نژاد اور پری زاد خواصیں تھیں۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں جامِ شراب تھا' دوسری خاص دان لیے ہوئے تھی اور برابر پان دیتی جاتی تھی۔

جاتے جاتے یہ جلوس اتنی دور تک بڑھ گیا کہ اسلامی لشکر گاہ صرف نصف فرسخ پر تھی۔

داہر اپنے لشکر کے ساتھ مقابلے کو نکلا۔ مسلمانوں نے دلیری اور شجاعت سے داہر کی فوجوں کو روکا۔ نہایت خوں ریز جنگ ہوئی۔

شام ہوگئی۔ تقدیر نے کسی کے حق میں فیصلہ نہیں دیا۔

دوسرے دن پھر دونوں طرف کے جوان بڑھے۔ سپاہ گری کے جوہر دکھائے۔ شام کے اندھیرے نے پھر نقارہ بجایا۔ چار دن گزر گئے۔ دونوں لشکر آپس میں ٹکراتے رہے اور بے نیل و مرام واپس آتے رہے۔

پانچویں دن کی قیامت خیز صبح نمودار ہوئی۔ محمد بن قاسم نے صفیں مرتب کیں۔ ان کے سامنے کھڑے ہوکر پُرجوش خطبہ پڑھا اور ہر سپاہی کے دل میں جوشِ جواں مردی پیدا کردیا۔ عربوں کی طرف سے سبقت ہوئی۔ وہ اپنے طولانی نیزے جھکائے ہوئے دشمن کی طرف بڑھے۔ سب کی یہ کوشش تھی کہ داہر تک پہنچا جائے لیکن اس کے جاں باز محافظ اس کی حفاظت کررہے تھے۔ عربوں نے محافظوں کا حصار توڑ دیا لیکن ہاتھیوں کے قریب جانے کی ہمت نہیں تھی۔ لشکرِ اسلام کے آتش بازوں نے پچکاریوں سے ان پر روغنِ نفت پھینک کر آگ برسانا شروع کردی۔ ہاتھی اس سے ڈر کر پیچھے کی طرف بھاگے اور اپنی ہی فوج کو روندنا شروع کردیا۔ اس افراتفری میں لشکرِ اسلام کے نیزہ باز اور تیر انداز دشمن پر پل پڑے۔ اسی اثنا میں ایک نفت بردار نے داہر کے ہاتھی پر روغن پھینکا جس سے وہ سراسیمہ ہوکر بھاگ نکلا۔ عماری میں آگ لگی ہوئی تھی۔ فیل بان نے بہت کوشش کی لیکن اب ہاتھی کسی کے اختیار میں نہیں تھا۔ گھبرا کے بھاگا اور پانی میں کود گیا۔ وفادار برہمن پانی میں کود پڑے اور ہاتھی کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ وہ کنارے تک تو آگیا لیکن دریا سے باہر آنے کو تیار نہیں تھا۔ وہیں دلدل میں بیٹھ گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے تیر برسائے جانے لگے۔ ایک تیر داہر کو زخمی کرتا ہوا گزر گیا۔ راجا زخمی تھا لیکن بہادر تھا۔ ہاتھی سے اترا اور تلوار کھینچ کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے لشکریوں میں بھی نیا جوش پیدا ہوگیا' ایسی بلا کی جنگ ہوئی کہ خدا کی پناہ۔

اسی بھیڑ میں ایک عرب نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ راجا داہر کی گردن تن سے جدا ہوگئی۔ جنگ جاری تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ داہر مارا جاچکا ہے کچھ برہمنوں کی نظر داہر کی لاش پر پڑ گئی۔ مصلحت اسی میں تھی کہ داہر کی موت کا کسی کو علم نہ ہو۔ انہوں نے اس کی لاش کو ریت کے اندر چھپادیا اور بھاگنا شروع کردیا۔ قیس نامی ایک عرب تلوار لے کر ان پر جھپٹ پڑا۔ ان لوگوں نے جان کے خوف سے کہا۔ ''ہمارا قتل بے کار ہے۔ داہر مارا جاچکا ہے۔'' وہ جگہ بھی بتادی جہاں داہر کی لاش پڑی تھی۔

یہ خبر مشہور ہوتے ہی داہر کی فوج نے بھاگنا شروع کردیا۔

محمد بن قاسم خود داہر کی لاش کے پاس گیا اور ضرورتاً سر کاٹ لیا گیا۔

اس روز جمعرات کا دن اور 93 ہجری کی دس تاریخ یہ مطابق 7 جون 712ء تھی۔

داہر کا آفتابِ اقبال غروب ہوتے ہی شکست خوردہ سندھی فوج نے بھاگ کر قلعہ راوڑ کی پناہ لی۔ داہر کے لڑکے جیسیہ اور اس کی بیوی اور بہن رانی بائی نے قلعہ بند ہوکر لڑائی کو جاری رکھا۔ عربوں نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ جیسیہ میں مقابلے کی سکت نہ رہی تو موقع پاکر برہمن آباد بھاگ گیا۔ رانی مقابلے پر ڈٹی رہی لیکن عرب آتش بازوں اور سنگ اندازوں کی کوشش سے کی فصیل میں شگاف پڑ گئے۔ اس پر رانی بائی اپنے آپ کو بے بس پاکر بہت سی دیگر عورتوں کے ساتھ آگ میں کود دی اور زندہ جل گئی۔

قلعے پر عربوں کا قبضہ ہوگیا۔

راجا داہر کا وزیر سیاگر نہایت دور اندیش تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کرلی۔ اسی کی وساطت سے باقی ماندہ مغوی اور گرفتار شدہ... عورتوں اور بچوں کو رہائی ملی۔

جیسیہ راوڑ سے بھاگا اور چالیس ہزار سپاہ کے ساتھ

برہمن آباد میں مورچا بند ہوگیا۔ عربوں نے وہاں پہنچ کر اس کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ شہر کے لوگ اتنے پریشان ہوئے کہ شہر کے تاجروں نے خفیہ طور پر بات چیت کرکے غیر فوجی آبادی کے لیے امان مانگی۔ محمد بن قاسم نے حجاج سے اجازت لینے کے بعد انہیں امان دے دی۔

جیسیہ موقع پاکر فرار ہوگیا' صرف چالیس ہزار فوجی قلعے میں رہ گئے۔ ان فوجیوں نے مقابلہ ضرور کیا لیکن .... جیسیہ کے فرار نے انہیں بددل کردیا تھا۔

محمد بن قاسم نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کردیا تھا۔ اس نے ایک حصے کو اس طرف روانہ کیا جس طرف .... جیسیہ بھاگا تھا۔ مخبروں کی مدد سے انہوں نے اسے جالیا۔ لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے ہمراہ حارث علافی کا بیٹا محمد علافی بھی تھا۔ وہ فرار ہوکر کشمیر پہنچا اور وہاں کے راجا کے پاس پناہ گزیں ہوگیا۔

قلعہ برہمن آباد پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

برہمن آباد کی فتح کے بعد لشکرِ اسلام کے حوصلے بڑھ گئے' وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ اروڑ فتح کیا۔ قلعہ باتیہ کو انگوٹھے سے مسل دیا۔ یہاں تک کہ ملتان بھی فتح کرلیا۔ ملتان کا صوبہ بھی راجا داہر کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم کے ہاتھ اس قدر مالِ غنیمت لگا کہ اب تک کسی شہر کی فتح سے اتنی دولت نہیں ملی تھی۔

محمد بن قاسم نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ الگ کیا اور اسے حجاج بن یوسف کے پاس عراق بھیج دیا۔ حجاج نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کی خدمت میں اس دولت کو اس عریضے کے ساتھ بھیج دیا۔

''میں نے سندھ پر حملہ کرتے وقت آپ سے کہا تھا کہ وہاں خرچ ہونے والی رقم کا دُگنا آپ کے خزانے میں جمع کرواؤں گا اور آج میں اپنے وعدے میں سرخرو ہوگیا ہوں اور دُگنے سے بھی کئی گنا آپ کے خزانے میں جمع کررہا ہوں۔''

ایک اندازے کے مطابق اس مہم میں چھ کروڑ درہم خرچ ہوئے اور بدلے میں بیس کروڑ درہم خزانے میں جمع کروائے گئے۔ محمد بن قاسم نے ملتان کی فتح کے بعد یہاں بھی ایک عالی شان مسجد تعمیر کروائی اور ایک شخص داؤد بن نصر کو ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ خود اس نے بقیہ سازوسامان جنگ اور لشکریوں کے ساتھ اقامت اختیار کی۔

❁❁❁

حجاج بن یوسف نے سعید بن جبیر کو بالکل بے گناہ اپنی آنکھوں کے سامنے قتل کرادیا تھا اور ان کا سر کاٹ کر زمین پر دے مارا تھا۔ کہتے ہیں جب سعید بن جبیر کا سر زمین پر گرا تو حجاج پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ اس کے حواس مختل ہوگئے۔ وہ سلطنت کے امور انجام دیتا رہا لیکن ہر دم دہشت زدہ رہنے لگا۔ اسے معمولی معمولی چیزوں سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ چلانے لگتا تھا۔

''مجھے سعید بن جبیر سے کیا لینا تھا۔''

''سعید بن جبیر نے میرا کیا بگاڑا تھا۔''

یہ دیوانگی اس پر ایک سال تک طاری رہی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اس کے جی میں آئی' ایک نجومی کو بلا کر اس سے پوچھا، ان دنوں آپ کے علم میں کسی بادشاہ کے مرنے کا ذکر ہے؟

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں لیکن وہ آپ نہیں ہیں۔ میرے علم میں جو بادشاہ مرے گا' اس کا نام کلیب ہوگا۔''

یہ سن کر حجاج چیخ اٹھا۔

''بدبخت وہ میں ہی ہوں۔ میری ماں نے میرا نام کلیب رکھا تھا۔'' اس کی زبان پر بے اختیار یہ اشعار آگئے۔

''اے پروردگار! دشمنوں نے قسم کھا رکھی ہے اور کوشش میں ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ میں جہنمی ہوں۔''

''کیا وہ جہالت کی وجہ سے قسم کھا رہے ہیں؟ ان کا بُرا ہو' وہ کیا گمان کرتے ہیں اس عظیم ذات سے جو عفوودرگزر اور مغفرت کرنے والی ہے۔''

اس دن کے بعد سے وہ اپنی موت کا منتظر ہوگیا۔ آخر 95 ہجری شوال کی بیس تاریخ کو اس نے انتقال کیا۔

محمد بن قاسم اس وقت قنوج کی تسخیر کا ارادہ کررہا تھا کہ اس کو اپنے مربی حجاج بن یوسف کی موت کی خبر پہنچی۔ اس نے تسخیر کا ارادہ ترک کردیا اور اروڑ چلا آیا تاکہ دارالخلافہ سے قریب رہے۔

دوسرا اہم سالار قتیبہ بن مسلم بھی اس صدمے سے دوچار ہوا۔ وہ محاذِ جنگ کو چھوڑ کر مرو کی طرف پلٹا۔ واپسی میں تمام فوجوں کو منتشر کرتا آیا۔ کچھ فوج بکارا میں چھوڑی کچھ فوج کو کہیں اور بھیج دیا اور مرو چلا آیا۔

حجاج کی تدفین اس کے بسائے ہوئے شہر 'واسط' میں ہوئی لیکن اس کی قبر کا نشان مٹا کر پانی بہادیا گیا۔

مورخ لکھتے ہیں کہ جنگ کے علاوہ حجاج نے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو قتل کیا۔ حجاج کے انتقال کے بعد قید خانے کا جائزہ لیا گیا تو 33 ہزار افراد بے گناہ قید تھے۔

حجاج کا قید خانہ بلا چھت کے تھا۔ گرمیوں میں سورج کی تپش سے بچنے اور سردیوں میں بارش سے حفاظت کا کوئی

انتظام نہیں تھا۔

اس کی سفاکی اپنی جگہ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی وجہ سے بنو امیہ کی سلطنت کو عروج ملا۔ اس کے بعض کارنامے تو ایسے ہیں جسے تاریخ اسلام ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اسی کی کوششوں سے قرآن مجید علیحدہ علیحدہ اجزا پاروں میں تقسیم کیا گیا اُن پر اعراب لگوائے تاکہ قرأت میں آسانی ہو۔ اسی کے مشورے پر خلیفہ عبدالملک نے پہلی مرتبہ اسلامی سکّہ مضروب کرایا اور رومن سکوں کو اپنے ملک سے ختم کیا۔ زراعت وتجارت کے فروغ میں بھی اس کا حصہ بے مثال تھا۔

اسی سال ولید بن عبدالملک کا بھی انتقال ہوگیا۔ ولید کے مرنے کے بعد سلیمان عبدالملک وارثِ تخت ہوا تو اس کے نزدیک حجاج سے زیادہ کوئی شخص اس کا دشمن نہیں تھا۔ اسے صدمہ تھا تو یہ کہ اب حجاج ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں تک اس کے دستِ ستم کی کسی طرح رسائی نہیں ہوسکتی تھی۔ حجاج کا انتقام اس نے حجاج کے عزیز واقارب اور اس کے متعین کردہ افسروں سے لیا۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اس نے تخت پر بیٹھتے ہی یزید بن مہلب کو والیِ عراق مقرر کیا جو ظاہر ہے حجاج کا دشمن تھا۔ حجاج نے اسے گورنری سے معزول کیا تھا قید میں رکھا تھا۔ اس کی قسمت تھی کہ بچ نکلا تھا۔

ایک خارجی صالح بن عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں خراج وصول کرنے کی خدمت دی۔ اس سے زیادہ سخت انتقام لینے والا خاندان حجاج سے کوئی نہ ہوسکتا تھا۔ ان دونوں کو متعین کرنے کے بعد سلیمان نے انہیں حکم دیا کہ خاندانِ حجاج کے لوگ برابر ماخوذ کر کے قتل کیے جائیں۔

اس خوں ریزی کا حکم دیتے ہی حکم دیا کہ محمد بن قاسم کو ولایت سندھ سے معزول کردیا جائے اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو مقرر کر کے روانہ کیا۔

یزید بن ابی کبشہ نے سندھ پہنچتے ہی محمد بن قاسم کو گرفتار کرلیا۔ مجرموں کی طرح ٹاٹ کے کپڑے پہنائے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں اور عراق کی طرف روانہ کردیا۔

اس کے عراق پہنچنے پر صالح بن عبدالرحمٰن نے اسے شہر واسط کے جیل خانے میں بھجوادیا جہاں حجاج بن یوسف کے سب لوگ قید تھے۔ اس قید خانے میں محمد بن قاسم کو رات دن سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ وہ ان سزاؤں کو صبر وشکر سے برداشت کرتا رہا اور بالآخر ان اذیتوں سے تنگ آکر اسی قید خانے میں 22 سال کی عمر میں انتقال کرگیا۔

عہدِ حجاج کے ایک اور نامور مجاہد قتیبہ بن مسلم کا حال بھی محمد بن قاسم سے مختلف نہ ہوا۔ اس نے سلیمان کی تخت نشینی کی خبر سنتے ہی دربارِ خلافت کو لکھا۔ ''اگر میں اپنے عہدے سے ہٹایا گیا تو بغاوت اختیار کرلوں گا۔''

سلیمان خاموش رہنے پر تیار تھا لیکن لوگوں نے ایسے فساد ڈالے کہ وہ قتیبہ کی مخالفت پر آمادہ ہوگیا قتیبہ کا کسی نے ساتھ نہیں دیا اور وہ شاہی فوج کے ہاتھوں مع اپنے تمام اعزہ کے گھر میں محصور ہو کے لڑتا ہوا مارا گیا۔

حکمرانوں کی نادانیاں کیسے کیسے تاب دار گوہروں کو مٹی میں ملادیتی ہیں۔ اگر ولید کی زندگی چند روز اور وفا کرتی یا سلیمان انتقام کی آگ میں اندھا نہ ہوتا اور محمد بن قاسم کو کشور کشائی میں مشغول رہنے دیتا تو شاید ہندوستان کی تاریخ ہی اور ہوتی... لیکن افسوس!

فاتحِ سندھ ہونے کے باوجود محمد بن قاسم کی موت کی خبر جب سندھ پہنچی تو گھر گھر کہرام مچ گیا صفِ ماتم بچھ گئی۔ انہوں نے اس کا مجسمہ بنوا کر نصب کروایا۔ محمد بن قاسم نے اپنی قید کے دوران چند اشعار کہے تھے جو تمام دنیا میں مشہور ہوگئے۔ یہ اشعار اس کے استقلال اور دل کی مضبوطی کو ظاہر کرتے ہیں۔

''اگر میں شہر واسط اور اس کی سرزمین پر بندھا جکڑا اور زنجیروں میں پھنسا رہا تو کوئی مضائقہ نہیں اس لیے کہ بہت سے شہسوار تھے جن کے دلوں میں، میں نے اپنی ہیبت بٹھادی تھی اور بہت سے حریف میرے مقابل آئے تو میں نے ان کو مار ڈالا۔

''اگر میں ثابت قدمی سے کام لیتا (یعنی یزید بن کبشہ سے لڑتا) تو وہ عورتیں اور مرد جو لڑائی کے لیے فراہم کیے گئے تھے روند ڈالے جاتے۔

''قبیلہ سکسکی (یزید بن ابی کبشہ) کے سوار کبھی ہماری زمین میں داخل نہ ہوئے تھے اور نہ کبھی قبیلہ عک کا کوئی شخص مجھ پر سردار مقرر ہوا تھا۔

''افسوس اے زمانے جو شرفا پر سخت ہے۔''

ماخذات

حجاج بن یوسف تاریخ کے آئینے میں، ابو محمد مخدوم زادہ. تاریخِ اسلام، معین الدین ندوی.
تاریخ سندھ اعجاز الحق قدوسی. تاریخ سندھ عبدالحلیم شرر. تاریخ طبری، ابن جریر طبری.



بڑے کھلاڑی

کاشف زبیر

جنگ چاہے تلوار کی ہو یا ذہانت کی... یکسوئی اور ادراک کا احساس دونوں میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ بچھی ہوئی بساط پر مہروں کی چال اسے بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی... کہیں جذبات کے سودے تھے اور کہیں جان کی بازی لگی تھی۔ ایسے میں اس کا فہم اسے آگاہی دے رہا تھا کہ پُرسکون سطحِ سمندر کی تہ میں یقیناً کوئی طوفان چھپا ہے۔

مغرب زدہ ماحول میں مجرمانہ سفاکی سے نبرد آزما چند لوگوں کا احوال

جوزز ملر کی کار بڑے گیٹ سے گزر کر اس وسیع و عریض ولا کے احاطے میں داخل ہوئی جس کے چاروں طرف خوب صورت باغ اور لان تھا۔ چار دیواری کم سے کم [illegible] فٹ بلند تھی اور اس پر کئی فٹ تک خاردار تاریں لگی تھیں۔ جا بہ جا کیمرے لگے تھے اور خودکار رائفلوں سے مسلح گارڈز چپّے چپّے پر موجود تھے۔ صاف لگ رہا تھا صاحب ولا کو اپنی جان بہت پیاری تھی اور اسے خطرات بھی بہت سارے تھے۔ جوزز تقریباً پینتیس برس کا خوبرو مگر مضبوط

آدمی تھا۔ اس نے کار پورچ میں روکی تو باہر نکلتے ہی ایک آدمی نے اس کی مکمل تلاشی لی اور مطمئن ہو کر بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ ولا میں داخل ہوئے جہاں جونز کو کئی مشینوں اور انسانی تلاشی کے عمل سے دو بار مزید گزرنا پڑا تھا۔ بالآخر اس کی رسائی ایک ہال نما کمرے تک ہوئی جس کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ الماریاں تھیں اور ان میں نادر و نایاب کتابیں اور دوسری قیمتی اشیا بجی تھیں۔ وسط میں ایک میز تھی اور اس کے دوسری طرف موجود شخص کو امریکی تاریخ کے چند طاقتور ترین سینیٹرز میں سے ایک کہا جاتا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں ساکت تھیں۔ جونز کے پیچھے اس وقت بھی ایک آدمی موجود تھا۔ سینیٹر گورڈن میگوئل نے اسے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے ایک تصویر جونز کی طرف بڑھائی اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ''تمہیں اس لڑکے کو تلاش کرنا ہے اور اسے میرے پاس لانا ہے۔''

تصویر تقریباً گیارہ یا بارہ سالہ لڑکے کی تھی۔ اس کے خدوخال جنوبی امریکن تھے۔ جس کے بائیں ابرو کا آخری حصہ کسی چوٹ کی وجہ سے اڑ گیا تھا اور وہاں زخم کا گہرا نشان تھا۔ لڑکا خوب صورت اور آنکھوں سے ذہین لگ رہا تھا۔ جونز نے سینیٹر کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟''

جواب میں سینیٹر نے ایک موٹا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اس میں پچاس ہزار ڈالرز ہیں۔ کام کے بعد اتنے ہی اور ملیں گے اخراجات کے علاوہ۔''

جونز ایک چھوٹی سی جاسوس فرم چلا رہا تھا جس کا مالک اور واحد کارکن وہ خود تھا۔ اس کا دفتر اس کا موبائل تھا اور انٹرنیٹ اس کی پبلسٹی کا ذریعہ۔ تیرہ سال پہلے اس نے پولیس جوائن کی تھی۔ چار سال بعد اس نے پولیس چھوڑ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اس کا شعبہ گم شدہ افراد کو تلاش کرنا تھا۔ چند سالوں میں اس نے اپنی ساکھ بنا لی تھی اور اب اس کے پاس کام کی کمی نہیں تھی لیکن اتنا بڑا معاوضہ اسے آج تک کسی نے نہیں دیا تھا۔ اخراجات کے علاوہ، وہ روز ڈھائی سو ڈالرز کے حساب سے چارج کرتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ وہ معاملے کو پوری طرح جان کر ہی کیس لیتا تھا۔ مگر یہاں اس کے سامنے سوائے ایک تصویر کے اور کچھ نہیں تھا۔ سینیٹر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے مزید کچھ نہیں بتائے گا۔ شاید اسی بات کا اتنا خطیر معاوضہ دیا جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر لڑکے کی تصویر کی طرف دیکھا تو جونز کو اس کی آنکھوں میں چیلنج محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو کہ تلاش کر سکتے ہو تو تلاش کر کے دکھاؤ۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، لڑکے کا نام اور تفصیل؟''

سینیٹر نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اسے پڑھو اور ذہن نشین کر لو کیونکہ ایک منٹ بعد میں اسے ضائع کر دوں گا۔''

جونز نے ایک منٹ بعد کاغذ واپس کر دیا اور سینیٹر گورڈن نے اسے برقی ڈسٹ بن میں ڈال کر جلا دیا۔ پھر وہ ذرا آگے کی طرف جھکا۔ ''تمہارے پاس صرف ایک مہینا ہے؟''

ایک دن پہلے جونز کو اٹلانٹا میں کال آئی تھی اور وہ آٹھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد فلوریڈا کے اس قصبے تک پہنچا تھا جہاں سینیٹر کا ساحل کے پاس عالی شان ولا تھا۔

☆☆☆

طیارہ ریوڈی جنیرو کے ایرپورٹ پر اترا۔ صفائی اور جدت کے معاملے میں ایرپورٹ کسی امریکی ایرپورٹ سے کم نہیں تھا۔ باہر کا علاقہ بھی شاندار تھا لیکن جب ٹیکسی اس جگہ سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہوئی تو راستے میں جا بجا غربت سے بھرپور مناظر بھی دکھائی دیے تھے۔ جونز کی منزل شہر سے باہر ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ جون میں موسم گرم تھا۔ یہ جگہ خط استوا سے دور نہیں ہے اس لیے موسم تقریباً سارے سال نم اور گرم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریوڈی جنیرو کے ساحل سیاحوں میں مقبول ہیں اور سال کے کسی بھی حصے میں یہاں سیاحوں کے رش میں کمی نہیں آتی۔ ٹیکسی شہر سے گزرتی ہوئی مضافات میں موجود جوز ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

جوز ٹاؤن ایک پہاڑی پر آباد چھوٹی سی بستی تھی جو دیکھنے میں تو شہر سے باہر تھی لیکن درحقیقت یہ شہر کا ہی ایک حصہ تھی۔ اسے پکی آبادی تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ اس سے ذرا ہی بہتر تھی۔ دو اور تین منزلہ مکان تھے جو نیچے سے اوپر تک کھلونوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے سڑک کے ساتھ کمرشل ایریا تھا اور یہیں وہ چند ہوٹل تھے جن میں جونز ٹھہر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو ریوڈی جنیرو کے کسی اچھے ہوٹل میں بھی رک سکتا تھا لیکن اسے کام تو جوز ٹاؤن میں ہی تھا کیونکہ اسے جس بچے کی تلاش تھی اس کے پائے جانے کا امکان اسی علاقے میں تھا۔ اس کا نام ماریو روبیلو تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ ٹیکسی والے نے جوز ٹاؤن کا نام سنتے ہی نفی میں سر ہلانا شروع کر دیا تھا لیکن جب جونز نے اسے بیس ڈالرز کا نوٹ دکھایا تو اس کا سر اثبات میں ہلنے لگا البتہ وہ اسے اتارتے ہی تو دو گیارہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد جونز نے اپنا بیگ اٹھا کر شانے پر لادا اور ایک ہوٹل کی طرف بڑھا جس کا بورڈ سیاحوں کو متوجہ کرتا تھا۔ اندر ایک خوب صورت اور نوعمر لڑکی نے اسے مسکراتے ہوئے بتایا کہ ہوٹل میں بلکہ آس پاس کے ہوٹلوں میں بھی کوئی کمرا خالی نہیں ہے کیونکہ سیزن اس وقت عروج پر ہے۔

''تب تک میں کہاں قیام کروں؟'' جونز نے دریافت کیا۔

''اتفاق سے میرے گھر میں ایک کمرا خالی ہے۔ تینوں وقت کھانے اور مجھ سمیت تمام سہولتوں کے ساتھ صرف سو امریکی ڈالرز روزانہ میں۔''

لڑکی ہوٹل کی آڑ میں اپنا دھندا چلا رہی تھی اور بلاشبہ وہ خوب صورت تھی لیکن جونز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے ہوٹل میں کمرا چاہیے، منیجر کہاں ہے۔''

لڑکی نے ہمت نہیں ہاری۔ ''کرایہ کم ہو سکتا ہے، میں تم سے صرف ستر ڈالرز لوں گی کیونکہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔''

''میرا خیال ہے منیجر کا کمرا وہ ہے۔'' جونز نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا تو لڑکی نے ہتھیار ڈال دیے۔

''تمہاری مرضی۔'' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تیسری منزل پر ایک کمرا خالی ہے واش روم کے ساتھ۔ کرایہ پندرہ امریکی ڈالرز روزانہ ہوگا۔''

جونز نے ابھی پاسپورٹ نہیں دکھایا تھا لیکن ہوشیار لڑکی اس کی زبان اور انداز سے بھانپ گئی تھی کہ وہ امریکی ہے اس لیے ڈالرز میں ریٹ بتا رہی تھی۔ جونز نے دو دن کے لیے کمرا بک کرایا اور کرایہ پیشگی ادا کر دیا۔ لڑکی اسے کمرا دکھانے ساتھ گئی اور کمرے میں آتے آتے اس کا موڈ پھر خوشگوار ہو گیا، اس نے جونز سے کہا۔ ''میں ماریا ہوں اگر تم اکیلے ہو اور تفریح کے لیے آئے ہو تو میں شام کو تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔''

اس بار جونز نے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی اسے معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی مقامی آدمی کی مدد کی ضرورت تھی اور یہ لڑکی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ جونز نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم کتنے بجے آف کرتی ہو؟''

ماریا کھل اٹھی۔ ''چھ بجے... لیکن میں گھر جا کر تیار بھی ہوں گی۔''

''میں سات بجے ہوٹل کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔''

جونز راضی ہو گیا۔ اس نے پچاس ڈالرز کا ایک نوٹ نکال کر لڑکی کی شرٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔ ''اسے پیشگی سمجھو۔''

ماریا خوشی سے جھومتے ہوئے واپس چلی گئی اس سوچ کے ساتھ کہ اس نے دولت مند امریکی کو پچاس ڈالرز میں گھیر لیا ہے۔ جونز نے اسی لیے اسے نوٹ دیا تھا۔ طویل فلائٹ نے اسے تھکا دیا تھا لنچ اس نے طیارے میں ہی کر لیا تھا، اس لیے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ چھ بجے اٹھ کر اس نے غسل کیا اور باہر آ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کے مشورے کے مطابق اس نے اپنی رقم اپنے پاس ہی رکھی تھی۔ کمرے کا تالا نہایت عام قسم کا تھا اور اسے بہ آسانی کھولا جا سکتا تھا۔ ہوٹل کے نزدیک ایک بار میں وہ بیئر سے شغل کرتا رہا اور سات بجے باہر نکل آیا۔ ماریا ٹھیک سات بجے نمودار ہوئی تھی، اس نے منی اسکرٹ پہن رکھا تھا جس میں اس کی سڈول ٹانگیں نمایاں تھیں۔ اس نے پاس آ کر جونز کے بازو میں بازو ڈالا۔

''ہائی ہینڈسم، یہ بتاؤ کہ کس قسم کی تفریح پسند کرو گے؟''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہاں نائٹ کلب بھی ہیں۔ ناچ گھر اور فائٹ کلب بھی۔'' ماریا نے وضاحت کی۔ ''چوتھی تفریح میں ہوں اور اپنے ریٹ تمہیں بتا چکی ہوں۔''

جونز نے جلدی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے فائٹ کلب ٹھیک رہے گا۔''

''لیکن وہاں جانے والوں کو داؤ لگانا پڑتا ہے کم سے کم بھی پانچ ڈالرز ہوتے ہیں۔'' ماریا نے اسے خبردار کیا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

فائٹ کلب قصبے کے وسط میں پہاڑی کو اندر سے کاٹ کر بنایا گیا ہال ثابت ہوا۔ پیچیدہ قسم کی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ وہاں پہنچے۔ جونز راستے کی نشانیاں دیکھتا رہا کیونکہ اگر وہ نشانیوں کا دھیان نہ رکھتا تو ماریا کی مدد کے بغیر مشکل سے ہی نیچے واپس پہنچتا۔ ہال بڑا تھا لیکن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ساتھ ہی وہاں منشیات اور سگریٹ کا دھواں بھی بھرا ہوا تھا۔ اکثر لوگ بیئر پی رہے تھے اور اونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ ہال میں تین رنگ تھے۔ وہ ایک رنگ کے گرد رکھی کرسیوں پر آ گئے۔ فائٹ شروع ہونے سے پہلے والے دونوں لڑاکوں کی رونمائی ہوئی اور ایک مکی سب سے رقم جمع کرنے لگا۔ وہ سب سے پانچ پانچ ڈالرز لے رہا تھا۔ لڑاکوں کی نشان دہی سرخ اور نیلے بینڈ سے کی جا رہی تھی۔ جس پر داؤ لگایا جاتا اس کے رنگ کا بینڈ مل جاتا۔ ہارنے والا اپنی رقم سے محروم

ہوجاتا اور جیتنے والے کو پانچ کے بدلے نو ڈالرز ملتے۔ ایک ڈالر بکی کی فیس ہوتی۔

جونز جانتا تھا اس قسم کے مقابلوں میں لوگوں کی جیب خالی کرائی جاتی تھی۔ جس پر زیادہ داؤ لگتا تھا وہ لازمی ہار جاتا اور لوگ اپنی رقم سے محروم ہوجاتے۔ آنے والوں میں اکثر سیاح تھے جو ایک بار لُٹ کر دوبارہ یہاں کا رخ نہیں کرتے۔ جونز دیکھ رہا تھا کہ بہت سارے جو صورت سے مقامی لگ رہے تھے انہوں نے کوئی رقم نہیں لگائی تھی اس کے بجائے وہ نشہ کررہے تھے۔ جونز نے اپنی اور مارسیا کی طرف سے دس ڈالرز نیلے بینڈ والے لڑکے پر لگا دیے۔ وہ دبلا تھا اور زیادہ تر لوگ اس کے مخالف پر داؤ لگا رہے تھے۔ مگر فائٹ شروع ہوتے ہی اس نے بجلی کی طرح لپک لپک کر حملے شروع کر دیے جبکہ اس کا بھاری بھرکم مخالف ست تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان نے اسے لمبا لٹا دیا۔ جونز نے دیکھا کہ وہ خاص مزاحمت کے بغیر ہی لیٹ گیا تھا اور اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے آہستہ سے مارسیا سے کہا۔ ''یہ نُورا کشتی ہے۔''

''کشتیاں ساری نُورا ہی ہوتی ہیں۔''

''لیکن یہاں لوگوں کو دھوکا دیا جارہا ہے۔''

''شش... کسی نے سن لیا تو تم بلاوجہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔'' مارسیا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم ایک منٹ رکو میں ذرا واش روم سے آتی ہوں۔''

مارسیا چلی گئی۔ اس دوران میں دوسری فائٹ شروع ہونے والی تھی۔ ایک فائٹ مشکل سے دس منٹ کی ہوتی تھی اور پانچ منٹ کے وقفے کے بعد دوسری فائٹ شروع ہو جاتی تھی۔ گویا ایک گھنٹے میں چار فائٹ ہوتی تھیں اور تین رنگ تھے یعنی بارہ فائٹ فی گھنٹا۔ وہاں موجود افراد کی تعداد کسی طرح تین سو سے کم نہیں تھی اگر اس میں دو سو سیاح تھے تو یہ لوگ اچھی خاصی کمائی کررہے تھے۔ وہاں کم سے کم ایک درجن افراد ایسے تھے جو شکل اور حلیے سے بدمعاش لگ رہے تھے اور وہ مسلح بھی تھے۔ ان کا کام کاروبار کو تسلی بخش انداز میں جاری رکھنا تھا اور اگر کوئی اس میں رخنہ ڈالے تو وہ اس کی گوشمالی کے لیے مستعد تھے۔ بکی اس سے رقم لینے آیا تو جونز نے انکار کردیا۔ ''میں نہیں کھیل رہا۔''

''تو پھر یہاں کیا کررہے ہو؟'' بکی نے اسے گھورا اور ایک بدمعاش نظر آنے والے شخص کو اشارہ کیا وہ فوراً آگے آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ جونز کو ہاتھ لگاتا وہ خود کھڑا ہوگیا اور لوگوں کے ہجوم کے درمیان سے گزرتے ہوئے باہر جانے لگا۔ اسی لمحے اس کی نظر مارسیا پر پڑی وہ دو قسم کے نوجوانوں سے بات کررہی تھی اور پھر اس نے جونز کو دیکھ لیا، اس نے مضطرب انداز میں نوجوانوں سے کچھ کہا تو انہوں نے پلٹ کر جونز کی طرف دیکھا اور لوگوں کو دھکیلتے ہوئے اس کی طرف آنے لگے۔ جونز کو خطرے کا احساس ہوا اور وہ جلدی سے باہر کے دروازے کی طرف لپکا۔ باہر نکلتے ہی وہ ایک پتلی گلی میں مڑ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے نوجوانوں کو دھوکا دے دیا تھا لیکن وہ بھی کم نہیں تھے انہوں نے درست اندازہ لگایا کہ وہ کس طرف جاسکتا تھا۔ ان کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ یہ پتلی سی گلی شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی اور اس میں مزید کوئی راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ جونز بلندی کی طرف جارہا تھا۔

اسے کچھ دور ایک اور گلی بائیں جانب نکلتی دکھائی دی اور وہ اس میں گھوم گیا مگر وہ نوجوانوں کے بچھائے جال میں آگیا تھا۔ ایک اس کا پیچھا کررہا تھا اور دوسرا یہاں پہلے سے گھات لگائے بیٹھا تھا، وہ کسی مختصر راستے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اس نے گھومتے ہی جونز کے سر پر کسی بھاری لیکن نرم چیز سے وار کیا اور وہ چکرا کر وہیں گر گیا۔ اسے لگا کہ اس کی جیبیں ٹٹولی جارہی تھیں پھر اس کا پرس نکال لیا گیا۔ ساتھ ہی اس کا موبائل فون اور گھڑی بھی اتار لی گئی تھی۔ جونز میں اتنی سکت نہیں تھی کہ مزاحمت کرسکتا۔ اُچکے بہ آسانی اپنا کام کرکے نو دو گیارہ ہوگئے۔ وہ کچھ دیر پڑا اپنے حواس بحال کرتا رہا پھر لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس دوران میں گلی میں مکمل خاموشی رہی تھی۔ جب وہ کھڑا ہوا تو ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز نے کچھ پوچھا۔ وہ جس مکان کے سامنے لُٹا تھا اس کے دروازے کی جھری سے ایک آنکھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں امریکی ہوں، تم انگلش جانتی ہو؟''

''ہاں تھوڑی بہت... تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''دو اچکوں نے مجھے یہاں لوٹ لیا۔ میرے سر پر کچھ مارا تھا۔''

''اوہ۔'' عورت نے اب دروازہ کھول دیا۔ ''اندر آجاؤ جب تک تمہاری حالت بہتر نہیں ہوجاتی......''

جونز لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آیا اور ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ عورت اس کے لیے پانی لائی پھر اس نے جونز کو تلخ اور گرم کافی دی۔ کافی نے بہترین کام کیا اور وہ پوری طرح ہوش میں آگیا۔ اس کا سر پھٹا نہیں تھا اور نہ ہی کوئی گومڑ تھا۔ عورت جو اس کے سر کا معائنہ کررہی تھی اس نے کہا۔ ''شاید انہوں نے ریت کی تھیلی ماری ہوگی۔''

''شاید۔'' جونز نے پہلی بار عورت اور اس کے گھر کو غور سے دیکھا۔ وہ تقریباً تیس برس کی جوان اور دلکش عورت تھی۔ تانبے جیسی سرخ رنگت اور نقوش کسی قدر مقامی ہونے کے باوجود دلکش تھے۔ البتہ جسم متناسب اور چست تھا۔ جونز نے اندازہ لگایا کہ اس میں سفید فام خون کی آمیزش بھی تھی۔ گھر غریبانہ لیکن صاف ستھرا تھا، کچن میں چھوٹی سی میز کے گرد چار کرسیاں تھیں جن پر کپڑے کے کور چڑھے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا چولہا تھا اور دوسری جانب درمیانے سائز کا فریج رکھا تھا۔ جونز فریج پر لگی ایک تصویر دیکھ کر چونکا۔ تصویر ایک بچے کی تھی اور اس کی صورت ماریو روبیلو سے خاصی مل رہی تھی۔ بچہ چھ سات سال کا تھا مگر اس کی آئی برو کی چوٹ بالکل ویسی ہی تھی جیسی اس نے تصویر میں دیکھی تھی اور نقوش بھی مل رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ کیا وہ اتفاق سے اسی بچے کے گھر پہنچ گیا ہے جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ عورت اسے غور سے دیکھ رہی تھی اس نے بھانپ لیا تھا کہ وہ بچے کی تصویر دیکھ کر چونکا تھا۔ اب وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جونز زبردستی مسکرایا۔ ''معاف کرنا یہ تمہارا بچہ ہے؟''

عورت نے سر ہلایا۔ ''ہاں، ماریو میرا ایک ہی بیٹا ہے۔''

اب شک کی گنجائش نہیں تھی۔ ''اس کا باپ...؟''

''وہ مرچکا ہے۔'' عورت کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔ ''جب ماریو چھ برس کا تھا تب گیریو کو کسی نے قتل کردیا۔''

''اوہ، مجھے افسوس ہے۔'' جونز نے کہا۔ ''سوری میں نے اپنا نام نہیں بتایا میں جونز ملر ہوں۔''

''روز روبیلو!'' عورت نے اپنا تعارف کرایا۔ ''تم ماریو کی تصویر دیکھ کر چونکے کیوں تھے؟''

''میرا خیال ہے میں نے اس بچے کو کچھ دیر پہلے فائٹ کلب میں دیکھا تھا۔ لیکن وہ تقریباً بارہ سال کا لڑکا ہے۔'' جونز نے بات بنائی۔

''تم نے درست نوٹ کیا ماریو اب بارہ سال کا ہی ہے اور اسے فائٹ کلب پسند ہے لیکن تم وہاں کیا کرنے گئے تھے، غیر ملکیوں کے لیے وہ کوئی اچھی جگہ نہیں ہے؟''

''مجھے مارسیا لے گئی تھی، وہ اس ہوٹل میں کام کرتی ہے جہاں میں ٹھہرا ہوں۔'' جونز نے جھینپ کر کہا۔

''مارسیا۔'' روز نے گہری سانس لی۔ ''وہ اچھی لڑکی نہیں ہے میرا مطلب ہے......وہ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور یہاں آنے والے سیاحوں کو لٹوا دیتی ہے۔''

جونز نے اپنا دکھتا ہوا سر ٹٹولا۔ ''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میرا پرس اور اس میں موجود تمام رقم گئی۔ صرف پاسپورٹ بچا ہے۔ گھڑی اور موبائل بھی لے گئے۔''

''اوہ، اب تم کیا کرو گے؟'' روز کے لہجے میں ہمدردی آگئی تھی۔

''دیکھو......'' جونز نے مبہم انداز میں جواب دیا اور کھڑا ہوگیا۔ ''تمہاری مدد اور کافی کا شکریہ۔''

روز ہچکچائی پھر اس نے ایک دراز کھول کر اس میں سے کچھ رقم نکال کر جونز کی طرف بڑھائی۔ ''یہ رکھ لو تم خالی ہاتھ نہیں رہو گے۔''

جونز نے جلدی سے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''پلیز۔'' روز نے اصرار کیا تو اس نے رقم لے لی۔ یہ پچاس ریل تھے جو تقریباً پچیس امریکی ڈالرز بنتے تھے۔

''میں یہ رقم واپس کردوں گا۔''

''اگر تمہیں آسانی ہو تو۔'' روز مسکرائی۔ ''ورنہ اتنی ضروری بھی نہیں ہے۔''

جونز ہچکچایا لیکن پھر اس نے کہا۔ ''ایک سوال کرسکتا ہوں؟''

''ہاں پوچھو۔''

''گیریو کے بعد تم گھر کیسے چلا رہی ہو؟ کیا تم جاب کرتی ہو؟''

''اگر تم اسے جاب سمجھو تو۔'' روز نے جواب دیا۔ ''میں میلڈو جیکوئس کے نائٹ کلب میں کام کرتی ہوں۔ اتفاق سے فائٹ کلب بھی اسی کی ملکیت ہے۔''

جونز نے پوچھا نہیں کہ وہ کیا کام کرتی ہے، اسے معلوم تھا کہ نائٹ کلب میں عورتیں کیا کرتی ہیں۔ وہ باہر نکل آیا۔ فائٹ کلب کا ماحول اس نے دیکھ لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میلڈو جیکوئس کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ ساتھ ہی وہ طاقتور بھی تھا۔ جونز نے دیکھا کہ گلی کے کونے پر ایک آدمی موجود تھا اور جیسے ہی وہ باہر آیا۔ آدمی جلدی سے رخ موڑ کر کھڑا ہوگیا۔ کیا وہ اس کی یا اس مکان کی نگرانی کررہا تھا۔ جونز نیچے کی طرف جانے لگا تو اس نے آدمی کو اپنے پیچھے پایا۔ وہ ہوٹل تک اس کے ساتھ آیا تھا لیکن وہ باہر ہی رک گیا۔ جونز نے چابی لی اور اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے دو دردکش گولیاں کھائیں اور لیٹ گیا۔ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا کیونکہ ابھی اس کا موڈ نہیں تھا۔ سر کا درد کبھی بڑھ جاتا اور کبھی کم ہوتا رہا۔ اگلی صبح وہ اٹھا تو سر کا درد غائب تھا لیکن پیٹ میں بھوک سے درد ہو رہا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ باہر آیا تو رات کو اس کا پیچھا کرنے والا بھی نظر نہیں

آیا۔ کوئی اور شخص بھی نگرانی کرتا دکھائی نہیں دیا تھا۔

وہ سڑک پر کسی فون بوتھ کی تلاش میں تھا بالآخر اسے ایک فون بوتھ نظر آ گیا۔ اگرچہ اس میں نہایت قدیم طرز کا خستہ حال فون لگا ہوا تھا لیکن وہ کام کر رہا تھا۔ جونز نے سکے لے لیے تھے، اس نے سلاٹ میں کئی سکے ڈالے اور ایک نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ''جونز بات کر رہا ہوں۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔''

''کیسی مدد کی؟''

''کل رات دو اچکوں نے مجھے لوٹ لیا۔ مجھے رقم ایک موبائل فون اور کسی ہتھیار کی ضرورت ہے۔''

''ٹیکسی لے کر ریو ڈی جنیرو کے ال پانیما بیچ پر آجاؤ۔ وہاں میں خود تمہیں دیکھ لوں گا۔''

سینیٹر گورڈن نے اسے جو کاغذ یاد کرایا تھا اس میں ایک فون نمبر بھی تھا، کسی مشکل کی صورت میں وہ یہاں کال کر کے مدد لے سکتا تھا۔ جونز کو نہیں معلوم تھا کہ اس نمبر پر اسے کون ملے گا۔ اس نے ٹیکسی لی اور ال پانیما روانہ ہو گیا۔ وہ راستے میں عقبی آئینے میں دیکھتا رہا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے لیکن عقب میں گاڑیوں کا بے تحاشا ہجوم تھا جس میں کسی خاص گاڑی پر نظر رکھنا ممکن نہیں تھا۔ پون گھنٹے بعد وہ ساحل سمندر پر تھا جہاں نہانے والوں سے زیادہ غسل آفتابی کے شوقین خواتین و حضرات کا ہجوم تھا اور ان میں سے بیشتر غیر ملکی باشندے تھے۔ جونز نے ٹھنڈی سانس لی وہ اس جگہ تفریح کے بجائے کام سے آیا تھا۔ ابھی وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی جو برمودا شارٹ اور پھولدار نیلی شرٹ پہنے ہوئے تھا اس کے پاس آیا اور آہستہ سے بولا۔ ''سینیٹر گورڈن... میرے ساتھ آؤ۔''

جونز اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اسے ایک اوپن ایر ریستوران میں لے آیا۔ گرمی تھی لیکن ساحل کی طرف سے تیز ہوا چل رہی تھی۔ ویٹریس ان کے بیٹھتے ہی نازل ہو گئی۔ ادھیڑ عمر آدمی نے اسے ٹھنڈی بیئر لانے کو کہا اور اس کے جاتے ہی ایک لفافہ نکال کر جونز کی طرف بڑھا دیا۔ ''ہوا کیا تھا؟''

جونز نے اسے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور لفافے کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ اس میں ڈالرز، ایک موبائل فون اور ایک عدد ریوالور اور اس کی فاضل گولیاں تھیں۔ اس نے رقم اور موبائل الگ الگ جیبوں میں رکھے اور ریوالور لفافے کے ساتھ ہی پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔ ادھیڑ عمر آدمی نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ البتہ اس نے کام کے بارے میں پوچھا۔ ''لڑکے کا سراغ لگا؟''

''میرا خیال ہے تم یہ بات پوچھنے کے مجاز نہیں ہو۔'' جونز نے اسے گھورا تو اس نے سر ہلایا۔

''لڑکے کو یہاں سے لے جانے کا انتظام مجھے کرنا ہے۔''

''جب وہ مل جائے گا تو میں کال کر دوں گا۔'' جونز نے کہا اور کھڑا ہو گیا پھر اسے خیال آیا۔ ''کیا تم میلڈ جیکوئس کے بارے میں جانتے ہو؟''

ادھیڑ عمر آدمی نے سر ہلایا۔ ''وہ ایک طرح سے جوز ٹاؤن کا بے تاج بادشاہ ہے۔ وہاں ہونے والا ہر جرم اس کے اشارے پر ہوتا ہے اور منشیات کا بہت بڑا بیوپاری بھی ہے۔''

''کیا یہ بات یہاں کی پولیس نہیں جانتی ہے؟''

''جانتی ہے اور اسے گرفتار کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے لیکن وہ بہت چالاک آدمی ہے اپنے کسی جرم کا کوئی سراغ نہیں چھوڑتا۔'' ادھیڑ عمر آدمی نے کہا اور ویٹریس کو بیئر لاتے دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے ایک نوٹ میز پر رکھا اور ویٹریس سے بولا۔ ''اس میں تمہاری ٹپ شامل ہے بیئر واپس لے جاؤ۔''

ویٹریس خوش ہو گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ادھیڑ عمر آدمی بھی اٹھ گیا۔ ''تم جس کام سے آئے ہو اس پر توجہ دو۔ ایک مہینے میں سے چار دن گزر چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق برازیل کی پولیس جلد میلڈ و جیکوئس اور اس کے گینگ کے خلاف کارروائی کرنے والی ہے۔''

جونز نے واپسی کے لیے ٹیکسی کے بجائے بس کا انتخاب کیا۔ اس طرح اسے اندازہ لگانے میں آسانی رہتی کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا تھا یا نہیں۔ وہ اب تک الجھن میں تھا کہ روز کے مکان سے پیچھے لگنے والا آخر اس کے پیچھے کیوں آیا تھا؟ اگر وہ روز کی نگرانی کر رہا تھا تو اس کے پیچھے آنے کا مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ اگر وہ اس کی نگرانی کر رہا تھا تب یہ سلسلہ اب تک جاری رہنا چاہیے تھا۔ بس نے اسے تقریباً پورا ریو ڈی جنیرو گھما کر جوز ٹاؤن پہنچایا تھا۔ وہ اسٹاپ سے پیدل ہوٹل کی طرف چل پڑا تھا۔ راستے میں اس نے بچوں کی ایک ٹولی کو آپس میں لڑتے دیکھا۔ بلکہ ایک لڑکا تین لڑکوں سے نبرد آزما تھا۔ قریب آنے پر جونز نے اسے شناخت کر لیا وہ ماریو ربیلو تھا۔ تینوں لڑکے اس کے ہم عمر تھے اور جسامت میں سب ایک جیسے تھے۔ ماریو بہت پھرتی دکھا رہا تھا اس وجہ سے وہ اس پر حاوی ہونے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے لیکن وہ تین تھے۔ جونز سڑک کی دوسری جانب تھا وہ رک کر دیکھنے لگا۔

اچانک ایک جوان اور چہرے سے جرائم پیشہ نظر آنے والا شخص بچوں کی طرف جھپٹا اور اس نے تینوں لڑکوں کو تھپڑ اور گھونسے مار کر ماریو سے دور کر دیا ساتھ ہی وہ چلا چلا کر مقامی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے الفاظ ماریو کی سمجھ میں نہیں آئے تھے لیکن انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ماریو سے لڑنے پر ان تینوں لڑکوں کو سخت سست سنا رہا تھا۔ اچانک اس نے تینوں لڑکوں کو ایک ایک تھپڑ رسید کیا تو وہ گرتے پڑتے وہاں سے بھاگ نکلے۔

لڑکوں کے بھاگنے کے بعد جوان آدمی بھی ایک طرف چل پڑا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ اس نے ماریو کو بچوں سے بچایا تھا لیکن اس نے نہ تو ماریو سے بات کی تھی اور نہ ہی اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ دوسری طرف ماریو کا انداز حیرت انگیز تھا وہ کینہ توز نظروں سے جوان آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا پھر وہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگا، ذرا آگے آنے کے بعد اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا بٹن دبا کر کھلنے والا چاقو نکال لیا۔ جونز نے یہ دیکھتے ہی تیزی سے سڑک کراس کی اور ماریو کے برابر میں چلنے لگا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے اتنا سا چاقو اس کے لیے ناکافی ہے۔''

ماریو چلتے چلتے رک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے انگلش آتی تھی۔ اس نے جونز کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کون ہو تم؟... امریکی؟''

جونز کو حیرت تھی کہ تقریباً ہر شخص اسے امریکی کی حیثیت سے شناخت کر لیتا تھا کوئی اسے انگریز سمجھنے کی غلطی نہیں کرتا تھا۔ جونز نے سر ہلایا اور جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھا۔ ''میرا نام جونز ہے..... تمہاری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔''

ماریو نے اس سے رومال نہیں لیا اور بے پروائی سے ٹی شرٹ کے دامن سے ناک صاف کی۔ جونز نے شانے اچکا کر رومال واپس جیب میں رکھ لیا۔ اس نے ماریو سے پوچھا۔ ''تم پڑھے لکھے ہو؟''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ایسے ہی، تمہاری انگلش بہت اچھی ہے۔''

ماریو نے سر ہلایا۔ ''میں نے چار سال امریکن اسکول میں پڑھا ہے۔ وہ ریو ڈی جنیرو میں تھا پھر ہم یہاں آ گئے۔ اب میں یہاں اسکول میں پڑھتا ہوں۔''

نزدیک ہی گروسری شاپ تھی۔ جونز نے وہاں سے کولڈ ڈرنک کے دو ٹن لیے۔ ایک اپنے لیے کھولا اور دوسرا ماریو کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد ٹن تھام لیا اور اسے کھول کر ایک ہی سانس میں آدھا کر دیا۔ پھر ہاتھ کی پشت سے منہ صاف کیا۔ وہ دونوں سڑک کے ساتھ ایک بنچ پر آ بیٹھے تھے۔ ماریو نے سوال کیا۔ ''تم مجھے جانتے ہو؟''

''ہاں تبھی تمہاری طرف آیا ہوں۔''

''کیسے جانتے ہو؟''

کل فائٹ کلب سے نکلنے کے بعد مجھے دو لڑکوں نے لوٹنے کی کوشش کی ان سے بچنے کے لیے بھاگا لیکن تمہارے گھر کے سامنے انہوں نے مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا۔ میرا پرس، موبائل اور گھڑی لے کر بھاگ گئے۔ اتفاق سے تمہاری ماں نے دیکھ لیا اور اس نے مجھے اندر بلا کر کافی پلائی اور کچھ رقم دی تھی، میں نے وہیں تمہاری تصویر فریج پر دیکھی تھی۔''

''وہ پرانی تصویر ہے۔'' ماریو کے لہجے میں شک تھا۔

''لیکن یہ زخم کا نشان ویسا ہی ہے۔'' جونز نے اس کی کٹی ہوئی آئی برو کو چھوا۔ ''اس سے تم آسانی سے پہچانے جاتے ہو۔''

جونز کا خیال تھا کہ لڑکا آسانی سے اس کی باتوں میں آ جائے گا لیکن یہ بات سن کر بھی اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی وہ بہ دستور اسے گھورتا رہا پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن میرے پیچھے کیوں آئے ہو؟''

''میں تمہیں بڑی پریشانی سے بچانا چاہتا تھا، تمہارا کیا خیال ہے تم اس ننھے سے چاقو سے اس بڑے آدمی کو جو صورت سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا ہے قتل کر دیتے... نہیں بیٹے، یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔''

''مجھے بیٹا مت کہو۔'' ماریو کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ''یہ حق صرف میرے باپ کو تھا اور وہ مر چکا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔''

جونز کی بات پر ماریو کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں میں گہری نفرت آ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک دن میں اپنے باپ کے قاتل کو ضرور مار دوں گا۔''

جونز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم جانتے ہو تمہارے باپ کا قاتل کون ہے؟''

ماریو نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ ''ہاں جانتا ہوں۔ میلڈ و جیکوئس میرے باپ کا قاتل ہے۔''

جونز دم بہ خود رہ گیا تھا۔ یہ تو نہایت عجیب کہانی اس کے سامنے آ رہی تھی۔ اول تو یہ کیس ہی اس کے لیے حیران

کن تھا۔ ایک طاقتور اور دولت مند ترین امریکی سینیٹر نے اسے ماریو روبیلو کی تلاش کی ذمے داری سونپی۔ اسے بچے کو صرف تلاش نہیں کرنا تھا بلکہ اسے امریکا بھی لانا تھا اور سینیٹر گورڈن اس کے لیے خطیر رقم خرچ کر رہا تھا۔ دوسری طرف بچہ اور اس کی ماں نہایت غربت میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہ رہے تھے اور ماریو کی ماں روز کو جو ایک خوب صورت عورت تھی، گھر چلانے کے لیے میلڈو جیکوئس کے نائٹ کلب میں کام کرنا پڑتا تھا اور اب ماریو انکشاف کر رہا تھا کہ میلڈو جیکوئس ہی اس کے باپ کا قاتل ہے۔ جونز نے کچھ دیر بعد کہا۔

''تمہاری ماں جیکوئس کے نائٹ کلب میں کام کرتی ہے۔''

''وہ مجبور ہے۔'' ماریو نے جواب دیا۔ ''میرے باپ کے مرنے کے بعد جیکوئس کے آدمی ہمیں یہاں لے آئے۔ اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔ جیکوئس کے آدمی ہماری نگرانی کرتے ہیں۔''

بے اختیار جونز نے آس پاس دیکھا اور اس نے سڑک کے پار اس آدمی کو دیکھ لیا جس نے گزشتہ رات روز کے گھر سے اس کا پیچھا کیا تھا۔ ماریو کی بات درست تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ میلڈو جیکوئس ایسا کیوں کر رہا تھا۔ یقیناً گیریو روبیلو سے اس کی دشمنی تھی اسی بنا پر اس نے اسے قتل کر دیا یا کرا دیا تو اب اسے گیریو کے بیوی بچے سے کیا مطلب تھا۔ روز خوب صورت عورت تھی لیکن اس کا حسن ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے وجہ قرار دیا جاتا۔ ماریو ایک عام سا بچہ تھا۔ جونز نے یہی سوال ماریو سے پوچھا۔ ''جیکوئس ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

''میں نہیں جانتا، مجھے اس سے نفرت ہے اور میں اسے قتل کر دوں گا۔''

جونز نے جب یہ کیس لیا تو اسے تجسس تھا کہ ایک سینیٹر اس بچے کو کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید سینیٹر سے اس کا کوئی خونی رشتہ ہو لیکن بچے کے خدوخال گواہی دے رہے تھے کہ اس کا سینیٹر سے کوئی خونی رشتہ ممکن ہی نہیں ہے۔ بچہ اور اس کی ماں غریب پس منظر سے تعلق رکھتے تھے۔ خوش قسمتی سے اسے ماریو کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہ خود ہی اسے مل گیا لیکن یہاں سے ایک نئی کہانی سامنے آئی تھی۔ جوز ٹاؤن کا بے تاج بادشاہ اور مافیا کا باس میلڈو جیکوئس بھی ماریو میں دلچسپی رکھتا تھا اس نے ماریو کے باپ کو قتل کیا اور ان دونوں ماں بیٹے کو جوز ٹاؤن میں لے آیا۔ ماریو کی ماں روز جیکوئس کے نائٹ کلب میں کام کرتی تھی اور خود ماریو جیکوئس کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

جونز نے ماریو کی طرف دیکھا۔ ''تم جوز ٹاؤن نکلنا چاہتے ہو؟''

''ہاں مجھے اس جگہ سے بھی نفرت ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ بات تم کسی کو بتاؤ گے نہیں، اپنی ماں کو بھی نہیں...... ٹھیک ہے؟''

ماریو نے سر ہلایا تو جونز ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ نگرانی کرنے والے نے اس کے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ ماریو کی نگرانی کر رہا تھا۔ مارسیا ہوٹل میں موجود تھی اور جونز کو دیکھ کر اس کا رنگ ایک لمحے کو بدلا لیکن جونز اس سے بالکل نارمل انداز سے ملا۔ ''تم کہاں چلی گئی تھیں میں بور ہو کر باہر نکلا تو دو اچکے پیچھے لگ گئے اور ایک گلی میں گھیر کر انہوں نے مجھے لوٹ لیا۔''

''اوہ۔'' مارسیا نے سکون کا سانس لیا اور مصنوعی ہمدردی سے بولی۔ ''میں بھی پریشان ہو گئی تھی، یہاں کسی اجنبی کا اکیلے گھومنا ٹھیک نہیں ہوتا، تمہارا زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟''

''ساری رقم اور موبائل کے ساتھ گھڑی بھی گئی۔'' جونز نے جواب دیا۔ ''اب میرے پاس زیادہ رقم نہیں بچی۔''

اگر مارسیا اسے احمق جان کر دوبارہ تفریح پر چلنے کی دعوت دینے والی تھی تو اس نے یہ سنتے ہی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ لنچ اس نے ڈائننگ ہال میں کیا۔ ہوٹل کی طرح یہاں کھانا بھی گزارے لائق تھا۔ وہ شام پانچ بجے تک کمرے میں رہا اور پھر باہر آ گیا۔ ہوٹل سے باہر آ کر اس نے سڑک کے پار موجود بار کا رخ کیا اور وہاں ایک ایسی میز سنبھال لی جہاں سے وہ ہوٹل کے دروازے پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے بیئر کا گلاس منگوا لیا۔ بار کے ٹی وی پر فٹ بال میچ لگا ہوا تھا اور تقریباً تمام افراد ٹی وی کی طرف متوجہ تھے۔ جونز نے برازیل میں فٹ بال کا کریز پایا تھا ہر وہ شخص جو فٹ بال کھیل نہیں سکتا تھا وہ دیکھتا ضرور تھا۔

چھ بجے مارسیا ہوٹل سے نکلی اور اپنا بڑا سا بیگ شانے پر ٹانگے ایک طرف پیدل چل پڑی۔ جونز نے بل پہلے ادا کر دیا تھا۔ وہ باہر نکل آیا اور سڑک کے دوسری طرف رہتے ہوئے مارسیا کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اچانک اوپر کی طرف جانے والی ایک گلی میں مڑ گئی۔ سورج ڈوب گیا تھا اور گلیوں میں اندھیرا تھا۔ جونز کو تعاقب کرنے میں آسانی ہو رہی تھی کیونکہ اگر مارسیا پلٹ کر دیکھتی بھی تو وہ جونز کو نہیں پہچان سکتی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد

وہ ایک احاطے میں داخل ہوئی جس کے چاروں طرف کئی منزلہ عمارتیں تھیں اور یہ احاطہ ان عمارتوں کا مشترکہ صحن بھی تھا۔ مارسیا سیڑھیاں چڑھ کر ایک عمارت کی دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں چلی گئی۔ احاطے میں کچھ عورتیں سرِشام ہی ٹہل رہی تھیں اور ان کا انداز اور حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ کال گرل ہیں اور گاہکوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ اسے دیکھ کر ایک ادھیڑ عمر اور چوڑے منہ والی عورت اس کی طرف آئی۔

”اونلی ٹوئنٹی ڈالرز۔“ اس نے مقامی لہجے میں کہا۔

جونز نے اس کا معائنہ کیا اور سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے بولا۔ ”بہت مہنگی ہو۔“

عورت مقامی زبان میں اسے مغلظات سناتی ہوئی واپس چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور اس کی طرف آتی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور اس دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور مارسیا نے اس کی جھلک دیکھتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن جونز آرام سے اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ اگر کوئی نیچے سے دیکھ رہا تھا تو اسے لگا ہوگا کہ جونز کو اندر بلایا گیا ہے۔ مارسیا نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ جونز نے ریوالور نکال لیا۔ مارسیا کا منہ فوراً بند ہو گیا اور اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”ان دو لفنگوں کا پتا جنہوں نے مجھے لوٹا تھا۔“

”میں نہیں جانتی...“ مارسیا نے ہٹ دھرمی سے کہنا چاہا تو جونز نے ریوالور کی نال اس کے منہ میں ٹھونس دی اور آہستہ سے بولا۔

”مجھے خوب صورت لڑکیوں پر بالکل رحم نہیں آتا۔ مجھے صرف ان کا نام پتا چاہیے۔ اگر تم مشکل میں پڑنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔“

اس بار مارسیا سچ مچ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ جونز نے نال ہٹائی تو اس نے کہا۔ ”وہ بہت خطرناک لوگ ہیں انہیں شبہ ہو گیا تو میری موت بہت دردناک ہوگی۔“

”انہیں شبہ نہیں ہوگا۔ اگر تم ان کے بارے میں بتا دو تو میں بھول جاؤں گا کہ یہاں تم سے ملاقات ہوئی ہے لیکن تم نے نہیں بتایا تو میں انہیں تلاش کر لوں گا اور انہیں یہ بتاؤں گا کہ ان کے بارے میں تم نے مجھے بتایا ہے اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

یہ سن کر مارسیا کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ ”پلیز نہیں وہ سچ مچ مجھے مار ڈالیں گے۔“

”تم مجھے ان کے نام اور پتا بتا دو۔“

”ڈونیلو اور گارمین ان بدمعاشوں کے نام ہیں وہ شام کے بعد فائٹ کلب میں پائے جاتے ہیں جہاں وہ آنے والے سیاحوں کو تاڑتے اور موقع پا کر انہیں لوٹ لیتے ہیں۔“ جونز نے نیچے ایک دکان سے پی کیپ لی اور اسے یوں پہن لیا کہ اس کا چہرہ ذرا سا چھپ گیا۔ راستے میں اس نے ایک مکان کے سامنے رکھا بیس بال کا چھوٹا سا بلا اٹھا لیا جو کسی بچے کا تھا لیکن ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ وہ فائٹ کلب میں داخل ہوا۔ ڈونیلو اور گارمین وہاں موجود تھے۔ جونز انہیں دیکھ کر وہاں سے نکل آیا۔ اس نے فائٹ کلب کے پاس ہی ایک تاریک گلی میں پوزیشن سنبھال لی اور دیوار سے یوں ٹک کر کھڑا ہو گیا جیسے نشے نے اسے بے بس کر دیا ہو۔ دو افراد نے یکے بعد دیگرے اس کی تلاشی لینا چاہی لیکن ایک ایک گھونسا کھا کر وہ بھاگ نکلے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ڈونیلو اور گارمین ایک موٹے اور ادھیڑ عمر سیاح کے پیچھے باہر آئے۔ وہ نشے میں دھت ہو رہا تھا اور اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں بوتل تھی، وہ نیچے کی طرف چل پڑا۔ وہ دونوں اس کے پیچھے تھے اور جونز ان کے پیچھے۔ ایک سنسان گلی میں ان دونوں نے ادھیڑ عمر آدمی کو گھیر لیا اور اسے زمین پر گرا کر ٹھوکروں سے مارنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں لوٹ مار کے علاوہ مار پیٹ سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ حالانکہ موٹے آدمی نے مزاحمت نہیں کی تھی لیکن وہ بلاوجہ اسے پیٹ رہے تھے۔ جونز دبے قدموں ان تک پہنچا اور اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہوتے اس نے ایک کا سر بجایا، وہ کراہ کر گرا تو دوسرا چونکا اور اس نے چاقو نکال لیا لیکن جونز نے اسے استعمال کا موقع نہیں دیا، دوسرا وار اس نے چاقو والے کے ہاتھ پر کیا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز اس کی بلبلاہٹ میں دب گئی۔ جونز نے چند وار مزید کیے اور اس بات کو یقینی بنا دیا کہ اب ایک مہینے تک وہ کسی واردات کے قابل نہیں رہیں گے دونوں کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور انہیں خاصے عرصے پلاسٹر میں بند رہنا تھا۔ موٹا آدمی کھڑا ہو گیا اور جب جونز ان دونوں کی مرمت کر رہا تھا تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نیچے جانے لگا۔ اپنا کام مکمل کر کے جونز نے بلا ایک طرف پھینک دیا۔ اس نے دونوں کی تلاشی لی اور ان کے پاس موجود ساری رقم نکال لی۔ اس کا موبائل نہیں تھا اس نے ان کے موبائل پٹخ کر توڑ دیے۔ اپنا کام کر کے وہ دوبارہ اوپر کی طرف چل پڑا۔ اس کا رخ روز کے مکان کی طرف تھا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں روز نے باہر جھانکا اور اسے دیکھ کر ہچکچائی۔

”سوری، میں کام پر جا رہی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں میں تمہارا قرض واپس کرنے آیا تھا۔“ جونز نے جیب سے رقم نکال کر اس کی طرف بڑھائی لیکن روز نے رقم نہیں لی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔

”اندر آجاؤ۔“

جونز اندر آیا۔ روز نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کیتلی میں پانی چڑھا دیا پھر وہ اس کے سامنے آبیٹھی۔ اس نے غور سے جونز کو دیکھا۔ ”بہ ظاہر تم اتفاق سے یہاں آئے میں نے ڈونیلو اور گارمین کو دیکھا تھا جب وہ تمہیں لوٹ رہے تھے۔ اس کے باوجود مجھے لگتا ہے یہ پوری طرح اتفاق نہیں ہے۔“

”وجہ؟“

”تم آج دوپہر میں ماریو کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس سے کیسے ملے؟“

جونز مسکرایا۔ ”ایک اور اتفاق تھا۔“

”ماریو تم سے بہت گھل مل کر بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے کسی سے اس طرح بات کرتے نہیں دیکھا۔“

جونز سوچ رہا تھا کہ روز کو پوری بات بتائے یا نہیں کہ وہ کس طرح ماریو سے ملا تھا لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ”اسے کچھ لڑکے مار رہے تھے میں نے بیچ بچاؤ کرایا تھا۔“

روز کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔ ”وہ جیسے جیسے بڑا ہو رہا ہے اس کے مزاج میں جارحیت آتی جا رہی ہے۔ یہاں رہ کر وہ بگڑ رہا ہے۔“

”ماریو اچھا لڑکا ہے لیکن تم نے ٹھیک کہا وہ یہاں رہا تو یہاں کا ماحول اسے بگاڑ دے گا۔“ جونز نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ”تم دونوں یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے ہو؟“

”یہاں ہمارا گھر ہے۔“

”گھر تو کہیں بھی بن سکتا ہے، اصل مسئلہ ماریو کی تربیت کا ہے۔“

روز چپ رہی اور پھر اٹھ کر کافی بنانے لگی۔ اس نے مگ جونز کے سامنے رکھا۔ ”ابھی ہم یہاں سے نہیں جا سکتے۔“

”سنو، تم دونوں میرے ساتھ امریکا چلو۔“ جونز نے اچانک کہا تو روز کا چہرہ سفید پڑ گیا اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنا مگ میز پر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے، امید ہے تم برا نہیں مناؤ گے؟“

جونز نے رقم میز پر رکھی تو روز نے اٹھا کر اسے واپس تھما دی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”او کے... لیکن تم میری تجویز پر غور ضرور کرنا۔“ جونز اس کے ساتھ باہر آیا۔ روز نے دروازہ لاک کیا اور ایک طرف چل پڑی۔ جونز کی پیشکش پر اس کے رویے میں نمایاں تبدیلی آئی تھی وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے جونز سے جلد از جلد چھٹکارا چاہتی ہو۔ اس کے جانے کے بعد جونز خود بھی ایک دوسرے راستے سے نائٹ کلب کی طرف چل پڑا۔ وہ جونز ٹاؤن کے نچلے حصے میں تھا اور اس کا سائن بورڈ دور ہی سے دکھائی دیتا تھا۔ چند بند گلیوں میں گھسنے کے بعد اس نے درست راستہ دریافت کر لیا اور نائٹ کلب پہنچ گیا۔ اندر ویسا ہی ماحول تھا جیسا ایک نائٹ کلب کا ہوتا ہے۔ شور، میوزک، دیوانہ وار ناچتے نوجوان جوڑے اور نیم عریاں ویٹریس اور اسٹریپ گرلز۔ ایک طرف عام لوگوں کا حصہ تھا جسے فولادی جالی سے وی آئی پی حصے سے الگ کیا گیا تھا۔ اس طرف ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

جونز ایک میز پر آگیا اور روز اسے وی آئی پی حصے میں نظر آئی تھی۔ وہ ایک بوڑھے اور چہرے سے بیمار نظر آنے والے شخص کے ساتھ تھی۔ وہ قیمتی لیدر والے صوفے میں دھنسنے کے انداز میں بیٹھا تھا اور اس کے آس پاس مستعد بھاری ڈیل ڈول والے افراد سے پتا چل رہا تھا کہ وہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ روز اس کے پاس بیٹھی تھی اور وہ اس کے شانے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جونز دیکھ رہا تھا کہ روز بہ مشکل ہی مسکرا رہی تھی۔ یقیناً اسے اس بوڑھے کی بے تکلفی پسند نہیں آئی تھی لیکن وہ یہاں ملازم اور مجبور تھی۔ جونز نے نزدیک سے گزرنے والی ایک ویٹریس کو روکا۔ ”میں سیاح ہوں یہاں مسٹر میلڈو جیکوئس کے بارے میں سنا ہے، کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟“

ویٹریس نے اسے غور سے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”مسٹر جیکوئس مصروف آدمی ہیں وہ ہر کسی سے نہیں ملتے۔“

بوڑھا آدمی روز سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ پریشان لگ رہی تھی۔ پھر جونز نے اسے اٹھتے دیکھا۔ بوڑھا آدمی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر کی طرف چلا گیا۔ روز نے باہر کا رخ کیا تھا۔ جونز بھی باہر آگیا۔ اس نے روز کو اپنے گھر کی طرف جاتے دیکھا۔ کیا روز صرف اس بوڑھے آدمی کے لیے وہاں آئی تھی اور اس کے جاتے ہی روز کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ جونز ہوٹل واپس آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ سینیٹر گورڈن کے آدمی کو ماریو کے بارے میں بتا دیا جائے تاکہ وہ اسے امریکا پہنچانے کا انتظام کرے۔ اس

نے فیصلہ کیا کہ وہ صبح اسے کال کرے گا۔ ہوٹل میں خاموشی اور سناٹا تھا اسے کاؤنٹر پر کوئی نظر نہیں آیا لیکن چابی اس کے پاس تھی وہ اوپر آیا اور اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا ہی تھا کہ کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ فوراً بے ہوش ہوگیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اسے لگا جیسے وہ ریل کی پٹڑی پر لیٹا ہے اور ریل اس کے اوپر سے دندناتی ہوئی گزر رہی ہے شور ایسا ہی تھا اور براہ راست دماغ کو لگ رہا تھا۔ پھر اس نے کسی کی گنگناتی آواز سنی۔ ''چوٹ شدید ہے، دماغ پر اثر ہوسکتا ہے۔''

''اسے ہوش میں لاؤ۔'' کسی آدمی نے کرخت لہجے میں کہا۔

اچانک ہی جونز ہوش میں آگیا اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر نرس کے لباس والی عورت نے ایمونیا کی بوتل پیچھے کر لی۔ سر سے گزرنے والی ریل اصل میں سر پر چلنے والا پنکھا تھا جو آواز کر رہا تھا لیکن جونز کو لگ رہا تھا کہ ریل گاڑی شور کرتی گزر رہی ہے۔ اس نے سر گھمایا تو اسے سفید کوٹ میں ڈاکٹر کے ساتھ وہی بوڑھا دکھائی دیا جو نائٹ کلب میں تھا اور روز اس کے پاس تھی۔ ڈاکٹر صورت سے سفید فام لگ رہا تھا جبکہ بوڑھے کے نقوش مقامی تھے لیکن اس کی رگوں میں یقیناً سفید فام خون کی آمیزش تھی۔ اس نے چاندی کے دستے والی چھڑی تھام رکھی تھی۔ اس کے اشارے پر اس کے دو آدمی آگے آئے اور انہوں نے بازو سے پکڑ کر جونز کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے سر کا درد کسی قدر کم ہوا تھا اور چکر آنا بند ہوگئے تھے۔

''تم روز کے گھر کیوں گئے؟'' بوڑھے آدمی نے سوال کیا۔ ''ماریو سے کیوں ملے تھے؟''

''تم... کون ہوتے... ہو پوچھنے والے۔'' جونز نے ہانپتے ہوئے کہا۔ جواب میں اسے پکڑے ایک آدمی نے اچانک مڑ کر اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ وہ کراہ کر جھکا۔ مارنے والے نے سرد لہجے میں کہا۔

''مسٹر جیکوئس کے سوال کا جواب دو۔''

جونز چونک اٹھا، تو یہ جیکوئس تھا۔ اپنے نام کی دہشت کے برعکس وہ بہت کمزور اور عام سا بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ اگر اس نے قیمتی سوٹ نہ پہنا ہوتا تو اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہیں تھی البتہ اس کی آنکھوں میں سختی نمایاں تھی۔ مکا زوردار تھا اور جونز کے پیٹ میں تکلیف کے گولے اٹھ رہے تھے۔ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے جیکوئس کی طرف دیکھا۔ ''دو اچکوں نے مجھے مسز روبیلو کے مکان کے سامنے لوٹا تھا وہ ہمدرد خاتون مجھے اندر لے گئی اور کافی پیش کی اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا اس لیے اس نے مجھے کچھ رقم بھی مدد کے لیے دی تھی وہیں میں نے اس کے بیٹے کی تصویر دیکھی اور جب اسے بچوں سے لڑتے دیکھا تو اس سے ملا تھا۔''

''کیا تم دوبارہ روز کے پاس گئے تھے؟'' جیکوئس نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

''ہاں، میں اس کی رقم واپس دینے گیا تھا۔ اس سے زیادہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

یہ جگہ کسی اسپتال کا حصہ لگ رہی تھی۔ شاید آپریشن تھیٹر تھا۔ جیکوئس مڑ گیا اور اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا، وہ جونز کو اپنے نرغے میں لیے اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔ وہ ایک دفتر نما کمرے میں آئے اور جیکوئس میز کے پیچھے جا بیٹھا۔ وہاں ایک کسی قدر موٹا آدمی بھی موجود تھا، اس کے نقوش جیکوئس سے مل رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''اس نے کچھ بتایا؟''

''یہ کہہ رہا ہے کہ روز سے اتفاقاً ملا ہے۔''

''بکواس کرتا ہے۔'' موٹے آدمی نے کہا۔ ''یہ ماریو سے بھی ملا تھا۔ اب وقت بہت قریب ہے اور ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔'' موٹے آدمی نے کہتے ہوئے پستول نکال کر جونز پر تان لیا۔

''ایک منٹ۔'' جیکوئس نے اسے روک لیا اور جونز نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ وہ سمجھا تھا کہ ابھی موٹا آدمی گولی چلا دے گا۔ ''یہ امریکی سیاح ہے۔''

''امریکی سیاح ریوالور لے کر نہیں گھومتے ہیں۔''

''مجھے لوٹ لیا گیا تھا اس لیے میں نے اپنی حفاظت کے لیے ریوالور لیا تھا۔'' جونز نے جلدی سے کہا۔

''تم نے ڈونیلو اور گارمین کو مارا، ان کی ہڈیاں توڑ دیں۔'' موٹے آدمی نے الزام لگایا۔

''یہ غلط ہے، میں نے کسی کو نہیں مارا۔'' جونز نے انکار کیا۔ ''میرا کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے تم لوگوں نے بلاوجہ مجھے پکڑا ہے۔''

موٹے آدمی نے اس کا پرس نکال کر سامنے فرش پر پھینک دیا۔ ''تم امریکی ہو لیکن اس پرس میں تمہارا سوشل سیکیورٹی کارڈ نہیں ہے۔''

جونز نے پرس اٹھایا، اس میں اس کا ڈرائیونگ لائسنس اور کریڈٹ کارڈ تھا مگر نقد رقم غائب تھی۔ اپنا سوشل سیکیورٹی کارڈ یا جاسوسی کا لائسنس وہ ساتھ نہیں لایا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی بچت ہوگئی تھی ورنہ وہ اسے اب تک مار چکے ہوتے۔ بہرحال خطرہ تو اب بھی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تو مجھے لوٹنے والے تمہارے آدمی تھے۔''

موٹا آدمی غرایا۔ ''تم شرافت سے اگل دو کہ یہاں کس لیے آئے ہو اور تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''میں سیاحت کرنے آیا ہوں مجھے کسی نے نہیں بھیجا ہے۔'' جونز اپنی بات پر اڑا ہوا تھا، اس نے محسوس کیا کہ جیکوئس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور وہ کھنچنے کے انداز میں سانس لے رہا تھا۔ موٹے آدمی نے بھی محسوس کر لیا وہ پرتشویش انداز سے جیکوئس کی طرف جھکا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''

''نہیں... میرا خیال ہے وقت آگیا ہے۔''

جونز نے ان کی باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ تو دیکھ رہا تھا کہ موٹا آدمی اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، اس کا پستول والا ہاتھ بھی جھک گیا تھا۔ جونز نے اچانک اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ موٹا آدمی بھڑکا لیکن وہ اس سے پہلے ہی اس سے ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا فرش پر جا گرا۔ موٹے آدمی کا سر فرش پر لگا تو وہ چند لمحے کے لیے ساکت ہو گیا۔ جونز نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور فوراً ہی اس کا رخ جیکوئس کی طرف کر دیا اور آہستہ سے بولا۔ ''کوئی حرکت مت کرنا۔''

جیکوئس ساکت تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم بچ نہیں سکو گے۔''

''شاید...... لیکن اگر تم نے کسی کو آواز دی یا کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کی تو تم لازمی مارے جاؤ گے۔ یہ بتاؤ میں کسی کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے کیسے جا سکتا ہوں؟''

''ایسا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' جیکوئس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ تمہارا بھائی ہے؟'' جونز نے موٹے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں، یہ میرا بھائی ہے۔''

جونز نے موٹے آدمی کے سر پر پستول کا دستہ مارا اور وہ ہوش میں آتے ہوئے دوبارہ بے ہوش ہوگیا۔ ''اگر یہاں کوئی راستہ نہیں ہے تو میں پہلے اس کے سر میں سوراخ کروں گا اور پھر تمہیں بھی مار دوں گا اس کے بعد ہی کوئی مجھے قتل کر سکے گا۔''

جونز نے موٹے آدمی کے سر سے پستول لگایا تھا کہ جیکوئس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔''

کمرے میں ایک خفیہ دروازہ بھی موجود تھا۔ جیکوئس جیسے جرائم پیشہ ہمیشہ اپنے ٹھکانے پر ایسے خفیہ راستے رکھتے ہیں جہاں سے وہ بہ وقت ضرورت فرار ہو سکیں۔ جیکوئس اسے باہر تک لایا۔ یہ راستہ ایک تنگ و تاریک گلی میں کھل رہا تھا۔ جونز نے جیکوئس کو اسی کی ٹائی سے باندھا تاکہ وہ فوری طور پر اپنے آدمیوں کو اس کے پیچھے روانہ نہ کر سکے اور اسے کچھ مہلت مل جائے۔ باہر نکلتے ہی اس نے تیزی سے اوپر کا رخ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ جیکوئس کے آدمی اسے نیچے اور قصبے سے باہر جانے والے راستوں پر تلاش کریں گے۔ ابھی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی اور تاریکی اس کی مدد کر رہی تھی۔ روز کے دروازے پر دستک دینے سے پہلے اس نے آس پاس کا اچھی طرح جائزہ لیا کہ کوئی نگران تو موجود نہیں ہے لیکن اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ دل کڑا کر کے اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر روز کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''روز میں ہوں جونز... پلیز میں مشکل میں ہوں۔''

روز نے دروازہ کھولا اور وہ فوراً اندر گھس گیا۔ اندر تاریکی تھی۔ وہ باریک اور مختصر نائٹی میں تھی اور خاصی دلکش لگ رہی تھی لیکن جونز کو ہوش کہاں تھا۔ اس نے روز کا ہاتھ تھام لیا۔ ''جیکوئس کے آدمی مجھے ہوٹل سے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں تم سے اور ماریو سے کیوں ملا اور کیا کسی نے مجھے بھیجا ہے۔''

روز کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''کیا انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے؟''

''نہیں، مجھے جیکوئس کے موٹے بھائی کو بے ہوش کر کے فرار ہونا پڑا۔ اب مجھے پناہ چاہیے۔''

''سیبرو۔'' روز نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔''

''جیکوئس بیمار ہے، اسے کیا بیماری ہے؟''

''اسے دل کا کوئی مسئلہ ہے۔ ایک امریکی ڈاکٹر مستقل یہاں موجود رہتا ہے، سنا ہے وہ جیکوئس کا علاج کرنے آیا ہے۔''

سامنے کچن میں رہنا مناسب نہیں تھا روز اسے پیچھے بیڈ روم میں لے آئی۔ دوسرے بیڈ روم میں ماریو سو رہا تھا۔ جونز نے کہا۔ ''سنو، مجھے تمہارے اور ماریو کے لیے یہاں خطرہ محسوس ہو رہا ہے بہتر ہوگا تم یہاں سے نکلنے کی سوچو۔''

''ہم یہاں سے نہیں جا سکتے۔'' روز کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''اول تو ہمارا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہے دوسرے یہاں سے نکل کر کہیں جیکوئس کے آدمیوں سے نہیں بچ سکتے۔''

''میں نے تمہیں ایک پیشکش کی تھی۔'' جونز نے آہستہ سے کہا۔

''تم ہمیں امریکا کیوں لے جانا چاہتے ہو؟''

''تم اور ماریو وہاں محفوظ رہو گے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں شہریت نہ سہی لیکن امریکا میں رہنے اور کام کرنے کی اجازت مل جائے۔ ماریو وہاں پڑھ سکے گا۔''

روز کی آنکھوں میں خواب اتر آئے تھے۔ پھر وہ چونکی اور اس نے حسرت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ بہت مشکل ہے۔ جیکوئس ہمیں کبھی جانے نہیں دے گا وہ ماریو کے پیچھے پاگل ہے۔''

''ماریو۔'' جونز چونکا۔ ''اسے تم سے کوئی مطلب نہیں ہے؟''

روز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں تقریباً سب یہی سمجھتے ہیں کہ جیکوئس مجھ میں دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ وہ ظاہر بھی ایسا ہی کرتا ہے کہ مجھے روز بج سنور کے اس کے پاس جانا پڑتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ اس نے آج تک مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ اسے صرف ماریو کا خیال ہے۔ اسے چھینک بھی آجائے تو جیکوئس پاگل ہو جاتا ہے مجھے حکم ہے کہ ماریو کا ہر ممکن خیال رکھوں۔''

جونز کو ایک خیال آیا۔ ''کیا وہ ماریو کو بھی اپنے پاس بلاتا ہے؟''

''نہیں... نہیں۔'' روز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے ماریو آج تک اس سے اکیلے میں نہیں ملا ہے۔''

''پھر اسے ماریو سے کیا دلچسپی ہے؟'' جونز نے پوچھا۔ ''جبکہ وہ ماریو کے باپ کا قاتل بھی ہے۔''

''یہی تو مجھے بھی آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔'' روز نے کہا۔ ''میں نے بھی دوسروں کی طرح سنا ہے کہ گیریو کو جیکوئس نے قتل کرایا ہے۔''

''تمہیں اس پر یقین...'' جونز کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ باہر سے کچھ افراد کا شور سنائی دیا اور پھر مکان کا دروازہ بجایا جانے لگا۔ کئی افراد چلا چلا کر دروازہ کھولنے کو کہہ رہے تھے۔ جونز نے پستول نکالا تو روز کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''نہیں... وہ کئی ہیں تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے یہاں ماریو بھی ہے، میں گولیاں چلنے کا رسک نہیں لے سکتی۔''

''تب مجھے کہیں چھپا دو۔''

جونز کی بات مکمل ہونے سے پہلے روز اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔ وہ اسے بیڈروم کے پیچھے واقع چھوٹے سے گوشے میں لائی اور اوپر ایک دو چھتی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں چلے جاؤ...... جلدی۔''

اس کے جاتے ہی جونز کھڑکی اور دیوار پر پاؤں جماتا ہوا اوپر چڑھ کر اس مختصر سی دو چھتی میں داخل ہو گیا۔ روز نے دروازہ کھول دیا اور جیکوئس کے آدمی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ وہ مقامی زبان میں روز سے شاید اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پھر ماریو کے اور روز کے چلانے کی آواز آئی اور ایک منٹ کے اندر وہاں خاموشی چھا گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیکوئس کے آدمی اسے نہ پا کر واپس چلے گئے تھے لیکن جونز کی چھٹی حس خبردار کر رہی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا جب کوئی آواز نہیں آئی تو وہ نیچے اترا اور دبے قدموں بیڈروم میں آیا۔ وہاں جیسے کوئی طوفان آکر گزر گیا تھا اور روز بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی۔ جونز نے جلدی سے اسے دیکھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس نے کچن سے پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑکا، کچھ پانی اس کے حلق میں ٹپکایا تو اسے ہوش آگیا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے ماریو کا نام لیا تو جونز کو ماریو کا خیال آیا اس نے جلدی سے دوسرے بیڈروم اور پھر پورے گھر میں دیکھ لیا ماریو کہیں نہیں تھا، باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ تو کیا جیکوئس کے آدمی ماریو کو لے گئے تھے۔

وہ واپس آیا تو روز سر تھام کر رو رہی تھی اسے دیکھ کر گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''وہ ماریو کو لے گئے۔''

''وہ مجھے تلاش کرنے آئے تھے؟''

روز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ ماریو کا پوچھ رہے تھے میں نے مزاحمت کی تو ایک نے مجھے سر پر گھونسا مارا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ تمہارا کسی نے نام تک نہیں لیا تھا۔''

''وہ ماریو کو لے گئے ہیں۔'' جونز نے کہا۔ ''آخر جیکوئس کو ماریو سے کیا مطلب ہے؟ اس کی طبیعت بہت خراب تھی اور جب دونوں بھائی بات کر رہے تھے تو کئی بار کہا کہ وقت آگیا ہے۔''

روز چونک گئی پھر اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں وہ ماریو کو کہاں لے گئے ہیں۔''

''تب تم پولیس کو کال کرو۔''

روز ہنسی۔ ''مقامی پولیس کچھ نہیں کرے گی وہ تو جیکوئس کی وظیفہ خوار ہے۔''

جونز سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے روز سے موبائل مانگا اور سینیٹر گورڈن کے آدمی سے رابطہ کیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''میں جونز بات کر رہا ہوں۔''

''تم کہاں ہو، تمہارا موبائل کس کے پاس ہے؟ میں نے رابطے کی کوشش کی تھی۔''

جونز نے اسے مختصراً اپنی روداد سنائی اور ماریو کے بارے میں بتایا۔ ''میں نے اسے تلاش کر لیا ہے لیکن اسے جیکوئس کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

''اوہ کاش کہ تم پہلے بتاتے میں تم سب کو وہاں سے نکالنے کا انتظام کر لیتا کچھ دیر میں فیڈرل پولیس وہاں بڑے پیمانے پر ریڈ کرنے والی ہے۔ تم اس سے پہلے ماریو کو لے کر وہاں سے نکل جاؤ۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' جونز نے کہا اور فون بند کر کے روز سے کہا۔ ''کچھ دیر میں فیڈرل پولیس جیکوئس اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ریڈ کرنے والی ہے ہمیں اس سے پہلے ماریو کو حاصل کر کے یہاں سے نکلنا ہے۔''

جب جونز فون پر بات کر رہا تھا تب ہی روز چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے شک زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو اور یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''

جونز نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''روز مجھ پر اعتماد کرو میں تمہارا اور ماریو کا ہمدرد ہوں۔''

روز کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے شانے ہلائے۔ ''میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔''

''اپنی رقم اور ضروری کاغذات ساتھ لے لو کیونکہ اب تمہیں یہاں واپس نہیں آنا ہے۔''

''ہاں، مجھے اب یہاں واپس نہیں آنا ہے۔'' روز نے خود سے کہا اور ایک بیگ اٹھا کر اس میں ضروری چیزیں رکھنے لگی۔ پھر اس نے کپڑے بدلے اور پینٹ شرٹ پہن لی۔ کریپ سول والے جوگرز پہن کر وہ بھاگ دوڑ کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ دونوں باہر آئے تو صبح ہونے میں کچھ وقت تھا۔ مشرق کی طرف سے روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ عین اسی لمحے نیچے پہاڑی کے دامن میں کئی پولیس کاریں اور گاڑیاں نمودار ہوئیں۔ ان کی روشنیاں اور سائرن کا شور یہاں تک آرہا تھا پھر ان سے بے شمار مسلح پولیس نکل کر پہاڑی کے اوپر آنے والے راستوں پر چڑھنے لگی۔ وہ نائٹ کلب، فائٹ کلب اور جیکوئس کے ٹھکانے کو چاروں طرف سے گھیر رہی تھی۔ ابھی پولیس راستے میں تھی کہ اوپر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ جونز نے روز کی طرف دیکھا۔

''اب کیا کریں، یہاں تو مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' روز نے کہا اور تیزی سے ایک طرف جانے لگی جونز اس کے پیچھے تھا۔ وہ کسی گلہری کی طرح پھرتی اور رفتار کے ساتھ تنگ و تاریک گلیوں سے گزر رہی تھی اور بعض اوقات جونز اس سے پیچھے رہ جاتا تھا۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر روز نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس پر چڑھ کر چھتوں سے جانا ہوگا۔''

پہلے جونز نے روز کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا اور پھر ایک پائپ پکڑ کر خود بھی اوپر پہنچ گیا۔ یہاں ہر طرف اونچی نیچی اور آڑی ترچھی چھتیں تھیں۔ وہ سنبھل کر ان پر چلنے لگے۔ اکثر چھتیں ٹین کی شیٹوں کی تھیں اور ان کے کناروں پر بھی سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا۔ روشنی نمودار ہونے سے کسی قدر آسانی ہو گئی تھی۔ جونز روز کے پیچھے تھا، اس نے پوچھا۔ ''ہمیں کہاں جانا ہے؟''

''اس مکان تک۔'' روز نے ایک تین منزلہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ''ماریو اور جیکوئس وہیں ہوں گے۔''

فائرنگ میں شدت آگئی تھی کیونکہ پولیس بھی اب جواب دے رہی تھی اور ساتھ ہی اپنا گھیرا تنگ کرتی جا رہی تھی۔ جیکوئس کا مکان مین روڈ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اب وہ جھک کر احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک موقع پر روز سلپ ہو کر گرنے لگی تھی لیکن جونز نے بروقت اس کا ہاتھ تھام کر اسے واپس کھینچ لیا۔ مکان زیادہ دور نہیں تھا مگر جیسے جیسے وہ قریب جا رہے تھے اس کا خطرہ بڑھ رہا تھا کہ کوئی مکان سے انہیں دیکھ لے اور پولیس کا ساتھی سمجھ کر گولی مار دے۔ جونز نے روز کو پیچھے کر لیا۔ وہ مکان کے پاس پہنچ گئے۔ اس تک جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ انہیں تقریباً چار فٹ چوڑی گلی پھلانگ کر مکان کے چھجے تک جانا تھا۔ پہلے جونز نے چھلانگ لگائی اور چھجے پر پہنچ گیا پھر روز بھی اس کے پاس آگئی۔ وہ چھجے پر سرکتے ہوئے ایک کھڑکی تک پہنچے۔ اتفاق سے یہ کمرا خالی تھا، وہ دونوں اندر اتر گئے۔

''جیکوئس کہاں ہوگا؟''

''ہمیں سامنے والے حصے پر جانا ہے اسی منزل پر۔'' روز نے جواب دیا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ راہداری میں نکلے چند قدم ہی دور گئے ہوں گے کہ سامنے سے ایک مسلح شخص نمودار ہوا۔ وہ روز کو دیکھ کر نہیں چونکا لیکن اس کے پیچھے جونز پر نظر پڑتے ہی اس

نے اپنی رائفل اٹھانا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی جونز نے اسے گولی ماردی۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ روز اچھل پڑی۔

''یہ کیا، کیا؟''

''آگے چلو۔'' جونز نے کہا اور مرنے والے کی رائفل اٹھالی اور پستول روز کو تھما دیا۔ روز دوڑنے لگی۔ وقت کم تھا اور پولیس اندر آجاتی تو دوسروں کے ساتھ وہ بھی گرفتار ہو جاتے۔ وہ اس حصے میں آئے جہاں جونز پہلے بھی آچکا تھا اور یہاں ایک چھوٹا سا اسپتال یا آپریشن روم بنا ہوا تھا۔ آپریشن روم کے دروازے پر ایک مسلح شخص موجود تھا اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا لیکن جونز اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی گولی چلا چکا تھا وہ زمین پر گرا اور ٹانگ پکڑ کر چلانے لگا۔ لیکن رائفل کا بٹ سر پر کھا کر اس کی چیخ و پکار رک گئی۔ وہ دونوں بیک وقت دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے اور ساکت رہ گئے۔ ایک طرف جیکوئس آپریشن ٹیبل پر بے ہوش پڑا تھا اور اس کا پیٹ چاک تھا۔ دوسری طرف ماریو بھی ایسی ہی ایک ٹیبل پر ساکت تھا لیکن بہ ظاہر وہ ٹھیک نظر آرہا تھا۔ مسئلہ جیکوئس کے بھائی سیبرو کا تھا، وہ وہاں موجود تھا اور اس نے ان کے اندر آتے ہی ماریو کے سر پر پستول رکھ دیا تھا۔ روز چلائی۔ ''نہیں... پلیز۔''

سیبرو نے غرا کر کہا۔ ''تب ہتھیار پھینک دو ورنہ میں اسے شوٹ کردوں گا۔''

وہاں آپریشن کا مخصوص لباس پہنے ہوئے ایک ڈاکٹر اور اس کی مددگار نرس موجود تھی۔ جونز ان سے مل چکا تھا اور وہ اس وقت آپریشن کی تیاری کر رہے تھے۔ سیبرو کی دھمکی پر روز کا پستول والا ہاتھ جھک گیا لیکن جونز نے رائفل کا رخ سیبرو کی جانب رکھا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہاں کیا ہورہا ہے؟''

وہ سب خاموش رہے۔ جونز نے کچھ دیر بعد دوبارہ کہا۔ ''میرا خیال ہے یہاں ٹرانسپلانٹ کیا جارہا ہے۔ اس بچے کے جسم سے تم کون سا عضو نکالنے والے تھے؟'' جونز نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔

''جگر۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''مسٹر جیکوئس کا جگر جواب دے گیا ہے اور اس کا واحد حل دوسرا جگر ہے۔ اس بچے کے ٹشوز مسٹر جیکوئس سے میچ کرتے ہیں۔''

روز کے لیے یہ شاک تھا، وہ چلائی۔ ''کیا تم میرے معصوم بچے کا جگر نکال کر اسے مارنے والے تھے؟''

''میرا خیال ہے یہ کئی سال پہلے ہی منصوبہ بنا چکے تھے، کیونکہ ماریو کو پہلے ہی منتخب کرلیا گیا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟''

سیبرو نے سر ہلایا۔ ''ہاں... مسئلہ یہ تھا کہ ماریو بچہ تھا اور اس کا جگر مکمل نہیں ہوا تھا ڈاکٹر نے بارہ سال کی عمر سے پہلے ٹرانسپلانٹ سے انکار کر دیا تھا تبھی ہمیں اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔''

''اب تم کچھ نہیں کر سکتے، باہر پولیس آگئی ہے۔'' جونز نے خبردار کیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا یہ آپریشن ضرور ہوگا ورنہ یہ بچہ زندہ نہیں رہے گا۔'' سیبرو نے ضدی لہجے میں کہا۔

''دیکھو اتنا وقت نہیں ہے کہ ڈاکٹر آپریشن مکمل کر سکے اس سے پہلے پولیس آجائے گی اور ماریو کے ساتھ ساتھ جیکوئس بھی مارا جائے گا۔'' جونز نے اسے سمجھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ وقت گزار رہا تھا کیونکہ نرس بتدریج حرکت کرتے ہوئے سیبرو کے پیچھے آرہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک سرجیکل چاقو دبا ہوا تھا۔

''مارا جائے گا۔'' سیبرو جنونی ہو رہا تھا۔ ''اسے مرنا تو ویسے بھی ہے، میں کہہ رہا ہوں رائفل پھینک دو ورنہ میں اسے شوٹ کردوں گا۔''

''اوکے... اوکے۔'' جونز نے جلدی سے کہا اور رائفل نیچے رکھ دی۔ سیبرو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پستول ماریو کے سر سے ہٹا کر جونز کی طرف کردیا۔

''گڈ بائی مسٹر جونز۔''

لیکن اس کے گولی چلانے سے پہلے ہی نرس نے چاقو اس کے شانے میں اتار دیا۔ وہ انتظار کررہی تھی کہ پستول کی نال بچے کے سر سے ہٹے۔ سیبرو اذیت سے چلایا اور پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ جونز نے لپک کر پستول اٹھایا اور نرس سے کہا۔ ''تھینک یو سسٹر۔''

''مجھے ان تمام حرامزادوں سے نفرت ہے۔'' نرس بولی اور ڈاکٹر کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ فائرنگ کی نزدیک آتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ پولیس مکان میں داخل ہو چکی ہے۔ پانچ منٹ بعد آپریشن روم کا دروازہ کھلا اور ایک اسٹریچر باہر نکلا اس پر ماریو لیٹا تھا اسے آکسیجن لگی تھی اور بازو میں ڈرپ کی نلکی منسلک تھی۔ ڈاکٹر اور دو نرسیں اسٹریچر کے ساتھ تھیں۔ وہ ایک راہداری سے ہوتے باہر نکلے تو ہر طرف پولیس تھی لیکن مخصوص لباس اور اسٹریچر کی وجہ سے کسی نے انہیں نہیں روکا اور وہ بہ آسانی ایک ایمبولینس تک پہنچ گئے۔ پولیس کے ساتھ ہی کئی ایمبولینسیں بھی آئی تھیں۔ اندر گھستے ہی نرس نے ڈرائیونگ کیبن کی دیوار پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''چلو جلدی۔''

جونز نے منہ سے ڈاکٹر والا مخصوص ماسک ہٹایا اور روز کی طرف دیکھا جو بے ہوش ماریو کا چہرہ چوم رہی تھی۔ دوسری نرس کے لباس میں وہ تھی۔ ایمبولینس کی وجہ سے وہ بہ آسانی وہاں سے نکل آئے تھے۔

☆☆☆

جونز ملر ایک بار پھر سینیٹر گورڈن کے عالی شان ولا کے اندر موجود تھا۔ اس بار اسے فوری اندر نہیں لے جایا گیا بلکہ گیٹ پر ہی روک لیا گیا تھا پہلے اندر موجود سینیٹر کو اطلاع دی گئی اور اس نے انٹر کام پر جونز سے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''اب کیوں آئے ہو؟''

''اپنا باقی معاوضہ لینے۔'' جونز نے جواب دیا۔

''تم بچے کو نہیں لا سکے اس لیے معاوضہ کس بات کا؟''

''میں بچے کو لے آیا تھا لیکن وہ اب آپ کے لیے بیکار تھا۔ وہ کیوں بیکار ہوگیا...... کیا یہ میں یہاں انٹر کام پر ہی بتاؤں؟''

سینیٹر گورڈن سوچتا رہا پھر اس نے گارڈ سے بات کرانے کو کہا اور گارڈ نے اسے اندر جانے کی اجازت دیدی۔ مختلف مراحل جسمانی اور مشینی تلاشیوں سے گزر کر وہ اسی ہال میں سینیٹر کے سامنے پہنچا۔ وہ میز کے دوسری طرف موجود تھا اور جونز کو اس کی آنکھوں میں نفرت کی چمک دکھائی دی تھی۔ اس بار سینیٹر نے اسے بیٹھنے کو نہیں کہا اور ذرا آگے جھک کر بولا۔ ''مجھے دھوکا دینے والوں سے نفرت ہے اور ایسے لوگ زیادہ دن زندہ نہیں رہتے ہیں۔''

''ایک فرد کو دھوکا دینا بہتر ہے لیکن ..... پوری قوم کو دھوکا دینے والوں کے بارے میں کیا خیال ہے، کیا انہیں زندہ رہنے کا حق ہونا چاہیے؟'' جونز نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''خیر...... میں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ تمہیں وعظ کروں۔ تم نے میلڈ وجیکوئس کی موت کی خبر سن لی ہوگی۔''

میلڈ وجیکوئس دو دن پہلے پولیس کی تحویل میں اسپتال میں دم توڑ گیا تھا، اس کا جگر بالکل جواب دے چکا تھا۔ سینیٹر خاموش رہا۔ جونز نے بات جاری رکھی۔ ''افسوس کہ تم اسے بلیک میل نہیں کر سکے۔ اسی لیے تم ماریو کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے۔ میلڈ وجیکوئس کو تمہاری کتنی رقم دینی تھی؟''

''تین ملین ڈالرز۔'' سینیٹر نے آہستہ سے کہا۔

''اب انہیں بھول جاؤ، ویسے سیبرو جیکوئس موجود ہے چاہو تو اس سے نکلوانے کی کوشش کرو۔ میلڈ وجیکوئس برا آدمی تھا لیکن اس نے مرنے سے پہلے ایک اچھا کام کیا۔ اس نے رقم لے کر بھی تمہیں وہ پانچ ٹن ہیروئن نہیں دی جو دس ہزار امریکیوں کو موت کی وادی میں دھکیل دیتی۔''

''یہ سب بکواس ہے جسے کہیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔'' سینیٹر گورڈن غرایا۔

''درست ہے لیکن میں نے تمام سیاق و سباق کے ساتھ ایک مکمل اسٹوری لکھ کر رکھ دی ہے۔ میرے مرتے ہی یہ اسٹوری ملک کے بیس بڑے اخباروں اور بیس بڑے نیوز چینلز کو ای میل کرنے کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ پر بھی شائع کردی جائے گی اور اس کے بعد تمہارا تاعمر سینیٹر بنے رہنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔''

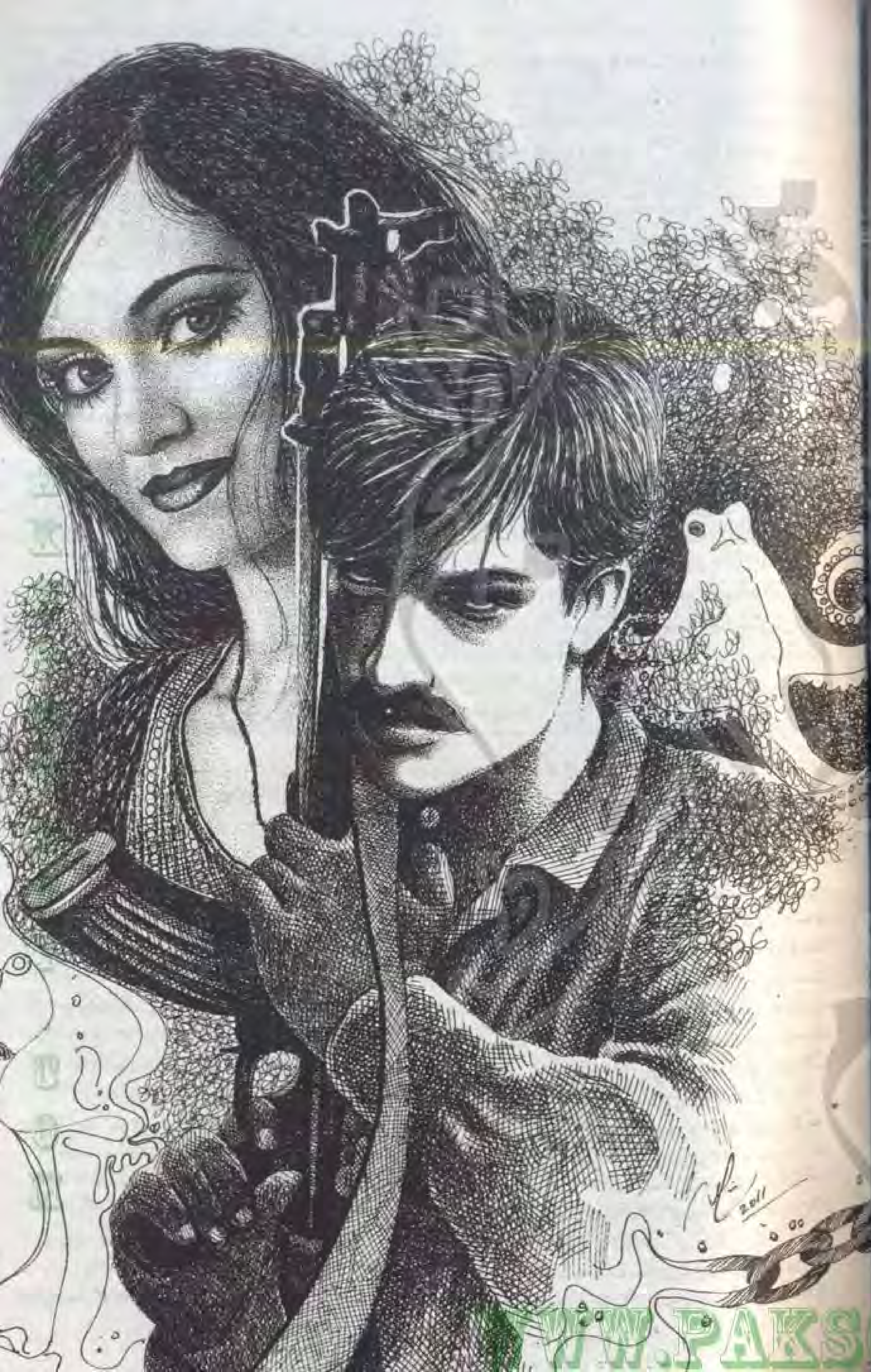
سینیٹر گورڈن خاموش رہ کر جونز کے الفاظ تول رہا تھا اور اس کا دماغ اندر ہی اندر اس صورت حال کا تجزیہ کر رہا تھا اور بالآخر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میری طرف سے کچھ نہیں ہوگا لیکن آدمی جوانی میں مر سکتا ہے اور تمہیں کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے۔''

جونز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''سینیٹر! ویسے تم شاید کبھی چرچ نہیں گئے ہو لیکن میری زندگی کی دعا مانگنے کے لیے ہر اتوار چرچ ضرور جایا کرو۔ یہی ایک صورت ہے تمہاری بچت کی۔''

سینیٹر گورڈن کچھ دیر اسے کینہ توز نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اس نے میز سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا۔ ''اسے لو اور یہاں سے ہمیشہ کے لیے دفع ہوجاؤ۔''

جونز نے لفافہ اٹھا کر چیک کیا اور مطمئن ہو کر اسے جیب میں رکھ لیا۔ ولا سے روانہ ہوتے وقت وہ خوش تھا کہ معاملہ طے ہوگیا۔ وہ صرف رقم کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ سینیٹر کو تنبیہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کے بغیر وہ سکون سے زندگی نہیں گزار سکتے تھے اور یہ کام اس نے جان کا خطرہ مول لے کر کیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سینیٹر خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرتا اور اس کے بعد اس کی واپسی ناممکن ہو جاتی۔ اسے اٹلانٹا سٹی جانا تھا جہاں روز اور ماریو اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کی واپسی کے فوراً بعد وہ اور روز شادی کر لیتے، ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا۔

□



کشکول

انوار صدیقی

قسط: 19

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوجن کو برہنہ حالت میں کوئی پُراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے۔ یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے

ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے کچھ جڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے او پر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے بیہودہ عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذات خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور اورنگ زیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگ زیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے

ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایت دی۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ اسی کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی تابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگ زیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگ زیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی نیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کو آمادگی پر منتج ہوگئی۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواست گار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگ زیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیرنگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ بعض معاملات میں سراج بھی لاعلم تھا، ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں الجھی ہوئی تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مختلف الجھنوں کا شکار تھا۔ شیخ حامد کے گرد گھیرا تنگ ہو گیا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب وشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"گولی جس زاویے سے لگی ہے اس سے یہی اندازہ ہے کہ وہ زمین کے بجائے کسی قدرے اونچی جگہ سے چلائی گئی تھی۔" سرجن نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ چاہیں تو میں اپنی فائنڈنگ (Finding) رپورٹ بھی تحریری طور پر دے سکتا ہوں۔"

"پلیز سرجن، میں اس کے لیے ذاتی طور پر آپ کا شکرگزار ہوں گا۔ ایک ریکویسٹ اور بھی کروں گا۔"

"فرمائیے......"

"آپ اس کیس کی اطلاع اب کسی بھی غیر متعلقہ فرد کو فراہم نہیں کریں گے۔"

"میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں لیکن اسپتال کے متعلقہ تھانے کو ایسے معاملات کی رپورٹ دینا بھی میری ذمہ داری ہے۔"

"یہ علاقہ میرے ہی پاس ہے، میں آپ کی فائنڈنگ کو باقاعدہ آفیشلی طور پر ریسیو کروں گا۔"

سرجن سے مل کر سراج اور سیٹھ عثمان دوبارہ اسپتال کے وی آئی پی روم میں آگئے جہاں دوسرے کمرے میں لیاقت حسین بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ اس نے سراج کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

"بابا کو کب تک ہوش آئے گا صاحب؟"

"ہمت سے کام لو......" سراج نے اس کا ہاتھ تھام کر دوستانہ انداز میں سمجھایا۔ "میں ابھی سرجن سے مل کر آرہا ہوں۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ تمہارے والد بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ گولی فوری طور پر نکال لی گئی۔ رہا ہوش آنے کا معاملہ تو اس میں چار چھ گھنٹے لگیں گے۔ تمہارے والد کو سکون پہنچانے کی خاطر انجکشن ضروری تھا۔"

"مجھ سے ایک وعدہ کریں صاحب۔" لیاقت حسین پھر جذباتی ہونے لگا۔ "اگر آپ کو اس حرام کے تخم کے بارے میں کوئی سراغ ملے جس نے میرے سر سے باپ کا سایہ اٹھانے کی کوشش کی تھی تو مجھے ضرور خبر کر دیں۔"

"تم مجھے بہت عزیز ہو لیاقت حسین...... میرا اور تمہارا دشمن الگ الگ کیسے ہو سکتا ہے؟"

لیاقت حسین سراج کا جواب سن کر یکلخت اس سے لپٹ گیا، سراج اسے تسلی دینے کی خاطر اس کی پشت تھپ تھپا رہا تھا جب اس کے موبائل کی ٹیون بجنے لگی، اس نے آنے

والے نمبروں کو غور سے دیکھا، وہ نمبر اس کے کسی واقف کار کے نہیں تھے پھر بھی اس نے موبائل آن کر کے کانوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''سراج اسپیکنگ......''

''مالک مرجائے تو اس کے وفادار غلام بھی سکون سے نہیں بیٹھتے۔'' سرد لہجے میں کہا گیا۔ ''ہم تم کو اور تمہارے ایس پی کو بھی سکون کا سانس نہیں لینے دیں گے...... سرفراز خان کے زخمی ہونے کو ہماری طرف سے ایک وارننگ سمجھو۔''

جملے کے اختتام کے ساتھ ہی دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

''کس کا فون تھا؟'' سیٹھ عثمان نے سراج کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر سنجیدگی سے سوال کیا۔

''تھی ایک آفیشل کال۔'' سراج نے لیاقت حسین کی موجودگی میں آنے والی کال کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا لیکن اس کا ذہن بہ دستور موصول ہونے والی کال کے نشیب و فراز میں الجھا رہا تھا۔

***

پرتاب بھوشن اس وقت مندر میں بیٹھا بڑے انہماک سے کسی منتر کے بول جاپ کر رہا تھا جب دروازے پر کسی کی آہٹ سن کر چونکا۔ اس نے پلکوں کے درمیان جھری کر کے دیکھا، وہ مندر کی سب سے حسین پجارن سلونی تھی جو ایک بار اس کے بازوؤں تک آ گئی تھی لیکن بڑے پجاری کی وجہ سے کھیل ادھورا چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ رام نام ست ہو جانے والی پجارن مدھو نے بروقت اسے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب وہی اس کے دروازے پر لگی کھڑی پرتاب بھوشن کو لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلونی کی سندرتا کو دیکھ کر پرتاپ منتر کے بول بھول گیا۔ اس نے جاپ توڑ کر اسے ٹٹولتی نظروں سے گھورا۔ وہ بڑے پجاری کی خاص رکھیل تھی اس لیے دوسرے پنڈت پجاری بھی اسے دیکھ کر صرف آنکھیں سینکنے پر گزارا کرتے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے سلونی کو سرتاپا غور سے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں سوال کیا۔ ''اس سے یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟''

''تمہیں دیکھ رہی تھی۔'' سلونی نے مسکرا کر جواب دیا پھر ایک ادا سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا؟''

''بڑے پجاری کو بھنک مل گئی تو اس بار تجھے شما نہیں کرے گا۔''

''وہ آج سویرے سویرے ہی میرٹھ یاترا کے لیے چلا گیا ہے، واپسی میں ایک مہینا بھی لگ سکتا ہے اور......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہونٹ چبانے لگی۔

''چپ کیوں ہو گئی؟''

''اس گرو گھنٹال کا دل بھی اب مجھ سے بھر گیا ہے۔'' اس کے جواب میں حقارت کا رنگ گھلنے لگا۔ ''جاتے جاتے آخری بار منہ مارنے کے بعد اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اب میں جس کے ساتھ من چاہے موج میلا کر سکتی ہوں۔''

''سچ کہہ رہی ہے......؟''

''کیا تمہیں میری بات پر وشواس نہیں آیا......؟ چاہو تو پجاری مدن چند سے پوچھ لو جو بڑے پجاری کی جگہ چندیا پر چندنی لگا کر بیٹھ گیا ہے۔'' سلونی نے کولہے پر ہاتھ رکھ کر شرماتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ بھی کچھ کم...... حرامی نہیں ہے، مندر کی گدی سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلے سر سے پاؤں تک کسی بھوکے گدھے کے الو سار مجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جانے کب سے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا کم ذات۔'' وہ ایک لمحے کو رکی پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

''مدھو نظر نہیں آ رہی؟''

''وہ...... وہ بھی اپنے گاؤں کا کہہ کر گئی ہے۔'' پرتاپ نے جھوٹ کا سہارا لے کر دانہ ڈالا۔ ''دروازے سے لگی کیوں کھڑی ہے، آ...... اندر آ جا اور اسے کنڈی مار دے۔''

''تم بھی کہیں گئے ہوئے تھے شاید؟'' وہ دروازے کا چھپکا لگا کر پرتاپ کے قریب بیٹھ گئی۔

''ہاں...... ایک ضروری کام نپٹانا تھا۔'' پرتاپ نے اس کا ہاتھ تھام کر قریب گھسیٹ لیا پھر بہکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایک بات پوچھوں رانی۔ سچ بتائے گی۔''

''پوچھ کر دیکھ لو۔'' اس نے اٹھلا کر جواب دیا۔

''سنسار میں چھڑے چھانڈ پجاریوں کی کمی بھی نہیں ہے پھر...... تو سب کو چھوڑ کر میرے پاس کیوں آ گئی؟''

''بڑے پجاری کا کہنا تھا کہ تم دیوی کے خاص سیوک ہو...... جاپ منتر کر کے تم نے مہان شکتی بھی پراپت کر لی ہے۔''

''پھر......''

''میں بھی سدا سے دیوی درشن کی بھوکی ہوں۔'' اس نے مچل کر پرتاپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، تم ایک بار مجھے بھی دیوی درشن کرادو، میں سارا جیون تمہارے چرنوں کی دھول بن کر بتادوں گی۔''

''دیوی درشن کے لیے بڑی کٹھن تپسیا کرنی پڑتی ہے، من کو مار کر کیول اسی کو دھونی رمانی پڑتی ہے۔''

''تم جیسا کہو گے، میں ویسا ہی کروں گی مہاراج......'' سلونی نے بڑے پیار سے کہا۔

''میں تجھے مدھو کی جگہ دے سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہوگی۔'' پرتاپ کے ہاتھ پجارن کے سندر شریر پر بہکنے لگے۔ ''تو میرے سوا کسی اور کا من نہیں بہلائے گی۔''

''یہ بات میرے بس میں نہیں ہے مہاراج......'' اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ ''مندر میں چھوٹے بڑے پجاری ہم پجارنوں کو دیوتاؤں کا پرساد سمجھ کر منہ مارتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی ان سے نہ نہیں کر سکتا۔''

''جانتا ہوں، پر تو اس کی چنتا مت کر۔'' پرتاپ نے اپنی پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''بڑے پجاری کی بات اور تھی، پر تو مدن چند میرا کہا نہیں ٹال سکتا، اس کا ایک اشارہ ہو گیا تو پھر تیرے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں کرے گا۔''

''یہ بھی تمہارا ایکار ہو گا لیکن مدھو کے آ جانے کے بعد......''

''تو میرے اشارے پر چلتی رہی تو میں مدھو کو بھی واپس آنے سے روک دوں گا۔'' پرتاپ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس نے سلونی کو پوری طرح اپنے بازوؤں کے حصار میں جکڑا۔ پھر دانت کچکچا کر مدھو کے سلسلے میں لیاقت حسین کے مقابلے میں اپنی شکست کا غصہ بھی سلونی کے دہکتے، مچلتے جسم پر اتارنے میں مگن ہو گیا۔

***

ملٹری ہائی کمان کی وہ تقریب ہیڈ کوارٹر کے ہال میں ہی منعقد ہوئی تھی جہاں ملٹری انٹیلی جنس آفیسران کے علاوہ پولیس کے ایک دو اعلیٰ افسر اور سول انتظامیہ کے بھی کچھ لوگ مدعو تھے۔ اخباری نمائندوں میں سے صرف چھ چیدہ چیدہ پریس رپورٹر کو ہی بلایا گیا تھا۔

ملٹری کا بینڈ خاصی دیر سے نغمہ سرا تھا۔ کرنل احتشام بنفسِ نفیس آنے والے شرکا کا استقبال کر رہا تھا جب وہ، اورنگ زیب اور سراج کو گاڑی سے اتر کر ریڈ کارپٹ کی طرف بڑھتا دیکھ کر تیزی سے قدم بڑھاتا ان کے قریب گیا، بڑی گرمجوشی سے دونوں سے ہاتھ ملا کر اس نے ستائشی جملے ادا کیے۔

''کم آن دی ہیروز آف دی ڈے...... آئی ویلکم بوتھ آف یو۔''

''تھینک یو سر۔'' اورنگ زیب اور سراج نے باری باری جواب دیا۔

''یو آر ٹو ارلی۔'' کرنل احتشام نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''آپ دونوں کو سب سے آخر میں آنا چاہیے تھا تاکہ سب کی نگاہیں آپ کے انتظار میں ہوتیں۔''

''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے سر ورنہ میں نے جو کچھ کیا وہ میری ڈیوٹی تھی۔''

جواب میں کرنل احتشام نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا پھر ایک سول آفیسر کے استقبال کے لیے آگے بڑھ گیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے بیشتر لوگوں کی نظریں اورنگ زیب کی سمت اٹھنے لگیں۔ وہ قدم بڑھاتا پشت میں رکھی خالی کرسیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جب استقبال کمیٹی کے دوسرے لوگ اسے ہاتھ تھام کر اسٹیج پر لے گئے جہاں بیشتر کرسیاں ابھی تک خالی نظر آ رہی تھیں، تقریب کا وقت نو بجے تھا جبکہ ابھی سوا آٹھ بجے تھے۔

''آپ کی وجہ سے آج میں بھی شہ بالا بن گیا ورنہ اپنے ایسے نصیب کہاں؟'' سراج نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بذلہ سنجی کا ثبوت دینے کی کوشش کی۔

''کیا تم بھول رہے ہو کہ الماس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا پھر اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''سرفراز خان پر حملہ کرنے والوں کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟''

''ہو سکتا ہے آکٹوپس کے کسی خاص آدمی کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ ورنہ زیادہ تر مجرم انڈر گراؤنڈ ہی ہو گئے ہیں۔''

''کیا تمہاری عثمان صاحب کے کہنے کے مطابق یہ کسی کاروباری حلقے کی شرارت نہیں ہو سکتی؟ ممکن ہے اس حملے کے ذریعے اس نے سرفراز خان کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہو کہ اگر اس نے دوسروں کے منہ کا نوالہ چھین کر صرف اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش کی تو یہ اس کے لیے دوبارہ کسی واردات میں جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

''نہیں......'' سراج نے دبی زبان میں کہا۔ ''یہ محض عثمان کا خیال ہے۔''

''پھر...... تمہارا کیا خیال ہے؟''

''آکٹوپس کا کوئی سر پھرا چاہنے والا ہی غالباً اب ہیرو بننے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''میں تمہارے اس خیال سے متفق نہیں ہوں......'' اورنگ زیب نے بات جاری رکھتے ہوئے پہلو بدل کر کہا۔ ''معاملہ ہیرو بننے کا نہیں بلکہ حکم کی پیروی کرنے کے زیادہ امکانات ہیں۔''

"کیا مطلب؟" سراج چونکا۔ "کیا آپ نے ابھی تک آکٹوپس کو مردہ تسلیم نہیں کیا؟"

"اس وقت تک تسلیم نہیں کروں گا جب تک اس کی ڈیڈباڈی اپنی نظروں سے نہیں دیکھ لوں گا۔"

"گویا آج کی تقریب کو صرف ریہرسل سمجھوں۔" سراج نے زیرِلب مسکرا کر جملہ ادا کیا۔

اسٹیج کے لیے منتخب کچھ اور معزز مہمان آگئے تو ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ تقریب ٹھیک نو بجے شروع ہوئی، کرنل احتشام نے بذاتِ خود شیخ حامد کی مختلف حیثیتوں کے بارے میں اپنی آفیشل معلومات کے مطابق روشنی ڈالی، خوب صورت الفاظ میں ایس پی اورنگ زیب اور سراج کی کوششوں کو سراہتے ہوئے ڈی آئی جی کے لیے بھی ستائشی جملے ادا کیے پھر اس نے تقریب کے مہمان خصوصی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی جس نے چند رسمی جملوں کے بعد ڈی آئی جی اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو ملٹری کی طرف سے تعریفی سند بھی پیش کی... اورنگ زیب کو تالیوں کی گونج میں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ بعدازاں کرنل احتشام نے دوبارہ مائک لے کر اخباری نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں اخباری نمائندوں کو صرف بیس منٹ کا وقت دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد ڈنر کا اہتمام کیا گیا ہے۔"

"میں مسٹر اورنگ زیب سے صرف ایک ہی سوال کروں گا۔" ایک انگریزی اخبار کے خصوصی نمائندے نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔ "کیا آپ نے ابھی تک دونوں لاشوں کا سراغ نہ ملنے کے باوجود شیخ صاحب اور اس کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے چھلانگ والے دوسرے شخص کو مردہ تسلیم کرلیا ہے؟"

"آج کی تقریب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔" اورنگ زیب نے محتاط انداز میں گول مول جواب دیا۔

"میرا سوال کچھ اور تھا۔" اسی نمائندے نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "کیا آپ نے بھی ان دونوں کو مردہ مان لیا ہے؟"

"لاش برآمد نہ ہونے کی صورت میں یہی سمجھا جاسکتا ہے۔" اورنگ زیب نے دوبارہ خوبصورت لفظوں میں ٹالنے کی کوشش کی تو اخباری نمائندہ برا سا منہ بنا کر بیٹھ گیا، وہ پوری طرح مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔

"ہماری معلومات کے مطابق آپ کو مرکز کی طرف سے خاص اسی مہم کے پیشِ نظر یہاں تعینات کیا گیا تھا؟ کیا یہ درست ہے؟"

"نو کمنٹس......"

"شیخ حامد کے بارے میں آپ پہلے سے کیا معلومات رکھتے تھے؟" تیسرے نمائندے نے کرید کی۔

"اس کی فائل میں نے یہاں ڈیوٹی رپورٹ کرنے کے بعد ہی پڑھی تھی۔"

"محترم......" انگریزی اخبار... کا نمائندہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ کو جس ملٹری اعزاز سے نوازا گیا ہے کیا آپ نے اسے دل سے قبول کرلیا ہے؟"

"میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ اچھا ماتحت اسی کو کہتے ہیں جو افسران کی حکم عدولی کا مرتکب نہ ہو۔ ویسے بات اگر میرے اختیار کی ہوتی تو میں یہ گولڈ میڈل اتار کر اپنے ڈی آئی جی کے گلے میں انتہائی عقیدت سے ڈال دیتا جنہوں نے کبھی میرے کام میں افسرانہ مداخلت نہیں کی۔"

اورنگ زیب نے اتنی معصومیت اور خوب صورتی سے جواب دیا کہ پوری محفل زعفران زار بن گئی، اس کے ساتھ ہی کرنل احتشام نے کھانے کا اعلان کیا تو سب ہی مہمان کرسیوں سے اٹھنے لگے۔ کھانے کے دوران بھی مختلف مہمان اورنگ زیب اور سراج کو مبارکباد دیتے رہے جسے وہ نہایت خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے۔

رات کو پونے گیارہ بجے کے بعد ہی اورنگ زیب اور سراج کی واپسی ممکن ہوئی۔ راستے میں سراج نے کہا۔

"آج مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ آپ ایک اچھے سیاست دان بھی بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس انداز میں آپ اخباری نمائندوں کو بہلاتے رہے، میں اسے خاص طور پر نوٹ کررہا تھا۔ میڈل والی بات سن کر ڈی آئی جی کی باچھیں بھی کھل گئی تھیں۔"

"میرا ذہن ابھی تک سرفراز خان پر ہونے والے حملے کے بارے میں الجھ رہا ہے۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "میرا ذاتی خیال ہے کہ اس حملے کے بہانے ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی ایک بھونڈی کوشش کی گئی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں......" سراج سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "آپ اس حملے سے کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟"

"میں اس کی کوئی مناسب وضاحت نہیں کرسکتا کیونکہ میرے ذہن نے ابھی تک آکٹوپس کو مردہ قبول نہیں کیا اور...... اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو سرفراز خان پر ہونے والا حملہ اسی کے اشارے پر کیا گیا ہوگا۔" اورنگ زیب نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تم یہ کیوں فراموش کررہے ہو کہ لیاقت

حسین کو کسی غیبی قوت نے نواز رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر منظم حملوں سے بھی بال بال بچتا رہا ہے۔ ہم آکٹوپس کی تلاش میں بھی لیاقت حسین کے اچانک اسٹیئرنگ موڑ دینے کے بعد ہی گڈانی بیچ کی طرف گئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آسانی سے ہمیں کوئی بھنک ملنے سے پیشتر ہی فرار ہو گیا ہوتا۔ پھر آج کی تقریب کا اہتمام بھی نہ ہوتا۔"

"میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھ سکا......" سراج نے کسمسا کر وضاحت چاہی۔

"سرفراز خان پر ہونے والے حملے کو...... لیاقت حسین کے لیے بھی ایک وارننگ ہی سمجھو...... مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اگر اس نے آکٹوپس کے معاملات میں مزید دخل دینے کی کوشش کی تو اس کی سزا...... اس کے گھر والوں کو بھی دی جاسکتی ہے۔"

"اوہ...... آئی سی......" سراج نے چونک کر کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ اس حملے سے ہم تو بھنک سکتے ہیں لیکن جو غیبی قوتیں لیاقت حسین کی مدد کررہی ہیں وہ متاثر نہیں ہوں گی۔"

"مسلمان ہونے کے ناتے میں بھی یقین رکھتا ہوں کہ رحمانی قوتوں کے مقابلے میں طاغوتی قوتیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں مگر...... تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ جرائم پیشہ افراد اور خاص طور سے انڈرورلڈ سے تعلق رکھنے والوں کا کوئی دھرم ایمان سرے سے نہیں ہوتا۔ مجرموں کی یہی خوش فہمی ہماری کامیابی کا سبب بھی ہوتی ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" سراج نے اس بار ہونٹ چباتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا پھر وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ اورنگ زیب کے موبائل پر کال موصول ہوئی۔

"ہیلو......" اورنگ زیب موبائل پر چمکتے نمبروں کو دیکھ کر مسکرا کر بولا اس وقت کیسے یاد آگئی۔"

"آپ کو پُرخلوص مبارکباد دینا چاہتی تھی۔" دوسری جانب سے میڈم روبی کی آواز سنائی دی۔

"میرے ساتھ سراج بھی موجود ہیں۔"

"گولڈ میڈل کے حوالے سے میں نے آپ کو ترجیح دی ہے۔" میڈم روبی کا لہجہ بھی دوستانہ تھا۔ "آپ دونوں اب میرے لیے الگ الگ نہیں رہے۔"

"اس عزت افزائی کا شکریہ۔ اب اگر میں آپ کی مبارکباد کے جواب میں آپ کو بھی مبارکباد پیش کروں تو کیسا رہے گا؟"

"کس بات کی مبارکباد؟"

"گھر بسانے کے سلسلے میں میری اطلاع کے مطابق آپ نے بھی کسی سے آکٹوپس کا کانٹا نکل جانے کی شرط لگا رکھی تھی۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آج آپ پہلی بار اتنے دوستانہ موڈ میں بات کر رہے ہیں ورنہ آپ کے ذہن میں تو شاید افلاطون کی روح نے ڈیرا جما رکھا تھا۔"

"یہ بھی کرم نوازی ہے آپ کی کہ افلاطون کا نام لیا۔ کہیں شیطان کہہ دیا ہوتا تو کوئی برا مان جاتا۔"

"یہ اشارہ کس کی طرف ہے......"

"وہی جو میری اور آپ کی گفتگو سن کر جیلس ہو رہا ہے۔" اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا پھر موبائل سراج کی طرف بڑھا دیا۔

***

سرفراز خان کو چھ گھنٹے بعد ہی ہوش آ گیا۔ آنکھ کھولتے ہی اس کے اندر جلالی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نظریں گھما کر گردوپیش کا جائزہ لیا، سیٹھ عثمان کے علاوہ لیاقت حسین بھی اس کے پاس تھا، قریب ہی ایک میل نرس بھی نظر آ رہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے بابا کہ تمہیں ہوش آ گیا......" لیاقت حسین نے باپ کا ہاتھ تھام کر بڑی اپنائیت سے کہا۔

سرفراز خان نے سیٹھ عثمان کو دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی پھر لیاقت حسین کی نظروں میں نظریں ڈال کر ٹھوس لہجے میں بولا۔ "تمہارا چہرے پر اداسی کس لیے ہے؟ مرد ہو کر موت سے ڈرتا ہے؟"

"بابا......" لیاقت چونکا۔ "تم اس وقت......"

"جانتا ہوں......" اس نے سیٹھ عثمان پر تشکرانہ نظر ڈالی۔ "ہمارا دوست نے ہم کو کسی بڑے اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔"

"مم...... میں شرمندہ ہوں سرفراز خان کہ یہ ناگہانی حادثہ آپ کو میرا مہمان ہوتے ہوئے پیش آیا۔" سیٹھ عثمان کے لہجے میں خجالت تھی۔

"روایتی باتیں مت کرو میرے دوست۔" سرفراز خان نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "جو تقدیر میں لکھا ہو، وہ پورا ہو کر رہتا ہے لیکن مجھے بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ادھر شہر میں ہمارا کوئی مخالف ہوگا۔"

"فکر مت کرو بابا......" لیاقت حسین نے باپ کی تسلی کی خاطر کہا۔ "ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں ایک دو روز میں چھٹی مل جائے گی۔"

"زخم بھرنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔" سرفراز خان عجیب انداز میں مسکرایا۔ "کیا تمہارا نظر بھی اس پر نہیں پڑا جس نے حملہ کیا تھا؟"

"نہیں......" لیاقت حسین بل کھا کر بولا۔ "اگر وہ میری نظروں میں آ جاتا تو اس کو جہنم واصل کرنے سے دریغ بھی نہ کرتا۔"

"میں نے سراج کو اطلاع کر دی ہے، وہ سب معاملہ دیکھ لے گا۔" سیٹھ عثمان نے کہا۔

"گھر پر کسی کو اطلاع ہوئی......؟"

"میں نے فی الحال منع کر دیا ہے ورنہ سب... پریشان ہوتے۔" سیٹھ عثمان نے پھر شرمندگی کا اظہار کیا۔ "زخم بھرنے اور فوری دیکھ بھال کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم آپ کو آج بھی گھر لے جا سکتے تھے۔"

"مجھے کسی اور کا نہیں لیاقت کا ماں کا فکر ہے دوست۔ اس خدا کی نیک بندی کو ہر بات کا پتا چل جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں بھی آج تک نہیں سمجھا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ اللہ کی بندی ہمارا حال سے ضرور باخبر ہوگا۔"

سرفراز خان کی یہ بات خود لیاقت حسین کے لیے بھی نئی تھی۔ ماں نے اسے اور فرحین کو واپس جاتے وقت صرف اسی کو علیحدہ کمرے میں بلا کر بڑے نانا کا ذکر ضرور کیا تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ اسے دور رہ کر بھی ہر بات کا علم ہو جاتا ہے۔ لیاقت حسین ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ سرفراز خان نے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"تم گھر جاؤ لیاقت، سب سے یہی کہنا کہ ہم خدا کا کرم سے روغ موٹ (بھلا چنگا) ہے۔ دو ایک دن اسپتال کا سیر کر کے واپس آ جائے گا۔"

"کوئی آنے کی ضد کرے تو اسے روکنا نہیں۔" سیٹھ عثمان نے اس کے جاتے جاتے محبت سے کہا۔ "گاڑی لے جانا، میں سراج کے ساتھ آ جاؤں گا۔ وہ آنے کا کہہ کر گیا ہے۔"

لیاقت حسین کے جانے کے بعد سرفراز خان نے سیٹھ عثمان سے دوبارہ کاروباری باتیں شروع کر دیں، میل نرس انجکشن لگانے آیا تو اس نے بڑی بے پروائی سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

***

فرحین اس وقت راحیلہ بیگم اور لیاقت حسین کی ماں کے ساتھ ہی بیٹھی تھی جب لیاقت حسین نظریں جھکائے اندر داخل ہوا، ماں نے اسے ایک نظر بھر کر دیکھا پھر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کر ماں کی جان، جو مصیبت آنا تھا وہ ٹل گیا۔ سب اوپر والے کا کرم ہے۔"

"بابا کو ہوش آیا یا نہیں؟" فرحین نے سوال کیا۔

"آ گیا ہے......"

"ابھی...... عثمان کا فون آیا تھا۔" راحیلہ بیگم نے سب کو مطمئن کرنے کی خاطر مسکرا کر کہا۔ "سرفراز خان صاحب نے ہوش میں آتے ہی تجارت کا حساب کتاب پھیلانا شروع کر دیا ہے۔"

راحیلہ بیگم کے بے حد اصرار کے بعد لیاقت حسین نے کھانا کھایا لیکن وہ ابھی تک باپ کو پیش آنے والے حادثے کی وجہ سے پریشان تھا۔ گولی چلانے والا اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل گیا تھا۔

لیاقت حسین کے کھانے کے دوران بھی اِدھر اُدھر کی کچھ باتیں ہوتی رہیں پھر لیاقت حسین کی ماں نے راحیلہ بیگم سے کہا۔

"ہمارے آنے سے تمہیں بلاوجہ ایک پریشانی نے گھیر لیا۔ ہم بہت شرمندہ ہے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں......؟" راحیلہ بیگم نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "گھر میں کسی بزرگ کی موجودگی تو باعثِ برکت سمجھی جاتی ہے۔ البتہ ہمیں شرمندگی کا اظہار کرنا چاہیے کہ...... یہاں آ کر آپ کو بیٹھے بٹھائے ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔"

"سب اوپر والے کا مرضی سے ہوتا ہے میرا جان...... اس کے اشارے کے بغیر ایک دانہ بھی اِدھر سے اُدھر حرکت نہیں کر سکتا۔"

"تو فکر مت کر ماں۔" فرحین نے ماں کو دلاسا دیا۔ "اپنے سراج صاحب گولی چلانے والے نامراد کو چوہے کے بل سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"وہی ہوگا میرا جان جو اوپر والے کو منظور ہوگا۔" ماں نے کہا پھر وہ لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "تو میرے ساتھ ادھر دوسرے بنگلے میں اپنے گھر چل۔ مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

ماں کا حکم تھا اس لیے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، فرحین اور راحیلہ بیگم بھی ایک دوسرے کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھتی رہیں لیکن کسی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیاقت حسین خاموشی سے ماں کو لے کر انیکسی میں آ گیا۔ سانس درست کرنے کی خاطر ماں کچھ دیر ایک کرسی پر بیٹھ کر آرام کرتی رہی پھر لیاقت کا ہاتھ تھام کر اس کو اپنے

قریب فرش پر بٹھالیا۔ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔
"دشمنوں کا زور تمہارے اوپر نہیں چل سکتا اس لیے اب وہ دوسرا راستہ اختیار کررہا ہے۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو... ماں؟" لیاقت حسین نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔

"میں جو کہہ رہی ہوں اسے دھیان سے سن لیاقت...... اس شہر میں تیرے بابا کا کوئی دشمن نہیں ہے، وہ تجھے قابو کرنے کی خاطر اوچھے ہتھکنڈے اختیار کررہے ہیں...... دشمنوں اور ایک کافر کو کسی عورت کا جل کر مرجانے کا صدمہ کھائے جارہا ہے۔"

لیاقت حسین چونکا، اس نے ابھی تک ماں کو مدھو پجارن (جو فرحین کا روپ دھار کر آئی تھی) کے جل کر مرنے کی کوئی خبر نہیں سنائی تھی، وہ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

"جس کا قسمت میں مرنا تھا وہ مر کر جہنم رسید ہوگیا لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔"

"کیا اچھا نہیں ہوا اماں؟"

"بڑے نانا کا تعویذ تیرے قبضے سے نکل گیا۔ وہ ہوتا تو کوئی کافر کا تخم تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن......" ماں ایک لمحے کو خلا میں گھورتی رہی پھر اپنے ہاتھ سے چھٹے کلیجی کے رنگ کے عقیق کی انگوٹھی کو اتار کر لیاقت حسین کو دیتے ہوئے بولی۔ "اس کو پہلا فرصت میں کسی سنار کاریگر سے اپنا سامنے بڑا کرا کے کلمے کی انگلی میں ڈال لینا۔ اس کے بعد اوپر والا تیری حفاظت کرے گا۔"

"بابا کا دشمن کون ہوسکتا ہے؟" لیاقت حسین نے کسمسا کر سوال کیا۔

"وہ تیرے بابا کا نہیں تیرا دشمن ہے۔" ماں نے خلا میں گھورتے ہوئے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "تو نے عین موقع پر گاڑی کا رخ نہ پھیرا ہوتا تو اس بدبخت کا بھانڈا ابھی نہ پھوٹتا......"

"یہ...... یہ...... تو کس کی بات کررہی ہے......؟"

"وہی جو آسمان سے گرا اور کہیں کھجور میں اٹک کر رہ گیا ہے۔" ماں نے کھوئے کھوئے انداز اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

ماں کی نظریں بہ دستور خلا میں کہیں بھٹک رہی تھیں۔ لیاقت حسین اس کا جواب سن کر بری طرح چونکا۔ ایک لمحے وہ ماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر دبی زبان میں پوچھا۔

"جو آسمان سے گرا تھا کیا وہ ابھی تک زندہ ہے؟"

"تو جس کا نمک کھا رہا ہے لیاقت...... صرف اس کی فکر کر۔" ماں نے اس بار لیاقت حسین کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔ "جو کھیل یہاں شروع ہوا ہے وہ ابھی بہت سارا کروٹیں لے گا۔ اس سے دور ہی رہ...... یہی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں ماں لیکن ان کے بڑے احسان ہیں میرے اوپر......" لیاقت حسین نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ان سے اچانک منہ پھیر لیا تو یہ بھی خود غرضی ہوگی۔"

"پھر......" ماں نے قدرے الجھ کر سوال کیا، "تو کیا چاہتا ہے؟"

"گاڑی پھرنے والی بات اور رنگ زیب صاحب اور سراج صاحب نے بھی کی تھی لیکن کچھ مجھے یاد نہیں...... اب تو بھی وہی حوالہ دے رہی ہے، مجھے بتا ماں کہ بات کیا ہے؟"

"تو اسے بھول گیا جس نے ایک چٹکی خاک زمین سے اٹھا کر تیرے منہ میں ڈالا تھا پھر وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔"

"وہ...... وہ کون تھا ماں؟"

"تھا خدا کا ایک بندہ جو اوپر والے کے اشارے پر ہی تجھے نواز گیا تھا۔" ماں نے رک رک کر ٹھوس انداز میں کہا۔ "تیرا منہ سے جو ایسی بات نکلتا جو تجھے بعد میں یاد نہیں رہتا، اس میں بھی اوپر والے کی بہت سی مصلحتیں ہیں جو تو نہیں سمجھتا۔"

"ماں......" لیاقت حسین نے ماں کا پیر دباتے ہوئے خاص طور پر شیخ حامد کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ "جو آسمان سے گرا تھا وہ کہاں ہے؟...... مرگیا یا ابھی تک زندہ ہے؟" لیاقت حسین نے بات جاری رکھی۔ "وہ اچھا آدمی نہیں تھا ماں، بڑا ظالم تھا اور...... اور اس کا تعلق بھی زیر زمین رہنے والی خطرناک تنظیموں سے تھا...... وہ سب شیطان اور پلید لوگ ہیں ماں۔"

"تو فکر مت کر......" ماں نے پھر خلا میں دور کہیں گم ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک پلید...... دوسرا پلید کی وجہ سے مارا جائے گا۔ اس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔"

"دوسرا پلید کون ہوگا......؟" لیاقت حسین نے تیزی سے پوچھا، اس کے دل کی دھڑکنیں ماں کو ایک نئے رنگ میں دیکھ کر تیز ہونے لگیں۔

"وہ...... وہ...... بھی گناہوں میں گلے گلے تک غرق ہے...... بدنصیب۔"

"اس کا کوئی نام کوئی...... اتا پتا تو ہوگا؟"

"وہ...... وہ......" ماں کی پلکیں اچانک جھپکنے لگیں پھر

اس نے لیاقت کی طرف دیکھ کر تھکے تھکے انداز میں کہا۔ "فرحین کو بلا کر میرے لیے ایک کپ قہوہ تیار کرادے۔ بڑا خواہش ہورہا ہے۔"

لیاقت حسین نے ماں کی اچانک تبدیل ہونے والی کیفیت کو محسوس کیا تو پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ خاموشی سے جاکر فرحین کو بلا لایا جس نے ماں کے لیے قہوہ تیار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

ماں نے قہوہ پی کر تھکے تھکے انداز میں کمر سیدھی کرنے کی خاطر بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں تو فرحین خاموشی سے لیاقت حسین کا ہاتھ تھام کر کچن میں لے گئی۔ سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے...... ماں کی طبیعت ٹھیک تو ہے؟"

"ہاں آں...... لیکن وہ مجھ سے خفا ہے۔" لیاقت نے بات بنانے کی خاطر اداس لہجے میں جواب دیا۔

"تجھ سے خفا ہے......!" فرحین نے تعجب کا اظہار کیا۔ "کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی۔"

"ہاں...... بتائی تو تھی لیکن......" لیاقت حسین جملہ ادھورا چھوڑ کر خلا میں دیکھنے لگا۔

"ایسی کیا بات ہے جو تو مجھ کو بتاتے ہوئے ہچکچا رہا ہے......" فرحین الجھنے لگی، تنک کر بولی۔ "آنے دے سراج صاحب کو...... میں ان سے تیری شکایت کروں گی۔"

"سمجھنے کی کوشش کر لیاقت کی جان......" لیاقت حسین نے فرحین کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "بابا کو خیریت سے گھر واپس آلینے دے پھر میں ماں کی شکایت بھی دور کردوں گا۔"

"مجھے ٹالنے کی کوشش کررہا ہے......؟" فرحین نے لیاقت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "کھا میرے سر کی قسم کہ تو سچ کہہ رہا ہے۔"

"میں نے پہلے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے......؟" لیاقت حسین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شکوہ کیا۔

"نہیں...... لیکن اس وقت سچ بتانے سے کیوں ہچر مچر کررہا ہے۔"

"ماں صرف مجھ سے نہیں...... تجھ سے بھی ناراض ہے۔ جانتی ہے کیوں......؟"

"کیوں...... اس کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی۔"

"وہ...... وہ وجہ اس وقت یہاں کچن میں کھڑے کھڑے تجھے نہیں سمجھا سکتا...... بابا کو گھر آلینے دے پھر اطمینان سے تجھے ایسا سمجھاؤں گا کہ پھر تو کبھی مجھے اتنے دنوں فراموش نہیں کرے گی۔"

"چل ہٹ...... بلی کے خواب میں چھچھڑے ہی سمائے رہتے ہیں۔" فرحین نے ایک ادا سے اپنا ہاتھ چھڑایا پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ایکسی سے چلی گئی۔

لیاقت حسین ماں کے پاؤں دبانے اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں پھر ماں کی کہی ہوئی باتیں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگیں مگر وہ ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

⁂⁂⁂

تھریسیا حسب معمول صبح کے ناشتے کی میز پر میڈم روبی کے ساتھ موجود تھی۔

گزشتہ رات اس نے میڈم کو ایس پی اورنگ زیب کو فون کرتے سنا تھا۔ اس وقت وہ بے حد خوش نظر آرہی تھی لیکن اس وقت ناشتے کی میز پر خلافِ معمول وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تھریسیا ایک لمحے تک اس کو مختلف زاویوں سے تولتی رہی پھر اس نے دبی زبان میں پوچھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں......؟"

"کسی دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ ہوسکے تو ایک کسک سی دل میں رہ جاتی ہے۔"

"اوہ......" تھریسیا نے اس کا مفہوم سمجھ کر کہا۔ "میرا خیال ہے جو کچھ ہوا وہ بہتر ہی تھا۔ اس کی لاش اگر مل بھی جاتی تو کیا ہوتا؟"

"میں اس کے منحوس چہرے پر نفرت سے تھوک کر کم از کم اپنے شوہر کی روح کو کچھ تسکین تو پہنچا سکتی تھی۔"

"کول ڈاؤن میڈم......" تھریسیا نے اسے سمجھانے کی خاطر کہا۔ "اگر آپ اپنی آخری خواہش کی تکمیل کرلیتیں تو اس کی وجہ جان کر کچھ افراد آپ کے زخم کو مزید کریدنے کی کوشش بھی ضرور کرتے۔"

میڈم نے تھریسیا کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی بات کی گہرائی سمجھ میں آئی تو وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "تم...... تم شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہو لیکن بہرحال میں اس منحوس کے مردہ چہرے کو نہ دیکھ سکی جو فرعون بنا ہوا تھا۔"

"بھول جائیں...... خس کم جہاں پاک۔" تھریسیا نے موضوع بدل دیا۔ "آپ نے اورنگ زیب اور سراج صاحب کو صرف مبارک باد تو دی ہے، کیا ان کی دعوت کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟" میڈم نے تھریسیا کو تعجب سے دیکھا۔ "اب تو الماس بھی میری بہن بن چکی ہے، اس رشتے سے بھی سب کو بلانا میرے پروگرام میں شامل ہے۔

تم سے پروگرام بنانے کے بعد ہی ان کو آگاہ کروں گی۔"

دونوں اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے ناشتے کی میز سے اٹھ کر لاؤنج میں آگئیں جب میڈم کے موبائل پر سگنل موصول ہوا۔ اس نے نمبر دیکھ کر ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر موبائل آن کر کے بولی۔

"آپ نے پہل کر دی ورنہ میں ابھی آپ ہی کو فون کرنے کا سوچ رہی تھی۔ کل کی تقریب کے سلسلے میں میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک باد۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ازخود مبارک باد دے دی ورنہ میں اس وقت اسی کا مطالبہ کرنے والا تھا۔" دوسری جانب سے ڈی آئی جی نے بے تکلفی سے کہا۔ "اگر پہلے سے علم ہوتا تو کچھ دیر اور صبر کر لیتا۔"

"تقریب کیسی رہی......؟"

"نہایت شاندار...... بس آپ کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔"

"میں سمجھی نہیں؟...... میری کمی کا احساس آپ کو اس تقریب میں کیسے ہو گیا......؟" میڈم نے زیرلب مسکرا کر سوال کیا۔

"اس خیال نے کہ آپ کو بھی پوری طرح یقین آجاتا کہ شیخ حامد کا کانٹا اب ہمارے درمیان سے نکل چکا ہے۔"

ڈی آئی جی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"میں آپ کا مقصد سمجھ رہی ہوں۔" اس نے پہلو بدل کر صاف گوئی سے کہا۔ "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے لیکن مجھے کچھ وقت درکار ہوگا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم جو قدم اٹھائیں، سوچ سمجھ کر ہی اٹھائیں۔"

کسی کی موت کی نہیں بلکہ کسی خطرناک دشمن کی موت کی خوشی میں، میں آپ کی، مسٹر اورنگ زیب اور سراج صاحب اینڈ مسز کی دعوت کرنے کے بارے میں بھی اس وقت تھریسیا سے ڈسکس کر رہی تھی۔"

"فائن...... مجھے شدت سے انویٹیشن کا انتظار رہے گا۔"

ڈی آئی جی سے گفتگو ختم ہونے کے بعد میڈم نے فون آف کیا تو تھریسیا نے کہا۔

"میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ اب آپ کو اپنا گھر بسا لینا چاہیے۔"

"اطمینان سے غور کروں گی۔" میڈم نے موضوع بدل کر کہا۔ "لوچن کا معاہدہ کب ختم ہو رہا ہے؟"

"دو ماہ بعد لیکن آپ کو اس وقت لوچن کا خیال کیسے آگیا؟" تھریسیا نے وضاحت چاہی۔

"اسے فارغ کرنے میں جلدی نہ کرنا...... ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس کی ضرورت پڑے۔" میڈم نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ "کل رات سراج نے مجھے فون کر کے ایک ایسی اطلاع دی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا......؟"

"مسٹر اورنگ زیب کا خیال ہے کہ آکٹوپس ابھی مرا نہیں ہے۔"

"اس خیال کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی۔" تھریسیا نے تعجب سے دریافت کیا۔

"نہیں...... اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ جب تک وہ اس کی مکروہ لاش خود اپنی نظر سے کفن میں لپٹی نہیں دیکھ لیتا، مردہ تسلیم نہیں کرے گا۔" میڈم نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اورنگ زیب ایک تجربے کار ذہین اور ذمہ دار آفیسر ہے۔ اس نے اگر اس منحوس کی موت کو تسلیم نہیں کیا تو اس کی کوئی معقول وجہ بھی ضرور ہوگی۔"

"آپ ابھی لوچن کی بات کر رہی تھیں۔" تھریسیا نے میڈم کو یاد دلایا۔ "اس سے کیا کام لینا ہے؟"

"ابھی میرے ذہن میں کوئی واضح پروگرام نہیں ہے پھر بھی اسے چھ مہینے کے لیے اور انگیج کر لو۔"

"ایز یو وش۔" تھریسیا نے کہا پھر وہ ملازموں کو روزمرہ کے کاموں کی ہدایت دینے کی خاطر اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد میڈم نے کچھ سوچ کر اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ فوری قائم ہو گیا۔

"خیریت......!" دوسری جانب سے اورنگ زیب کی مانوس آواز سنائی دی۔ "اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"مجھے شبنم کے بارے میں دریافت کرنا ہے۔ ایک عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اوہ......" کچھ توقف سے جواب ملا۔ "میری اطلاع کے مطابق وہ آج کل اپنے ذاتی فلیٹ میں ہی ہے لیکن میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ فی الحال اس سے دور ہی رہیں تو مناسب ہوگا۔"

"کوئی خاص وجہ......؟"

"یہ بات آپ کے علم میں بھی ہے کہ وہ کس کے آفس میں ملازم تھی۔ اس کا اچانک سامنے آکر اپنے فلیٹ میں موجود ہونا بہت سے شکوک کو جنم دے رہا ہے۔ میرے کچھ

خاص آدمی بھی اس کی نقل و حرکت کی نگرانی پر مامور ہیں۔"

"آپ کے آکٹوپس کے مرنے کے بعد اب اسے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟" میڈم نے آکٹوپس کے نام پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال میں اس موضوع پر فون پر گفتگو کرنے سے گریز ہی کروں گا۔" سنجیدگی سے جواب ملا۔

"میں آپ سب کی مشترکہ دعوت کا پروگرام بنا رہی ہوں۔" میڈم نے شبنم کا ذکر ختم کر کے برسبیل تذکرہ کہا۔ "ابھی تھریسیا سے یہی بات کر رہی تھی۔"

"زندگی اور موت کا کوئی بھروسا نہیں...... اس لیے نیک کام کر گزرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" اورنگ زیب نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ جواب میں میڈم نے دو چار رسمی باتیں کیں پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے ذہن میں ایک بار پھر شیخ حامد کا تصور کلبلانے لگا جو اورنگ زیب کے خیال کے مطابق مرا نہیں تھا۔ "حقیقت کیا تھی؟" یہی ایک سوال اس کے ذہن میں بار بار صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہا۔

⁂⁂⁂

گرے کلر کی وہ ہائی روف اس وقت شہر کے سب سے پوش علاقے کی طرف جانے والی اس سڑک سے گزر رہی تھی جو متوازی ذیلی سڑک سے تقریباً دس بارہ فٹ بلندی پر بیضوی برج کی شکل میں بنائی گئی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر سفید وردی میں ملبوس ایک پستہ قد شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی اس کی شخصیت میں ایک اضافہ ہی لگ رہی تھی، سر پر نظر آنے والی کیپ پر بھی اسی کمپنی کا مونوگرام بنا تھا، یہ اس کا اصل روپ نہیں تھا، وہ زیروز یروسیون کے احکامات پر عمل کرنے والا مارشل آرٹ کا ماہر چائنیز باشندہ لوچن تھا، اس کا تعلق اس بین الاقوامی زیرِزمین تنظیم سے تھا جو منہ مانگے داموں کے عوض ایسے تجربہ کار افراد ایک خاص اور طے شدہ وقت کے لیے فراہم کرتی تھی جو ہر ناممکن کو ممکن بنا دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ لوچن کی مدت پوری ہونے میں صرف دو ماہ اور باقی رہ گئے تھے، اس کے ساتھ دو افراد اور بھی ایک جہاز میں آئے تھے جن میں سے دو مارے جاچکے تھے۔ آپس میں ان تینوں کا تعارف بھی محض ایک اتفاق کی بنا پر جہاز میں ہوا تھا ورنہ وہ پہلے سے ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ ان کا تعلق بھی الگ الگ ملکوں سے تھا۔

حسبِ معمول لوچن اس وقت بھی بے پروا نظر آرہا تھا جب پچھلی سیٹ پر نظر آنے والے شخص نے اسے مخاطب کیا۔ وہ بھی وشنو کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

"ہمیں اس وقت جگا سے ملاقات کرنی ہے۔"

"جگا......" وشنو چونکا۔ "کیا ہمارا جگا کے سامنے جانا مناسب ہوگا؟"

"تم اس وین میں بیٹھ کر اپنی کلونت کو یاد کرتے رہنا۔" لوچن نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جگا سے صرف مجھے ملاقات کرنی ہے۔"

اس بار پشت سے کچھ نہیں کہا گیا البتہ کلونت کے نام پر وہ اندر ہی اندر جھلس کر ضرور رہ گیا تھا۔ وہ بھی اس وقت حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر میک اپ میں تھا ورنہ اس کا تعلق بھی لوچن ہی کے قبیلے کے افراد میں شمار ہوتا تھا، وہ رام دیال سے وشنو بن گیا تھا۔ کلونت اس کی بیوی تھی، خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہ ظاہر وفادار بھی تھی لیکن ایک روز اس کی وفاداری کا بھانڈا بھی اتفاقیہ پھوٹ گیا جب رام دیال المعروف وشنو چار روز کا کہہ کر جانے کے دو دن بعد ہی اچانک گھر آگیا تھا، کلونت کو اپنے ہی ایک دوست کے ساتھ بے لباس اور قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے اپنے دوست کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا لیکن کلونت کو کرپان مار مار کر بڑی اذیت ناک موت مارا تھا پھر وہ کچے بارڈر کے راستے سرحد کراس کر کے پڑوسی ملک میں داخل ہوا۔ یہاں بلیک ٹائیگر کے ذریعے اس کی رسائی شیخ حامد تک ہو گئی تھی۔ لوچن اور اس کی ملاقات جیل میں ایس پی اورنگ زیب کے اشارے پر ہوئی تھی۔ بہرحال، اس وقت کلونت کے حوالے نے اس کے زخموں پر نمک کا کام کیا تھا۔

"کیا بات ہے مائی ڈیئر۔" لوچن نے عقب نما آئینے میں وشنو کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم اچانک چپ کیوں ہو گئے؟"

"میں تم سے آخری بار درخواست کر رہا ہوں۔" وشنو نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "دوبارہ کبھی تم کلونت کا نام زبان پر نہیں لاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے......" لوچن نے بہ دستور بے پروائی سے جواب دیا پھر بیضوی سرخ نما سڑک ختم ہونے کے بعد اس نے وین کا رخ ذیلی سڑک پر موڑ دیا جہاں کشمیری فرنیچر کے نام پر جگا نے کاروبار کر رکھا تھا، پچھلی بار وہ یہاں ہاشم کے ساتھ آیا تھا جو بعد میں مار دیا گیا تھا۔

"کیا تم کو اس وقت جگا سے ملاقات کرنے کی ہدایت

ملی ہے؟" وشنو نے تھوڑے توقف سے دریافت کیا۔

"ہاں...... یہی سمجھ لو۔"

"ہم جس انداز میں ملٹری کی دسترس سے فرار ہوئے ہیں اس کے بعد کیا ہمارا جگا یا کسی اور ایسے آدمی سے ملنا مناسب ہوگا جو پولیس اور ملٹری انٹیلی جنس کی فہرست میں موجود ہے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔" لوچن مسکرایا۔ "ہماری ملٹری انٹیلی جنس اتنی بے پروا بھی نہیں ہے کہ ہم آسانی سے فرار ہو جاتے۔"

"پھر......؟"

"اس کا موقع ہمیں کسی خاص مصلحت کی بنا پر فراہم کیا گیا ہے۔"

وشنو اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا، اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہے۔

لوچن نے وین عین کشمیری فرنیچر کے شوروم کے سامنے روکی پھر...... نیچے اتر کر سیدھا اس میز کی طرف گیا جس پر منیجر کی تختی نظر آرہی تھی۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے؟" میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے شخص نے دانا ڈالنے کی کوشش کی۔ "فرنیچر کی لین دین بعد میں ہوتی رہے گی۔"

"آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ...... لیکن میں اس وقت یہاں فرنیچر خریدنے کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔"

"پھر......"

"مجھے اس وقت تمہارے جہانگیر بٹ (جگا) صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔"

"آپ کو کسی نے غلط پتا......"

لوچن نے اس کا جواب پورا ہونے سے بیشتر ایک ایسا کوڈ ورڈ دبی زبان میں استعمال کیا کہ منیجر اپنی نشست پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس نے لوچن کی وردی اور اس کے چہرے کو بہ نظر غور دیکھا پھر انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے پر آہستہ سے دریافت کیا۔

"کیا حکم ہے جناب......؟"

"میں نے اسے دیکھ لیا ہے، آنے دو......"

منیجر کے ساتھ ہی لوچن بھی اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شوروم کے اندر سے مختلف راستوں کے ذریعے گزرنے کے بعد منیجر ایک دروازے کے باہر رک گیا۔

"آپ اندر جا سکتے ہیں۔"

لوچن نے مسکرا کر منیجر کو دیکھا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جگا سامنے ہی ایک میز پر بیٹھا نظر آگیا۔ اس کے بائیں جانب ایک خونخوار شکاری کتا بھی موجود تھا۔ لوچن کو دیکھ کر اس نے کوئی حرکت نہیں کی لیکن اس کی زبان ضرور کپکپانے لگی تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ وہ جگا کے ایک اشارے پر اس کے شکار کو جھنجوڑنے میں غیر معمولی پھرتی کا ثبوت دینے سے دریغ نہیں کرے گا۔ لوچن نے ایک نظر میں کمرے کا جائزہ لیا پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھ کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو تم اس وقت میک اپ میں ہو اور تمہارا نام......"

"تمہارے اندازے کے عین مطابق لوچن ہی ہے۔"

"اس وقت کیسے آنا ہوا......؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم نے جو کوڈ استعمال کیا ہے اس کے پیشِ نظر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ شاید مجھے کوئی اہم کام سونپا جا رہا ہے۔" جگا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"نہیں...... فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" لوچن نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

"پھر...... کیسے زحمت کی؟"

"مجھے کچھ دیر کے لیے ایک محفوظ مقام کی ضرورت تھی۔ اس وقت میرے یہاں آنے کا صرف یہی مقصد ہے۔" جواب دینے کے ساتھ ہی لوچن نے موبائل نما کوئی ڈیوائس نکال کر میز پر رکھ دی پھر اس کے دونوں ایئرفون (Ear Phone) کے تاروں کو ڈیوائس میں لگا کر دوسرے سرے کانوں میں لگا لیے۔ ساتھ ہی اس نے میز پر رکھا ہوا پیڈ اور ایک بال پن اٹھا کر بڑی بے تکلفی سے اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔

جگا بڑی معنی خیز اور کھوجی نظروں سے لوچن کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ لوچن کی پوری توجہ ایئرفون میں ابھرنے والی آوازوں پر مرکوز تھی۔ پہلی آواز کسی ٹیون کی تھی جو بار بار ابھرتی رہی پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ دوسری بار جن نمبروں پر رابطہ قائم کیا گیا۔ ادھر سے بھی ریکارڈڈ آواز ابھری تھی کہ "یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔"

لوچن کی نظروں میں ابھرنے والا تجسس گہرا ہو رہا تھا جب تیسری بار تین مرتبہ ٹیون سنائی دینے کے بعد کسی نے

آواز بنا کر پوچھا تھا "کون ہے......؟"

"ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے۔" اس بار موبائل کرنے والے نے بھی آواز بنا کر مختصراً ایک معنی خیز سوال کیا۔ "جنگی مشق میں ہمارا جو بڑا جہاز حصہ لے رہا تھا۔ کیا وہ واقعی ڈوب گیا؟"

"تم نے غلط نمبروں پر ڈائل کیا ہے۔" دوسری جانب سے رابطہ منقطع کرنے میں غیر معمولی عجلت کا مظاہرہ کیا گیا۔

لوچن پیڈ پر کچھ نمبر درج کرنے میں مصروف تھا جب پھر ایک مانوس ٹیون کی آواز ابھری۔ "تم نے ابھی کچھ دیر پیشتر جس نمبر پر رابطہ قائم کیا تھا اس کا مقصد کیا تھا؟"

"مجھے اس جہاز کے کپتان کا نائب سمجھو۔" کال اٹینڈ کرنے والے نے بہ دستور بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہارے سوال کا جواب۔ ہاں یا نہیں دیا جا سکتا البتہ ایک اہم بات غور سے سن لو......" دوسری سمت سے خشک اور تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ "دوبارہ خود سے کسی بھی نمبر کو آزمانے کی حماقت نہ کرنا۔ ضروری احکامات تمہیں ہماری جانب سے ملتے رہیں گے۔"

اس کے ساتھ آوازوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لوچن نے مختصر ڈیوائس کو دوبارہ سمیٹ کر چمڑے کے ایک مختصر پاؤچ (Pouch) میں رکھا، لیٹر پیڈ کا صفحہ پھاڑ کر جیب میں رکھا پھر اس نے جگا کی سمت دیکھا جو بہ دستور اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا میں تمہارے کاروباری معاملات میں مخل تو نہیں ہوا؟"

"کس کی کالز سن رہے تھے؟" جگا نے اس بار مسکرا کر سوال کیا۔

"اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" لوچن نے بے پروائی سے جواب دیا پھر کتے کی طرف دیکھ کر بولا۔ "حفاظت کے لیے شکاری کتوں کا استعمال اب بہت پرانا ہو گیا ہے۔"

"یہ تمہارا خیال ہے دوست لیکن میرا تجربہ اس کے برعکس ہے۔" جگا نے کتے کے بارے میں کہا۔ "میرے مخصوص اشارے پر یہ میرے کسی مخالف کو پل بھر میں اوپر پہنچا دیتا ہے۔"

"سمندر کے اوپر چلنے والے جہازوں کو اپنی حقیقتوں کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب کوئی سب میرین اپنا کام کر گزرتی ہے۔" لوچن کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ "میرے اور تمہارے درمیان جہاز اور سب میرین ہی جتنا فرق ہے۔"

جگا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ خود کو سنبھال کر چبھتی آواز میں بولا۔ "جو بات تجربے کے بغیر کہی جائے اس میں زیادہ وزن بھی نہیں ہوتا۔"

"فی الحال ہم ایک ہی کارواں کے دو فرد ہیں جگا لیکن......" لوچن نے کتے کو حقارت سے دیکھ کر کہا۔ "تم اگر چاہو تو میری بات کا ذاتی تجربہ بھی کر سکتے ہو...... یہ کھیل بھی دوستانہ ماحول میں ہوگا۔"

جگا نے جواب میں لوچن کو مسکرا کر دیکھا پھر اس کے الٹے ہاتھ کی درمیانی انگلی اٹھ گئی، شکاری کتے نے اس مخصوص اشارے کو پاتے ہی برق رفتاری سے چھلانگ لگائی تھی لیکن وہ درمیان ہی میں قلابازی کھا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ جگا اچھل کر کھڑا ہو گیا اس کے تیور بدلنے لگے۔

"میں نے کہا تھا کہ میں اس قسم کے کھیل کو پسند کرتا ہوں۔" لوچن نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔ "پریشان مت ہو، کتا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ کچھ دیر میں لوٹ پوٹ کر پھر پوری طرح ہوش میں آجائے گا۔"

"تم نے شاید اپنے جبڑوں میں مخصوص سوئیاں پش فائر (Push Fire) کرنے والی نلکی چھپا رکھی تھی۔"

"یہ بھی طریقہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ زندگی ہتھیلی پر رکھ کر موت سے کھیلنے والوں کے پاس اس سے زیادہ موثر اور جدید کھیل تماشے موجود ہیں۔"

"چائے یا ڈرنک پینا پسند نہیں کرو گے دوست۔" جگا نے اس بار دوستانہ لہجے میں دعوت دی۔

"ادھار رہی...... پھر کبھی اطمینان سے ملاقات ہوگی تو یہ قرض بھی وصول کر لوں گا۔" جواب میں لوچن نے بھی دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اور وشنو دوبارہ وین میں سفر کر رہے تھے لیکن دونوں نے چپ سادھ رکھی تھی۔ ان کے چہروں سے یہی تاثر عیاں تھا کہ وہ اپنی اپنی کسی گہری سوچ میں غرق ہیں۔

جگا نے لوچن کے جانے کے بعد گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے شکاری کتے کو ٹٹولا...... اس کی سانس بہ دستور چل رہی تھی۔

☆☆☆

افضل خان کا ذہن بہ دستور گزرے ہوئے واقعات کے تانے بانے میں الجھ رہا تھا۔ اسے صرف اس حد تک اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس وقت کسی پرائیویٹ اسپتال کے

کارنر روم میں زیرِ علاج ہے۔ وہ اسپتال کس علاقے میں تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ وہاں اس کا داخلہ کس نے کرایا تھا؟ ملٹری انٹیلی جنس نے یا پولیس والوں؟

گزشتہ ایک ہفتے سے یا اس سے کچھ زیادہ مدت سے وہ اسی اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ ڈاکٹر اور نرس اس کا باقاعدگی سے پورا خیال رکھتے تھے لیکن وہ اس سے گفتگو کرنے سے گریز ہی کرتے تھے...... کیوں؟

اس کے ذہن میں ماضی کی بہت سے تلخ یادیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ بگ باس نے جس وجہ سے اس سے ناراض ہو کر نظریں پھیر لی تھیں اس میں بھی وہ بے قصور ہی تھا پھر جس انداز میں ریڈ کراس اسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے اس سے ایک دن اچانک نظریں بدل کر کہا تھا کہ یا تو وہ اپنے علاج کے اخراجات خود برداشت کرے یا پھر کسی خیراتی اسپتال میں داخل ہو جائے اسی دن اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ بگ باس کے کام کا نہیں رہا۔

اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد اس نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا مصمم ارادہ کر لیا تھا جس شہر کے طول و عرض میں بگ باس کا دست راست ہونے کے سبب اس کا ڈنکا بجتا تھا وہاں وہ سر جھکا کر بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اسی ارادے سے قدم اٹھاتا اسپتال سے نکلا تھا جب شبنم سامنے آ کر اسے اپنے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گئی تھی۔ وہ ذاتی طور پر شبنم کو پسند کرتا تھا، اس لیے انکار نہ کر سکا لیکن یہ بھی بہ خوبی جانتا تھا کہ بگ باس کے اشارے کے بغیر شبنم بھی اس کے بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی...... پھر شبنم ہی کے ذریعہ بگ باس نے اسے رستم علی آغا خانی کے خلاف استعمال کیا...... اس خطرناک مہم میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسے ایک موہوم سی اُمید تھی کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لے گا لیکن حالات کے دھارے اسے دور بہا لے گئے تھے۔ وہ منجدھار میں پھنسا رہ کر ڈوبتا، ابھرتا رہا پھر حالات اور قسمت نے اسے دوبارہ بگ باس کے زیرِ زمین کمرے تک پہنچا دیا تھا۔

آخری بار اسے بگ باس کی گڈ بکس میں آنے کے لیے جگا کو قابو کرنا تھا...... جگا بڑی مچھلیوں میں شمار ہوتا تھا اس لیے اسے پھانسنے کی خاطر اس نے امداد علی کو بہ طور چارہ استعمال کیا تھا، وہ اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ امداد کے بلانے پر جگا ساحلی علاقے تک آ گیا تھا۔ افضل خان نے ان دونوں پر اس وقت ریوالور تان لیا تھا جب وہ آپس میں بغل گیر ہو رہے تھے۔ جگا امداد علی کی غداری پر تلملا اٹھا تھا، وہ آسانی سے خود کو افضل خان کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ افضل خان اس صورت سے نمٹنے کی خاطر کوئی پلان بنا رہا تھا جب کسی نے پشت سے فائر کیا اور وہ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے گر کے بے ہوش ہو گیا۔

دوسری بار اسے اس وقت ہوش آیا جب وہ ملٹری انٹیلی جنس کے ہاتھوں میں پوری طرح پھنس چکا تھا، وہاں امداد علی اور جگا بھی تھے جنہوں نے اپنا اپنا ہاتھ صاف ہونے کی وجہ سے سب کچھ صاف صاف اگل دیا تھا۔ ملٹری کے ایک میجر نے ان تینوں کا بیان باقاعدہ ریکارڈ کیا تھا۔ اس کے بعد ان تینوں کو شہر کے کسی دور دراز علاقے میں لے جایا گیا۔ جہاں خفیہ طور پر عدالت کے ذمہ داروں نے اس کے علاوہ امداد علی اور جگا کا بیان بھی دوبارہ ریکارڈ کیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک کسی ایسے مقام پر رکھا گیا جس کے بارے میں وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا اور اب...... اب وہ کچھ دنوں سے کسی اسپتال کے ایسے کارندوں میں تھا جہاں کے ڈاکٹر اور نرسوں نے بھی اپنی زبانوں پر تالے ڈال رکھے تھے۔

اس وقت بھی وہ اپنے نامساعد حالات کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی کوششوں میں منہمک تھا جب ایک نئی نرس مرہم پٹی کا سامان لیے داخل ہوئی۔ افضل خان کی تجربہ کار نظروں نے اسے غور سے دیکھا۔ بہ ظاہر وہ ایک کچی لکڑی کے مانند نظر آ رہی تھی جسے ایک ذرا سی کوشش کے بعد ہموار کیا جا سکتا تھا۔

جتنی دیر تک نرس خاموشی سے گھٹنے کی پٹی تبدیل کرتی رہی، افضل خان اسے غور سے دیکھتا رہا، اس کی خاموشی بھی اس بات کی غماز تھی کہ اسپتال کے بڑوں نے اسے بھی زبان بند رکھنے کی تاکید کر رکھی ہے۔

"سسٹر...... تمہارا نام کیا ہے؟" افضل خان نے اسے سرسری انداز میں مخاطب کیا۔

"ہمارا یہاں کوئی نام نہیں ہوتا۔ سب نرس یا سسٹر ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

"کل والی نرس سے میں نے ایک ضروری چیز کے لیے درخواست کی تھی۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن شاید اس کی ڈیوٹی......"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔ اس کا تبادلہ دوسرے وارڈ میں ہو گیا ہے۔" جواب سادگی سے دیا گیا۔

"دراصل مجھے اپنے عزیز کو اپنی بیماری کی اطلاع دینی ہے۔ اسی لیے میں نے اس سے کاغذ اور بال پین کی درخواست کی تھی۔"

”ممکن ہے اس نے آپ کو بہلانے کی خاطر ہامی بھر لی ہو ورنہ آپ کے کمرے میں آنے والے تمام اسٹاف کو صرف اپنے کام سے کام رکھنے کی سخت ہدایت ملی ہے۔“ نرس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں بھی آپ سے غیر ضروری بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”لیکن یہاں جو میرا علاج ہو رہا ہے...... میں اس کے اخراجات ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ افضل خان نے کسمسا کر نرس پر ایک نیا جال ڈالنے کی کوشش کی۔

”اس سلسلے میں بھی آپ کو ڈاکٹر سے بات کرنی چاہیے جو شام کی ڈیوٹی پر راؤنڈ کرتا ہے۔“

”صرف ایک بات اور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ افضل خان نے ایک آخری کوشش کی، اچھے اور بڑے اسپتال کے عملے کی یونیفارم پر کوئی نہ کوئی مونوگرام بھی ہوتا ہے لیکن تمہارے اسپتال میں شاید اس کا رواج نہیں ہے۔“

”اس بارے میں آپ یہاں سے رخصت ہوتے وقت انتظامیہ کو اپنی رائے دے سکتے ہیں۔“ نرس نے اپنا سامان سمیٹتے ہوئے کہا پھر مسکرا کر بے تکلفی سے بولی۔ ”آپ جیسے بھلے چنگے آدمی کو موجودہ حالت میں دیکھ کر مجھے دکھ ضرور ہوا مگر...... میں آپ کی کوئی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

نرس اپنا جواب مکمل کر کے خاموشی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی، افضل خان کا ذہن پھر اپنی پوزیشن کا معما حل کرنے کی گتھیوں میں الجھ رہا تھا جب اچانک اس نے کسی کے قدموں کی آہٹ پا کر دوبارہ دروازے کی سمت دیکھا۔ اسے اپنی نظروں پر شبہ ہونے لگا۔ آنے والی شبنم کے سوا کوئی اور نہیں تھی جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جگنو چمکنے لگے تھے، پلکیں بار بار جھپکا کر وہ اس طرح دیکھتا رہا جیسے اس بات کا یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

”کیسے ہو افضل خان؟“ شبنم نے اس کے قریب آ کر درشت لہجے میں پوچھا۔

”خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر جو گولی چلائی گئی تھی وہ گھٹنے کی ہڈی سے نہیں ٹکرائی ورنہ شاید زندگی بھر لنگڑاتا رہتا۔“

”کیا تمہیں اندازہ ہے وہ فائر کس نے کیا تھا؟“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مجھے محض ایک اندازہ ہے کہ فائر......“ افضل خان روانی میں اپنا جملہ پورا...... کرتے رک گیا پھر اس نے کمرے کے در و دیوار پر اس طرح نظر دوڑانی شروع کر دی جیسے کسی خاص چیز کی تلاش میں ہو۔

”کیا میرے کمرے تک آتے ہوئے اسپتال کے کسی عملے سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی تھی؟“ افضل خان کے لہجے میں تجسس تھا۔

”نہیں...... کیوں؟“

”ایک اہم بات اور......“ وہ بہ دستور سنجیدہ تھا۔ ”تمہیں کس طرح علم ہوا کہ میں اس اسپتال میں ہوں؟“

”اوہ......“ شبنم نے بھی ہونٹ چباتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”تم شاید یقین نہ کرو لیکن جس نے تمہارے اسپتال کا پتہ دیا اور ملنے کی اجازت دی اس نے بھی بگ باس کے حوالے سے ہی گفتگو کی تھی۔“

”بگ باس......!“ افضل خان کی پیشانی پر آڑی ترچھی لکیروں کا جال پھیل کر گہرا ہونے لگا۔ کچھ توقف سے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں!......“ شبنم نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”بگ باس کا حوالہ دینے والا کون ہو سکتا ہے جبکہ اخبارات کی اطلاعات اور دوسرے معتبر اداروں کا بھی خیال ہے کہ بگ باس سمندر میں ڈوب چکا ہے۔“

”ہاں...... اخبارات میں یہی کچھ شائع ہوتا رہا ہے لیکن مجھ سے فون پر رابطہ قائم کرنے والے نے اسی کا حوالہ دیا تھا۔“

”ہمیں اس وقت بھی محتاط رہ کر گفتگو کرنی ہوگی۔“ افضل خان نے شبنم کو قریب تر بلا کر بڑے مدھم لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کمرے میں بھی کہیں نہ کہیں ایسا حساس نظام ضرور موجود ہے جس کے ذریعہ ہماری گفتگو کہیں دوسری جگہ بھی سنی جاتی ہوگی۔“

شبنم نے افضل خان کی بات سن کر پلکیں جھپکائیں، وہ خود بھی ابھی تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ اپنے ذاتی فلیٹ تک کس طرح پہنچی تھی، ایک ٹائپ شدہ پیغام کے ذریعے اسے کسی سے ہدایت ملی تھی کہ وہ صرف فلیٹ تک محدود رہے ورنہ نتائج کی ذمہ دار بھی وہی ہوگی۔ وہ پیغام کس کی طرف سے تھا؟ وہ کوئی آخری نتیجہ نہیں قائم کر سکی تھی۔ پھر بھی حالات کے پیشِ نظر وہ اس ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور تھی۔ وہ ابھی افضل خان کی سرگوشی میں کہی جانے والی بات پر ذہنی طور پر الجھ رہی تھی جب اس نے مخصوص اشارے سے شبنم کو محتاط رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔

”کیا سچ ہے اور کیا غلط...... ہمیں یہ بھول کر حالات کے دھاروں پر چلنا ضروری ہے۔“

”میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے لیکن وہ کون ہے؟ جو ہمیں اپنے اشاروں پر چلا رہا ہے اور...... خود سامنے نہیں آتا؟“ شبنم نے بھی دیدہ و دانستہ اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

”وہ جو بھی ہے، بہر حال اس پوزیشن میں ہے کہ ہمیں پوری طرح کنٹرول کر سکے۔“

”تم...... تم نے آج سے پہلے کبھی اس قدر مایوسی کا اظہار نہیں کیا......“

”وقت اور حالات نے شاید مجھے اس وقت تک کے لیے بزدل بنا دیا ہے جب تک حالات پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آ جاتے۔“ افضل خان نے بات جاری رکھی۔ ”وہ بگ باس کی شخصیت ہو...... ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ ہوں یا پولیس کے ذمہ دار آفیسر...... ہم کو ان تینوں صورتوں میں فی الحال صرف ان کے اشارے پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔“

”بگ باس کے بارے میں تمہارا ذاتی خیال کیا کہتا ہے؟“

”میں نے کہا نا کہ فی الحال ہم کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ افضل خان کے لہجے سے مایوسی ہی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”ایک امکان اور بھی ہے......“ شبنم نے پُرخیال انداز میں خلا میں گھورا۔

”وہ کیا......؟“

”ہو سکتا ہے کہ پہلے کی طرح پھر دو پارٹیاں ہمیں الجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”پلیز......“ افضل خان نے ٹوٹے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ”کوئی اور بات کرو۔“

شبنم نے افضل خان کا مقصد سمجھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ افضل خان کو ایک طرف کھسکتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی بیڈ پر ذرا سا ٹک گئی لیکن وہ زیادہ دیر گفتگو جاری نہ رکھ سکے۔

کمرے میں اسپتال کے بڑے ڈاکٹر اور ڈیوٹی نرس کو آتا دیکھ کر شبنم تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر کے تیور اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ”خاتون......“ اس نے براہ راست شبنم کو مخاطب کیا۔ ”آپ کو مریض سے ملنے کی اجازت کس نے دی تھی؟“ اس نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

”مجھے دروازے پر نو وزیٹرس (No Visitors) کا کوئی نوٹس بھی نہیں نظر آیا۔“ شبنم نے تیزی سے جواب دیا۔ وہ ڈاکٹر کے لب و لہجے سے مرعوب نہیں ہوئی تھی۔

”وہ تختی کس نے ہٹائی......؟ میں اس کے بارے میں بعد میں تفتیش کروں گا لیکن آپ...... آپ ازراہِ مہربانی تشریف لے جائیں۔“

”ڈاکٹر......“ افضل خان نے کچھ سوچ کر مداخلت کی۔ ”یہ...... یہ میری منگیتر ہیں۔“

”ہو سکتا ہے...... مگر اوپر سے سخت احکامات ہیں کہ کسی کو بھی بغیر اجازت آپ سے ملاقات کی اجازت نہ دی جائے۔“

”یہ کس کا حکم ہے؟“ شبنم نے وضاحت چاہی۔

”ملٹری انٹیلی جنس کا...... آپ چاہیں تو اس کی تصدیق براہِ راست بھی کر سکتی ہیں۔“

شبنم نے پلٹ کر افضل خان کی طرف دیکھا پھر اس کے اشارے پر ڈاکٹر کو برہم نظروں سے گھورتی باہر چلی گئی لیکن...... بگ باس کے حوالے سے فون کرنے والے کے بارے میں بھی اس کا ذہن پھر سے الجھنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”بگ باس اگر زندہ ہے تو کیا وہ اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ افضل خان کی ملاقاتوں پر پابندی عائد ہے؟“

⁂⁂⁂

سراج اس وقت اورنگ زیب ہی کے کمرے میں موجود تھا۔ شیخ حامد کے سلسلے میں ابھی تک اورنگ زیب نے اپنی رائے نہیں بدلی تھی۔ اسی شبہے کے پیشِ نظر اس نے کرنل احتشام کے ساتھ میٹنگ کر کے بہ طور خاص وشنو کو فرار ہونے کا موقع فراہم کرنے کا پلان مرتب کیا تھا۔ لوچن کا معاملہ اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ فوج کی تحویل میں رہتا لیکن وشنو کے ساتھ اسے بھی فوجی گاڑی میں اس لیے رکھا گیا تھا کہ وشنو کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور ان کے درمیان اعتماد کی جو فضا قائم ہو گئی تھی وہ بھی برقرار رہے۔ اس وقت سراج اور اورنگ زیب کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ سراج نے اپنے ممکنہ شبہے کا اظہار کیا۔ ”کیا وشنو کسی بھی صورت میں ہمارے لیے کارآمد ہو سکتا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ اورنگ زیب نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم اس پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہارے اس خیال کی صد فیصد تائید کرتا ہوں۔ وشنو کی سابقہ ہسٹری سے بھی پوری طرح واقف ہوں، وہ ایسا دومنہا سانپ ہے جو بہ ظاہر ایسا بے ضرر نظر آتا ہے جس سے کسی خطرے کی توقع نہیں ہوتی لیکن اپنے بچاؤ کی خاطر دونوں طرف سے ڈنک مارنے سے

دریغ بھی نہیں کرتا۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لوچن کو میں نے اسی لیے اس کے ساتھ رکھا ہے کہ وہ قریب رہ کر پوری طرح اس کی نگرانی کر سکے۔''

''خود لوچن کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟''

''یو آر رائٹ......'' اورنگ زیب نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ایسے لوگ صرف کنٹریکٹ کی مدت تک وفادار رہتے ہیں۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کی تنظیم کے سربراہ کنٹریکٹ کی مدت کے دوران ڈبل کراس کرنے کی سزا صرف اور صرف موت تجویز کرتے ہیں۔ مدت ختم ہونے کے بعد ان پر عائد تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ تم اس ضمن میں میڈم روبی کو بھی قبل از وقت آگاہ کرو۔''

''میری معلومات کے مطابق لوچن کا معاہدہ ختم ہونے میں ابھی غالباً دو یا تین ماہ کی مدت باقی ہے۔''

دونوں کے درمیان شیخ حامد اور اس کے باقی گرگوں کے موضوع پر گفتگو کا سلسلہ جاری تھا جب ڈیوٹی کانسٹیبل نے ایک وزیٹنگ کارڈ لا کر میز پر رکھ دیا۔ اورنگ زیب نے کارڈ پر نظر ڈالی تو اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت نمودار ہونے لگی۔

''کون ہے......؟''

''ڈی ایس پی لودھی۔''

''اوہ......'' سراج نے کسمسا کر پوچھا۔ ''کیا آپ اسے بہ طور ماتحت قبول کرلیں گے؟''

''بڑی مچھلیوں کے شکار کے لیے کانٹے میں چھوٹی مچھلیاں لگانا زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔''

ایک منٹ بعد اورنگ زیب کے بلانے پر لودھی اس کے سامنے اٹینشن پوزیشن میں موجود تھا پھر اورنگ زیب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''اس وقت کیسے آنا ہوا......؟ میرا مطلب ہے کہ تمہاری پوسٹنگ تو کسی دور دراز علاقے میں ہے۔''

''کل تک تھی سر لیکن اب......'' لودھی نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''اب نئے آرڈر کے تحت مجھے فوری طور پر آپ کو ڈیوٹی رپورٹ کرنے کو کہا گیا ہے۔''

''فائن......'' اورنگ زیب نے ہلکے طنزیہ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ''کیا تم نے خوشی سے اس تبادلے کو قبول کرلیا ہے؟''

''میں فی الحال اس پوزیشن میں نہیں ہوں سر کہ کچھ کہہ سکوں۔''

''پریشان مت ہو۔'' اورنگ زیب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ہمیشہ ٹیم ورک کو پسند کرتا ہوں۔ تم اگر خوش نہیں ہو تو میں اپنے ذرائع سے تمہارے موجودہ آرڈر کو منسوخ بھی کرا سکتا ہوں۔ تم اپنی چوائس کا علاقہ بتا دو، دو روز کے اندر تمہیں میری بات کا تحریری ثبوت بھی مل جائے گا۔''

''ایسی بات نہیں ہے سر۔'' لودھی نے ہونٹ چباتے ہوئے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔ ''آپ کو جو اطلاعات پہلے ملی تھیں وہ غلط نہیں تھیں لیکن اس میں میری کچھ ایسی مجبوریوں کو دخل تھا جس کی وجہ سے اس دلدل سے اگر نکلنے کی کوشش کرتا تو شاید میری لاش کا بھی پتا نہ چلتا۔ رعایت سے سزا ملتی تو بھی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔''

''آئی۔ سی! گویا تمہاری کچھ دکھتی رگیں شیخ حامد کے ہاتھوں آگئی تھیں؟''

''جی...... جی ہاں۔''

''لیکن اب تو تمہیں اس کا خطرہ نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ......'' اورنگ زیب نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن اس کی نظریں بہ دستور لودھی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''درخت کی جڑ جب تک بنیاد سے نہ اکھڑے اس وقت تک کچھ خدشات بہ دستور باقی رہتے ہیں۔'' لودھی نے دبی آواز میں جواب دیا۔

''اگر تم میرے ساتھ ایک ٹیم ورکر کی حیثیت سے کام کرنا پسند کرتے ہو تو پھر کھل کر بات کرو۔ میں صاف گوئی پسند کرتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔'' سراج نے اٹھنا چاہا تو لودھی نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا، پہلی بار اس نے بااعتماد لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں مسٹر سراج کہ آپ سر کے کافی قریب ہیں اس لیے...... اس لیے میں چاہتا ہوں کہ وہ باتیں آپ کے بھی علم میں آجائیں جن کی وجہ سے وردی میں ہونے کے باوجود میں اپنے اختیارات استعمال کرنے سے قاصر ہو گیا تھا۔''

''میں جانتا ہوں کہ ایک پولیس آفیسر کن وجوہات کی بنا پر کسی مجرم کے سامنے دم ہلانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' اورنگ زیب نے کہا پھر سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تم نے ابھی کہا تھا کہ درخت کی جڑیں باقی رہ جائیں تو وہ سر ابھارنے کی کوشش ضرور کرتی ہیں۔''

''میں نے غلط نہیں کہا تھا سر......'' لودھی نے کھل کر کہا۔ ''شیخ حامد کا جہاز غرق ہو جانے کے بعد اب اس عملے کے کچھ افراد مجھے خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' اورنگ زیب چونکا۔

''چار روز قبل کسی نے فون کر کے کہا تھا کہ میرا تبادلہ آپ کے پاس ہو جائے گا۔ اس وقت میں اسے محض ایک بھونڈا مذاق سمجھا تھا لیکن اب میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔''

''اب وہ تم سے کیا چاہتے ہیں......؟'' اورنگ زیب کے تیور تیکھے ہونے لگے۔

''وہ اپنے بگ باس کا انتقام لینے کی پلاننگ کر رہے ہیں۔'' لودھی نے کھل کر کہا۔ ''مجھے دبی زبان میں یہی مشورہ دیا گیا ہے کہ میں بہ ظاہر آپ کی گڈ بکس (Good Books) میں آنے کی کوشش کروں لیکن ان کی جانب سے ملنے والی کسی بھی ہدایت سے انکار کرنے کی جرأت بھی نہ کروں۔''

''آپ کا شبہ کن افراد پر ہے؟''

''میں نے فون کرنے والے کی آواز پہلی بار سنی تھی اس لیے......''

''کچھ اور لوگ تو آپ کی نظروں میں ضرور ہوں گے؟'' اورنگ زیب نے اس کے جملے کو کاٹ کر سوال کیا۔

''میرے پاس شیخ حامد کے خلاف بھی کچھ ایسے ٹھوس ثبوت موجود ہیں جو پولیس کے لیے اب بھی بہت کارآمد ہو سکتے ہیں، ان دستاویزی ثبوت کی بنا پر آپ کچھ ایسے سرکاری ذمہ دار اور باحیثیت لوگوں کو بھی ننگا کر سکتے ہیں جو شیخ حامد کے جرائم میں اس کی معاونت کرتے رہے ہیں اور بھاری بھاری رقمیں اس غداری کے عوض بٹورتے رہے ہیں۔''

''کچھ ایسے نام میری فہرست پر بھی پہلے سے موجود تھے۔'' اورنگ زیب نے حقارت کا اظہار کیا۔

''سر...... میرے پاس کچھ ایسی ہوش ربا شرمناک تصاویر بھی موجود ہیں جن کے سامنے آنے کے بعد وہ شاید موت ہی کو ترجیح دیں گے۔''

''گڈ...... ایسی صورت میں تو آپ مجرموں کے خلاف میرے لیے ایک کارآمد ثابت ہوں گے۔''

''ایک درخواست کروں گا سر......''

''فرمائیں......''

''مجھے اپنی کارکردگی اور آپ سے وفاداری ثابت کرنے کے لیے ڈبل رول بھی ادا کرنا ہوگا ورنہ مجھے بلیک میل کرنے والے مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔'' لودھی نے کسمسا کر کہا۔ ''آپ کا اعتماد میرے لیے شرط ہے۔''

''ڈونٹ وری...... میں نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ تمہاری جوائننگ رپورٹ پر دستخط کرنے سے پیشتر تمہیں اپنی ذاتی کسوٹی پر ضرور پرکھوں گا۔''

''شکریہ سر......'' لودھی نے اپنی فائل کھول کر اورنگ زیب کے سامنے رکھ دی۔

سراج خاموش بیٹھا ایک ایک بات نوٹ کر رہا تھا، ابھی تک یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اورنگ زیب کیا واقعی لودھی کو اپنی ماتحتی میں قبول کرلے گا......؟ وہ لودھی کو گفتگو کے دوران کبھی آپ اور کبھی تم کہہ کر مخاطب کر چکا تھا پھر...... اس وقت سراج چونکا جب اورنگ زیب نے لودھی کی ڈیوٹی رپورٹ کرنے والی دستاویز پر ایک سادہ کاغذ رکھ کر اس پر کچھ لکھنا شروع کر دیا، خود لودھی بھی اس وقت کسمسانے لگا تھا۔

سادے کاغذ پر کچھ تحریر کرنے کے بعد اس نے وہ کاغذ لودھی کے سامنے رکھ کر اسے محتاط رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اب آپ ایک ٹیم ورکر کے ساتھ کام کریں گے۔''

''رائٹ سر......'' لودھی نے جواب دیا لیکن اس کی نظریں سادے کاغذ پر لکھے گئے پیغام کو حیرت سے بار بار دیکھ رہی تھیں پھر اس وقت سراج کے کان بھی کھڑے ہونے لگے جب لودھی نے جیب سے اپنا قیمتی موبائل نکال کر اورنگ زیب کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''آئی وش یو آل دی بیسٹ۔'' اورنگ زیب نے اٹھ کر لودھی سے معنی خیز انداز میں ہاتھ ملایا پھر وہ سراج کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا اپنے آفس سے باہر آگیا۔ لودھی بھی ساتھ تھا، اس کا موبائل اورنگ زیب کے سیدھے ہاتھ میں تھا پھر جو کچھ ہوا۔ اس نے سراج اور لودھی کے علاوہ عملے کے ان افراد کو بھی چونکا دیا جو اورنگ زیب کو آفس سے باہر نکلتا دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

اورنگ زیب نے باہر نکل کر لودھی کے موبائل کو اِدھر اُدھر دیکھ کر فضا میں اچھال دیا۔ پھر موبائل جب بلندی سے نیچے آکر پختہ فرش سے ٹکرایا تو ہلکا سا دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موبائل نے آگ پکڑ لی۔

لودھی جیب سے رومال نکال کر پیشانی کا پسینا پونچھنے لگا۔ سراج نے تعجب سے اورنگ زیب سے دریافت کیا۔

''یہ سب کیا تھا؟''

''جرائم پیشہ افراد کی سازش ہی سمجھو جو ہدایت پر عمل

نہ کرنے والوں کے لیے موت کا پیغام بھی بن سکتی ہے۔ اس کے علاوہ موبائل کے اندر ایسی پاور فل ڈیوائس بھی ضرور ہوگی جس کے ذریعے ہماری گفتگو کہیں اور بھی سنی جارہی ہوگی۔"

"ہم...... میرے لیے اب کیا حکم ہے؟" لودھی نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔ "موبائل پر جو بیتی اس سے وہ بھی بوکھلا گیا تھا۔

"دو روز آرام کرو...... اس کے بعد میں تمہیں اپنی ٹیم میں شامل کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔"

لودھی باقاعدہ سیلیوٹ کر کے چلا گیا تو سراج، اورنگ زیب کے ساتھ واپس اس کے دفتر میں آ گیا۔

"میں نے ڈی آئی جی سے پہلے ہی اس شبہے کا اظہار کر دیا تھا کہ لودھی کو باقاعدہ کسی پلاننگ کے تحت خاص طور پر میرے پاس ٹرانسفر کیا گیا ہے۔" اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے بڑے زہریلے انداز میں کہا۔ "اب یہ معلوم کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ لودھی کے ٹرانسفر کے احکام کس کی سفارش پر عمل میں آئے تھے۔"

سراج کی پیشانی پر بھی سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ وہ جانتا تھا کہ اب لودھی کے تبادلے میں اہم کردار ادا کرنے والا بھی کسی صورت اپنی کرسی کو نہیں بچا سکے گا۔ وہ کچھ کہنے کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اورنگ زیب کے سامنے رکھے موبائل کی اسکرین روشن ہوگئی، اس نے ایک نظر نمبروں کو دیکھا پھر کال ریسیو کرنے میں خاصی جلدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خشک لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا میرے نمبروں کو صرف بہت اہم معاملات کے لیے استعمال کرنا...... کہو...... اوہ!...... کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں ہے؟...... گڈ...... کسی کو تمہارے اوپر شبہ تو نہیں ہوا؟...... ہاں، میں پوری طرح واقف ہوں۔ ایک منٹ کے باوجود بھی کبھی زیادہ خوش فہمی بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، تم نے اچھا کیا...... فکر مت کرو، میں خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوں...... ایسا نہیں ہوگا۔" اچانک اورنگ زیب کا لہجہ تبدیل ہوگیا، اس نے ٹھوس آواز میں کہا۔ "میں جو کہتا ہوں اسے کر گزرنے سے دریغ بھی نہیں کرتا...... ایک بار پھر نوٹ کرلو...... میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پتھر کی لکیر ہوتے ہیں...... نہیں، ابھی زیادہ جلدی نہ کرنا...... ہاں آں...... یہ مناسب رہے گا۔" سراج نے موبائل آف کیا تو سراج نے پوچھا۔

"کس کی کال تھی؟"

"اس سلسلے میں راستے میں تفصیل سے بات ہوگی...... میرا اس وقت کرنل احتشام سے ملنا بے حد ضروری ہے۔" سراج موبائل جیب میں رکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تو سراج کو بھی بادل ناخواستہ اس کی پیروی کرنی پڑی۔

☆☆☆

سیٹھ عثمان نے لیاقت حسین کی خدمت اور جاں نثاری کے عوض سرفراز خان کے اسپتال سے گھر آنے سے پیشتر اپنے آفس کا ایک کمرا اس کے بزنس کے لیے مختص کر دیا جس پر "ماربل ایکسپورٹرز" کی تختی بھی آویزاں ہوگئی تھی۔ ایک ایسے تجربہ کار آدمی کو بھی رکھ لیا تھا جو ماربل کی ایکسپورٹ میں ماہر تھا۔ لیاقت حسین خوش تھا کہ اب باپ اور ماں بھی اس کے ساتھ رہیں گے لیکن سرفراز خان نے اسپتال سے گھر آتے ہی واپس جانے کی رٹ لگا رکھی تھی۔

اس وقت بھی رات کے کھانے کے بعد گھر کے سارے افراد لاؤنج میں بیٹھے سرفراز خان سے اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے، لیاقت حسین ماں کے پاس قالین پر بیٹھا تھا، ماں نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے تھے۔ اس نے بھی شوہر کی ضد کے آگے زبان کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شوہر کی ناں کو ہاں میں بدلنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، جو بات ایک بار اس کی کھوپڑی میں سما جائے اس کا نکلنا ناممکن ہی تھا۔

"میں نے آپ کے کاروبار کا سارا سیٹ اپ مکمل کر دیا ہے، ایک دو روز میں ضروری اسٹیشنری چھپ کے آجائے تو بیرونی منڈیوں کے تاجروں سے خط کتابت بھی شروع کر دی جائے گی، مستقل نہ سہی لیکن شروع شروع میں کم از کم سال بھر تک آپ کا یہاں ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد آپ کو نہیں روکا جائے گا۔"

"پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہوتا ہے میرا دوست۔" سرفراز خان نے کسمسا کر جواب دیا۔ "ادھر بھی ہمارا بہت سارا مخالف ہے لیکن آج تک کسی کا اتنا ہمت نہیں ہوا جو ہمارا طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔"

"آپ کے ساتھ یہاں جو حادثہ پیش آیا ہم اس کے لیے شرمندہ ہیں لیکن آپ یہاں ہوں گے تو ہمارے سروں پر بھی ایک بزرگ کا سایہ رہے گا۔" راحیلہ بیگم نے بھی سمجھانے کی کوشش کی۔

"خدا تم دونوں کا جوڑی سلامت رکھے میرا بچہ لیکن ہم نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ادھر لیاقت ہے تمہارا پاس اور اپنا دوست کے ہوتے ہوئے ہمیں پورا اطمینان بھی ہے۔ بس جانے سے پہلے ایک قانونی کام کرنا ضروری ہے۔"

"کون سا قانونی کام خان صاحب؟" سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "اگر آپ ایکسپورٹ لائسنس کی بات کر رہے ہیں تو اس کے حصول میں آپ کو کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوگا۔"

"دوست، ہم تمہارا شکر گزار ہے کہ تم نے ہم کو باہر کا منڈی کے بارے میں سارا اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ تمہارا جگہ کوئی اور ہوتا تو زبان بھی نہ کھولتا لیکن ہم بھی کاروبار کے بارے میں کھرا بات کرنے کا عادی ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ ہمارا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔"

"اطمینان رکھیں انکل۔" راحیلہ بیگم نے بڑے پیار سے کہا۔ "آپ جیسا چاہیں گے سب کچھ اسی طرح ہوگا۔"

"تو اس بات کا قانونی کاروباری کارروائی بھی ہمارا جانے سے پہلے مکمل کرالو تاکہ فائدہ اور نقصان میں ہم دونوں برابر کا شریک ہوگا۔" سرفراز خان نے براہِ راست سیٹھ عثمان کو اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ "یہی ہمارا پہلا اور آخری شرط ہے۔"

سیٹھ عثمان کو یہ شرط منظور نہیں تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سرفراز خان کا تعلق اس علاقے سے تھا جہاں انہوں نے اپنی شملہ کو کبھی نیچا نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک لمحے کو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر ان کی نظر لیاقت حسین پر پڑی تو انہوں نے دل میں ایک فیصلہ کر کے کہا۔ "سرفراز خان صاحب...... مجھے آپ کا یہ فیصلہ منظور ہے لیکن ایک شرط پر۔"

"کیسا شرط......؟"

"میں اپنا منافع جس طرح چاہوں اور جہاں چاہوں خرچ کروں، آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"ہم کو کیا اعتراض ہوگا......؟ تم جانو اور تمہارا منافع۔"

سیٹھ عثمان کی نظروں اور ان کی باتوں کا مفہوم راحیلہ بیگم نے بھانپ لیا تھا، اس لیے انہوں نے فوراً ہی گفتگو کا موضوع بدل کر کہا۔ "انکل، عثمان نے آپ کی شرط مان لی ہے۔ اب میرا بھی آپ پر کچھ حق ہے، آپ کو بھی میری ایک بات ماننی پڑے گی۔"

"کوئی کاروباری بات تو نہیں ہے؟" سرفراز نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی نہیں......"

"پھر بولو کیا بات ہے۔ تم ہمارا لیے فرحین سے کم نہیں ہے پھر ہم تمہارا بات کس طرح ٹال سکتا ہے۔"

"آپ کو ابھی کم از کم ایک ماہ یہاں میری خاطر رکنا ہوگا۔" راحیلہ بیگم نے اتنی محبت سے کہا کہ سرفراز خان کچھ دیر بغلیں جھانکتا رہا پھر اس نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے جواب دیا۔ "بس ہمارا دوست سے ہمارا آدھا ساجھا کا بات طے ہوگیا ہے تو تم بھی ایسا ہی بات کرو۔ ہم تمہارا خواہش سے انکار نہیں کرے گا لیکن تمہارا محبت بھرا اصرار پر پندرہ دن اور رک جائے گا۔"

"اوپر والے کا کمال ہے جو آج تم نے کسی کا بات مان لیا ورنہ......"

"یہ ہمارا اور ہماری بیٹی کا معاملہ ہے۔" سرفراز خان نے بیوی کا جملہ کاٹ کر کہا۔ "ہم انکار کیسے کر سکتا تھا۔"

فرحین اور لیاقت حسین بھی خوش تھے کہ سرفراز خان نے پندرہ دن رکنے کی بات مان لی تھی، اس دوران سیٹھ عثمان نے بھاگ دوڑ کر تمام ضروری کارروائی مکمل کرالی۔ قانونی دستاویز پر دونوں فریق کے دستخط بھی ہوگئے۔

سرفراز خان کی واپسی کی مدت جیسے جیسے کم ہورہی تھی فرحین اور لیاقت حسین دونوں کو ان کی جدائی کا احساس ڈستا رہتا تھا، راحیلہ بیگم ہر وقت مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگی رہتی تھیں۔ لیاقت حسین کی ماں بھی ان کے حسن سلوک کی گرویدہ ہوگئی تھیں، ان کا زیادہ تر وقت راحیلہ بیگم کی طرف گزرتا تھا، شام کو دفتر کے اوقات ختم ہونے کے بعد وہ لیاقت حسین کی اینکسی میں آجاتی تھیں جہاں فرحین بھی ان کی خدمت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں جانے دیتی تھی۔

لیاقت حسین نے کئی بار ماں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع تلاش کیا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کے ذہن میں ماں کی زبان سے نکلنے والی ایک ادھوری بات سما کر رہ گئی تھی جس کا کھوج لگانے کی خاطر وہ بے چین تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پچھلے دنوں اس نے ماں کی زبان سے ایک بات سنی تھی جو رہ رہ کر اس کے ذہن میں چبھتی رہتی تھی۔ بزرگ کے ہاتھوں ایک چٹکی خاک کھانے والی بات اس کی ماں کو بھی معلوم تھی۔ اسی ضمن میں ماں نے کہا تھا۔ "تیرا منہ سے جو ایسی بات نکلتا ہے جو بعد میں تجھے یاد نہیں رہتا...... اس میں بھی اوپر والے کا بہت سی مصلحتیں ہیں جو تو نہیں سمجھ سکتا۔" اسی حوالے سے لیاقت حسین نے ماں سے شیخ حامد کے بارے میں اپنا تجسس دور کرنے کی خاطر دریافت کیا تھا...... "جو آسمان سے گرا تھا وہ کہاں ہے؟ مر گیا یا ابھی تک زندہ ہے؟ وہ اچھا آدمی نہیں تھا، بڑا ظالم تھا۔ اس

کا تعلق بھی دنیا کے خطرناک لوگوں سے تھا...... وہ سب شیطان اور پلید لوگ تھے ماں۔"

"تو فکر مت کر......" ماں نے خلا میں دور کہیں گم ہوتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "ایک پلید...... دوسرا پلید کی وجہ سے مارا جائے گا۔ اوپر والے کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ وہ...... وہ...... بھی گناہوں میں گلے گلے تک غرق ہے۔ بدنصیب۔"

"وہ کون ہے ماں؟ اس کا کوئی نام، کوئی اتا پتا تو ہوگا۔"

"وہ......وہ......" ماں کی پلکیں کئی بار جھپک کر رہ گئیں پھر...... اس نے کیا کہا تھا؟ خود اسے بھی یاد نہیں رہا تھا، اس پر بھی وہی کیفیت طاری ہوگئی تھی جو خود لیاقت حسین پر متعدد بار طاری ہو چکی تھی۔ اسی ضمن میں وہ ماں کو پھر کریدنا چاہتا تھا۔ قسمت سے اسے باپ کے واپس جانے سے دو دن پہلے ماں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے ماں سے پھر دوسرے پلید کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ ماں اس کی بات سن کر کچھ دیر گم صم رہی پھر اس نے خلا میں کہیں دور گم ہوتے ہوئے کہا۔

"ہر فرعون کے لیے خدا نے کوئی نہ کوئی موسیٰ ضرور پیدا کیا ہے...... وہ...... وہ...... جو پردوں میں چھپ گیا ہے وہ بھی پلید تھا۔ جس کے ہاتھوں اس کا انجام خراب ہوگا وہ......وہ بھی پلید ہے اور اس کا نام...... اس کا نام......" ماں پھر اپنی بات مکمل نہ کر سکی اس نے عجیب نظروں سے لیاقت حسین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم ابھی کیا بات کر رہا تھا؟"

"ہمارا درمیان کسی پلید کا بات ہو رہا تھا۔" لیاقت حسین نے ماں کی بدلتی کیفیت محسوس کرتے ہوئے مبہم انداز میں جواب دیا۔

"ہاں...... وہ خدائی خوار پلید ہی تھا جس نے ہمارا بھاگ اور تمہارا سر سے باپ کا سایہ چھیننے کا کوشش کیا تھا۔ حشر کے روز اس کا انجام بھی خراب ہوگا۔"

"ماں......" لیاقت حسین نے ماں کو مزید کریدنے کا خیال ترک کرتے ہوئے اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر کہا۔ "تو بابا کو روکنے کی کوشش کر۔ تمہارا جانے کے بعد ہمارا دل بھی بہت اداس ہوگا۔"

"یہ بھی تیرا خوش قسمتی ہے کہ وہ بیگم صاحب کے کہنے پر پندرہ دن کے لیے راضی ہوگیا ورنہ تو بھی واقف ہے کہ اس نے تیرا طرف سے بھی کبھی آنکھیں پھیر لی تھیں۔"

"اب تو وہ ہم دونوں سے ناراض نہیں ہے؟"

"نہیں......" ماں نے اس کے سر پر شفقت سے [ہاتھ] پھیرا۔ "ہم جانتا تھا کہ فرحین کا خدمت پتھر کو موم کرے گا۔ تیرا باپ بھی شرمندہ ہے لیکن اپنی زبان سے کبھی اقرار نہیں کرے گا۔"

ماں بیٹے کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی جب فرحین آگئی۔ اس نے ماں کے پیچھے بیٹھ کر اس کے گلے میں با[نہیں] ڈال دیں پھر لیاقت سے بولی۔ "اب تو اپنا کام کر...... سے پہلے کا اور بات تھا لیکن اب ماں پر میرا حق زیادہ ہے۔"

"تم دونوں ہی ہمارا دل کا ٹکڑا...... اور آنکھوں [کی] ٹھنڈک ہے۔" ماں نے دونوں کا دل خوش کرنے کی خاطر پھر فرحین کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ویسا...... بچیوں کا [حق] زیادہ ہوتا ہے۔"

فرحین نے ماں کا آخری جملہ سن کر لیاقت حسین کو چڑھایا تو وہ بھی جواب میں مسکرا دیا لیکن اس کے ذہن میں ابھی تک کچھ ایسے سوال گونج رہے تھے جو حل ہوتے ہو[تے] رہ گئے تھے۔

"وہ پلید کون تھا جس کے بارے میں ماں کی زبان دوسری بار بھی کوئی وضاحت کرتے کرتے رہ گئی تھی اور...... کاپٹر سے جن دو افراد نے چھلانگ لگائی تھی۔ ان کا آخر کیا ہوا تھا؟...... وہ زندہ تھے یا لقمۂ اجل بن چکے تھے؟

میڈم روبی کے مشورے کے باوجود تھریسیا نے [؟] پر ہی دعوت کا پُرتکلف اہتمام کر لیا تھا۔

دعوت میں ڈی آئی جی کے علاوہ ایس پی اورنگ زیب، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج اور الماس بھی موجود تھے۔ کھانے سے پیشتر ڈرنکس کا دور چلا، سب دل کھول کر انجوائے کر رہے تھے جب سراج نے میڈم کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے چٹکی لینے والے انداز میں تھریسیا سے دریافت کیا۔

"یہ دعوت کس خوشی میں کی گئی ہے......؟"

"یہ کسی موذی کی موت کا کرشمہ ہے جسے آج سب مل کر انجوائے کریں گے۔"

"اور اس کا سہرا مسٹر اورنگ زیب کے سر ہے۔" میڈم نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

"آپ شاید سہرے کو عام انداز میں استعمال کر رہی ہیں۔" سراج نے پھر اسے چھیڑا۔ "اصل سہرا تو کسی اور کے سر پر نظر آ رہا ہے۔"

"یو آر رائٹ......" ڈی آئی جی نے موقع سے فائ[دہ]

اٹھاتے ہوئے روبی کو دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ کھانے کے بعد شاید اس کا اعلان بھی آج کر دیا جائے گا۔"

"ڈونٹ وری" تھریسیا نے میڈم کو نظریں چراتے دیکھ کر کھنکارتے ہوئے اعلان کیا۔ "معزز خواتین و حضرات۔ میں آپ سب کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اصل سہرے کا اعلان کرنے کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی ہے۔ اس کا اعلان میں کھانے کے اختتام پر کافی کے دور کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اب...... کچھ مہمانوں کا تجسس اور بے چینی دیکھ کر میں یہ بتانا ضروری سمجھ رہی ہوں کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ اطلاعاً عرض ہے کہ ہماری میڈم اور آپ کے ڈی آئی جی بہت جلد نکاح پڑھانے والے قاضی کو بلانے والے ہیں۔"

میڈم کے علاوہ سب نے تالیاں بجائیں۔ الماس خوشی کا اظہار کرنے والوں میں پیش پیش تھی۔

پُرتکلف کھانے کے دوران بھی قاضی اور نکاح کے حوالے سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ اورنگ زیب خلافِ توقع اچانک کچھ بجھا بجھا نظر آنے لگا۔ شاید اس لیے کہ اس نے ابھی تک شیخ حامد کی موت کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن اس کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ میڈم روبی کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے۔

کافی کا دور شروع ہوا تو اس نے اپنا کپ ختم کرنے میں بھی خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا پھر سراج سے سرگوشی میں کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے، تم الماس کو رازداری سے سمجھا دو کہ وہ رکنے کی ضد نہ کرے۔"

"اتنی جلدی کیا ہے......؟"

"سمجھا کرو......" اورنگ زیب نے دبی زبان میں کہا۔ "ہمیں ڈی آئی جی اور میڈم کو موقع دینا چاہیے کہ وہ تنہائی میں کھل کر سہرے اور قاضی کے باقی معاملات بھی طے کر لیں۔"

"گڈ......" سراج نے بات سمجھ کر جواب دیا پھر اس نے الماس کو اشاروں اشاروں میں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو سب سے پہلے وہی اپنا پرس سنبھال کر جانے کے لیے اٹھی تھی۔

"یہ کیا......؟" میڈم روبی نے اسے مخاطب کیا۔ "تمہیں اچانک اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

"مجھے گھر پر ایک ضروری کام یاد آگیا۔" الماس نے شوخی سے جواب دیا تو میڈم کو اسے چھیڑنے کا موقع مل گیا۔

"اب تو تمہاری شادی کو ایک عرصہ ہو گیا۔ کیا اب بھی تمہارا ضروری کام ختم نہیں ہوا......؟"

"ہاں...... اسی بہانے ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت ہمارے جانے کے بعد تم بھی ضروری کام کے سارے معاملات جلد از جلد طے کر لو تاکہ ہم سب کو پھر سے ڈی آئی جی صاحب اور تم سے الگ الگ دعوت کھانے کا موقع میسر آسکے۔"

الماس کے بعد سراج اور اورنگ زیب بھی مسکراتے ہوئے اٹھے، میڈم کو مجبوراً انہیں رخصت کرنا پڑا۔ ان سب کے جانے کے کچھ دیر بعد میڈم بھی کچھ دیر کے لیے اندر گئی تو تھریسیا نے بڑی سنجیدگی سے ڈی آئی جی سے کہا تھا۔

"اگر میں آپ سے میڈم کے سلسلے میں کوئی اہم بات کروں تو آپ برا تو نہیں منائیں گے؟"

"آپ کی بات کا اگر برا منایا تو پھر میرے دل کی ترجمانی کون کرے گا۔" جواب معنی خیز تھا۔

"حیرت ہے؟...... آپ پولیس والوں کی جمالیاتی حس بھی اتنی تیز ہوتی ہے مجھے پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا۔"

"اب اندازہ ہو گیا ہے تو وہ بات بھی کہہ ڈالیں جو آپ کے ذہن میں شاید بہت دیر سے کلبلا رہی ہے۔"

"آپ کی بذلہ سنجی نے تو اس تمام سسپنس کو ختم کر دیا جو میں پیدا کرنا چاہتی تھی۔" تھریسیا بے تکلفی سے مسکرائی پھر اس نے کھل کر کہا۔ "آپ اب جب چاہیں میڈم کو انگیجمنٹ رنگ پہنا سکتے ہیں، اس کے بعد آپ دونوں کی مرضی سے طے شدہ تاریخ پر نکاح کی رسم بھی سادگی سے ادا ہو جائے گی۔"

اور...... اس وقت بھی ڈی آئی جی رات کے دو بجے کے باوجود اپنے بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کی بیوی کو انتقال کیے آٹھ سال سے زیادہ ہو چکے تھے، اس کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی جو مرنے والی کا دکھ بانٹ سکتی۔ جس محکمے سے اس کا تعلق تھا، جس عہدے پر وہ فائز تھا اس کا فائدہ اٹھا کر اگر ماتحتوں کو ایک اشارہ کر دیتا تو اس کی راتیں رنگین ہو سکتی تھیں۔ ایک سے ایک خوب صورت لڑکی اور حسین جسم بطور رشوت اور اس کو پیش کیے جا سکتے تھے لیکن اس نے کم از کم دو باتوں سے خود کو محفوظ رکھا تھا۔ جوئے کے اڈوں سے بچتا لینا اور بدنام عورتوں سے خود کو دور رکھنا۔

آٹھ سال کی تنہا زندگی گزارنے کے بعد اس نے میڈم روبی کا خواب دیکھا تھا جس کی تکمیل میں سراج اور تھریسیا نے اس کی کسی نہ کسی زاویے سے مدد کی تھی اور آج...... آج تھریسیا نے منگنی کی انگوٹھی اور نکاح کا ذکر بھی کھل کر کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے میڈم سراج وغیرہ کے جانے کے بعد کچھ دیر کو سامنے سے ہٹ بھی گئی تھی، یہ بات بھی اس

کی ضمانت تھی کہ تھریسیا نے جو پیغام اس تک پہنچایا اس میں میڈم کے ارادے کا بھی دخل ہوگا۔ سب کی موجودگی میں وہ اسی بات کا اظہار کر چکی تھی۔

ڈی آئی جی آنے والے کل کے بارے میں حسین خواب بن رہا تھا جب فون کی گھنٹی کی آواز نے اس کے حسین خوابوں کو بکھیر دیا، اس نے جھلا کر فون سیٹ کی طرف دیکھا جو اس کے سرہانے ہی موجود تھا۔ رات کے دو بجے کس کے پیٹ میں مروڑ ہوئی تھی؟ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے کے باوجود کال ریسیو کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"ہیلو......" ریسیور اٹھا کر اس نے بے حد خشک اور خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"سر...... میں اس علاقے کا ایس ایچ او عرض کر رہا ہوں جس میں ڈی ایس پی لودھی صاحب کی رہائش ہے۔ اس وقت ان ہی کے بنگلے سے فون کر رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟...... کیا لودھی خود رابطہ نہیں کر سکتا تھا؟" ڈی آئی جی کا پارہ اور چڑھ گیا۔

"میں نے ان ہی کے سلسلے میں اس وقت آپ سے براہِ راست رابطہ کرنا ضروری سمجھا تھا سر......"

"کیا پریشانی درپیش ہے؟"

"سر...... لودھی صاحب کی برہنہ اور بری طرح ادھڑی ہوئی لاش ان ہی کی خواب گاہ میں موجود ہے۔" دوسری طرف سے بڑی بوکھلاہٹ میں کہا گیا۔ "گھر والوں کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے، میں بنگلے پر تعینات کانسٹیبل کی انفارمشن پر بذاتِ خود یہاں آیا ہوں لیکن خواب گاہ کے اندر ابھی تک قدم نہیں رکھا۔ اس کی وجہ وہ خون آلود ایک مخصوص علالت ہے جس کی وجہ سے میں نے براہِ راست آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھا ہے۔"

"ایسی کون سی علالت ہے جس نے تمہیں تفتیش سے روک رکھا ہے؟"

"آکٹوپس سر......" جواب سنجیدگی سے دیا گیا۔ "خواب گاہ میں مختلف دیواروں پر یہ خون آلود نشانات خاص طور پر بنائے گئے ہیں اس لیے میں نے بذاتِ خود۔"

"ٹھیک ہے...... تم خواب گاہ سے دور رہو...... کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا، میں پہنچ رہا ہوں۔"

آکٹوپس کے علامتی نشانات اور لودھی کی موت کی اطلاع سن کر ڈی آئی جی وقتی طور پر بوکھلا گیا تھا، اس نے وقت ضائع کیے بغیر ایس پی اورنگ زیب کو بھی مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا پھر بڑی عجلت میں تیار ہو کر باہر نکلا تھا۔ اس کے لودھی کی خواب گاہ تک پہنچنے کے [illegible] منٹ بعد ہی اورنگ زیب بھی آ گیا۔

ایس ایچ او کی اطلاع غلط نہیں تھی۔ لودھی کی [illegible] لاش اس کے بستر کے قریب ہی فرش پر بکھری پڑی تھی۔ لاش کی ادھڑی ہوئی کیفیت اس بات کی ترجمانی کر رہی تھی کہ اسے بے حد تشدد اور ایذا رسانی کے بعد ہلاک کیا گیا تھا۔ دیواروں پر ہر طرف آکٹوپس کی شبیہہ کو مرنے والے کے خون سے بطورِ خاص اجاگر کیا گیا تھا جس کی سمت اورنگ زیب کی نظر بار بار اٹھ رہی تھی۔

ڈی آئی جی کے براہِ راست فون کھڑکھڑانے سے دوسرے تکنیکی شعبے سے تعلق رکھنے والی ٹیمیں بھی جائے حادثہ پر پہنچ گئیں، مختلف زاویوں سے جائے حادثہ کی تصویریں لی گئیں۔ فنگر پرنٹس کے عملے نے بڑی جانفشانی سے تمام کونے کھدروں سے فنگر پرنٹس حاصل کر لیے۔ علاقے کے ایس ایچ او نے دیگر تمام ضروری تفصیلات تحریر کیں۔ آخر میں اورنگ زیب نے اپنے مخصوص اور مختصر کیمرے سے لاش کی تصویریں لیں اور دیوار پر موجود آکٹوپس کی شبیہہ کو بھی اپنے انداز میں کیمرے میں محفوظ کیا پھر لودھی کی لاش کو ضروری قانونی کارروائی کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

تمام ممکنہ قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ڈی آئی جی نے اورنگ زیب کے مشورے پر خواب گاہ کو فوری طور پر سیل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے ڈی آئی جی کو وہ کہانی بھی تفصیل سے سنا دی جو لودھی کے موبائل کے ساتھ پیش آئی تھی۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ اس نے جان بوجھ کر لودھی کی ڈیوٹی رپورٹ کرنے والے کاغذ پر کچھ لکھنے سے کیوں گریز کیا تھا؟

"آئی سی" ڈی آئی جی نے حیرت سے کہا۔ "گویا آپ کو اس بات کا شبہ تھا کہ موبائل کے ذریعے آپ کے اور لودھی کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس نے دشمنوں کو بھی باخبر کر دیا تھا۔"

"جو صورت اس وقت سامنے آئی ہے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اگر آپ نے مرنے والے کے موبائل کو تباہ نہ کیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ اس کے ذریعہ ہم......"

"یہ آپ کا خیال ہے۔" اورنگ زیب نے زہریلے انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ "اگر میں اس موبائل کو محفوظ رکھتا تو بھی اسے دوسری جانب سے جلا دیا جاتا...... ہو سکتا

ہے کہ اس وقت میں بھی آپ کے سامنے موجود نہ ہوتا۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" ڈی آئی جی نے ایک لمحہ توقف سے کہا پھر ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ "شیخ حامد کے سمندر برد ہو جانے کے بعد اب آکٹوپس کی علامت کو استعمال کرنے سے لودھی کے قاتلوں کا کیا مقصد ہے؟"

"میری نظروں میں ایک ہی مقصد ہے......" اورنگ زیب نے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا کر جواب دیا۔ "ہر پولیس آفیسر کا اپنا اپنا ایک علیحدہ سوچنے کا انداز ہوتا ہے اور میں...... میں نے بار بار یہی کہا ہے کہ جب تک میں اپنی نظروں سے اس باسٹرڈ کی لاش نہیں دیکھ لیتا اس کو مردہ نہیں سمجھ سکتا۔"

"گویا آکٹوپس کا نشان......"

"اسے بھی میں شیخ حامد کی طرف سے پولیس والوں کے لیے ایک کھلا چیلنج ہی کہوں گا۔"

"اگر میں آپ کی بات کو تسلیم کر لوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی ہمیں آپ کے آکٹوپس کی ایسی علامتوں سے بار بار سامنا ہو سکتا ہے۔" ڈی آئی جی نے خاصا الجھ کر اورنگ زیب کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"بہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔" اورنگ زیب نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا لیکن اس کے چہرے پر ابھرنے والی تجسس آمیز سنجیدگی بہ دستور برقرار تھی۔ پھر لودھی کے بنگلے سے باہر آ کر جب ڈی آئی جی اپنی کار میں بیٹھنے لگا تو اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر مدھم آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے آپ سے اب ایک بہت ضروری بات دریافت کرنی ہے...... سر۔"

سر کا لفظ جس انداز میں ادا کیا گیا اس نے ڈی آئی جی کو بھی چونکا دیا تھا۔

"آپ...... آپ کیا اہم بات معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"صرف...... وہ نام...... جس نے مرنے والے کا تبادلہ میرے انڈر میں کرنے کی آپ سے سفارش کی تھی۔"

"مم...... میں...... سمجھا نہیں۔" ڈی آئی جی نے کسمسا کر پوچھا۔ "اس نام کو جان کر آپ کیا کریں گے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ذہن میں خاص طور پر وہی نام کیوں آ گیا؟"

"میں نے پہلے ہی آپ سے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ لودھی کو کسی خاص وجہ سے میرے پاس پوسٹ کیا جا رہا ہے۔" اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر جواب دیا۔ "خود آپ نے بھی اقرار کیا تھا کہ ایک بار آپ کو بھی اس وقت لودھی کے تبادلے کے آرڈر منسوخ کرنے کو اوپر سے کہا گیا تھا جب غالباً آپ نے وہ اقدام مرحوم کی سزا میں تخفیف کے ارادے سے اٹھایا تھا۔"

اورنگ زیب کے آخری جملوں کو سن کر ڈی آئی جی اس طرح چونکا جیسے اس کا ہاتھ اچانک بجلی کے ننگے تاروں میں دوڑتے ہوئے ہائی وولٹیج کے کرنٹ سے چھو گیا ہو...... چند لمحوں تک خاموشی سے اورنگ زیب کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتا ہوا بولا۔

"مم...... مم...... میں وہ نام...... آپ کو ضرور بتا دوں گا لیکن...... اس وقت نہیں۔"

"ایز یو وش سر......" اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا پھر وہ ڈی آئی جی کے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اپنی کار کی سمت قدم اٹھانے لگا۔

❖❖❖

حسبِ معمول سراج اتوار کے دن دیر تک سونے کا عادی تھا لیکن جب ساڑھے آٹھ بجے اس کی چادر گھسیٹ کر الماس نے اسے اٹھنے کے لیے کہا تو وہ جھلا گیا۔ پہلے اس نے پلکوں کے درمیان جھری پیدا کر کے قریب رکھی گھڑی پر نظر ڈالی پھر جھلا کر بولا۔

"یار...... نہیں کرتا مجھے گرما گرم ناشتا اور آج اتوار بھی ہے۔"

"گرم گرم ناشتے کی وجہ سے نہیں، میں نے آپ کو ایک گرما گرم خبر کی وجہ سے اٹھایا ہے۔"

"کل سے اخبار بند کر دو۔ مجھے نہیں دیکھنا اخبار...... اگر ہاکر مجھے کہیں گلی میں بھی نظر آیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ پلیز سونے دو۔" اس نے دوبارہ کروٹ بدلنے کے ساتھ چادر بھی منہ پر گھسیٹ لی۔

لیکن...... جب الماس نے صرف اخبار کی سرخی بلند آواز میں سنائی تو وہ اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے جھپٹ کر اخبار الماس کے ہاتھوں سے چھینا پھر اس سرخی پر نظر پڑتے ہی وہ پوری طرح بیدار ہو گیا جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی کے وحشت ناک قتل کے بارے میں چھپی تھی۔

پوری خبر پڑھنے کے بعد اس نے منہ دھونا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ سیدھا ناشتے کی میز پر آ گیا۔

"اورنگ زیب صاحب کا کوئی فون آیا تھا؟" اس نے الماس سے پوچھا۔

"پلیز...... مجھے ناشتے کے دوران ڈسٹرب نہ کیا کریں۔" الماس نے بھی شوہر کے لہجے کی نقل اتاری پھر تعجب سے بولی۔ "مجھے خود بھی حیرت ہے کہ اورنگ زیب

بھائی نے آپ کو رات ہی اطلاع کیوں نہیں دی۔"

"ہم......" سراج نے ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچا پھر موبائل اٹھا کر اورنگ زیب کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری جانب سے ٹیون کی آواز ابھرتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ سراج نے دوبارہ ری ڈائل کیا۔ اس بار بھی کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ اس کی توجہ پوری طرح اخبار کی خبر اور موبائل پر تھی اس لیے وہ الماس کے لبوں پر ابھرتے والی شوخ مسکراہٹ کو بھی نہ دیکھ سکا پھر اس نے تیسری بار کال کرنے کا ارادہ کیا تو الماس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"یہ کس کے نمبر بار بار ڈائل کیے جا رہے ہیں؟ خلافِ معمول نہار منہ کس کی یاد ستا رہی ہے؟"

الماس کے چبھتے ہوئے جملے بھی خلافِ توقع تھے۔ سراج نے اسے گھور کر دیکھا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہتا اس کا موبائل گنگنانے لگا، روشن اسکرین پر اورنگ زیب کے نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے شکوہ کیا۔

"مجھے حیرت ہے کہ آپ نے رات ہی مجھے کال کیوں نہیں کی۔"

"ناشتے کے لیے نہیں پوچھو گے؟"

اورنگ زیب کا جواب موبائل کے ساتھ ساتھ اس کی پشت سے بھی واضح طور پر سنائی دیا تو سراج کو الماس کی مسکراہٹ کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ اس نے تیزی سے نظریں گھما کر دیکھا، اورنگ زیب نے بڑی اپنائیت سے اس کے شانے دبائے پھر اس کے ساتھ ہی ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔

"ڈی آئی جی نے بھی رات مجھے سوتے سے جگا دیا تھا۔ اصل حادثے کا علم مجھے بھی جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد ہی ہوا۔ اس وقت میں نے تم کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

ناشتے کے دوران اورنگ زیب نے اس کو وہ تمام باتیں بھی تفصیل سے بتا دیں جس کی بھنک اخبار والوں کو نہیں ملی تھی۔

"کیا لودھی کا موبائل ضایع کرتے وقت آپ کو اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ اسے بعد میں قتل بھی کیا جا سکتا ہے؟"

"نہیں......" جواب بے حد سنجیدگی سے دیا گیا۔ "اس وقت تک آکٹوپس کا کوئی علامتی نشان میری نظروں کے سامنے نہیں آیا تھا۔"

"اب آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟"

"فی الحال میں کوئی حتمی بات کہنے سے گریز کروں گا لیکن اب بھی مجھے اس کی موت کا یقین نہیں آ سکا ہے۔"

"لودھی کے ساتھ جو بہیمانہ انداز اختیار کیا گیا ہے، ہم سب کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔" سراج نے کچھ توقف سے کہا۔ "شیخ حامد کے ہاتھوں ہمارے بہت سے لوگ کسی نہ کسی انداز میں بکے ہوئے تھے۔ ان سب کے لیے بھی یہ حادثہ ایک لمحہ فکریہ ہی ثابت ہو گا۔"

"جذباتی مت بنو......" اورنگ زیب نے پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ "لودھی کے قتل کی وجہ وہ موبائل تھا جو ان میرے ذہن میں ایک خطرہ بن کر ابھرا تھا۔ اس کے ضایع ہونے کے بعد لودھی کا انجام میرے لیے کچھ غیر متوقع نہیں رہا۔ انڈر ورلڈ کے بڑے غداروں کو اس سے کہیں زیادہ وحشیانہ انداز میں سسکا سسکا کر مارنے کے عادی ہوتے ہیں۔"

"پلیز......" الماس نے اپنی نشست پر کسمسا کر کہا۔ "ناشتے کی میز پر مرنے والے کی تفصیل نہ بیان کریں۔"

"ڈی آئی جی صاحب نے آپ کو اس شخص کا نمبر کیوں نہیں بتایا جس نے لودھی کے تبادلے کی سفارش کی تھی؟"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اورنگ زیب نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر سراج کو غور سے دیکھا۔ "کیا تم ڈی آئی جی کو بھی کسی زاویے سے مشکوک سمجھ رہے ہو؟"

"جی نہیں لیکن...... اس نے نام ظاہر کرنے سے گریز کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ وہ وقتی طور پر میرے اس اچانک سوال پر سٹپٹا گیا تھا۔ اس کا یہ عمل قدرتی تھا...... تم کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے کہ اس نے لودھی کی سزا میں کمی کے بہانے سے جو آرڈر کیے تھے وہ اوپر سے منسوخ کرائے گئے تھے، اس وقت ڈی آئی جی صاحب نے کہا تھا کہ لودھی کے سلسلے میں کہیں اوپر سے ان کو ایسا کرنے کو کہا گیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ آرڈر آکٹوپس کے اشارے پر جاری کیے جا رہے تھے جسے میں نے اتفاقاً علم میں آ جانے کے بعد اوپر سے کینسل کرائے تھے...... ہو سکتا ہے یہ بات کسی طرح ڈی آئی جی کے علم میں بھی آ گئی ہو۔"

"آئی۔سی! گویا اب ڈی آئی جی صاحب زیادہ محتاط ہو گئے ہیں۔" سراج نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "ممکن ہے اس بار وہ اوپر والوں سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کو موجودہ بڑی شخصیت کا نام بتائیں۔"

"وہ نام میرے علم میں پہلے ہی آ چکا ہے۔" اورنگ زیب نے سادگی سے کہا۔ "موبائل کا انجام دیکھنے کے بعد ہی میں نے اپنے خاص ذرائع سے معلوم کر لیا تھا۔ اب اگر ڈی آئی جی نے اس سے رابطہ قائم بھی کیا تو وہ اس سیٹ کے

نہیں ہوگا جس پر پہلے تعینات تھا۔"

"لیکن...... کیا ڈی آئی جی اس کے سیٹ پر نہ ہونے کی خبر سن کر چونکے گا نہیں؟"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اسے پوری طرح اس بات کا احساس ہوجائے کہ میں...... کسی بھی حوالے سے آکٹوپس کا نام درمیان میں آجانے کے بعد اب کسی کے احکامات کا پابند نہیں ہوں گا۔"

ناشتے کے دوران اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی جسے الماس کسی نہ کسی طور ہضم کرتی رہی لیکن جب وہ اٹھ کر لاؤنج میں آئے تو الماس نے ازخود بات کا رخ بدل کر کہا۔

"میں آپ دونوں کو ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔" "میں نے روبی کی دعوت سے آنے کے بعد دوسری صبح اسے فون کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اسی ماہ کے آخر تک وہ اور آپ کے ڈی آئی جی صاحب نکاح کے مرحلے سے بھی سبکدوش ہوجائیں گے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" اورنگ زیب نے کہا پھر سراج کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا براہ راست الماس سے مخاطب ہوا۔ "میڈم روبی کی شادی کے بعد آپ کے سراج کا کیا بنے گا؟"

"ان دونوں کی شادی سے میری صحت پر خدانخواستہ کیا اثر پڑے گا۔" سراج نے اورنگ زیب سے بڑا معصوم شکوہ کیا۔ "آپ میرا نام بلاوجہ درمیان میں لاکر الماس کو کسی شک میں مبتلا کررہے ہیں۔"

"پریشان نہ ہوں۔" الماس نے سراج کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "پہلے کی بات اور تھی لیکن اب روبی سے دوستی کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ بے حد شریف اور رکھ رکھاؤ والی خاتون ہے۔"

"میری بھی یہی رائے ہے مگر سراج کی خیر پھر بھی ممکن نہیں ہے۔" اورنگ زیب نے دوبارہ سراج کو دیکھ کر کہا۔

"پلیز...... آپ میری خیر نہ ہونے کی وضاحت بھی کر دیں ورنہ الماس کسی وقت بھی ایک ذرا سی غلط فہمی پر میرا جینا دوبھر کردے گی۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ دار بھی آپ ہوں گے۔" سراج کے لہجے میں ایسی معصومیت اور بھولپن تھا کہ الماس کے علاوہ اورنگ زیب بھی ہنس دیا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "الماس کی بات دو تین روز قبل ہوئی تھی جبکہ لودھی کا قتل گزشتہ رات کو ہوا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں......" اس بار الماس نے اورنگ زیب سے سوال کیا۔ "بھلا روبی کی شادی کا لودھی صاحب کے قتل سے کیا تعلق ہے؟"

"آکٹوپس......" اورنگ زیب نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "شادی کے سلسلے میں بھی میڈم نے یہی شرط رکھی تھی کہ وہ شیخ حامد کی موت کے بعد ہی اس کا حتمی فیصلہ کرے گی۔ ممکن ہے کہ لودھی کے سلسلے میں اخبار میں شائع ہونے والی تفصیل میں آکٹوپس کی شبیہ کا حوالہ دیکھ کر......"

اورنگ زیب کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سراج کے موبائل کی روشن ہونے والی اسکرین پر میڈم روبی کے نمبر نظر آیا تو سراج نے اورنگ زیب کو دبی زبان میں "میڈم روبی" کہہ کر کال ریسیو کی۔

"جی...... میں خاکسار سراج بول رہا ہوں...... جی ہاں، میں نے خبر پوری تفصیل اور مع حوالہ جات پڑھ لی ہے...... ننانوے فیصد لوگوں کا یہی خیال ہے کہ وہ شارک مچھلیوں کی غذا بن چکا ہے۔ رہا ایک فیصد کا معاملہ تو وہ اس وقت ہمارے درمیان ہی موجود ہیں...... جی...... گڈ، میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ آپ براہِ راست ان سے چھان بین کرلیں۔" سراج نے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی موبائل اورنگ زیب کی طرف بڑھا دیا۔

اورنگ زیب نے بڑی صاف گوئی سے میڈم روبی سے بھی یہی کہا کہ جب تک وہ شیخ حامد کی لاش کو اپنی نظروں سے نہیں دیکھ لیتا اس کی موت کی تصدیق یا تردید نہیں کرسکتا۔ اس نے دوسری طرف سے اصرار کے باوجود کوئی مشورہ دینے سے بھی معذرت کرلی تھی۔

میڈم سے اورنگ زیب کی گفتگو ختم ہونے کے بعد بھی خاصی دیر تک میڈم اور ڈی آئی جی کی شادی کا معاملہ ہی زیرِ بحث رہا۔

☆☆☆

شیخ حامد کے سمندر میں غرق ہوجانے کی اطلاع سے کاروباری حلقوں میں ایک استحکام سا پیدا ہوگیا تھا۔ بڑے تاجروں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ سرکاری ٹینڈر بھرنے کے مقابلے میں اب وہ صورت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ دوسری جانب ان دلالوں کا کاروبار بھی مندا پڑ گیا جو دونوں فریق سے اندر کی خبریں، قبل از وقت پہنچانے کے عوض لمبی لمبی رقمیں بٹورتے تھے۔ بہرحال اب مقابلے کی فضا ختم ہونے کے بعد سب ہی بڑے تاجروں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



کیرم بورڈ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

محبت کے انداز نرالے ہوتے ہیں... کبھی سرشاری تو کبھی اذیت بھری بے زاری... گزرے ہوئے بے شمار لمحات میں کوئی ایک لمحہ ایسا بھی گزرتا ہے جس میں کسی کی پوری زندگی محصور ہوجاتی ہے۔ یادوں کے دائرے اور محبتوں کے حصار سے اڑنے والے طائر پرواز کر جاتے ہیں مگر کسی کی آنکھیں دور خلاؤں میں انہیں ڈھونڈتی رہ جاتی ہیں۔

وقت کی بے عنوان یادوں میں کھوجانے والے چند رشتوں کی تلاش

آخری بار جب میں نے انہیں دیکھا تھا تو وہ بہت کمزور ہوچکے تھے۔ اس دن جب میں ان کے گھر پہنچا تو وہ سورہے تھے یا شاید بے ہوش تھے۔ چہرے کی جھریاں ایک دوسرے کے اوپر سمانے کی کوشش کررہی تھیں۔ سرخ ہونٹ کے ساتھ زبان بھی سرخ سرخ ہورہی تھی۔ سر پر کوئی بال نہیں اور ماتھے کے تل کافی نمایاں تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں اور چہرہ کسی مرے ہوئے آدمی کا چہرہ لگ رہا تھا۔

انہوں نے آنکھیں کھولیں تو احساس ہوا کہ وہ زندہ

ہیں۔ دھنسی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک سی باقی تھی۔ زندگی کی چمک، زندہ رہنے کی روشنی۔ انہوں نے مجھے دیکھا، پہچان کی ایک رمق سی آنکھوں میں آئی، انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکرا نہیں سکے۔ کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکے۔ سوچ کا عمل اور سمجھنے کا سلسلہ جاری تھا، ذہن بیدار مگر جسم ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ مجھے دیکھا ہوگا، کچھ سوچا ہوگا۔ دماغ میں الفاظ اگے ہوں گے۔ سب مل کر جملے بنیں ہوں گے مگر زبان پر کوئی قابو نہیں تھا جیسے دماغ اور زبان کے درمیان بجلی کی لائن کٹ گئی تھی۔ میرا دل ان کی کمزوری اور بیماری پر اتنا نہیں دکھا جتنا ان کے چہرے کی بے بسی پر دکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے سوچا تھا، یا اللہ انہیں اچھا کردے یا انہیں موت دے دے۔ تھوڑی دیر تک ان کے پیروں کے پاس کھڑا رہا، انہیں دیکھتا رہا، ان کی بے بسی پر کڑھتا رہا پھر گھر چلا آیا۔

رات دو بجے ثریا کا فون آیا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ مجھے افسوس تو ہوا مگر تسلی بھی کہ اب وہ زندہ رہنے کے عذاب سے نکل گئے ہیں۔ موت نے زندگی کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا بھی خاتمہ کردیا تھا۔

ثریا نے ہی بتایا کہ کلیم کو امریکا خبر کردی گئی ہے۔ کلیم میرا دوست تھا۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی ہوم اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ میں نے کامرس گروپ لے کر چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کی اور اس کے بعد کراچی میں ہی میرے لیے راستے کھلتے چلے گئے۔ کلیم کا داخلہ سندھ میڈیکل کالج میں ہوگیا تھا۔ میٹرک کے بعد ہم دونوں کی تعلیمی سرگرمیاں تو مختلف تھیں مگر ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ہم لوگ پابندی سے ملتے، اکثر ساتھ ساتھ گھومتے۔ میں اس کے گھر جاتا اور وہ ہمارے گھر آتا...... دوستی بڑھتی چلی گئی تھی۔ کلیم کی تین بڑی بہنیں تھیں۔ وہ گھر میں ہر ایک کا لاڈلا تھا۔ ہونا بھی چاہیے، پاکستان میں تین بہنوں کے بعد بھائی کا پیدا ہونا تو جیسے ایک طرح کا معجزہ تھا۔ کلیم کو بھی اپنی اہمیت کا اندازہ تھا مگر وہ اپنی اس اہمیت کا ناجائز فائدہ کبھی نہیں اٹھاتا تھا۔

میں اپنے کام میں مصروف رہنے لگا اور گھر کی دوسری ذمے داریوں میں الجھتا چلا گیا اور وہ ڈاکٹر بن کر امریکا چلا گیا۔ میں نے سنا کہ اس نے امریکا کے امتحانوں میں بڑے اچھے نمبر لیے ہیں۔ شروع میں تو وہ ہر سال کراچی کا چکر لگاتا رہا۔ وہ جب بھی آتا ہم لوگ کئی شامیں ضرور ساتھ گزارتے تھے۔ برنس روڈ پر یا کسی چائنیز ریسٹورنٹ میں، گزرے زمانوں کی باتیں کرتے ہوئے۔ اس کی تین بہنوں کی شادی میں، میں نے نہ صرف یہ کہ شرکت کی بلکہ بے انتہا کام بھی کیا تھا، بالکل گھر کے کسی فرد کی طرح۔

پھر بہنوں نے بڑے چاؤ سے کتنی ہی لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد کلیم کے لیے بھی لڑکی پسند کرلی اور بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اس کی۔ شادی سے پہلے تک تو کلیم یہی کہتا رہا کہ اسے امریکا کچھ دن رہنے کے بعد پاکستان واپس آنا ہے مگر شادی کے بعد ایسا لگا تھا جیسے اسے پتا ہی نہیں ہے کہ وہ پاکستان واپس آئے گا۔ ہر سال وہ پاکستان آتا ضرور تھا مگر بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ۔

اس کے ہاں پہلے دو جڑواں لڑکے ہوئے تھے جن کا عقیقہ بھی کراچی میں ہی ہوا۔ پھر ایک کے بعد ایک کرکے دو بیٹیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ اس کا کام امریکا میں بڑھ بھی گیا مگر چھٹیوں میں وہ آتا ضرور تھا۔

آہستہ آہستہ وہ امریکن ہوتا چلا گیا۔ میں نے اسے تبدیل ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس کے انگلش بولنے کا انداز، اس کے زور سے چلانے کا طریقہ، بات بات میں ''گاڈ ڈیم'' کی تکرار، چھوٹے چھوٹے بل کو دینے کے لیے بھی پرس کا نکالنا پھر اپنے کسی کارڈ کے ذریعے بل دینے کی کوشش کرنا۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں جنہیں میں دیکھ رہا تھا کہ کس طرح سے آہستہ آہستہ وہ تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ بدلا ہوا پاکستانی امریکن۔ اس کے امریکن ہوجانے کے باوجود اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں محسوس کی تھی میں نے۔

مجھے ایک دفعہ اپنی کمپنی کی طرف سے ایک ٹریننگ کے لیے امریکا بھیجا گیا، نیویارک میں ایک ہفتے کا کام تھا میرا، اس کے بعد کلیم نے مجھے ٹکٹ بھیج کر اٹلانٹا بلا لیا تھا۔ پھر پانچ دن تک وہ اپنی ویگن میں مجھے لے کر گھومتا گھماتا رہا۔ خوب سیر کرائی اس نے اور خوب پیسا بھی خرچ کیا مجھ پر۔

وہ بڑی شان سے رہ رہا تھا امریکا میں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اٹلانٹا کے ایک اور علاقے میں عنقریب گھر لینے والا ہے جو بڑا بھی ہے اور اچھا بھی۔ اس کی بیوی نسیمہ بھی مجھے بہت خوش لگی اور بچے تو تھے ہی پیارے پیارے سے۔

میرے واپس آنے کے کچھ ہی ہفتوں کے بعد کلیم کی والدہ کا یکایک انتقال ہوگیا۔ زیادہ عمر نہیں تھی اس وقت ان کی، مشکل سے پچاس سال کی ہوں گی بس یکایک بیمار پڑ گئی تھیں۔ کچھ ذیابیطس کا مسئلہ تھا۔ کلیم کو خبر کی گئی اور اس کے آنے تک وہ جانبر نہیں ہوسکی تھیں۔ نہ جانے کیا ہوا، تیز بخار آیا ان کو، پھر دیکھتے ہی دیکھتے موت واقع ہوگئی۔ کلیم

ایک ہفتہ رہ کر چلا گیا تھا۔ بہت اداس، بہت پژمردہ، بہت بے حال۔ میں اس کی بے حالی کا اندازہ کرسکتا تھا اپنی ماں کی موت مجھے یاد تھی۔ مجھے کسی بھی قسم کا احساس جرم تو نہیں تھا مگر کلیم کو شدید احساس تھا کہ وہ موت کے وقت ان کے سرہانے نہیں تھا۔ کاش وہ یہاں ہوتا تو شاید کچھ کرسکتا۔ آج کل کے زمانے میں کوئی ذیابیطس سے نہیں مرتا ہے اور یہ کوئی بیماری تھوڑی ہے، ایک ہارمون کی کمی ہے اور اس کی کمی سے کوئی مرجائے، وہ بھی آج کل جبکہ ہر چیز ہر جگہ مل جاتی ہے، سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔

اس واقعے کے بعد کلیم کے والد تو یکایک بوڑھے، بہت بوڑھے ہوگئے۔ تیس پینتیس سال کا ساتھ اچانک اس طرح سے چھوٹ جائے تو شاید ایسے ہی ہوتا ہے۔

زندگی ان کے لیے بہت کٹھن ہوگئی۔ بڑا سا گھر تھا مگر گھر میں کوئی بھی نہیں تھا ان کے لیے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں اور اکلوتا بیٹا امریکا میں۔ چھ مہینے کے اندر اندر کلیم نے انہیں اپنے پاس امریکا بلا لیا مگر وہ دو ماہ سے زیادہ نہیں رہ سکے وہاں۔ امریکا کی زندگی انہیں راس نہیں آئی۔ بڑا گھر، گھر میں ہر قسم کا سامان، چوبیس گھنٹے کا ٹیلی وژن بھی۔ کلیم بھی، کلیم کی بیوی بھی اور بچے بھی مگر ان کا دل نہیں لگا تھا۔ وہ واپس آگئے اپنے اسی گھر میں جہاں ان کے بچے بڑے ہوئے تھے، جہاں سے ان کی بیٹیوں کی ڈولیاں اٹھی تھیں اور جہاں سے ان کی بیوی کا جنازہ نکلا تھا۔ وہ اداس ضرور تھے مگر مجھے لگا کہ وہ خوش بھی ہیں۔

کچھ ماہ کے بعد کلیم پھر آیا۔ مجھے یاد ہے، انہوں نے کلیم سے کہا تھا کہ وہ اتنا پڑھا لکھا ڈاکٹر ہے کہ اب اس کے لیے کراچی میں رہنا اور پیسے کمانا قطعی مشکل نہیں ہوگا۔ کراچی میں مکمل طور پر غیر صلاحیت یافتہ ڈاکٹر کما رہے ہیں اور خوب کما رہے ہیں تو کلیم کا تو مقام ہونا ہی بلند تھا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ کلیم کراچی واپس آجائے اور اپنا کام یہاں شروع کرے۔ مگر کلیم اب امریکا میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے ہم دونوں نے صدر میں چودھری فرزند علی کی دکان سے قلفی کھائی تھی، وہاں سے بوہری بازار کی طرف آئے تھے۔ کلیم نے پنجابی، بلوچی، پشتو اور سندھی گانوں کے کیسٹ خریدے۔ صدر کی کوآپریٹو مارکیٹ سے علاقائی دستکاری کا بہت سا سامان خریدا۔ زینب مارکیٹ سے ہاتھ کے کام کی چادریں اور قالین خریدے، ان سب کو امریکا میں اپنے پتے پر بک بھی کرایا تھا پھر ہم لوگ تھک کر وہاں سے ہاٹی ڈے ان کے، جو اب میریٹ ہوگیا ہے، نادیہ ریسٹورنٹ میں کافی پینے آگئے تھے۔ بات کرتے کرتے یکایک کلیم نے کہا۔ ''یار میرے ابو کو سمجھاؤ۔ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں، اس اسٹوپڈ ملک میں؟ کیا ہے یہاں؟ اور کیا کروں گا میں یہاں؟ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے۔ وہ خود تو امریکا چلنے کو تیار نہیں ہیں بلکہ الٹا مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں بھی پاکستان آکر کراچی میں کام کروں۔ ارے یار! میں اس ملک میں کیا کام کروں گا؟ نہ کوئی قانون ہے نہ ہی کوئی نظام۔ میں کیسے سمجھاؤں ان کو؟ ان کی تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا ہے۔''

ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ امریکا میں بور اور پریشان ہوجاتے تھے۔ ان کے لیے امریکا میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہاں ان کی ایک دنیا تھی، وہاں ان کا ایک لڑکا تھا۔ کلیم کے لیے پاکستان میں کچھ نہیں تھا۔ کلیم افسردہ اور پریشان امریکا واپس چلا گیا اور وہ اپنے پرانے گھر میں اپنی یادوں کے ساتھ رہ گئے تھے۔

بیٹیاں باپ کے لیے پریشان رہتیں اور انہوں نے آپس میں ڈیوٹیاں لگالی تھیں۔ ہر ہفتے وہ کسی نہ کسی کے گھر چلے جاتے، گھر پر ایک نوکر کا بھی انتظام تھا اور زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ اس انداز پر وہ اگر خوش نہیں تھے تو ناخوش بھی نہیں تھے۔

پھر ایک روز گھر پر رات کو ڈاکو آگئے۔ جو بھی کچھ قیمتی سامان تھا لے گئے، کلیم کے ابا کو مار مار کر بے ہوش کردیا اور نوکر کی جان چلی گئی۔ ایسا ہی ہو رہا تھا کراچی میں اس وقت۔ دوسرے دن ان کی چھوٹی بیٹی ان کے گھر آئی تو اس نے وہاں سے دوسرے رشتے داروں کو اور مجھے فون کرکے بلایا، انہیں اسپتال میں داخل کرنا پڑا تھا۔

میں نے انہیں آغا خان اسپتال میں دیکھا تھا۔ وہ ہوش میں تھے مگر خوف ان کے چہرے پر آنسوؤں کی طرح بہہ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیوں ہوا، کیسے ہوا؟ انہوں نے رک رک کر بتایا تھا کہ ایک سیاسی جماعت کے لوگ ان سے کچھ پیسوں کا مطالبہ کررہے تھے مگر انہوں نے منع کردیا۔ جس پر ان سے کہا گیا کہ انہیں مار دیا جائے گا اور مکان پر قبضہ کرلیا جائے گا۔ انہوں نے اس بات کو محض دھمکی سمجھا اور کسی سے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہوگیا۔ کراچی میں تو یہی ہو رہا تھا۔ لڑکے ہتھیار لے کر آتے تھے، دکانوں میں، مکانوں میں، کاروبار پر، دن کو، رات کو...... زبردستی پیسے بھی چھین لیتے، گھر والوں کو یرغمال بھی بنا لیتے تھے۔ عورتوں، لڑکیوں کی عزت پامال

کردیتے۔ کراچی میں تو جیسے جنگل کا راج تھا۔ انسان نہیں وحشی تھے سب لوگ۔ ان گھروں میں جہاں بوڑھے اکیلے رہ رہے ہوں یا جہاں بیوائیں بغیر سہارے کے زندگی کے دن گزار رہی ہوں وہاں تو جانے کیا کچھ ہوجاتا تھا۔ بھرے پرے گھروں پر بھی بڑی تعداد میں اسلحہ لے کر راتوں کو حملہ ہوتا تھا۔ پولیس، رینجرز اور سیاسی لیڈر چین کی نیند سو رہے تھے۔ لوگ پریشان تھے۔ کلیم کے ابو بہت پریشان تھے۔ دو دن بعد وہ اسپتال سے اپنی دوسری بیٹی رخسانہ کے گھر منتقل ہوگئے تھے۔ ایک ماہ کے اندر ہی ان لوگوں نے ناظم آباد کا پرانا مکان فروخت کردیا تھا۔

مکان سے قیمتی چیزیں تو پہلے ہی چوری ہوگئی تھیں۔ کچھ فرنیچر وغیرہ میں نے خریدنے کی کوشش کی تھی جو بہت حجت کے بعد انہوں نے بہت ہی تھوڑے پیسوں میں مجھے دے دیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ چند چھوٹی چھوٹی بچوں کے بچپن کی چیزوں کو انہوں نے احتیاط سے الگ کرلیا تھا۔ کلیم آیا نہیں، فون آتے رہے تھے۔ اس کے ابا کے پاس بھی اور میرے پاس بھی۔ مجھ سے اس نے کہا تھا کہ میں ہفتے دو ہفتے میں انہیں ضرور دیکھ لیا کروں۔ میں نے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ میرے جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اپنی بیٹی کے گھر میں تھے، اپنے نواسوں، نواسیوں کے درمیان۔ ان کا داماد بھی بہت خیال رکھنے والا آدمی تھا۔ مگر پھر بھی کلیم کی خواہش تھی تو میں ان کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ بڑی پابندی کے ساتھ ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ ان سے باتیں کرتا تھا، ان کے بارے میں، ان کی صحت کے بارے میں...... اور وہ باتیں کرتے تھے کلیم کے بارے میں، کلیم کے کام کے متعلق، کلیم کا بچپن اور کلیم کا گھر جو اٹلانٹا میں تھا۔ انہیں اس کے بارے میں باتیں کرکے مزہ آتا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ اپنی بیٹی کے گھر میں سیٹ ہوگئے۔ بچوں کے ساتھ مصروف رہتے، اخبار پڑھتے اور محلے کی مسجد میں جاکر نماز پڑھ لیتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بے چینی سے میرا انتظار کرتے رہتے تھے۔ کلیم کی باتیں سناتے، اس کے فون کا ذکر کرتے، اس کے بچوں کی تصویریں دکھاتے۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی باتیں کرکے وہ خوش ہوتے ہیں اور ان کے پاس خوش ہونے کے لیے تھا بھی کیا۔

کلیم پھر نہیں آیا۔ وہ خط بھی نہیں لکھتا تھا، ہاں فون کرتا تھا۔ مصروف آدمی کے لیے فون کرنا آسان ہوتا ہے۔ فون پر صرف آواز ہوتی ہے۔ کم وقت میں بہت ساری باتیں کرنے کی خواہش ہوتی ہے، آدمی کی شرمندگی بھی چھپ جاتی ہے اور احساسِ جرم کو بھی چھپایا جاسکتا ہے۔ خط میں تو بڑی جگہ ہوتی ہے، بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، بہت کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ خاص کر اگر اپنے گھر بھیجا جارہا ہو تو... پاکستان آنے سے ڈرتا تھا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ اپنے باپ سے کہے کہ وہ پاکستان نہیں آئے گا۔ اس میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ انہیں آکر دوبارہ امریکا لے جانے کے لیے آمادہ کرتا۔

وہ فون کرتا اور ہر مہینے اس کے اکاؤنٹ سے خود بہ خود کچھ رقم ان کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوجاتی۔ الیکٹرانک ٹرانسفر۔ کاش الیکٹرانک کے ذریعے جذبات، احساسات، پیار بھی ٹرانسفر ہوسکتے۔ کلک سے بٹن دبا کر کسی کے جلد کے لمس کا احساس ہوسکتا، ہونٹوں کی نمی محسوس ہوتی۔ آنکھوں کی چمک نظر آتی، کپکپاتے ہوئے ہاتھ اور دھڑکتے ہوئے دل بھی محسوس ہوتے۔ الیکٹرانک ٹرانسفر سے یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے تو صرف ڈالر ٹرانسفر ہوسکتے تھے۔ سنگ دل ڈالر کے نوٹ، حساب کتاب کے ساتھ۔

مجھے یاد ہے، ایک دن انہوں نے کہا۔ ”پرانا زمانہ اچھا تھا جب پوسٹ مین منی آرڈر کے ذریعے پیسے لے کر آتا تھا تو ایک رومانیت ہوتی تھی اس میں۔ سارے محلے کے لوگوں کو پتا ہوتا کہ آج بیٹے نے پیسے بھیجے ہیں۔ پوسٹ مین کو چائے پلائی جاتی، کچھ پیسے دیے جاتے اور آدمی فخر سے سر اٹھا کر گھومتا، لوگوں کو بھی پتا ہوتا کہ اس کا بیٹا ہے، قابل ہے، دور ہے مگر باپ کا خیال کرتا ہے۔ آج کل کیا ہے، محض بینک سے آیا ہوا ایک خط، آپ کے اکاؤنٹ میں اتنے ڈالرز آگئے ہیں۔ ٹھنڈے کالے حروف، جذبات سے عاری کسی ٹائپ رائٹر کی ٹھک ٹھک کی طرح تکلیف دہ۔“ وہ ایسی ہی باتیں کرنے لگے تھے۔ وقت کے ساتھ بڑھاپا اور کمزوری دونوں انہیں آہستہ آہستہ فتح کرتے چلے جارہے تھے۔

ایک دن جب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دونوں چھوٹی بیٹیوں نے انہیں نہلا کر غسل خانے سے نکالا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھے چائے کے ساتھ بسکٹ کھا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ وہاں رہی تھیں پھر چلی گئیں تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ لوگ مجھے رشید، جو ان کا خاص نوکر تھا، اس کے حوالے نہیں کرتے ہیں بلکہ مجھے خود سے نہلاتے ہیں۔ بڑی تکلیف دیتا ہوں ان لوگوں کو۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر بولے کہ جب صرف بیٹیاں ہوتی تھیں تو سب لوگ ہم دونوں میاں بیوی کو رحم کی نظر سے دیکھتے تھے بلکہ مجھے یاد ہے، میری ماں نے تو کہہ بھی دیا تھا کہ میاں، بیٹا نہیں ہوگا تو بڑھاپا کیسے

گزارو گے؟ دیہات کی سادہ عورت تھیں وہ، جو انہوں نے دیکھا وہی کہہ دیا تھا۔ کلیم کی ماں کو بہت برا لگا تھا۔ اگرچہ ہم دونوں کی شدید خواہش تھی کہ بیٹا بھی ہو جائے ہمارے یہاں، پھر خدا نے بیٹا بھی دے دیا۔ کیا کیا خوشیاں نہیں منائی تھیں ہم لوگوں نے۔ کس کس طرح ناز اٹھائے تھے ہم نے کلیم کے مگر غلط تھی میری ماں۔ اسے کیا پتا تھا کہ امریکا بھی کوئی جگہ ہے جہاں بیٹے جاکر مصروف ہو جاتے ہیں اور بیٹیاں اپنے بوڑھے ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہیں۔ ان کے لہجے میں شکایت تھی، بلا کا درد تھا مگر ساتھ ہی کلیم کے لیے بے تحاشا پیار بھی۔ ''ارے وہ کرتا بھی کیا یہاں پر؟ اتنی قابلیت کے ساتھ تو وہ ضائع ہو جاتا۔ پاکستان کو اچھے ڈاکٹر تھوڑی چاہئیں، گدھے چاہئیں، گدھے آجاتے ہیں یہاں جو وہاں کچھ نہیں کر سکتے ہیں، جو وہاں ناکام ہو جاتے ہیں۔ کلیم تو بڑا قابل ڈاکٹر ہے۔ وہاں کے لیے ہی ہے وہ۔ یہاں، کیا کرے گا؟ پھر صحیح کہتا ہے کلیم۔ کراچی میں تو اب بچوں کی تعلیم بھی صحیح طریقے سے نہیں ہو سکتی۔ یہاں بچے تو ضائع ہو جائیں گے۔ سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے چکروں میں......''

عام طور پر میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا اور یہی کیا میں نے اس وقت بھی۔

آج وہ طویل بیماری کے بعد مر گئے۔ کل تدفین ہو جائے گی۔ تینوں بہنیں گلے لگ کر باپ کے لیے رو لیں گی۔ بھائی فلائٹ نہ ملنے کی وجہ سے دیر سے پہنچے گا۔ دو دن، چار دن غمزدہ ماحول میں رہنے کے بعد چیزیں نارمل ہونا شروع ہو جائیں گی اور پھر افسردگی کے ساتھ ہم سب لوگ کلیم کو ایرپورٹ پر جاکر الوداع کہیں گے۔ میں نے سوچا۔

مگر کلیم نہیں آیا اور میں کلیم کو وہ بڑا سا پیکٹ بھی نہیں دے سکا جو اس کے والد نے مرنے سے کچھ عرصے قبل میرے حوالے کیا تھا کہ جب بھی کلیم آئے تو میں اسے دے دوں۔ ''اس میں اس کے لیے کچھ اہم ہدایت ہے۔'' انہوں نے ہنس کر مجھ سے کہا تھا پھر ایک کہانی بھی سنائی تھی۔ نہ کلیم آیا تھا، نہ بہنوں کو اس کے گلے لگ کر رونے کا موقع ملا اور نہ ہی وہ کہانی میں اسے سنا سکا۔

پھر یکا یک مجھے اپنی کمپنی کی طرف سے امریکا جانا پڑ گیا۔ کلیم کو میں نے خبر کی کہ نیویارک میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد میں اس کے پاس آؤں گا۔

اٹلانٹا کے بڑے سے ایرپورٹ پر وہ مجھے لینے آیا۔ یہ ایرپورٹ شاید جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ سے بھی بڑا تھا۔ ایرپورٹ کیا، چھوٹا سا ایک شہر تھا۔ نہ جانے کتنے ٹرمینل تھے اور ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل جانے کے لیے اندر ہی اندر ٹرین کا نظام تھا۔ ایک وقت میں کئی کئی جہاز آتے جاتے رہتے تھے۔ ہم لوگ کراچی میں ایک بس کا اڈا نہیں بنا سکے تھے۔ ان لوگوں نے ہر شہر میں شہروں سے بھی بڑے ایرپورٹ بنا لیے تھے۔

کلیم اٹلانٹا میں اسٹون ماؤنٹین کے علاقے میں رہتا تھا۔ پورا اٹلانٹا گہرے سبز رنگ کے درختوں سے بھرا ہوا ہے اور اسٹون ماؤنٹین کا علاقہ بڑا شاندار، خوب صورت اور امیر لوگوں کا علاقہ ہے۔ پیچ اسٹریٹ کے اوپر ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے اس کا بڑا سا مکان تھا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے مجھے پورے گھر کی سیر کرائی۔ بڑا سا خوبصورت سا لان، سوئمنگ پول، لان کے ساتھ گھوڑوں کو رکھنے کی جگہ، مکان کے نیچے ایک تہ خانہ جس میں ورزش کرنے کا سامان اور اسٹور تھا۔ ایک بڑا ہال سا تھا اوپر جس میں ایک بڑا سا ڈرائنگ روم، اس کے ساتھ ایک بڑا سا باورچی خانہ اور کچھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس نے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے کہا کہ یہ میرا پاکستان ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

پھر وہ مجھے ہر ایک کمرے میں لے گیا۔ ہر کمرے کی ڈیکوریشن مختلف تھی۔ پنجاب، بلوچستان، سندھ اور سرحد کے حوالے سے۔ وہاں کی دستکاری، وہاں کی تصویریں، وہاں کے بنے ہوئے قالین اور وہاں کی موسیقی کے کیسٹ موجود تھے۔ ہر کمرے کو صوبے کے لحاظ سے سجایا سنوارا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ان کمروں کی سجاوٹ بناوٹ میں بڑی محنت اور عرق ریزی کی گئی ہے اور ساتھ ہی بے تحاشا پیسے بھی خرچ کیے گئے ہیں۔ وطن سے دور، وطن کا ہر صوبہ اس نے اپنے گھر میں بنا لیا تھا۔ ''یہ سارے ہمارے مہمانوں کے لیے کمرے ہیں۔ تم کہاں سونا چاہو گے۔ چلو تمہیں کراچی میں سلاتا ہوں۔ یہ ذرا الگ سا کمرا میں نے سندھی کمرے کے اندر بنایا ہوا ہے۔ یہ سندھ میں شامل بھی ہے اور سندھ سے الگ بھی ہے۔ سندھ میں شامل ہے کیونکہ یہ سندھ کا علاقہ ہے اور الگ بھی ہے۔ یہاں پر مہاجر، سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، افغانی، ہندو، عیسائی، پارسی، چینی، یہودی اور بھی سب اپنے الگ وجود کے ساتھ رہتے ہیں۔ اب تو ہر طرح کے لوگ کراچی آگئے ہیں۔ امریکا میں جارجیا کے شہر اٹلانٹا کے ایک گھر میں پاکستان کے چاروں صوبے بغیر کسی جھگڑے کے ایک ساتھ خوشی خوشی رہ رہے تھے۔

اوپر کے حصے میں اس کے اور بچوں کے کمرے تھے۔ اوپر بھی پکانے اور کھانے کا علیحدہ انتظام تھا۔ بہت خوب صورت گھر تھا اس کا، بڑی محنت کی تھی اس نے اور اس کی بیوی نے اس کو سجانے میں۔ امریکن مہمان گھر دیکھ کر ضرور مرعوب ہو جاتے ہوں گے۔

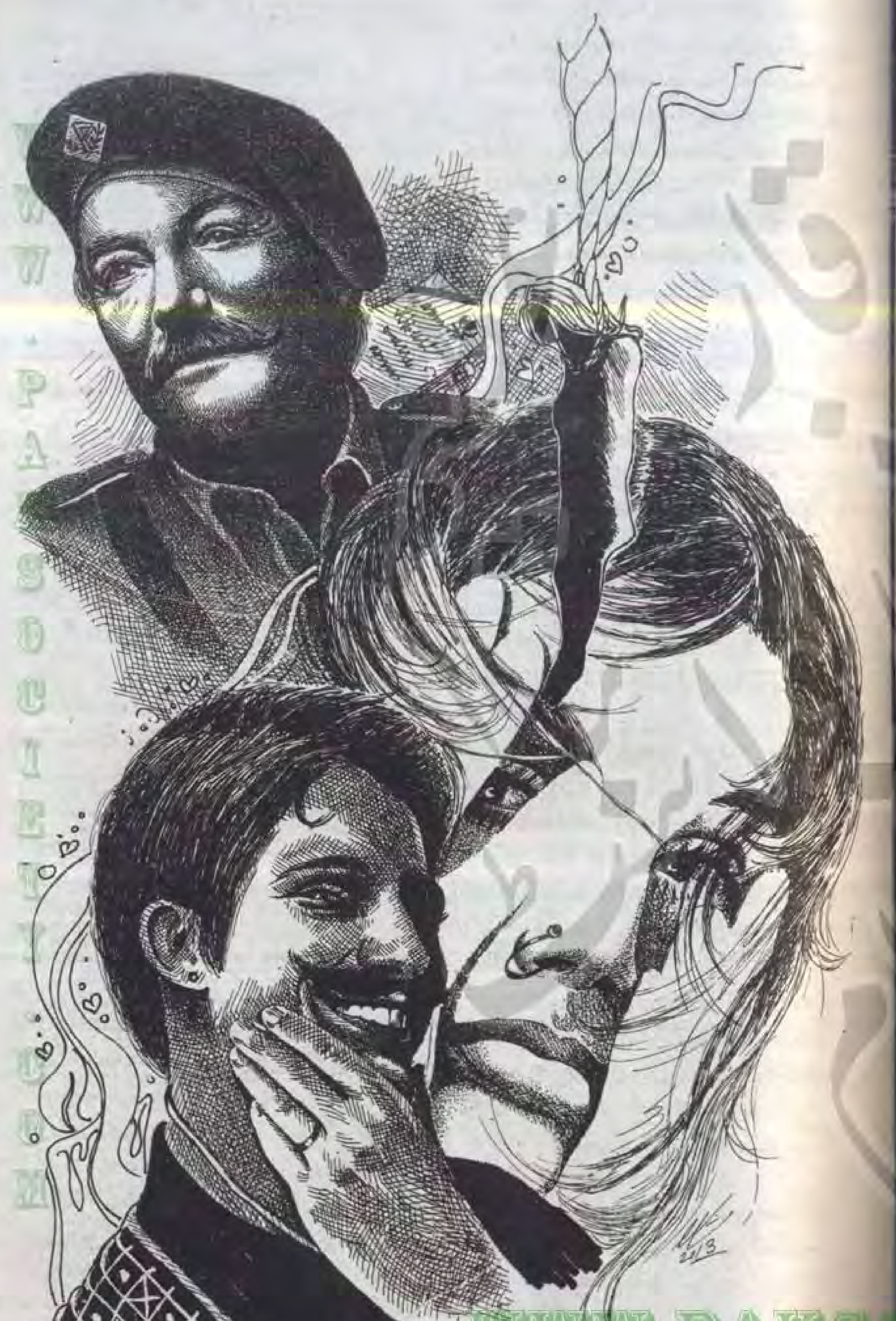
اس کے بچوں اور بیوی سے ملنے کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور کافی پیتے پیتے اس نے یکا یک مجھ سے کہا تھا۔ ''بہت مس کرتا ہوں پاکستان لیکن دیکھو، آنہیں سکا وہاں پر۔ ابا جان نے شرط ہی اتنی بڑی لگا دی تھی۔ بڑا دل کرتا تھا میرا کہ میں ان کے پاس آخری وقت میں تو ہو آؤں مگر یار مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے کہہ سکتا کہ میں پاکستان نہیں آؤں گا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پاکستان میں میرے لیے کچھ نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے بچے ہیں۔ ان کی تعلیم تو پاکستان میں ممکن ہی نہیں ہے۔ یار، کیا ہے، وہاں پر؟ ہر چیز کا بیڑا غرق ہو چکا ہے۔ خاص طور پر بچوں کا تو کوئی مستقبل نہیں ہے۔''

میں نے اس سے بحث نہیں کی، اس سے اختلاف نہیں کیا، اس کا فائدہ نہیں تھا مگر میں نے دل میں سوچا کہ پاکستان کا یہ آدمی جو وہاں ایمان دار تھا، یہاں بے ایمان ہو گیا ہے۔ اس ملک میں جہاں زیادہ تر لوگ سچ ہی بولتے ہیں، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ وہ پاکستان نہیں آئے تو اس میں کوئی بری بات نہیں ہے، جو کچھ یہاں پر ملا ہے تمہیں شاید پاکستان میں نہیں ملتا مگر اتنی تو ہمت سے کام لو کہ صرف یہی بات کہو۔ کہو کہ تمہاری اقتصادی مجبوریاں ہیں، کہو کہ تم بے تحاشا ڈالر کے بغیر نہیں رہ سکتے ہو۔ زندگی کی یہ آسائشیں، یہ سڑک پر گھر، یہ بازار، یہ سہولتیں سب اچھی چیزیں ہیں۔ تم ان کے عادی ہو گئے ہو۔ نہیں رہ سکتے اس جگہ پر جہاں مکھی، مچھر کے درمیان رہا جائے۔ بغیر پانی اور بجلی کے۔ کم از کم بچوں کے مستقبل اور تعلیم کا بہانہ تو نہ بناؤ۔ یہ عجیب بات ہے ہم لوگوں کی۔ پاکستان میں بھی ہر برا کام کرنے والا یہی کہتا ہے کہ وہ رشوت نہیں لینا چاہتا۔ وہ بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سب تو کرنا پڑتا ہے، اپنے بچوں کے لیے۔ آخر ان کا کیا قصور ہے؟ ان کو اچھی زندگی چاہیے۔ کتنے جھوٹے ہیں لوگ پاکستان سے امریکا تک۔ لیکن اس سے میں یہ بات نہیں کہہ سکا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف سنتا رہا پھر مجھے اس کے والد کے دیے ہوئے پیکٹ کا خیال آیا جس نے میرے سوٹ کیس کے تلے کو تقریباً مکمل طور پر گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ میں نے وہ پیکٹ اسے لاکر دے دیا۔

اس نے وہ پیکٹ میرے سامنے ہی کھول لیا۔ خاکی رنگ کے اس بڑے سے پیکٹ میں کچھ تصویریں تھیں اور ایک چھوٹا سا کیرم بورڈ۔ ایک لفافے میں اس کیرم بورڈ کی چھوٹی چھوٹی گوٹیاں بھی تھیں۔

''یہ دیا ہے تمہارے ابا نے تمہارے لیے۔ اسے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا انہوں نے۔ اپنا مکان چھوڑتے ہوئے اور کچھ نہیں اٹھایا تھا گھر سے۔ انہیں گھر کے لٹ جانے کا شاید اتنا غم نہیں تھا جتنا اس کیرم بورڈ اور تمہارے کمرے کی چیزوں کے بچ جانے کی خوشی تھی۔ اس چھوٹے سے کیرم بورڈ کو سینے سے لگا کر رکھا تھا انہوں نے۔ ہر روز اسے چھوتے تھے جیسے تم کو چھو رہے ہوں، دھیرے سے ہنستے تھے، جیسے تمہیں ان گوٹیوں سے کھیلتے ہوئے دیکھ رہے ہوں۔ اپنی تینوں بیٹیوں سے پیار تھا انہیں، تم سے شدید محبت تھی۔ تم بیٹے تھے ان کے، اکلوتے بیٹے۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم جب بہت چھوٹے تھے تو تم نے ایک دن ان سے جلدی آنے کو کہا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کے کالر کو پکڑ کر ان کے گالوں کو چوم کو اپنی تتلاتی ہوئی زبان میں۔ ان کو یاد تھا ایک ایک لفظ جو تم نے کہا تھا، ایک ایک حرکت جو تم نے کی تھی۔ ان کے ذہن کے پردے پر سلو اسپیڈ میں چلتی ہوئی کسی فلم کی طرح وہ پوری طرح محفوظ تھی اور اسی دن وہ نہیں آسکے تھے اور تم انتظار کر کر کے پریشان ہوتے رہے تھے۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے یہ چھوٹا سا کیرم بورڈ خریدا تھا انہوں نے۔ تم اسے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے اور نہ جانے کتنے دنوں تک تم اس سے کھیلتے رہے تھے۔ انہیں تو جیسے ایک ایک گیم یاد تھا۔ ایک ایک گوٹی کے ساتھ ایک کہانی تھی اور ایک ایک اسٹرائیک کے ساتھ ایک قصہ تھا۔ یہ بالکل بچوں والی باتیں ہیں۔ صرف ایک قصہ ہے مگر انہوں نے مجھے سنایا تھا اور کہا تھا کہ تمہیں اسی طرح سے بتا دوں۔ انہوں نے تمہیں کھو دیا۔ پر تمہارا کیرم بورڈ تو ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کیرم بورڈ تمہیں دے دوں تو پھر ایک بار تم خوش ہو جاؤ گے، ان کے امریکا نہ آنے سے تم شاید ناراض ہو گئے ہو۔''

کلیم ساکت، اپنی ویران آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ اس نے کیرم بورڈ کو زور سے سینے سے لگا کر بھینچ لیا تھا، جیسے کوئی اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیتا تھا۔



حرص کے ہاتھوں مجبور جرم وسزا کا ایک اور رنگ

ملک صفدر حیات

فتنہ ہوس

انسان کی فطرت میں اگر ہوس شامل ہوجائے تو فتنوں کا بازار گرم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا... کوئی زندگی ہارے یا ہو موت کی خواہش... کہیں ہو عزت کا نیلام یا کوئی ہوتا رہے بدنام... ہوس کی سلطنت میں ان باتوں کی پاسداری کا کوئی قانون نہیں ہوتا، جب مفاد پرستی کی راجدھانی میں جرم کا ارتکاب ایک ہوس گزیدہ اپنا حق سمجھنے لگے تو سناروں کی بستی میں لوہار کی پیدائش ہو ہی جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی تماشا یہاں بھی رونما ہو رہا تھا۔

موت برحق ہے اور کائنات کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ تلخ حقیقت بھی۔ کوئی شخص خدا کی ذات پر (نعوذ باللہ) یقین رکھتا ہو یا نہیں مگر وہ موت سے انکار نہیں کرسکتا۔ زندگی کو موت کی امانت اور موت کو زندگی کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال، موت ہو یا زندگی...... دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ٹھہرتی ہیں۔ کسی ایک کے انکار سے خود بہ خود دوسری کی نفی ہوجاتی ہے۔ سال ہا سال سے موت بڑے تواتر کے ساتھ زندگی کو نگلتی چلی آرہی ہے اور زندگی اس بات پر خوش ہے کہ ایک دن اس موت کو بھی موت آجائے گی......

صغریٰ...... عرف سُگی کی بھی موت آئی تھی اس لیے وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ اس کی موت کی خبر صابر علی کے توسط سے مجھ تک پہنچی تھی۔

ان دنوں میں ضلع گجرات کے ایک دور دراز تھانے میں تعینات تھا اور سُگی موضع سعید نگر کی رہنے والی تھی۔ مذکورہ گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ لگ بھگ ایک ہزار نفوس سے آباد سعید نگر میرے تھانے سے آدھے میل کے فاصلے پر مغرب میں واقع تھا۔ اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔

میں نے اطلاع کنندہ صابر علی کو فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک پندرہ سولہ سالہ خوب رو نوجوان بھی تھا۔ صابر علی نے درمیانے سائز کی ڈاڑھی رکھ چھوڑی تھی۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد جب سوالیہ نظر سے اس نوجوان کی طرف دیکھا تو صابر علی نے بتایا کہ وہ سُگی کا چچازاد ایوب تھا۔

جب وہ دونوں میرے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے صابر علی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''ہاں بھئی! صبح صبح کس معاملے نے تم لوگوں کو تھانے پہنچادیا ہے؟''

''سُگی نے خودکشی کرلی ہے تھانے دار صاحب......''

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''ہم آپ کو لینے کے لیے آئے ہیں۔''

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور سُگی کے بارے میں

استفسار کیا۔ اس نے مجھے مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے سوال کیا۔

''سگی سے تمہارا کیا رشتہ ہے صابر علی؟''

''جی...... میں تو پٹواری صاحب کا پڑوسی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایوب پٹواری مشتاق کا بیٹا ہے۔ سگی انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ میں تو بس ساتھ آ گیا ہوں جناب......!''

اس علاقے کے زیادہ تر لوگوں سے ابھی میری شناسائی نہیں ہوئی تھی البتہ، مشتاق پٹواری کا نام میں نے سن رکھا تھا اگرچہ اس سے میری ایک بھی ملاقات نہیں تھی۔ وہ سعید نگر کی ایک معروف شخصیت تھا۔

میں نے صابر علی سے پوچھا۔ ''خود پٹواری صاحب کہاں ہیں؟ اس واقعے کی اطلاع دینے تو انہیں تھانے آنا چاہیے تھا۔''

''ابا جی گوجرانوالہ گئے ہوئے ہیں۔'' ایوب نے بتایا۔ ''وہ آج شام تک واپس آجائیں گے۔''

وہ صبح کا وقت تھا اور میں ابھی اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا۔ میں نے ایوب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''وہ اتنی صبح گوجرانوالہ کیا لینے چلے گئے ہیں؟''

''وہ آج نہیں گئے۔'' ایوب نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ کل دوپہر کے بعد یہاں سے گئے تھے۔ ان کا رات کو گوجرانوالہ میں رکنے کا پروگرام تھا۔ یہ بات انہوں نے جانے سے پہلے گھر میں بتادی تھی۔''

میں نے سگی کی موت کے حوالے سے دو تین ضروری سوالات کیے پھر ان لوگوں کے ہمراہ جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ کانسٹیبل امانت علی بھی میرے ساتھ تھا۔

⊱⊱⊱

سعید نگر میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی چلتے ہوئے گاؤں پہنچ گئے۔ آدھے میل کا فاصلہ ہوتا ہی کتنا سا ہے، باتوں میں کٹ گیا اور چند منٹ کے بعد ہم سعید نگر کے اندر تھے۔ اس گاؤں میں کم و بیش ڈھائی سو گھر آباد تھے جن میں سب سے نمایاں تو چودھری فرزند علی کی حویلی تھی جو غیر تحریری طور پر سعید نگر کا حاکم بھی تصور کیا جاتا تھا۔ چند لمحات کے بعد میں، صابر علی اور ایوب کی معیت میں مشتاق پٹواری کے گھر پہنچ گیا۔

مشتاق پٹواری کا گھر خاصا کشادہ اور شاندار تھا جس کا رقبہ پندرہ مرلے سے کم نہیں تھا۔ کراچی میں رہنے والے اسے ساڑھے تین سو گز سمجھ لیں۔ اس رقبے کا زیادہ تر حصہ وسیع و عریض صحن کی شکل میں کھلا ہوا تھا جس کے وسط میں جامن کا ایک قد آور اور چھتناور درخت ایستادہ تھا۔ ڈھکے ہوئے حصے میں ایک بیٹھک، چار رہائشی کمرے، برآمدہ، غسل خانہ، باورچی خانہ اور ایک مویشیوں کا کمرا شامل تھا۔ میری خواہش پر فوراً مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں صغریٰ عرف سگی نے خودکشی کی تھی۔

موت کا منظر کسی بھی صورت خوشگوار نہیں ہو سکتا لیکن سگی کے حوالے سے میں بلا مبالغہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی موت کا نظارہ دل ہلا دینے والا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ جب میری نگاہ پہلی مرتبہ اس کی لاش پر پڑی تو وہ کمرے کی چھت سے جھول رہی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی گردن میں مضبوط رسی کا پھندا کسا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور گردن کی لمبائی میں نمایاں اضافہ نظر آتا تھا۔ پھندا بردار رسی کا دوسرا سرا چھت کے شہتیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ سگی کی لاش کمرے کے فرش سے کوئی دو فٹ اونچائی پر لٹک رہی تھی، مطلب یہ کہ اس کے پاؤں اور کمرے کے فرش کے درمیان بہ مشکل دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس جھولتی، لٹکتی لاش کے قریب ہی فرش پر ایک چوبی اسٹول الٹا پڑا تھا۔ اسٹول کا لفظ میں نے آسانی کے لیے استعمال کیا ہے ورنہ درحقیقت وہ ایک اسٹول نما اسٹینڈ تھا جو عموماً مٹی کے گھڑوں کے نیچے رکھا جاتا ہے۔ اپنے پایوں اور بناوٹ کے لحاظ سے وہ ایک اسٹول ہی دکھائی دیتا ہے۔ بس، اس کی ٹاپ سطح نہیں ہوتی بلکہ پانی والے گھڑے کو محفوظ سہارا فراہم کرنے کے لیے اس کو چوکھٹا نما بنایا جاتا ہے۔

میں نے کانسٹیبل امانت اور مشتاق پٹواری کے پڑوسی صابر کی مدد سے سگی کی لاش کو ''بحفاظت'' نیچے اتار لیا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ سگی نے موسم کی مناسبت سے گرم لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک خوش شکل اور پُرکشش لڑکی تھی۔ عمر تئیس اور چوبیس کے درمیان رہی ہوگی لیکن اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ اس کی تمام تر خوب صورتی اور رعنائی خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی چھت سے جھولتی ہوئی لاش کو دیکھ کر پہلی نظر ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کا شمار زندہ انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ معائنے نے بھی میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔

میں نے جائے وقوعہ کی کارروائی کو نمٹایا اور سگی کی لاش کو کانسٹیبل امانت کی نگرانی میں، پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس موقع پر پٹواری کی بیوی زلیخا نے مجھ سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! پٹواری جی کو تو آنے دیں پھر سگی کی لاش کو آپ......!''

''کیا پٹواری صاحب گھنٹے، دو گھنٹے میں آجائیں گے؟'' میں نے زلیخا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ تو جی شام تک ہی گوجرانوالہ سے واپس آئیں گے۔''

''میں شام تک ان کی واپسی کے انتظار میں لاش کو ادھر نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''وہ جب واپس آجائیں تو انہیں میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ میں خود ان سے بات کرلوں گا۔''

میرے حتمی انداز کے بعد زلیخا یا گھر کے کسی اور فرد نے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا۔ میں نے امانت علی کو حکم دیا کہ وہ سگی کی لاش کو لے کر فی الفور اسپتال کی جانب روانہ ہو جائے۔

''او کے ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں امانت علی کے جانے کے بعد زلیخا کے ساتھ بیٹھک میں آ گیا تاکہ اس اندوہناک واقعے کی تفصیل جان سکوں۔ تھانے سے اس طرف آتے ہوئے، راستے میں صابر علی سے میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق اس گھر میں کل چھ افراد رہتے تھے۔ پٹواری مشتاق، اس کی بیوی زلیخا، بڑی بیٹی نغمہ، نغمہ سے چھوٹے دو بیٹے ایوب اور اسحاق اور صغراں عرف سگی۔ پٹواری مشتاق تو گوجرانوالہ گیا ہوا تھا اور سگی عدم آباد کے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ باقی چاروں افراد اس وقت گھر کے اندر موجود تھے اور میں زلیخا کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا تھا۔

میں نے مناسب انداز میں، سگی کو پیش آنے والے واقعے پر اظہارِ افسوس کیا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''زلیخا! مجھے پتا چلا ہے، سگی کافی عرصے سے تم لوگوں کے ساتھ رہ رہی تھی؟''

''جی...... پچھلے پانچ سال سے وہ ادھر ہی تھی۔'' وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اور اس کے ماں باپ......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کوئی چھ سال پہلے میرے جیٹھ یعنی سگی کے باپ کرم دین کا انتقال ہو گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''سگی کا کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ اس کی ماں خورشید بی بی نے اپنے خاوند کی موت کا بڑا گہرا صدمہ لیا تھا۔ ظاہر ہے، سگی کو بھی کرم دین کے انتقال کا دکھ تھا لیکن خورشید نے گویا اس واقعے کو اپنے اوپر طاری کر لیا تھا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ وہ بڑی بہکی بہکی اور پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی حالت بگڑتی گئی پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ سگی اس وقت لگ بھگ اٹھارہ سال کی تھی۔ یہ ایسی عمر ہوتی ہے کہ انسان خود کو سنبھالنے کے قابل ہو جاتا ہے لیکن خورشید کی حالت ایسی تھی کہ ان دونوں کو ان کے حال پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا لہٰذا پٹواری جی اپنی بھابی اور بھتیجی کو یہاں لے آئے تھے۔''

''لیکن......'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''خورشید تو مجھے گھر میں کہیں نظر نہیں آئی۔ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے......؟''

''وہ بہت پہلے کہیں چلی گئی تھی۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''پٹواری جی نے اپنے گھر لانے کے بعد حکیم سے بڑی توجہ کے ساتھ اس کا علاج کرایا تھا لیکن سال، ڈیڑھ سال کے علاج کے بعد بھی اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ میں تو کہوں گی کہ علاج جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، اس کی دماغی صحت مزید بگڑتی چلی گئی۔ آخری دنوں میں تو اسے باقاعدہ دورے پڑنے لگے تھے۔ گردن مڑ جاتی، ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو جاتے اور منہ سے جھاگ بہنے لگتا۔ کئی بار تو اس کی زبان دانتوں تلے دب کر لہولہان ہو گئی تھی۔''

''یہ تو سیدھی سیدھی مرگی کی علامات ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولی۔ ''حکیم جی نے بھی یہی کہا تھا۔''

''لیکن زلیخا......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ خورشید بہت پہلے کہاں چلی گئی تھی؟''

''میں کیا بتاؤں جی......'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔ ''یہ بات تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی۔ وہ اپنے پاگل پن میں گھر سے باہر تو نکل ہی جایا کرتی تھی لیکن اپنی گلی کے اندر ہی رہتی تھی۔ ہم لوگ اسے پکڑ کر واپس لے آتے تھے لیکن ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ پھر کبھی پلٹ نہیں سکی......''

بڑے افسوس ناک انداز میں وہ بات ختم کر کے خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں نے خورشید کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟''

"بہت کوشش کی تھی تھانے دار صاحب......!" وہ ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے بولی۔ "سعید نگر کیا، ہم نے پورا گجرات اور اس کے گاؤں دیہات چھان مارے تھے۔ پٹواری جی نے کسی رشتے دار یا جاننے والے کا گھر نہیں چھوڑا لیکن یہ تمام تر تلاش بیکار ثابت ہوئی، خورشید کا کہیں پتا نشان نہیں مل سکا تھا اور آج تک یہ راز، راز ہی ہے کہ وہ آخر گئی کہاں۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ اب اس دنیا میں باقی بھی ہے یا......؟"

بڑے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ خاموش ہوگئی۔

"خورشید کی گمشدگی والے معاملے پر تو ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "فی الحال تم مجھے یہ بتاؤ کہ سگی نے کیوں خودکشی کی ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھانے دار صاحب۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "رات کو تو وہ اچھی خاصی اپنے کمرے میں سوئی تھی۔ صبح جب ہم نے دیکھا تو وہ چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ میں تو خود حیران ہوں کہ اس کو ہوا کیا۔"

"کیا سگی اس کمرے میں اکیلی ہی رہتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی، ہم نے یہ کمرا سگی اور خورشید کو دے دیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "وہ دونوں ماں بیٹی اسی کمرے میں رہا کرتی تھیں پھر جب خورشید اچانک غائب ہوگئی تو اس کے بعد سے کمرا سگی کے استعمال میں آگیا تھا۔"

"باقی کمروں میں افراد خانہ کس حساب سے آباد ہیں؟" میں نے اپنی معلومات کے لیے پوچھ لیا۔

"دیکھیں جی، یہ تو بیٹھک ہے ہماری جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔" وہ بتانے لگی۔ "اسی لائن میں دیوار کے ساتھ دو کمرے ہیں۔ ایک میں میرا بڑا بیٹا ایوب اور دوسرے میں نغمہ اور اسحاق رہتے ہیں۔ پھر عقبی دیوار کے ساتھ ان کمروں سے ملحقہ دو کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ایک میں پٹواری جی اور میں رہتے ہیں اور دوسرے میں سگی کی رہائش تھی جہاں اس نے چھت سے لٹک کر خود کو پھانسی دی ہے......" وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"ایک کمرا بیٹھک کے سامنے، دوسری دیوار کے ساتھ بنا ہوا ہے جو کہ مال مویشی کے لیے مخصوص ہے جہاں ہم اپنے جانوروں کے لیے چارہ وغیرہ ذخیرہ کرتے ہیں یا پھر سخت سردی اور بارش کے موسم میں جانوروں کو اس کمرے کے اندر باندھ دیا جاتا ہے۔"

اس نے اپنا طویل بیان ختم کیا تو میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔ "زلیخا! تم تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا ہے کہ پچھلی رات کو سگی ٹھیک ٹھاک اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئی تھی لیکن صبح جو کچھ ... علاوہ بالکل مختلف تھا۔ اس سے تمہاری سمجھ میں کیا آتا ہے؟"

"میری تو مت ماری گئی ہے تھانے دار صاحب......!" وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ سگی نے ایسی خطرناک حرکت کیوں کی ہے۔"

"زلیخا! ماشاءاللہ! تم سیانی بیانی ہو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اتنا تو تم سمجھ ہی سکتی ہو کہ کوئی انسان خوامخواہ تو اپنی جان نہیں لے لیتا۔ کوئی بہت بڑی مجبوری ہی انسان کو اپنی جان کا دشمن بنا لیتی ہے۔ جب کسی شخص کے لیے زندہ رہنا ممکن نہیں رہتا تو وہ خودکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔" وہ پُرسوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں بھی اسی سبب تک پہنچنا چاہتا ہوں جس نے سگی کو خودکشی پر مجبور کیا تھا؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"سبب کے بارے میں کیا کہوں جی۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ "مجھے تو یہ اس کا پاگل پن ہی لگتا ہے۔"

"پاگل پن......کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ جی کہ......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "انسان بیٹھے بٹھائے اپنی جان سے کھیل جائے تو اسے پاگل پن ہی تو کہیں گے، ویسے ایک بات پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔"

"کون سی بات؟" وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

"میں کچھ عرصے سے یہ محسوس کررہی تھی کہ سگی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں۔" اس نے بتایا۔ "وہ بہت کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔ بعض اوقات الٹی سیدھی باتیں بھی کرجاتی تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگنے لگتا تھا۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر جھرجھری لی تو میں نے پوچھا۔ "کس بات کا ڈر؟"

"آپ کو میں نے بتایا ہے نا، سگی کی ماں خورشید کی دماغی کیفیت کیا رہی تھی۔" اس نے بتایا۔ "سگی کی حالت کو دیکھ کر بعض اوقات مجھے ڈر لگنے لگتا تھا کہ کہیں وہ بھی اپنی ماں کی طرح پاگل نہ ہوجائے اسی لیے میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ سے کہا ہے کہ......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "سگی نے پاگل پن میں چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی ہے۔"

"ہوں......!" میں چند لمحات کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کہا۔ "اس بات کا پتا تو میں چلا ہی لوں گا کہ اس نے کون سے "پن" کے ہاتھوں مجبور ہوکر خود کو موت کے حوالے کیا ہے۔ تم فی الحال مجھے یہ بتادو کہ گزشتہ رات اس کا کسی سے کوئی جھگڑا وغیرہ یا تلخ کلامی تو نہیں ہوئی تھی؟"

"اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔" وہ بڑے وثوق سے بولی۔ "ہم سب لوگ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ نغمہ، ایوب اور اسحاق تو اسے اپنی سگی بہن سمجھتے تھے۔ ان چاروں کا کبھی آپس میں کسی بات پر بڑا اختلاف نہیں ہوا۔ میں سمجھتی ہوں......" وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے یقین ہے، خودکشی والے فیصلے میں سراسر اس کی اپنی مرضی شامل ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس نے ایسا سنگین قدم کیوں اٹھایا۔ اس گھر میں تو اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔"

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس حقیقت کو کھول دے گی کہ سگی نے کسی اندرونی یا بیرونی تکلیف کے لیے اپنی جان دی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم اس معاملے کے بارے میں اور کچھ جانتی ہو تو بتاؤ؟"

"نہیں جی۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں اور کچھ نہیں جانتی۔"

"پٹواری جی کب گوجرانوالہ گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کل دوپہر کے بعد یہاں سے گئے تھے۔"

"اور واپسی کے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

"آج رات تک وہ واپس آئیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں گھر کے دوسرے افراد سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے زلیخا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "خاص طور پر تمہاری بیٹی نغمہ سے......؟"

مجھے پتا چلا تھا کہ نغمہ کی عمر بیس سال تھی۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ نغمہ، سگی اور اس کے داخلی معاملات کے بارے میں سب سے زیادہ جانتی ہوگی۔

"میں ان کو بھیجتی ہوں جی......" یہ کہتے ہوئے زلیخا بیٹھک سے نکل کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب چلی گئی۔

زلیخا کے بڑے بیٹے ایوب سے میں مل چکا تھا۔ وہ اپنے پڑوسی صابر علی کے ساتھ اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے آیا تھا۔ اس سے چھوٹا اسحاق تھا جس کی عمر بارہ کے قریب رہی ہوگی۔ میں نے ان تینوں سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آسکی جو سگی کی خودکشی پر کسی زاویے سے روشنی ڈال سکتی۔ میں تھوڑی دیر کے بعد یہ کہتے ہوئے زلیخا کے گھر سے نکل آیا۔

"پٹواری جی جب گوجرانوالہ سے واپس آجائیں تو انہیں میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ باقی معلومات میں ان سے حاصل کرلوں گا۔"

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں واپسی کے لیے چل پڑا۔ اس واقعے نے مجھے دل گرفتہ کر دیا تھا۔ پتا نہیں کیوں، رہ رہ کر مجھے خیال آرہا تھا کہ سگی کی موت کسی جنونی کیفیت یا فوری فیصلے کا نتیجہ ہرگز نہیں ہوسکتی۔

میں پٹواری مشتاق کے گھر سے نکلا تو باہر گلی میں بھی لگ بھگ نصف درجن افراد کو جمع دیکھا۔ میں نے ان سے بھی ہلکی پھلکی پوچھ گچھ کی لیکن وہ لوگ میری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کرسکے۔ میں صابر علی کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے تھانے کی جانب بڑھنے لگا۔

صابر علی کی عمر تیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ چونکہ پٹواری کا پڑوسی تھا لہٰذا اس سے سوالات کرنا خاصا فائدہ مند ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"صابر علی! تم کرتے کیا ہو؟"

"بس جی، محنت مزدوری کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"کس قسم کی محنت مزدوری؟"

"زیادہ تر تو میں کھیتوں میں کام کرتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "اس کے علاوہ بھی جو کام مل جائے، انکار نہیں کرتا۔ بیوی بچوں کا پیٹ تو پالنا ہے نا جناب......"

"تم پٹواری صاحب کے پڑوس میں کب سے رہ رہے ہو؟"

"میں تو جی اس گھر میں پندرہ بیس سال سے رہ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "یہ پوچھیں کہ پٹواری جی کب سے

میرے پڑوس میں آباد ہیں۔"

"کیا مطلب صابر علی......!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتا ہو کہ پٹواری پہلے کہیں اور رہتا تھا؟"

"جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہاں تو یہ لوگ پانچ چھ سال پہلے آکر آباد ہوئے ہیں۔ یہ گھر دراصل پٹواری مشتاق کے بڑے بھائی کرم دین کا تھا۔ پہلے وہی خورشید اور نگی کے ساتھ اس گھر میں رہا کرتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد یہ تبدیلی آئی تھی۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ پٹواری مشتاق نے بڑے بھائی کی موت کے بعد اسی کے گھر میں ڈیرا ڈال دیا تھا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "بجائے اس کے کہ وہ اپنی بھتیجی اور بھابی کو اپنے گھر لے جاتا، وہ اپنا گھر چھوڑ کر بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہو گیا تھا۔"

"جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "پٹواری جی کا اپنا گھر بہت چھوٹا تھا۔ وہاں یہ سب لوگ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجی کی ہمدردی میں پٹواری جی ادھر ہی آ بسے تھے۔"

"ہمدردی......!" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ہمدردی جتانے کا یہ خاصا منفرد اور انوکھا طریقہ ہے بھئی۔"

وہ میرے اس تبصرے پر کچھ نہیں بولا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے تھانے کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے تھانے کی چار دیواری کے پاس رک کر اس سے پوچھا۔

"صابر علی! نگی کی موت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جی......" وہ متاملانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس نے خودکشی کی ہے جناب۔"

"خودکشی کی ہے، یہ تو اس کی چھت سے لٹکتی ہوئی لاش کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تم سے اس خودکشی کے سبب کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ نگی ایسا سنگین قدم اٹھانے پر کیوں مجبور ہوئی......؟"

"نہیں جناب...... مجھے اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہے۔" وہ بے بسی سے مجھے تکنے لگا۔

"اندازہ نہیں ہے تو اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم ان کے پڑوسی ہو۔ میں اندر کے حالات جاننا چاہتا ہوں۔" "تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟"

میرے پُراسرار اور انتہائی سنجیدہ انداز کو دیکھ ہوئے وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "جی سمجھ رہا ہوں تھانے دار جی، اس کام کے پیچھے میں رضیہ کو لگاتا ہوں جی......"

"رضیہ...... یہ رضیہ کون ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"رضیہ...... میری بیوی ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ کھوج کھرا لگانے والے کاموں کی بڑی ماہر ہے جناب۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی بیوی کو اس مشن پر لگا دو اور جیسے ہی کوئی خاص بات پتا چلے، تم فوراً میرے پاس آ جانا۔"

"جی......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آپ جیسا کہہ رہے ہیں، میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔"

"لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر۔" میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "اور یہ بات تم اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھا دینا۔"

"جی...... ٹھیک ہے۔" وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

☆☆☆

اس روز میں تھانے میں بیٹھا نگی کی خودکشی کے بارے ہی میں سوچتا رہا۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں خودکشی کی بہت سی وارداتیں دیکھی تھیں لیکن نگی والے معاملے میں مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ یہ عجیب کیا تھا، میں سردست اسے کوئی نام دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ صابر علی کی فراہم کردہ معلومات نے بھی میرے ذہن میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پٹواری مشتاق پہلے سعید نگر کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد وہ بیوی بچوں سمیت اس کے گھر میں ڈیرا ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے گاؤں والوں پر یہی ظاہر کیا تھا، جیسا کہ صابر علی کی باتوں سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ عجیب و غریب "نقل مکانی" پٹواری نے اپنی بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجی کی ہمدردی میں کی تھی لیکن میرا ذہن اس نوعیت کی ہمدردی کو قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ مجھے تو پٹواری کے اس عمل کے پیچھے کسی گہری سازش کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

میں کسی ممکنہ سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے بے چین ہو گیا لیکن سردست مشکل یہ تھی کہ اس کہانی کے بڑے کردار اب منظر عام پر نہیں رہے تھے۔ نگی کی پاگل ماں خورشید تین سال پہلے کہیں غائب ہو گئی تھی اور نگی بھی اب عدم آباد کی جانب روانہ ہو چکی تھی گویا...... ایک پارٹی تو سرے سے غیر حاضر تھی۔ مجھے جو کچھ بھی معلوم کرنا تھا،

دوسری پارٹی یعنی پٹواری اینڈ کمپنی ہی سے معلوم کرنا تھا اور وہ بھی بڑے طریقے اور سلیقے سے۔ اس کام کے آغاز کے طور پر میں نے صابر علی کو ایک اہم ذمے داری سونپ دی تھی۔ اسے اپنی بیوی رضیہ کی مدد سے دیوار کی دوسری جانب کا احوال جاننا تھا۔

دوپہر کے بعد کانسٹیبل امانت علی واپس آ گیا۔ میں نے امانت علی کو نگی کی لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیجا تھا۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھا تو میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ملک صاحب! میں نے نگی کی لاش کو اسپتال پہنچا دیا ہے۔" وہ میری نگاہ کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے بولا۔ "ابتدائی رپورٹ کل شام تک یا پھر پرسوں صبح مل جائے گی......"

"ہوں......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "امانت! تم تو مقامی ہو نا؟"

"جی ملک صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ہم لوگ پچھلی تین پیڑھیوں سے ادھر سعید نگر ہی میں رہ رہے ہیں۔ میرے پردادا کے زمانے سے۔"

"پھر تو تمہیں یہاں کے لوگوں اور ان کے حالات سے پوری واقفیت ہو گی......؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں...... بالکل!" وہ فخریہ انداز میں گردن اٹھاتے ہوئے بولا۔ "آپ حکم کریں، کسی کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں......؟"

"فی الحال تو میری تمام تر توجہ صغریٰ عرف نگی پر لگی ہوئی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ اپنے باپ کے انتقال کے بعد نگی اور اس کی ماں خورشید، پٹواری مشتاق کے ساتھ رہنے لگی تھیں اور وہ بھی اس طرح کہ پٹواری اپنے بال بچوں سمیت انہی کے گھر میں مقیم ہو گیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے امانت علی؟"

"جی ہاں، یہی حقیقت ہے......!" اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر اس واقعے کی تفصیل سے مجھے آگاہ کرنے لگا۔

کانسٹیبل امانت علی نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ صابر علی کی زبانی پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ یہ تفصیلی واقعات ضرور تھے لیکن اس میں کوئی نئی اور چونکا دینے والی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"پٹواری مشتاق کی یہ ہمدردی بڑی عجیب سی نہیں ہے؟"

"بہت عجیب ہے جناب......!" وہ آنکھوں کو گھماتے ہوئے بولا۔ "پٹواری مشتاق کی اس حرکت پر تو بڑی باتیں بھی بنی تھیں۔"

"کس قسم کی باتیں؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ...... یہی کہ......" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا کہ پٹواری مشتاق نے بہت بڑا اور لمبا ہاتھ مارا ہے......"

"لمبا ہاتھ مارا ہے...... کیا مطلب؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"جناب! بات یہ ہے کہ پٹواری جی کے پاس پہلے ایک چھوٹا گھر تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "بڑے بھائی کے انتقال کے بعد وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ان کے گھر میں آکر بس گیا۔ اپنا چھوٹا گھر کچھ دنوں کے بعد اس نے فروخت کر دیا تھا۔ اس موقعے پر لوگوں نے کہا کہ پٹواری کو اپنی بیوہ بھابی یا یتیم بھتیجی سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی دلچسپی بلکہ وہ اس بڑے مکان پر قابض ہونے کے لیے یہ جذباتی ڈراما کر رہا ہے......" وہ لمحے بھر کے لیے تھما، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"پھر جب خورشید اپنا توازن کھو بیٹھی اور کچھ عرصے کے بعد گھر سے غائب ہو گئی تو لوگوں کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ خورشید کی اس ذہنی کیفیت کا ذمے دار بھی پٹواری ہی ہے اور اب...... نگی بھی جان سے گئی!"

کانسٹیبل اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے جس اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا تھا وہ پہلے سے میرے ذہن میں موجود تھا۔ پٹواری کے بڑے بھائی کرم دین کے انتقال کے بعد سے اب تک کی صورتِ حال کو اگر تنقیدی نظر سے دیکھا جاتا تو پٹواری مشتاق کا کردار کئی زاویوں سے شک کے دائرے میں قید نظر آتا تھا۔ میں انہی نکات پر غور کر رہا تھا کہ امانت علی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ملک صاحب! پچیس ایکڑ زمین اور وہ بھی نہری زرعی اراضی بھی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے......"

"یہ کیا قصہ ہے امانت علی؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

"کرم دین کی پچیس ایکڑ زرعی اراضی بھی تھی۔" امانت علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جب پٹواری

مشتاق اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کے لیے خورشید اور سگی کے پاس آ گیا تو وہ پچیس ایکڑ زمین بھی پٹواری کے استعمال بلکہ پٹواری کے قبضے میں آ گئی۔ پچھلے پانچ، چھ سال سے وہی اس زمین کی کاشتکاری کے معاملات دیکھ رہا تھا۔"

"پچیس ایکڑ اچھی خاصی زمین ہوتی ہے......" میں نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔

"اسی لیے تو لوگ اس انداز میں سوچ رہے تھے ملک صاحب......!" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "خورشید کے پاگل پن اور پھر گمشدگی کے بعد تو مکان اور زمین کچھ زیادہ ہی پٹواری کے قبضے میں چلی گئی تھی اور اب سگی کی المناک موت کے بعد تو ہر چیز کا مالک و مختار صرف اور صرف پٹواری ہی ہے۔"

سگی کی موت کے ذکر پر، میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ کافی دیر سے میری سوچ ایک بے نام سی الجھن کا شکار تھی۔ میں نے چونک کر امانت علی کی جانب دیکھا اور پوچھا۔

"جب ہم نے سگی کی لاش کو پھندے میں سے نکال کر چارپائی پر لٹایا تھا تو تم نے کوئی خاص بات نوٹ کی تھی؟"

"کیسی خاص بات ملک صاحب؟" وہ متذبذب انداز میں بولا۔

"کوئی غیر معمولی اور خلافِ توقع بات......؟"

"میں سمجھا نہیں جناب۔" اس کے تذبذب میں تشویش در آئی۔ "آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں......؟"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے اپنے شک کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔ "جب ہم نے سگی کو پھانسی پر لٹکے دیکھا تھا تو پھندے کے باعث اس کی گردن کی لمبائی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا......؟"

"ایسا تو ہوتا ہے جناب......" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ "جب کوئی شخص پھانسی لگا کر خودکشی کرتا ہے تو لٹکنے کی وجہ سے اس کی گردن لمبی ہو جاتی ہے۔"

"اور اسی تناؤ یا کھنچاؤ کی وجہ سے اس کی آنکھیں بھی حلقوں سے باہر ابل پڑتی ہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہوتا ہے یا نہیں؟"

"بالکل ہوتا ہے ملک صاحب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "دم گھٹنے کے باعث جب بھی کسی شخص کی موت واقع ہوتی ہے تو اس کی آنکھیں ضرور باہر نکل آتی ہیں۔"

"لیکن سگی کے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہوا......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ...... ٹھیک کہہ...... رہے ہیں ملک صاحب......" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس کی آنکھیں تو بند تھیں جیسے...... گہری نیند سو رہی ہو......"

"اس کا مطلب سمجھتے ہو؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

جواب دینے کے بجائے وہ منتظر نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا۔ "حقیقت کا پردہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی چاک کرے گی مگر میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سگی کو پھانسی کے پھندے نے نہیں مارا......"

"پھر......؟" وہ حیرانی سے منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

"مجھے یقین ہے کہ سگی کی موت پھانسی کے پھندے تک پہنچنے سے پہلے ہی واقع ہو چکی تھی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مردہ سگی کو پھانسی کے پھندے سے لٹکا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔"

"پھر تو یہ سیدھا سیدھا قتل ہوا نا......؟" امانت علی کی آواز میں ہیجان جھلکتا تھا۔

"ہاں!" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "حالات و واقعات تو اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ صورتِ حال کی وضاحت کر دے گی۔"

"لیکن...... سگی کی جان کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟" وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

"تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے امانت علی؟" جواب دینے کے بجائے میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

"جناب! سیدھی سی بات ہے۔ میرا دھیان تو مشتاق پٹواری کی طرف جا رہا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "پٹواری کا پچھلا ریکارڈ بھی خاصا مشکوک ہے۔ اپنے بڑے بھائی کی زمین اور مکان پر قبضہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ کرم دین کی بیوہ خورشید اپنے پاگل پن میں پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اس زمین و جائداد کی اکلوتی وارث یہ سگی ہی باقی بچی تھی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا......؟"

"بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں امانت علی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم نے بڑے منطقی انداز میں صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے لیکن مشتاق پٹواری تو کل دوپہر کو ہی گوجرانوالہ چلا گیا تھا اور سگی گزشتہ رات ٹھیک ٹھاک اپنے کمرے میں سوئی تھی۔ پٹواری کو سگی کی موت کے ساتھ نتھی کرنا تھوڑا دشوار محسوس ہو رہا ہے۔"

میں نے آخری جملہ اس مقصد کے تحت ادا کیا تھا کہ اگر امانت علی کے ذہن میں کوئی خاص بات ہو تو فوراً اس کی زبان پر آ جائے لیکن مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ عام سے لہجے میں بولا۔

"یہ معاملہ پٹواری مشتاق کی واپسی پر ہی سلجھایا جا سکتا ہے ملک صاحب!"

"تمہارا کیا خیال ہے......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "ہم جب پٹواری سے پوچھیں گے کہ کیا سگی کو اسی نے ٹھکانے لگایا ہے تو وہ فوراً تسلیم کر لے گا کہ ہاں...... یہ اسی کا کارنامہ ہے؟"

"نہیں جناب! اگر مشتاق پٹواری سگی کے قتل میں ملوث ہے تو وہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔ ہمیں طریقے سلیقے سے تفتیش کر کے اس کی زبان سے اگلوانا ہو گا۔"

"وہ تو آج شام تک گوجرانوالہ سے واپس آئے گا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "لیکن ہم اس کے انتظار میں شام کا انتظار نہیں کر سکتے۔ تفتیش تو ابھی اور اسی وقت شروع ہو گی......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور اس تفتیش کا آغاز تم کرو گے امانت علی......!"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "مم...... میں......؟"

"ہاں، تم!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم سعید نگر ہی کے رہنے والے ہو لہٰذا تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ تم اپنے تئیں یہ جاننے کی کوشش کرو کہ ان دنوں مشتاق پٹواری کے گھر کے اندر کیا حالات چل رہے تھے، خصوصاً سگی کے حوالے سے......!"

"آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب!" وہ بڑے عزم سے بولا۔ "میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، مجھے کرنا کیا ہے۔"

"شاباش!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

آئندہ بیس منٹ تک میں کانسٹیبل امانت علی کو سگی کی موت اور پٹواری مشتاق کے ملوث ہونے کے حوالے سے مختلف نوعیت کی ہدایات دیتا رہا۔ میرے ذہن کو صبح سے جو نقطہ پریشان کیے ہوئے تھا وہ اب ابھر کر سامنے آ چکا تھا جبھی میری سرگرمی میں بھی خاصی تیزی آ گئی تھی۔

✦✦✦

آج کے مقابلے میں ہمارے زمانے میں تفتیش کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہوا کرتی تھیں۔ ہم لوگ پوچھ گچھ کے روایتی طریقوں پر ہی انحصار کیا کرتے تھے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کامیابی کا تناسب ہمارے زمانے میں آج کی نسبت کہیں زیادہ ہوا کرتا تھا۔ مجرم تک رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں فنگر پرنٹس بھی ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمارے دور میں فنگر پرنٹس کا رواج بھی عام نہیں ہوا تھا۔ اگر کوئی تفتیشی افسر اس جانب توجہ دیتا بھی تھا تو عدالت اس کی محنت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی۔ سگی کی حسرت ناک موت کا عقدہ حل کرنے کے لیے اگر فنگر پرنٹس کا سہارا لیا جاتا تو بہت سے سنسنی خیز انکشافات ہو سکتے تھے۔

رات کو میں تھانے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ پتا چلا، پٹواری مشتاق مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

پٹواری کی عمر پچپن کے قریب رہی ہو گی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک میانہ قد شخص تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ میں نے اسے اپنی میز کی دوسری جانب رکھی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

بیٹھنے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تھانے دار صاحب! یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"یہ سب" سے اس کی مراد یقیناً سگی کی المناک موت ہی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پٹواری جی! یہ سوال تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے۔ سگی آپ کے ساتھ رہتی تھی؟"

"میں تو کل دوپہر میں اسے بھلی چنگی گھر میں چھوڑ کر گیا تھا۔" وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ "آج واپس آیا ہوں تو یہاں کی صورتِ حال ہی بدلی ہوئی ہے۔"

"آپ سگی کی موت کے حوالے سے کیا کہیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیا کہوں جی۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا......" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بڑی بے چارگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں، اس کے دماغ میں خودکشی کا خیال کیوں آیا......؟"

"کیا آپ بھی یہی سمجھ رہے ہیں کہ سگی نے خودکشی کی ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں...... مجھے زلیخا نے یہی بتایا ہے۔" وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔

"زلیخا نے بتایا اور آپ نے یقین کر لیا؟" میرے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"جناب! آپ کو پتا ہے، میں تو کل سے گوجرانوالہ گیا ہوا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ زلیخا نے مجھے بتایا

ہے کہ سگی نے چھت سے لٹک کر جان دے دی ہے۔''

''ہوں......'' میں بہ دستور معنی خیز انداز میں اسے گھورتا چلا گیا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب! آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ سگی نے خودکشی نہیں کی......؟''

''ہاں، میں ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں سگی کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے......''

''ایسا کون کرسکتا ہے؟'' اس نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے پٹواری صاحب......!''

''اس گھر میں سگی کا کوئی دشمن نہیں ہے۔'' وہ خاصے سراسیمہ اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ''سب اس کا بہت خیال رکھتے تھے، اسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے کجا یہ کہ...... اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔''

''میں جس انداز میں سوچ رہا ہوں اس کی کلی وضاحت تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے پر ہی ہوگی۔'' میں نے پٹواری مشتاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر ٹٹولنے والے لہجے میں پوچھا۔

''پٹواری جی! آپ اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں نا کہ سگی اپنی جان گنوا بیٹھی ہے؟''

''جی ہاں...... اس میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں۔'' وہ جلدی سے تائیدی انداز میں بولا۔

''اگر میں آپ کی بات ہی کو درست مان لوں کہ سگی نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی ہے پھر ایک نہایت ہی خطرناک سوال سر اٹھاتا ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جب میں آپ کی بات مان رہا ہوں تو اس سوال کا جواب دینا بھی آپ ہی کی ذمے داری ہے۔''

''آپ سوال کریں تھانے دار صاحب۔'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں ضرور جواب دوں گا۔''

''سوال بہت آسان اور سادہ سا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کوئی بھی انسان راضی خوشی یا چاؤ میں اپنی جان سے نہیں کھیلتا۔ جب تک کوئی دکھ، کوئی پریشانی انسان کو زندگی سے مایوسی کی حد تک ناامید نہ کردے وہ خودکشی جیسے خطرناک فعل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے معنی خیز نظر سے پٹواری کو دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''سگی کی زندگی میں ایسا کون سا دکھ، ایسی کون سی پریشانی تھی جس کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی......؟''

''یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آرہی ملک صاحب۔'' وہ سخت الجھن کے عالم میں بولا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی اسے ہم پوسٹ مارٹم رپورٹ کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔''

وہ زبان سے کچھ نہیں بولا، پریشان نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کل کتنے بجے سعید نگر سے گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہوئے تھے؟''

''دوپہر کا کھانا کھا کر میں گھر سے نکلا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس وقت دو بجے تھے۔''

''جب آپ گھر سے رخصت ہوئے تو سگی صحیح سلامت تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ ''گوجرانوالہ آپ کس کے پاس گئے تھے؟''

''ملک امین کے پاس'' اس نے بتایا۔

''لگتا ہے، ملک امین کے ساتھ آپ کی خاصی گہری دوستی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے آپ نے پچھلی رات اور آج دن کا بیشتر حصہ اس کے ساتھ گزارا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ملک امین بہت ہی بھلے مانس اور گوجرانوالہ کی ایک معروف شخصیت ہے۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کئی مقابلے بھی لڑ چکا ہے۔''

''مقابلے لڑ چکا ہے......'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کس چیز کے مقابلے پٹواری صاحب......؟''

ملک امین کا نام میں نے پہلے بھی سن رکھا تھا لیکن فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آیا کہ میں کس حوالے سے اسے جانتا تھا اسی لیے پٹواری مشتاق سے سوال کی ضرورت بھی پیش آئی تھی۔ وہ بولا۔ اس کی آواز میں سرسراہٹ تھی۔

''ویٹ لفٹنگ کے مقابلے جناب......!''

مجھے فوراً یاد آگیا کہ ملک امین ایک مڈل ویٹ، ویٹ لفٹر تھا جو پاکستان کے علاوہ بیرون ملک جا کر بھی ویٹ لفٹنگ کے کئی مقابلوں میں حصہ لے چکا تھا اور ان مقابلوں کے حوالے سے اس کے پاس کئی اعزازات بھی تھے۔ وہ ایک معروف باڈی بلڈنگ اینڈ ویٹ لفٹنگ کلب کا روح رواں بھی تھا۔ مذکورہ کلب گوجرانوالہ کے شیراں والا باغ میں واقع تھا۔

''تو ملک امین کے ساتھ آپ کی گہری دوستی ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی...... جی ہاں......'' وہ بڑے فخر سے بولا۔

میں نے پٹواری مشتاق سے دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں پھر گفتگو کا رخ ایک خاص جانب موڑ دیا۔ اس رخ پر اس کے بڑے بھائی کرم دین کا انتقال، اس کی بھاوج خورشید کا پاگل پن اور بعد ازاں پُراسرار گمشدگی، اس کا اپنا مکان بیچ کر بھائی کے بڑے گھر میں ڈیرا ڈال دینا، کرم دین کی پچیس ایکڑ اراضی کو اپنے تصرف میں لے آنا اور سگی کی اچانک خودکشی ایسے تمام موضوعات شامل تھے۔

پٹواری نے نہایت ہی تحمل اور توجہ سے میری بات سنی اور میرے ہر سوال کا جواب ایسے پیرائے میں دیا جس سے اس کی انسان دوستی، اخلاص اور ہمدردی جھلکتی تھی۔ اس نے یہ تمام تر قربانیاں اپنی بھتیجی اور بھابی کی بھلائی اور بہتری کے لیے دی تھیں۔

میں نے اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر لوگوں کی اس کے بارے میں مخصوص رائے سے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ خاصی برہمی سے بولا۔

''ایسی باتیں میں نے بھی سنی ہیں لیکن یہ باتیں بنانے والے گیدڑوں کی طرح پیٹھ پیچھے زہر اگلتے ہیں۔ کوئی مرد کا بچہ سامنے آکر مجھ سے سوال نہیں کرتا۔ اب چھپ کر بولنے والوں کی زبان تو نہیں پکڑی جاسکتی نا......'' وہ لمحاتی توقف کے بعد خاصے جذباتی لہجے میں بولا۔

''میں اگر چاہتا تو کرم دین کی پچیس ایکڑ زرعی اراضی کو چپ چپاتے اپنے نام منتقل کرلیتا۔ ایک پٹواری کے لیے یہ بہت آسان کام تھا، یہی کام میں مکان کے سلسلے میں بھی کرسکتا تھا لیکن میں نے کسی لالچ یا سازش کے تحت خورشید اور سگی کی ذمے داری نہیں اٹھائی تھی۔ میرے دل میں ان کے لیے سچی ہمدردی تھی۔ آپ چاہیں تو مکان اور زمین کے کاغذات چیک کرسکتے ہیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں پٹواری جی۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''مجھے آپ کی بات پر پورا بھروسا ہے۔''

''لوگوں کو تو باتیں بنانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔'' وہ بہ دستور خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''کوئی اچھا کرے تو انہیں تکلیف، کوئی برا کرے تو انہیں پریشانی۔ کرم دین کی وفات کے بعد میں نے خورشید اور سگی کے لیے جو کچھ بھی کیا اس میں میری نیک نیتی اور خلوص شامل تھا۔ میرا اللہ، میری نیت اور دل کے حال کو جانتا ہے۔ مجھے لوگوں کی باتوں اور ان کے خیالات کی کبھی پروا تھی اور نہ ہی اب کوئی پروا ہے۔''

''میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں پٹواری جی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن سگی کی موت کے بعد صورت حال تبدیل ہوگئی ہے۔''

''کیا تبدیل ہوگئی ہے؟'' اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

''یہ پچیس ایکڑ زرعی اراضی اور وسیع وعریض شاندار مکان اب آپ کے رحم وکرم پر ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''رحم وکرم پر...... میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

''مطلب یہ کہ اب اس زمین جائداد کے مالک ومختار آپ ہی ہیں۔'' میں نے بہ دستور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور وہ بھی بلاشرکت غیرے......!''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' وہ اچھل پڑا۔

''قصور آپ کا ہے یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''لیکن باتیں بنانے والوں کے منہ ممکنہ حد تک کھل جائیں گے کہ بھئی...... اب تو پٹواری مشتاق کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوگا۔''

''ملک صاحب! میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے نا......'' وہ نہایت ہی مستحکم انداز میں بولا۔ ''مجھے کسی کے کچھ بھی کہنے کی ذرا پروا نہیں ہے۔ میں نے مر کر جس ذات کو منہ دکھانا ہے وہ سب جانتا ہے۔''

میں نے مزید چند سوالات کے بعد اس سے کہا۔ ''پٹواری جی! آپ جانتے ہیں کہ میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔ میرے تھانے کی حدود میں ایک جوان اور کنواری لڑکی نے خودکشی کی ہے لہٰذا یہ تحقیق اور تفتیش میرے فرائض کا حصہ ہے۔ مجھے امید ہے اس سلسلے میں آپ مجھ سے بھرپور تعاون کریں گے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں ملک صاحب۔'' وہ بڑے جوش سے بولا۔ ''آپ حکم کریں جناب......''

"فی الحال تو آپ گھر جا کر افرادِ خانہ میں سے کسی سے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بہ ظاہر خوش باش اور مطمئن دکھائی دینے والی نگی کے اندر ایسا کون سا کرب پنہاں تھا جس نے اسے خودکشی جیسے فعل پر مجبور کر دیا، اگر واقعی اس نے خودکشی کی ہے تو......!" میں نے بڑے معنی خیز انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور اگر...... میرے شک کے مطابق، اس نے خودکشی نہیں کی بلکہ اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے تو پھر یہ پتا لگانے کی ضرورت ہے کہ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"

"آپ کی ہدایت کے مطابق میں یہ جاننے کی کوشش ضرور کروں گا لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ آپ کے شک کی بنیاد کیا ہے......؟" اس نے بے حد اُلجھی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"پٹواری جی!" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "ایک آدھ دن صبر کر لیں، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دے گی۔"

"پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "کوئی اس کی جان کا دشمن کیوں کر ہو سکتا ہے......؟"

"حقیقت جو بھی ہے وہ بہت جلد کھل کر سامنے آجائے گی۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں نے آپ کے ذمے جو کام لگایا ہے، بس اس پر دھیان دیں اور نتیجہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"اچھا جی......" اس نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے میری بات اس کے حلق سے نہ اتری ہو۔

میں جانے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ بھی میری تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"پٹواری جی! آپ بالکل مطمئن ہو کر جائیں۔ اگر آپ کی بھتیجی نے واقعی خودکشی کی ہے تو میں اس کے اس سنگین اقدام کا سبب ضرور جان کر رہوں گا اور اگر اس کی موت کا معاملہ میرے شک کے مطابق ہے تو پھر آپ بہت جلد اس کے ذمے داروں کو میری گرفت میں دیکھیں گے۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے مزید کہا۔ "پٹواری جی! میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور جلد از جلد اس معمے کو حل کرنے کا متمنی بھی۔ اُمید ہے، اس سلسلے میں مجھے آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔"

"جی ہاں، ضرور......" اس نے پُروثوق انداز میں پھر پوچھا۔ "نگی کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟"

"کل شام تک یا...... زیادہ سے زیادہ پرسوں تک۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ اسی حساب سے اس کے کفن دفن کا بندوبست کرنا۔"

"جی...... بہت اچھا!" اس نے کہا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد تھانے سے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ فروری کا مہینا تھا۔ موسم سرما رخصت ہونے کو تھا تاہم ابھی بھی صبح و شام فضا میں اچھی خاصی خنکی موجود ہوتی تھی۔ پٹواری مشتاق لگ بھگ ساڑھے چھ بجے مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے کم و بیش پونا گھنٹا میرے ساتھ گزارا تھا۔ جب وہ رخصت ہوا تو رات پوری طرح اپنے پر پھیلا چکی تھی۔

میں رات کے کھانے اور نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر سونے کے لیے لیٹا تو اس وقت بھی نگی ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی موت میرے ذہن میں ابھی تک کسی معمے کے مانند تھی۔ وہ سیدھا سادا خودکشی کا کیس تو ہرگز نہیں تھا۔ ابھی تک میں نے بشمول پٹواری مشتاق لوگوں سے جو بھی پوچھ گچھ کی تھی اس میں کوئی بھی ایسی بات نکل کر سامنے نہیں آئی تھی جو میرے شک کو تقویت پہنچاتی لہٰذا مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا انتظار کرنا تھا۔

میں نے اسی حوالے سے پٹواری مشتاق کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ اس کے ساتھ میری جو بھی گفتگو ہوئی تھی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا نگی کی موت والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا تاہم میں اس کے بیان کو چیک کیے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ ملک امین گوجرانوالہ کا ایک مشہور و معروف ویٹ لفٹر تھا اور بین الاقوامی شہرت کا حامل بھی۔ وہ اس امر کی تصدیق کر سکتا تھا کہ پٹواری مشتاق گزشتہ روز کتنے بجے اس کے پاس پہنچا تھا اور آج کتنے بجے وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

میں اس رات صغریٰ عرف نگی کی حسرت ناک موت کی بھول بھلیوں میں چکراتے ہوئے نیند کی وادی تک جا پہنچا پھر اگلی صبح ہی میری آنکھ کھلی تھی۔

✦✦✦

بعض معاملات میں میری چھٹی حس بہت عمدہ کام دکھاتی ہے۔ میں اس کی غیر محسوس اور بے آواز پکار کو نظر انداز نہیں کیا کرتا۔ نگی کی خودکشی نما موت کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ گیارہ فروری کی صبح تھی جب میں صابر علی اور ایوب کی اطلاع پر پٹواری مشتاق کے گھر پہنچا تھا جہاں ایک کمرے میں نگی چھت سے لٹکی ہوئی پائی گئی تھی۔ بہ ظاہر یہ سیدھا سادا سا خودکشی کا کیس تھا لیکن میرا ذہن شروع ہی میں کھٹک گیا تھا۔ بعد ازاں کانسٹیبل امانت علی کے تائیدی بیان نے اس کھٹک پر روشنی بھی ڈالی تھی اور اب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے تمام تر خدشات کی تصدیق فرما رہی تھی۔

نگی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش ابتدائی رپورٹ کے ساتھ تیرہ فروری کی صبح اسپتال سے واپس آئی تھی اور یہ رپورٹ بڑی تہلکہ خیز تھی جس نے میرے تمام تر خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق نگی کی موت دس اور گیارہ فروری کی درمیانی شب نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس کی موت کا سبب پھانسی نہیں تھی۔

جی ہاں...... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہوا تھا کہ اس کی موت زہر خورانی کے باعث واقع ہوئی تھی۔ اس کے معدے کے کیمیکل ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہوئی تھی کہ اسے کوئی زود اثر زہر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔

یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز تھا اور میرے کھٹکے کی مکمل تصدیق کرتا تھا۔ اس نے خود زہر کھایا تھا یا اسے زہر دیا گیا تھا، ہر دو صورت میں اس کی موت کا سبب زہر خورانی ہی تھا اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر جان نہیں دی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اس بات کی وضاحت موجود تھی کہ جب نگی کو پھانسی دی گئی تو وہ زندگی کی قید سے مکمل طور پر آزادی حاصل کر چکی تھی یعنی پھانسی والے معاملے سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔

اس انکشاف سے یہ ایک بات بھی ثابت ہوتی تھی کہ نگی خود اپنی موت کی ذمے دار نہیں تھی۔ یہ کام کسی اور کا تھا مگر کس کا......؟ مجھے یہی پتا چلانا تھا، کسی نے اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا اور پھر پھانسی پر ٹانگ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔

اسی رپورٹ میں، سب سے زیادہ سنسنی خیز جو بات درج تھی وہ انکشاف انگیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ میری تمام تر معلومات کے مطابق، نگی غیر شادی شدہ تھی لیکن رپورٹ چیخ چیخ کر اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ تین ماہ کی امید سے تھی۔ اس انکشاف نے میرے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور میں بہ یک وقت کئی زاویوں پر سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میری سوچ میں مختلف سوالات سر اٹھا رہے تھے۔

اگر نگی شادی شدہ نہیں تھی تو پھر اس کے پیٹ میں کس کے گناہ کا پھل پل رہا تھا؟ کیا نگی نے اس پھل کے ساتھ ہی خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا؟ کیا اس گناہ کے ذمے دار نے کسی بہانے نگی کو زہر دے دیا تھا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری؟

ایک بات تو طے تھی کہ اگر نگی نے خود کو موت کے حوالے کیا ہوتا تو پھر پھانسی پر جا لٹکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ تمام تر حالات و واقعات کی روشنی میں فی الحال یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ نگی اپنی موت کی خود ذمے دار نہیں تھی بلکہ یہ کسی اور کا کارنامہ تھا اور اسی شخص نے نگی کو پھانسی پر لٹکا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ بہرحال پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے کے بعد بہت سی باتیں واضح ہو گئی تھیں لہٰذا میں بڑی سہولت سے تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھا سکتا تھا۔

میں نے پٹواری مشتاق کو تھانے بلا لیا۔ وہ یہی سوچ کر میرے پاس آیا تھا کہ میں نگی کی لاش اس کے حوالے کرنے والا ہوں۔ ظاہر ہے، مجھے نگی کی لاش تو اس کے سپرد کرنا ہی تھی لیکن اس سے پہلے ایک انتہائی سنجیدہ میٹنگ بھی ضروری تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ نڈھال سا اندر آیا اور میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "ملک صاحب! کیا میں نگی کی لاش کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟"

"بالکل لے جا سکتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے میں آپ سے چند اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے گمبھیر انداز کو دیکھتے ہوئے وہ چونکا پھر تشویش بھرے انداز میں پوچھنے لگا۔

"تھانے دار صاحب! خیریت تو ہے نا......؟"

"خیریت نہیں ہے پٹواری جی......!"

"کیا نگی کی خودکشی کا سبب سامنے آگیا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔

"خودکشی نہیں، قتل پٹواری جی......!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"قت...... قتل......" وہ ہکلا کر رہ گیا۔ "یہ آپ کیا...... کہہ رہے ہیں؟"

"میں حقیقت بیان کر رہا ہوں پٹواری جی۔" میں

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بیان کرتی ہے کہ سگی کو ایک خطرناک زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور بعدازاں اس کی لاش کو چھت سے لٹکا کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔''

''یہ...... یہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ایک ایسا انکشاف بھی درج ہے جسے سن کر آپ کے دماغ کے پرخچے اڑ جائیں گے۔''

''کک...... کیسا انکشاف......؟'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے آئندہ پانچ منٹ میں، نہایت ہی نپے تلے اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اسے حالات کی سنگین صورت سے آگاہ کردیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مریل سی آواز میں بولا۔

''یہ...... یہ کیسے...... ہوگیا...... ؟''

''یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہیے پٹواری جی؟''

''آپ مجھ سے...... بڑی سے بڑی قسم لے لیں ملک صاحب......'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''آپ کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا پٹواری جی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے حقیقت کھول دی ہے جسے جھٹلایا یا بدلا نہیں جاسکتا۔''

''اگر...... یہ بات گاؤں والوں کو پتا چل گئی تو...... میری عزت خاک میں مل جائے گی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''کاش! زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دفن ہوجاؤں۔''

''آپ کے زمین میں دفن ہونے سے بات نہیں بنے گی پٹواری جی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سگی کی موت کو ایک قتل قرار دے رہی ہے تو مجھے اپنی تفتیش کے ذریعے سگی کے قاتل تک پہنچنا ہوگا۔''

''اور اس تفتیش میں......!'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر وحشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''پٹواری جی! آپ ایک عزت دار آدمی ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ اپنی تفتیش کے دوران میں آپ کی عزت کی ممکنہ حد تک حفاظت کروں۔''

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا تھانے دار صاحب۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''اس میں احسان والی کوئی بات نہیں پٹواری جی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سخت گیر تھانے دار کے ساتھ ایک ہمدرد دل رکھنے والا انسان بھی ہوں۔ میں اس کیس میں آپ کی نازک پوزیشن اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔''

''یہ آپ کا بڑا پن ہے جناب۔'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔ ''آپ بہت عظیم انسان ہیں۔''

میں نے اس کے خیالات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کہا۔

''مجھے امید ہے، آپ اس کیس کو حل کرنے کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کریں گے۔ میں آپ کے تعاون کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

''آپ حکم کریں، میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''کیا آپ سگی کے اپنے کسی معاملے سے واقعی واقف نہیں ہیں، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ جس جانب اشارہ کررہی ہے......؟''

''آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں اگر مجھے ذرا بھی سن گن ہو۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اگر ایسی کوئی بات میرے علم میں ہوتی تو میں اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے نمٹا لیتا۔ سگی کی جان نہ جاتی۔''

''اب یہ بات کسی شک وشبے کی محتاج نہیں رہی کہ سگی کی لاش کو پھانسی پر لٹکا کر خودکشی کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔'' میں نے مشتاق پٹواری کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''مردہ سگی اپنی مرضی اور کوشش سے تو پھانسی نہیں لگا سکتی نا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی طے ہے کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جس کسی شخص نے بھی سگی کی لاش کو پھانسی دی ہے اس کا تعلق آپ کے گھر کے ساتھ بہت ہی گہرا ہے۔''

''یہ...... یہ نہیں ہوسکتا...... ملک صاحب......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''یا پھر......'' میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''یا پھر اسے آپ کے گھر کے اندر سے کسی کی پوری حمایت حاصل رہی ہے ورنہ......'' میں چند سیکنڈ کے لیے رکا پھر اپنی

بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ورنہ یہ کام ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ آپ کی بیوی زلیخا کے بیان کے مطابق وقوعہ کی رات گھر کے تمام افراد نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا تھا پھر تھوڑی دیر تک ان میں مختلف نوعیت کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے تھے پھر جب صبح سگی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئی تو زلیخا کو اس خلاف معمول بات پر شدید حیرت ہوئی۔ اس نے سگی کے کمرے میں جاکر صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو یہ انکشاف ہوا کہ اس نے چھت سے لٹک کر خودکشی کرلی ہے۔ زلیخا نے میرے سوالات کے جواب میں یہ بھی بتایا تھا......'' میں سانس درست کرنے کے لیے تھما، ٹٹولنے والی نظر سے مشتاق پٹواری کو دیکھا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''زلیخا نے بڑے یقین کے ساتھ مجھے بتایا تھا کہ رات کو اس نے گھر کے بیرونی دروازے کو بند کرکے اندر سے کنڈی لگائی تھی اور صبح جب وہ بیدار ہوئی تو کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ جس بھی شخص نے سگی کی لاش کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا تھا اسے گھر کے کسی فرد کی مکمل حمایت اور مدد حاصل رہی ہے اور وہ شخص یہ بھی جانتا تھا کہ سگی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا جاچکا ہے۔ اب آپ فرمائیں، کیا کہتے ہیں...... بیچ اس مسئلے کے......؟''

''میں آپ کی بیان کردہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا جناب......'' وہ شکستہ انداز میں بولا۔ ''لیکن یہ باتیں میرے ذہن میں جگہ بھی نہیں بنا پارہیں۔ میں اپنے گھر کے سبھی افراد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے بچے اور بیوی سگی سے بہت محبت کرتے تھے، اس کا ہر لحاظ سے بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سگی سے ایسی بھیانک دشمنی نہیں کرسکتا۔ میں تو......''

''ایوب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''ایوب...... میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

ایوب، پٹواری مشتاق کا بڑا بیٹا تھا جس کی عمر پندرہ سال کے قریب تھی لیکن اپنی صحت اور قد کاٹھ کے حوالے سے وہ اٹھارہ سال کا لگتا تھا۔ یہی نوجوان دو روز پہلے صابر علی کے ساتھ اس اندوہناک واقعے کی اطلاع دینے میرے پاس تھانے آیا تھا۔ ایوب کے ذکر پر پٹواری بری طرح چونکا تو میں نے کہا۔

''کیا ایوب، سگی کے ساتھ ملوث نہیں ہوسکتا؟''

میں نے یہ سوال ایک خاص زاویے سے کیا تھا۔ پٹواری فوراً میری بات کی تہ میں پہنچ گیا اور بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب......!''

''آپ کے اس وثوق کا کوئی خاص سبب؟''

''ایوب، سگی سے آٹھ نو سال چھوٹا ہے جناب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو سگی کو نغمہ کی طرح اپنی بڑی بہن سمجھتا تھا۔''

''نغمہ، ایوب کی سگی بہن ہے مگر سگی اس کی تایا زاد تھی۔'' میں نے رشتوں کے ایک انتہائی نازک پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ لاکھ سگی کو اپنی بہن سمجھتا رہے لیکن وہ اس کے لیے نامحرم ہی تھی یعنی ان دونوں کے بیچ ایسا کوئی معاملہ ممکن ہے جس کی نشاندہی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں کی گئی ہے......'' میں نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جوانی آگ اور پیٹرول کا کھیل ہے۔ اسے بارود اور ماچس سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ دو نامحرم جوان لڑکی اور لڑکے کے درمیان کوئی بھی گل کھل سکتا ہے۔ آپ تو ماشااللہ جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ میری باتوں کی تردید نہیں کریں گے۔''

''میں واقعی آپ کی باتوں کی تردید نہیں کروں گا کیونکہ آپ نے انسانی فطرت اور جوانی کی حقیقت کی بات کی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن مجھے اپنی اولاد پر بھی مکمل بھروسا ہے۔ میں اس انداز سے کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''مگر اب سوچنے کی ضرورت ہے پٹواری جی۔'' میں نے اصراری انداز میں کہا۔ ''حقیقت حال آپ کے سامنے ہے۔ میں تحقیق اور تفتیش کی گاڑی کو کسی بھی قیمت پر روک نہیں سکتا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں جو بھی چھوٹے بڑے انکشافات ہوئے ہیں وہ اب اس واقعے کے ریکارڈ کا حصہ بن چکے ہیں۔ مجھے اپنے اعلیٰ افسران کو بھی جواب دینا ہے۔ مجھے اُمید ہے، صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آپ مجھ سے حتی المقدور تعاون کریں گے۔''

''آپ نے میری عزت کا پردہ رکھنے کا وعدہ کیا ہے ملک صاحب۔'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں آپ سے ہر ممکن تعاون کروں گا۔ میں غیر محسوس انداز میں زلیخا کو

ٹٹولنے کی کوشش کرتا ہوں......"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں پٹواری جی۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ ایوب ہی نگی کے ساتھ ملوث رہا ہو۔ وہ کوئی باہر کا آدمی بھی ہوسکتا ہے۔ ایک بار مجھے اس شخص کا سراغ مل جائے، باقی کے معاملات میں خود ہی حل کرلوں گا۔"

"جی، میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے کام آسکوں۔" وہ خلوصِ نیت سے بولا۔

میں نے کہا۔ "پٹواری جی! آپ نگی کی لاش کو لے جائیں اور اس کی تدفین کا بندوبست کریں اور جیسے ہی کوئی خاص بات پتا چلے، آپ فوراً میرے پاس آئیں گے۔"

اس نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔ میں نے ضروری کارروائی کے بعد نگی کی لاش اس کے حوالے کردی۔

✈✈✈

میں نے پٹواری مشتاق کے ساتھ خاصا نرمی کا برتاؤ کیا تھا اور اسے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ مجھے سچا اور کھرا آدمی نظر آیا تھا۔ میں نے اپنے عملے کا ایک آدمی گوجرانوالہ روانہ کرکے پٹواری کے بیان کی تصدیق بھی کرالی تھی کہ وہ ملک امین کے پاس کتنا وقت گزار کر آیا تھا۔ پٹواری کی ذات شک وشبے سے بالاتر ثابت ہوئی تھی۔ یہ سب تو ٹھیک تھا لیکن خرابی والی بات یہ تھی کہ میں ابھی تک نگی کی پُراسرار موت کا معما حل نہیں کرپایا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر پٹواری کے گھر جاکر زلیخا، ایوب اور نغمہ سے خاصی تفصیلی بات چیت کی تھی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا تھا۔

یہ نگی کی تدفین کے دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ میں تھانے میں بیٹھا اسی گمبھیر مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ مجھے صابر علی کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ صابر علی وہ دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا جو نگی کی خودکشی کی خبر لے کر ایوب کے ہمراہ میرے پاس آیا تھا۔ وہ پٹواری مشتاق کا پڑوسی بھی تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ دھوپ رخصت ہوچکی تھی۔ اب تب میں اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد صابر علی میرے سامنے موجود تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بھرے بھرے جسم کی مالک ایک سانولی سلونی عورت بھی تھی۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر سوالیہ نظر سے صابر علی کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "یہ میری گھر والی رضیہ ہے جی۔" اس نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "ہم دونوں گاؤں والوں کی نظر بچا کر آپ کے پاس آئے ہیں جناب......"

رضیہ کا نام سنتے ہی مجھے فوراً یاد آگیا کہ میں نے صابر علی کو ایک اہم کام سونپا تھا وہ کام اس نے اپنی بیوی رضیہ کی مدد سے کرنا تھا۔ پچھلے دو دن ایسی افراتفری میں گزرے تھے کہ رضیہ کی طرف میرا دھیان ہی نہیں جاسکا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ مجھ سے ملنے آئے تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔

"تم لوگ گاؤں والوں کی نظر بچا کر میرے پاس آئے ہو تو اس کا یہی مطلب ہے کہ تمہارے پاس کوئی اہم اطلاع ہے؟" میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ایسی ہی بات ہے تھانے دار صاحب۔" صابر علی خاصے جوش سے بولا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا نا، رضیہ کھوج کھرا لگانے والے کاموں کی بڑی ماہر ہے۔"

"ہاں بتایا تھا......" میں نے گہری نظر سے رضیہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ہاں بھئی رضیہ! تم نے کیا کھوج کھرا نکالا ہے......؟"

رضیہ دیکھنے میں ایک عام سی دیہاتن نظر آتی تھی تاہم اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ یہ چمک ان لوگوں کے چہرے اور آنکھوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جن کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کرتا ہو۔ وہ عام دیہاتی عورت ہونے کے ساتھ خاصی پُرکشش بھی تھی۔ میں سوال کرکے خاموش نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

جواب دینے سے پہلے اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ صابر علی جلدی سے بولا۔ "رضیہ نے نگی کے چکر کا پتا چلالیا ہے جناب......"

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "کیسا چکر......؟"

میں نے چونکہ یہ سوال براہ راست رضیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کیا تھا لہٰذا جواب بھی اسی نے دیا۔

"تھانے دار صاحب! میں نے بڑی بوڑھیوں سے سن رکھا ہے کہ مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہیے پر جو سچ ہے وہ سچ ہے اور پھر...... یہ آپ ہی کا حکم تھا کہ دیوار کے اس پار کے حالات کا اندازہ لگاتا ہے......" لمحے بھر کو رک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ قانون کی مدد کے خیال سے کیا ہے جی۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو رضیہ۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "نگی کی موت جن حالات میں ہوئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس کے بارے میں مکمل تفتیش کی جائے۔ اس قانونی تقاضے کو نبھانے میں کوئی برائی یا گناہ نہیں ہے۔"

وہ میری وضاحت کے بعد خاصی مطمئن دکھائی دینے لگی۔ صابر علی بھی میری بات کی تائید میں سر کو اثباتی جنبش دینے لگا۔ میں دوبارہ رضیہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"اب جلدی سے نگی کے چکر کے بارے میں مجھے بتادو؟"

"مجھے پتا چلا ہے جناب......" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ "پچھلے سات، آٹھ ماہ سے نگی اور بشارت جٹ میں چکر چل رہا تھا۔"

"بشارت جٹ......!" میں تقریباً اچھل پڑا۔ "یہ کون ہے؟"

نگی کے کسی مرد کے ساتھ چکر کا سن کر میرا دھیان آپوں آپ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی جانب چلا گیا تھا اور اس کیس کی کڑیاں ایک ایک کرکے منسلک ہوتی دکھائی دینے لگی تھیں۔ میں نے بشارت جٹ کے بارے میں جتنی شدت سے سوال کیا تھا اس نے ان دونوں میاں بیوی کو چونکنے پر مجبور کردیا تھا۔

صابر علی نے بتایا۔ "بشارت جٹ، شوکت جٹ کا بڑا بیٹا ہے جناب۔"

"کیا یہ لوگ بھی موضع سعید نگر ہی میں رہتے ہیں؟"

"بالکل جناب!" صابر علی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "شوکت جٹ یہاں کا ایک چھوٹا زمیندار ہے اور اس کا گھر ہمارے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر ہے۔"

"تم سے دو گلیوں کے فاصلے کا مطلب ہے، نگی کے گھر سے بھی دو گلیوں کا فاصلہ۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ظاہر ہے جی...... ہم اور پٹواری جی پڑوسی ہی تو ہیں۔"

"بشارت جٹ کی عمر کیا ہوگی؟" میں نے سوال کیا۔

"یہی کوئی چھبیس ستائیس سال۔" صابر علی نے جواب دیا۔

"کیا بشارت جٹ شادی شدہ ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

صابر نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔"

"رضیہ تم نے بتایا ہے کہ پچھلے سات آٹھ ماہ سے نگی اور بشارت جٹ میں کوئی چکر چل رہا تھا۔" میں نے صابر علی کی بیوی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اس چکر کی کچھ وضاحت کروگی؟"

"وضاحت کیا کروں جی۔ آپ خود سیانے ہیں۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ "وہی چکر تھا...... عاشق معشوق والا۔"

"تمہارا مطلب ہے، وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملاقاتیں کرتے تھے......؟"

میں نے ابھی تک ان میاں بیوی کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے نازک ترین حصے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی ایسا کوئی ارادہ رکھتا تھا کیونکہ میں پٹواری مشتاق سے اس کی عزت رکھنے کا وعدہ کرچکا تھا اور میری حتیٰ

الامکان کوشش یہی تھی کہ اپنے وعدے کو نبھاؤں۔ کوئی تفتیشی رکاوٹ آڑے آجاتی تو دوسری بات تھی۔

''جی ہاں...... بالکل......'' رضیہ نے تصدیقی انداز میں گردن ہلائی۔ ''میرا یہی مطلب ہے تھانے دار جی......''

''کیا ان کے عشق کا معاملہ گاؤں والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... یہ کام وہ بڑا چھپ چھپا کر کر رہے تھے۔'' رضیہ نے بتایا۔

''پھر تم نے کیسے ان کے کارنامے کا سراغ لگالیا رضیہ؟''

ویسے ان کے ''چھپ چھپا'' کر کرنے والے معاملے سے میں بھی متفق تھا کیونکہ اگر یہ قصہ طشت ازبام ہوتا تو تھوڑی بہت سن گن مشتاق پٹواری کو بھی ہو ہی جاتی۔ میرے سوال کے جواب میں رضیہ نے بتایا۔

''تھوڑی مشکل تو پیش آئی ہے تھانے دار جی لیکن میں نے جیسے تیسے آپ کے حکم کے مطابق کام کر دیا ہے......''

''اس چکر کا اور کس کو پتا ہے رضیہ؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی جی۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''اگر تمہیں اس چکر کو ثابت کرنے کو کہوں تو پھر تم کیا کرو گی؟''

''میں گواہی کے لیے شاہدہ کو آپ کے پاس پیش کر دوں گی۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''یہ شاہدہ کون ہے؟'' میں نے قدرے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''یہ نگی کی بہت قریبی دوست ہے۔'' رضیہ نے بتایا۔ ''میں نے بڑی مشکل سے اس سے اس چکر کے بارے میں اگلوایا ہے۔ اگر نگی زندہ ہوتی تو شاید شاہدہ زبان نہ کھولتی۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں اس چکر کے بارے میں اور کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

''رضیہ! یہ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔ تم گھر جا کر آرام کرو......''

صابر علی نے پوچھا۔ ''رضیہ کو دوبارہ تھانے آنے کی ضرورت تو نہیں؟''

''بالکل نہیں......!'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''میں شاہدہ اور بشارت جٹ سے خود ہی نمٹ لوں گا۔''

''کہیں میرا نام تو نہیں آئے گا جناب......؟'' رضیہ نے حفظ ماتقدم کے طور پر پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''تم بے فکر ہو جاؤ۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا اپنے مخصوص انداز میں کروں گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ میں نے تمہاری فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں آگے بڑھ کر بشارت جٹ کی گردن پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

''گردن پر ہاتھ ڈالا ہے۔'' کے الفاظ نے ان میاں بیوی کو بری طرح چونکا دیا۔ صابر علی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''خیریت تو ہے نا ملک صاحب......؟''

''خیریت ہوتی تو نگی اپنی جان سے کیوں جاتی۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نگی کی موت میں بشارت جٹ کا ہاتھ ہے؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔'' میں نے ایک بار پھر مبہم انداز میں کہا۔

ان کے چہروں پر موجودہ الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ کبھی مجھے اور کبھی ایک دوسرے کو تعجب خیز انداز میں تکنے لگے۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

''تم لوگ اپنے ذہنوں کو نہ تھکاؤ اور گھر جا کر آرام کرو۔ میری تفتیش کا جو بھی نتیجہ برآمد ہوگا وہ آپ لوگوں کے سامنے آجائے گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔

⊹⊹⊹

شاہدہ اور بشارت کو میں نے یکے بعد دیگرے تھانے بلوالیا تھا۔

ان کی آمد میں، میں نے دانستہ آدھے گھنٹے کا فرق رکھا تھا اور یہ کارروائی صابر علی و رضیہ کے جانے کے فوراً بعد عمل میں آگئی تھی۔ میں متعلقہ لوگوں کو ایک رات کی مہلت دینے کو تیار نہیں تھا۔ بشارت جٹ کو گاؤں سے باہر کھیتوں میں سے پکڑا گیا تھا اس لیے وہ اکیلا ہی تھا جبکہ شاہدہ کو اس کے گھر سے نکال کر تھانے لایا گیا تھا چنانچہ اس کی ماں رحمت بی بی بھی ساتھ آگئی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ بشارت جٹ کو اس بات کی قطعاً کوئی خبر نہیں تھی کہ گھر کی بھیدن شاہدہ بھی اس وقت تھانے میں موجود ہے۔ بشارت حوالات میں تھا اور شاہدہ اپنی ماں کے ساتھ اس وقت میرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ میں نے رحمت بی بی کو بتا دیا کہ معمول کی پوچھ گچھ کے بعد میں انہیں گھر جانے کی اجازت دے دوں گا۔ میں دراصل شاہدہ سے رضیہ کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا تا کہ بشارت جٹ پر مضبوطی کے ساتھ ہاتھ ڈالا جا سکے۔ میں نے واقعتاً شاہدہ اور اس کی ماں کو دس پندرہ منٹ میں فارغ کر دیا۔ میں نے بڑے طریقے سلیقے سے شاہدہ کی زبان سے وہ راز اگلوا لیا جو تھوڑی دیر پہلے رضیہ کی زبانی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے جب انہیں زبان بند رکھنے کی تاکید کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تو انہیں یقین نہیں آیا۔ رحمت بی بی نے غیر اعتباری انداز میں مجھے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہم جائیں جی......؟''

''ہاں، ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''تو کیا آج رات تھانے میں گزارنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں جی...... بالکل نہیں!'' رحمت بی بی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''خدا کسی دشمن کو بھی تھانے میں رات گزارنے کا موقع نہ دے۔''

''تمہارا مطلب ہے، ہم کسی دشمن سے بھی زیادہ برے لوگ ہیں۔'' میں نے تفریحاً پوچھ لیا۔ ''جو دن رات یہاں تھانے میں پڑے رہتے ہیں۔''

''نہیں جی، یہ بات نہیں۔'' وہ تصحیح کرنے والے انداز میں بولی۔ ''آپ تو اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہیں۔''

''تم دونوں بھی اپنی ڈیوٹی نبھانے کی کوشش کرنا۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''یاد ہے نا، میں نے تمہیں کیا ہدایات دی ہیں؟''

''جی یاد ہے، یاد ہے......'' انہوں نے بہ یک زبان کہا۔ پھر بڑی سرعت کے ساتھ وہ میرے کمرے سے رخصت ہو گئیں۔

ان کی اضطراری عجلت کو دیکھتے ہوئے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ان کے ذہنوں میں یہ خوف جاگزیں ہے کہ اگر وہ مزید ایک لمحہ بھی تھانے میں رک گئیں تو میں انہیں پکڑ کر حوالات میں بند کر دوں گا۔

ان کے جانے کے پانچ منٹ بعد میں نے بشارت جٹ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ خاصا پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہ میرے عملے کے کئی افراد سے یہ سوال کر چکا تھا کہ اسے کس جرم میں پکڑ کر تھانے لایا گیا ہے۔

وہ میرے سامنے پہنچایا گیا تو میں نے کڑی نظر سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ''جانتے ہو بشارت...... میں نے تمہیں کیوں یہاں بلوایا ہے؟''

''تھانے دار صاحب! یہ بات تو میں نے کئی لوگوں سے پوچھی ہے۔'' وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ''لیکن کوئی مجھے کچھ بتاتا ہی نہیں ہے......''

''اس لیے کوئی کچھ نہیں بتاتا کہ یہ تمہارا نہیں، میرے پوچھنے کا سوال ہے۔'' میں نے سخت انداز میں کہا۔ ''بتاؤ، تم میں ایسی کون سی خوبی چھپی ہے جسے دیکھنے کے لیے میں نے تمہیں بڑے چاؤ سے اپنے پاس بلایا ہے......؟''

''جی...... آپ کی باتیں تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہیں۔'' وہ چوکنا نظر سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں بہت پریشان ہو گیا ہوں جی۔''

''میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھنا چٹکی بجانے میں تمہاری ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔''

وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

آیندہ پانچ منٹ میں، میں نے اسے اس کے کرتوتوں سے آگاہ کر دیا۔ وہ کسی بھی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے میرے بعض سوالوں کے جوابات ایسے بودے دیے تھے کہ اس کے نگی کی موت میں ملوث ہونے کا مجھے یقین ہو گیا لہٰذا میں نے اس کی تن فن اور اکڑفوں کو زائل کرنے کے لیے اسے حوالدار برکت علی کے حوالے کر دیا۔ حوالدار برکت مجرموں کی زبان کھلوانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔

⊹⊹⊹

اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو برکت علی نے بشارت جٹ کو بالکل سیدھا کر دیا تھا۔ رات بھر کی مہمان داری نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ مجھے پتا چلا کہ رات کو شوکت جٹ نے دو تین مرتبہ تھانے کا چکر لگایا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن تھانے کے عملے نے اسے حوالات تک جانے کا موقع فراہم نہیں کیا تھا اور یہ سب میری ہدایت کا نتیجہ تھا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا تو حوالدار برکت علی نے بشارت جٹ کو میرے سامنے پیش کر دیا اور بڑے فخر سے بتایا۔

''ملک صاحب! بندہ سچ بولنے پر پوری طرح آمادہ ہے جی۔ آپ چاہیں تو اس کا بیان قلمبند کر لیں۔''

''ہوں......'' میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا پھر بشارت جٹ کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔ ''کیوں بھئی سورما...... برکت علی ٹھیک کہہ رہا ہے......؟''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ رحم طلب نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ رات حوالدار نے اس کی کچھ زیادہ ہی مہمان داری کر دی تھی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ پھوٹ کا شکار نظر آتا تھا۔ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور بشارت جٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی...... شروع ہو جاؤ۔''

اور وہ میرا اشارہ پاتے ہی شروع ہو گیا۔

اس روز میں نے بشارت جٹ کا جو بیان قلم بند کیا وہ درحقیقت اس کا اقبالِ جرم تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے بڑے تمام جرائم کا اقرار کر لیا تھا۔ واقعات کے مطابق اس نے ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت نگی کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھا۔ انہی چوری چھپے کی ملاقاتوں میں ایک نازک لمحے کے دوران میں، وہ دونوں تمام اخلاقی حدود کو پھلانگتے چلے گئے جس کا نتیجہ وہی نکلا جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں درج تھا۔

اپنے اقبالی بیان میں بشارت جٹ نے جو سب سے زیادہ سنسنی خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ یہ سب کچھ اس نے نگی کی چاچی زلیخا کے اشارے پر کیا تھا۔ زلیخا نگی سے بہت زیادہ حسد کرتی تھی۔ نغمہ کے لیے جو بھی رشتہ آتا، وہ لوگ نگی کو پسند کر کے چلے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ زلیخا کی نگی کے لیے نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے ایک تیر سے کئی شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بشارت جٹ کے ساتھ نگی کو ملوث کر کے مشتاق پٹواری کی نظر میں اسے گرانا چاہتی تھی کہ وہ ایک آوارہ اور بدمعاش لڑکی ہے اور اس کی صحبت کا اثر نغمہ پر بھی پڑ سکتا ہے۔

مشتاق پٹواری اپنی بھائی اور بھتیجی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جب خورشید بی بی کہیں گم ہو گئی تو پٹواری کی ساری توجہ نگی کی جانب مبذول ہو گئی تھی اور اس بات سے زلیخا کو بڑی اذیت پہنچتی تھی، وہ حسد اور حرص کی آگ میں جلنے لگی تھی۔

زلیخا کی خواہش تھی کہ نگی کسی طرح مشتاق پٹواری کی نظر میں بری ثابت ہو جائے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بشارت جٹ کی مدد سے ایک ڈراما رچا لیکن جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ بشارت جٹ نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

دوسری جانب بشارت بھی بڑی مشکل میں آ گیا تھا۔ ان کے مشترکہ کارنامے کے نتائج کی روشنی میں نگی نے بشارت جٹ سے شادی کے لیے ضد شروع کر دی۔ یہ زلیخا کے پروگرام کا حصہ نہیں تھا۔ جب زلیخا اور بشارت جٹ نے ایک دوسرے کو اپنی بپتا سنائی تو زلیخا کے شیطانی ذہن نے فوراً اس مسئلے کا حل نکال لیا۔

اس نے بشارت جٹ کے ذریعے نگی تک سفوف کی ایک پڑیا پہنچوائی جو درحقیقت ایک زوداثر زہر تھا۔ بشارت نے مذکورہ پڑیا نگی کو دیتے ہوئے کہا کہ اگر وہ رات کو سوتے وقت یہ دوا کھا لے گی تو اسے اس مصیبت سے نجات مل جائے گی جس کی وجہ سے وہ بشارت جٹ کو شادی کے لیے مجبور کر رہی ہے۔

نگی کے پاس اور کوئی محفوظ راستہ نہیں تھا لہٰذا مجبوراً اسے بشارت جٹ کی بات ماننا پڑی جو کہ اصل میں زلیخا کی بات تھی۔ بہرحال، حسبِ پروگرام وقوعہ کی رات نگی نے سفوف کی وہ پڑیا اپنے معدے میں پہنچا دی اور موت کی ابدی نیند سو گئی۔

زلیخا نے اپنے منصوبے کو فائنل ٹچ دینے کے لیے بشارت جٹ کی مدد سے نگی کی لاش کو پھانسی پر لٹکا دیا تاکہ یہ تاثر دیا جا سکے کہ نگی نے خودکشی کی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ نکتہ موجود تھا کہ اگر پولیس کو کسی طرح نگی کے پیٹ میں پوشیدہ راز کی خبر ہو بھی گئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ نگی نے اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے خودکشی کی ہے چنانچہ زلیخا کی راہ کا ہر کانٹا صاف ہو جاتا۔

زلیخا کی یہ بدقسمتی کہ میں نگی کی لاش کو دیکھتے ہی چونک گیا تھا اور ایک مخصوص سوچ کے ساتھ جب میں نے اپنی تفتیش کو آگے بڑھایا تو کامیابی نے میرے قدم چوم لیے تھے۔

میں نے بشارت جٹ اور زلیخا بی بی کے خلاف بڑا سخت قسم کا چالان تیار کر کے انہیں عدالت کے حوالے کر دیا۔ ان کے ذہنوں اور دلوں میں موجود ہوس نے جو فتنہ جگایا تھا اس نے مشتاق پٹواری کے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔

برائی کا انجام بالآخر ہلاکت اور تباہ کاری ہی ہے۔

(تحریر: حُسام بٹ)

خیرخواہ

طاہر جاوید مغل

دشمنِ ایمان سے خیر کی توقع رکھنا عبث سہی مگر... کیا خبر تھی کہ پل پل چولا بدلنے والے اگلے لمحے کس روپ میں ملنے والے تھے... بس یہی سوچ کر اس نے خود کو ایک مضبوط خول میں بند کر لیا لیکن کیا کیجیے کہ بصارت کا دھوکا بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔



دھڑکنوں کے ساز پر رقصِ اجل کرنے والے دیوانے کا خواب

وہ اگست کی ایک خنک شب تھی۔ ملکۂ کوہسار مری پر شام ہی سے تابڑتوڑ بارش ہو رہی تھی۔ کشمیر پوائنٹ سے ذرا آگے نکلیں تو ایک سڑک دائرے کی شکل میں گھوم کر پھر سے کشمیر پوائنٹ پر آ جاتی ہے۔ اسی سڑک کے کنارے اپنے چھوٹے سے بنگلا نما گھر میں فہد تنہا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا ایک قبول صورت نوجوان تھا۔ ایم سی ایس کے بعد اسے حال ہی میں ایک اچھی جاب ملی تھی۔ جاب شروع ہونے سے پہلے دس پندرہ دن فراغت کے تھے۔ اس لیے وہ مری چلا آیا تھا۔ اس کی فیملی کو تین چار روز بعد آنا تھا۔

رومانی موسم کے اثرات فہد پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ ٹین کی مخروطی چھتوں پر موسلا دھار بارش...... کھڑکیوں میں بجلی کی چمک...... اور کہیں قریب کے گھر سے ابھرتی ہوئی موسیقی کی مدھر آواز۔ سارہ کی کمی فہد کو بڑی شدت سے محسوس ہوئی کاش......! وہ اس وقت اس کے

ساتھ ہوتی۔ دونوں ایک ہی نرم کمبل اپنے شانوں پر اوڑھتے اور اس حسین رات کی خنکی سے محظوظ ہوتے۔ لیکن وہ مجسم دلکشی دور تھی اور ابھی نجانے کتنے عرصے تک اسے دور ہی رہنا تھا۔ وہ اسی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی جہاں سے فہد نے ایم سی ایس کیا تھا۔ وہ ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد فوت ہو چکے تھے۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ وہ گلبرگ، لاہور کے پوش علاقے میں ایک وسیع وعریض کوٹھی میں اپنی والدہ کے ساتھ سکونت پذیر تھی۔ دونوں میں قریباً دو برس سے زبردست انڈر اسٹینڈنگ چل رہی تھی۔ فہد کو پوری امید تھی کہ عنقریب یہ رومانی تعلق ایک مضبوط رشتے میں بدلنے والا ہے۔ اسے سارہ کی دولت مندی اور جائداد سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے صرف سارہ چاہیے تھی، صرف سارہ۔

فہد نے اپنے سیل فون سے سارہ کو کال کی۔ انہوں نے دو گھنٹے بات کی مگر یہ دو گھنٹے جیسے دو منٹ میں گزر گئے۔ فہد نے ایک بار پھر سارہ سے کہا کہ اب یہ دوری اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ وہ جلدی سے سرخ کامدار جوڑا پہنے اور چھپاک سے اس کے گھر میں آجائے۔ وہ ایک بار پھر اپنے آخری دو سمیسٹرز کا ذکر کرنے لگی اور اسے دلکش انداز میں سمجھانے لگی کہ تھوڑا صبر اور......

فون پر بات ختم ہوئی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کشمیر پوائنٹ کا یہ حصہ ایسا گنجان نہیں تھا۔ رات بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ چیڑ اور دیودار کے بلند و بالا درختوں میں گھرا ہوا یہ بنگلا...... کسی جنگل کے ریسٹ ہاؤس کا منظر پیش کر رہا تھا۔ مری میں بجلی کم ہی جاتی ہے لیکن طوفانی بارش کے باعث چلی گئی تھی۔ کمرے میں دو موم بتیاں روشن تھیں۔ اچانک فہد کو لگا کہ بیرونی دروازے پر کسی نے دستک دی ہے۔ دوسری بار دستک ہوئی تو اس نے کمبل سے نکل کر ایک موم بتی اٹھائی اور دروازے تک پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ چوکیدار عطا اللہ ہوگا۔ مگر اس نے پوچھا تو ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''پلیز، ذرا دروازہ کھولیں۔''

فہد نے دروازہ کھولا۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ جیسے مبہوت رہ گیا۔ ایک خوبرو لڑکی چھتری لیے کھڑی تھی۔ بارش تیز تھی لہٰذا چھتری کے باوجود وہ جزوی طور پر بھیگ چکی تھی۔ اس کا لباس ایک پہلو سے اس کے جسم کا حصہ بنا ہوا تھا اور ہر نشیب و فراز کو نمایاں کر رہا تھا۔ گہرے سیاہ بالوں کی کچھ لٹیں شفاف گردن سے چپکی ہوئی تھیں۔

''جج...... جی فرمایئے۔'' فہد نے کہا۔

وہ مترنم آواز میں بولی۔ ''میری گاڑی آپ کے گھر کے سامنے خراب ہو گئی ہے۔ کافی کوشش کرتی رہی ہوں اسٹارٹ نہیں ہوتی، کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟''

''مدد......؟ اچھا...... میں دیکھتا ہوں۔''

لڑکی کے سراپے سے نظر چرا کر فہد واپس کمرے میں گیا۔ برساتی اوڑھی، ٹارچ لی، مقامی طرز کی بڑی سی چھتری اٹھائی اور دروازہ بند کر کے لڑکی کے ساتھ چل دیا۔ چوکیدار عطا اللہ اپنے چچازاد بھائی کے پاس مال روڈ کے ایک ہوٹل میں جا چکا تھا...... اسے اب صبح ہی آنا تھا۔ سلور رنگ کی سوزوکی کار بنگلے کے سامنے ہی کھڑی تھی، لڑکی نے فہد کو چابی تھمائی۔ فہد نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر سیلف لگائی، پھر بونٹ اٹھایا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ اِدھر اُدھر گھمایا۔ اسے پتا چلا کہ گاڑی کی ٹائمنگ بیلٹ ٹوٹ گئی ہے۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کا زیرو پرسنٹ امکان بھی نہیں تھا۔ اس نے لڑکی کو صورتِ حال بتائی۔ وہ مزید پریشان نظر آنے لگی۔ اس وقت کسی مکینک کے ملنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ بارش کی بوچھاڑیں چھتری کے باوجود لڑکی کو بھگو رہی تھیں۔ گاڑی کا بونٹ بند کر کے وہ دونوں دوبارہ گھر کے برآمدے میں آگئے۔

لڑکی اپنے سیل فون پر بار بار کوئی نمبر ملانے کی کوشش کر رہی تھی مگر رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ آخر وہ تھک ہار کر بولی۔ ''کیا آپ گھر میں اکیلے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''کیا آپ اجازت دیں گے کہ کہیں یہاں برآمدے میں کچھ وقت گزار لوں؟''

''برآمدے میں کیوں؟ اگر آپ مجھ پر بھروسا کر رہی ہیں تو پھر پورا کیجیے۔ کمرے میں آجایئے۔ میں یہاں برآمدے میں لیٹ جاؤں گا۔''

اس نے سرتاپا فہد کو دیکھا، پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''آپ بھلے آدمی لگ رہے ہیں، میں آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گی۔''

اگلے دس پندرہ منٹ میں فہد نے لڑکی کے لیے سارا انتظام کر دیا۔ لڑکی کی پینٹ شرٹ تقریباً بھیگ چکی تھیں۔ فہد نے اسے اپنی الماری دکھائی اور کہا کہ وہ وقتی طور پر اس میں سے کوئی بھی لباس نکال کر پہن سکتی ہے۔ ایل پی جی کے سلنڈر والا ہیٹر فہد نے آن کر دیا اور بیرونی دروازے کی چابی لڑکی کو دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ دروازہ اندر سے لاک کر لیں اور اطمینان سے سوئیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو

رنگ دے دیں۔''

اس نے لڑکی سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ وہ چاہتا تھا، اگر وہ کچھ بتانے کا ارادہ رکھتی ہے تو خود ہی بتائے، لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ فہد باہر برآمدے میں طویل صوفے پر کمبل لے کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے ڈرے ہوئے انداز میں دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

فہد کے ذہن میں کئی طرح کے شبہے بھی موجود تھے۔ کہیں یہ لڑکی کسی مصیبت کا پیش خیمہ نہ بن جائے...... فہد کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ کافی ایڈوانس ہے اور شاید گھر والوں سے ناراض ہو کر نکلی ہوئی ہے۔ اس کی گاڑی پر لاہور کی نمبر پلیٹ تھی۔

ایک وہم یہ بھی تھا کہ کہیں یہ کسی واردات کا تانا بانا نہ نکل آئے۔ لڑکی کے پاس موبائل موجود تھا اور اگر اس کی نیت میں گڑبڑ تھی تو وہ اندر سے کسی کو فون کر کے یہاں بلا سکتی تھی۔ بہرحال فہد نے اس وسوسے کو فوراً ہی رد کر دیا۔ وہ اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ ایک تیسرا شک یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ تو احمقوں کی طرح باہر بیٹھا ہے اور لڑکی اندر ہے۔ کہیں وہ قیمتی چیزوں پر ہاتھ صاف نہ کر لے۔ تاہم سوچ بچار کے بعد فہد کو اندازہ ہوا کہ اندر ایک ایل سی ڈی اور ایک ڈی وی ڈی کے علاوہ کوئی قیمتی شے تھی ہی نہیں۔

بارش کچھ دیر کے لیے دھیمی ہوئی لیکن اب ایک بار پھر زور پکڑ رہی تھی۔ ساتھ تیز ہوا بھی چلنے لگی تھی جو ایک پرہول گونج پیدا کر رہی تھی۔ اچانک اوپر سڑک کی طرف ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ فہد کو اندازہ ہوا کہ موڑ پر لگا ہوا اشتہاری کمپنی کا بڑا ہورڈنگ گر گیا ہے۔ یہ ہورڈنگ پہلے بھی گر کر ایک دو راہگیروں کو زخمی کر چکا تھا۔

دھماکے کی آواز کے فوراً بعد لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ ''یہ کیا ہوا؟'' وہ لرزاں آواز میں بولی۔

جواب دینے کے لیے فہد نے اس کی طرف دیکھا اور مبہوت رہ گیا۔ ہاتھ میں پھڑپھڑاتی شمع پکڑے وہ ایک تصویر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اس نے فہد کی ہی ایک قمیص پہن کر اس کی آستینیں اڑس رکھی تھیں۔ زیریں بدن پر فہد کی ایک شارٹ تھی جو اس کی پنڈلیوں کے آخری حصے تک پہنچ رہی تھی۔ اس بے ڈھنگے لباس نے اس کی دلکشی کو کچھ اور ہی رنگ دے دیا تھا۔ فہد نے اسے بتایا کہ اوپر سڑک پر نصب ایک بڑا ہورڈنگ گرا ہے اور یہ اسی کی آواز تھی۔ وہ کچھ دیر تذبذب میں رہ کر بولی۔ ''آپ اندر ہی آجائیں۔ باہر سردی بھی ہو گی۔''

فہد سمجھ گیا کہ وہ موسم کی شدت سے خوفزدہ ہے۔ وہ اندر چلا گیا۔ باہر بادل دہاڑ رہے تھے اور تند ہوا بارش کی بوچھاڑوں کو کھڑکیوں پر پٹخ رہی تھی۔ فی الحال سونا تو ممکن نہیں تھا۔ لڑکی اور فہد گیس ہیٹر کے قریب کرسیوں پر جا بیٹھے وہ بولی۔ ''میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے بارے میں بغیر کچھ جانے مجھے اپنے گھر میں رات گزارنے کی اجازت دی...... میرا نام مہوش ہے...... میں ماڈلنگ کرتی ہوں، حالانکہ امی ابو نے مجھے کبھی نہیں روکا مگر پتا نہیں کیوں بڑے بھائی کو میرے کام پر اعتراض رہتا ہے۔ میں جانتی ہوں یہ سب میری بھابی کا کیا دھرا ہے۔ آج صبح بھی بھائی مجھ سے بہت جھگڑے ہیں۔ میں نے گاڑی پکڑی اور نکل پڑی۔ یہاں سنی بینک کے پاس میری چھوٹی خالہ اور خالو رہتے ہیں۔ میں ایک دو ہفتے ان کے پاس رہنے کا ارادہ رکھتی ہوں لیکن پتا نہیں کیوں ان کے فون بند پڑے ہیں، شاید سو گئے ہیں وہ لوگ۔ اگر رابطہ ہو جاتا تو وہ ابھی مجھے لینے کے لیے پہنچ جاتے۔''

فہد نے ایک بار پھر دھیان سے اسے دیکھا تو یوں لگا کہ واقعی اس لڑکی کی شکل کہیں دیکھی ہوئی ہے۔ شاید کسی اخباری اشتہار وغیرہ میں۔ وہ ہوش ربا جسم کی مالک تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر، چہرے سے بھی پہلے اس کے جسم پر ہی پڑتی ہو گی۔ اس کے چہرے کے نقوش بھی جاذبِ نظر تھے۔ ان کی دلکشی میں ایک تلاطم سا تھا، جیسے وہ اپنی چکاچوند سے اپنے اردگرد کی ہر باقاعدہ شے کو بے قاعدہ اور درہم برہم کر دینا چاہتے ہوں۔

جواباً فہد نے بھی اسے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتایا...... اس نے یہ بھی کہا کہ یہاں اس کے پاس گاڑی نہیں ورنہ وہ خراب موسم کے باوجود اسے اس کی منزل تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔

باہر ہوا کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک ایک کھڑکی شور کے ساتھ کھل گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے نم جھونکے اندر آئے اور پلک جھپکتے میں دونوں شمعیں بجھ گئیں۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ فہد کو لڑکی کی ڈری ڈری آواز سنائی دی۔ وہ کھڑکی بند کرنے کے لیے لپکا تو اس کرسی سے ٹھوکر لگی جس پر یہ مہوش نامی لڑکی بیٹھی تھی۔ فہد اس کے اوپر ڈھے سا گیا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کے نیچے اس کے جسم کا گداز پن محسوس کیا اور اس کے نتھنوں میں اس کے ریشمی بالوں کی خوشبو گھس گئی۔ اس نے بمشکل کرسی کو الٹنے اور خود کو گرنے سے بچایا۔ سنبھل کر وہ کھڑکی تک پہنچا اور اسے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

''ٹارچ کہاں ہے؟'' مہوش کی لرزاں آواز سنائی دی۔
''وہی ڈھونڈ رہا ہوں۔''

تھوڑی سی کوشش سے اسے ٹارچ مل گئی۔ اس نے ٹارچ روشن کی، ٹارچ کی چمک بتدریج مدھم پڑتی جارہی تھی۔ کمرے میں عجیب سوئی سوئی سی روشنی پھیل گئی۔ لڑکی نے ذرا جھجک کر قمیص کے کشادہ گریبان میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکال کر فہد کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''یہ آپ کا قلم۔'' اس نے کہا۔

فہد نے قلم تھام لیا۔ اس میں مہوش کے آتشیں جسم کی مدھم سی حرارت موجود تھی۔

مہوش سے تصادم کے وقت یہ قلم فہد کی جیب سے مہوش کے گریبان میں منتقل ہوگیا تھا۔

''ویری ساری، آئی ایم رئیلی ویری ساری...... آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟'' فہد نے مہوش سے پوچھا۔

''کچھ زیادہ نہیں۔'' وہ اپنا بایاں کندھا دباتے ہوئے بولی۔

''دکھایئے۔'' فہد نے بے ساختہ کہا۔

اس نے قمیص کندھے پر سے تھوڑی سی کھسکائی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی ریشمی جلد پر سرخی مائل نیل نظر آرہا تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' فہد نے پھر کہا۔

''آپ نے جان بوجھ کر تو کچھ نہیں کیا۔''

''میں آپ کے لیے دوا لاتا ہوں۔'' فہد نے کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں پہنچا۔ الماری میں وکس کی شیشی رکھی تھی۔ فہد نے شیشی مہوش کو تھمائی۔ ''یہ لگا لیں، ورنہ چوٹ ٹھنڈی ہوکر تکلیف دینے لگے گی۔'' وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا تاکہ مہوش کندھے سے قمیص ہٹا کر اطمینان سے مرہم لگا سکے۔ اس نے ٹارچ وہیں رہنے دی تھی۔ چھوٹے سے گیس ہیٹر کی روشنی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ دو منٹ بعد مہوش کی مدھم آواز آئی، وہ کراہ رہی تھی۔

''خیریت ہے؟'' فہد نے پوچھا اور درمیانی دروازے سے جھانکا۔

اسے اندازہ ہوا کہ کندھے کے عقب میں بھی تھوڑی بہت چوٹ آئی ہے اور وہاں تک مہوش کا ہاتھ نہیں پہنچ پارہا۔

''کیا، میں کچھ مدد کرسکتا ہوں؟''

''اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو۔''

فہد اندر گیا، وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''یہ تھوڑا نیچے بھی چوٹ لگی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے قمیص نیچے سرکائی۔ کندھے کے عقب میں بھی نیل نظر آرہا تھا۔ ''خون تو نہیں نکلا؟'' مہوش نے پوچھا۔

''نہیں بس ذرا ضرب آئی ہے۔'' فہد نے کہا۔

اس نے وہاں مرہم لگایا اور ہولے ہولے ملنے لگا۔ اس کی نگاہ اس کی ریشمی کمر کو دور تک دیکھ سکتی تھی۔ لمس نے اس کے اندر عجیب چنگاریاں سی بکھیر دیں۔ دھڑکن بے ترتیب ہوگئی۔ اس نے جلدی سے اپنا کام ختم کیا اور پیچھے ہٹ گیا...... مہوش نے قمیص برابر کرلی۔

فہد کو لگا جیسے آج کی رات کسی کڑی آزمائش کی طرح اس پر اتری ہے۔ موسم...... تنہائی...... نیم تاریکی اور دو جوان جسم اچانک ہی ایک دوسرے کو بے پناہ شدت سے محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ قدرے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والا ایک شریف النفس شخص تھا۔ اسے اپنے چہرے پر حرارت محسوس ہوئی اور لگا کہ رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جارہی ہے۔ مہوش کی نگاہیں ایک لمحے کے لیے فہد کی نگاہوں سے ملیں اور آسمان کی طرح ایک برق سی اس کمرے کے اندر بھی کوند گئی۔

وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سارہ جیسے بانہیں پھیلا کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔ کیا میں تمہاری محبت نہیں ہوں؟ کیا ہم نے ایک دوسرے کو پانے کے لیے لاتعداد شب و روز انتظار میں نہیں گزارے۔ کیا ہمارا پیار اتنا ہی سطحی ہے کہ ایک بھیگی ہوئی شب کا ردعمل بھی نہ سہہ سکے۔

فہد نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں اور کمبل اوپر تک کھینچ لیا۔ ساتھ والے کمرے میں غالباً مہوش بھی بستر پر لیٹ گئی تھی۔ دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ کھلا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کی ہوش ربا موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ چند منٹ پہلے مہوش کی نگاہوں سے فہد کی نگاہوں کا ہونے والا ملاپ بڑا تہلکہ خیز تھا۔ اس ایک لمحے میں وہ شاید اپنی اپنی شناخت سے جدا ہوگئے تھے۔ بس مرد و زن رہ گئے تھے...... برسات کی رات میں بھیگے ہوئے دو جوان بدن۔ اس ایک لمحے میں مہوش کی ''توبہ شکن نسوانیت'' نے فہد کے احساسات پر بڑا کاری وار کیا تھا۔ اتنا کاری کہ وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔

اس نے سارہ کے بارے میں سوچا۔ وہ ایسے معاملوں میں بڑی حساس اور شکی مزاج تھی۔ وہ کسی طرح جان جاتی کہ فہد اس طرح رات کی تنہائی میں ایک جوان، خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایک کمرے میں ہے تو وہ قیامت برپا کردیتی۔ وہ لاکھ صفائیاں پیش کرتا، وہ ایک ایسی تفتیش کا آغاز کرتی جو فہد کو زندگی، موت کے درمیان لٹکا دیتی۔ فہد کے حوالے سے وہ اتنی ''کچی'' تھی کہ کبھی کبھی فہد کو ڈر لگنے لگتا تھا۔ وہ طویل سانس لے کر رہ گیا۔

ٹارچ بند ہوچکی تھی۔ گیس ختم ہونے سے ہیٹر بھی بند تھا۔ تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس تاریکی میں بس کبھی کبھی مہوش کی چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی تھی یا پھر پس منظر میں گرجتے بادلوں اور برستی بارش کا شور تھا۔ فہد نے کمبل اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی ایک کہنی پر بھی چوٹ آئی تھی لیکن وہ کچھ ایسی تکلیف نہیں دے رہی تھی۔ دل و دماغ میں عجیب سی کھلبلی تھی۔ وہ خود کو نیند کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ ایک طویل کوشش ثابت ہوئی۔ وہ غنودگی کی سی کیفیت میں بے حرکت پڑا رہا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بجلی کوند رہی تھی اور وادیوں میں کڑک کی گونج تھی۔ دیواروں سے سر پٹختی ہوا کبھی مدھم اور کبھی تیز ہوجاتی تھی۔ پتا نہیں کتنا وقت ایسے ہی گزر گیا۔ شاید ایک گھنٹا، شاید ڈیڑھ دو گھنٹے۔ اچانک فہد کو احساس ہوا کہ کوئی اس کے بالکل قریب موجود ہے، اس کے بستر پر اس کا پورا جسم سنسنا اٹھا۔ یہ مہوش تھی، اس کی چوڑیوں کی مدھم کھنک فہد کے کان تک پہنچی تھی، وہ اس کے بالوں کی خوشبو سے بھی ناآشنا نہیں تھا اور پھر وکس کی ہلکی سی بو۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں اپنی جگہ پڑا رہا۔ مہوش کے سانسوں کی حرارت اس کی گردن کے پچھلے حصے سے ٹکرا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مہوش کی نرم آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ''پلیز فہد، مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی مہوش کا کومل ہاتھ اس کے کندھے پر آگیا۔ جیسے گہری تاریکی میں وہ اس ہاتھ کے ذریعے فہد کی موجودگی کا ٹھوس ثبوت چاہتی ہو۔ اس کا جسم فہد کی پشت سے چھو رہا تھا۔

یہ کیسی لڑکی تھی؟ فہد اب اس کے بارے میں تذبذب کا شکار ہورہا تھا۔ صورتِ حال جو بھی تھی لیکن وہ جس طرح اس کے قریب ہوتی چلی جارہی تھی، یہ ناقابلِ یقین تھا۔ ایک بالکل افسانوی سچویشن۔ ایک طوفانی رات، ایک تنہا بنگلا، ایک حسین لڑکی، سہارے اور قربت کی طالب۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ کیا واقعی وہ اس کے قریب آنا چاہتی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں صورتِ حال اور بھی سنگین ہوگئی۔ یکبارگی زور سے بجلی کڑکی۔ بالکل یوں لگا جیسے بجلی کسی طرف اونچے درختوں پر گری ہے۔ وہ اس کے ساتھ چپک گئی۔ فہد کی پشت اس کے پُرحرارت جسم کی زد میں تھی۔ اچانک فہد کے جوان جسم میں لہو کی آتشیں موجیں سر پٹخنے لگیں۔ دماغ پر ایک عجیب سی مدہوشی چھاتی جارہی تھی۔ اس مدہوشی نے جیسے تاریکی ہی کی طرح اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید سارہ بھی دھندلا گئی تھی۔ وہ اس کی طرف مڑا تھا یا شاید مہوش نے اسے خود اپنی طرف موڑا تھا، اسے کچھ یاد نہیں۔ اس نے خود کو مہوش کے بہت قریب پایا، ایکدم اس کے روبرو۔ اس سے آگے کا مرحلہ مزید خطرناک تھا...... لیکن یہی وقت تھا جب فہد کے ذہن میں مزاحمت کا ایک زوردار جھماکا ہوا۔ اس کے دل نے کہا کہ یہ قدرت کی طرف سے اس کے لیے آزمائش ہے۔ اگر آج وہ اس آزمائش پر پورا نہ اتر سکا تو سارہ کو ہمیشہ کے لیے کھودے گا...... اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا، ہاں ایسا وہ نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مہوش کی جلتی ریشمی بانہیں۔ پیچھے ہٹائیں اور ایک بے ساختہ جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کمبل پیچھے ہٹایا اور ٹھنڈے فرش پر کھڑا ہوگیا۔

''کیا ہوا؟'' مہوش کی مخمور آواز ابھری۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

باہر برآمدے میں سردی تھی اور ہوا کے تھپیڑے تھے۔ اسے اپنے اور سارہ کے تصور کے لیے یہ جگہ بھی محفوظ نظر نہیں آئی۔ وہ اور آگے بڑھ گیا۔ صحن میں چلا گیا اور چند سیکنڈ میں سرتاپا بھیگ گیا۔ سرد ہواؤں نے اسے جھنجھوڑا اور اس کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند تیزی سے چھٹتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہ رات ختم ہوگئی...... مہوش چلی گئی...... وقت آگے بڑھ گیا۔ فہد ایک بہت بڑی آزمائش میں سرخرو ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے اس سرخروئی کا صلہ ملے گا۔ سارہ کو حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کا اعتماد مزید بڑھ چکا تھا۔ بہ ظاہر حالات بھی سازگار ہی تھے...... دو ہفتے بعد وہ لوگ مری سے واپس لاہور پہنچے تو فہد کی والدہ، بہن اور بڑے بھائی جان سارہ کے گھر گئے۔ بات چیت آگے بڑھتی محسوس ہورہی تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنا آناً فاناً اور حیران کن تھا کہ فہد بھونچکا رہ گیا۔ اسے اپنے حواس پر بھروسا نہیں ہورہا تھا۔ سارہ کی طرف سے سرد مہری کا رویہ بڑی تیزی سے سامنے آیا اور...... روز بروز شدت اختیار کرتا گیا۔ صرف ایک ماہ کے اندر فہد کو واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ وہ اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی...... کیوں؟ کس وجہ سے؟ وہ اس پر اتنا بڑا ستم کیسے کرسکتی تھی؟ اس کی کیا خطا تھی؟ اس کے پیار میں کیا کمی تھی؟ کیا وہ اس کے حوالے سے کسی شک کا شکار ہوئی تھی؟

اس کے پاس بے شمار سوال تھے۔ یہ سارے سوال اس نے خود سے کیے اور سارہ سے بھی۔ لیکن جنہوں نے جانا ہوتا ہے، وہ چلے جاتے ہیں۔ پیار کی دنیا میں جبر نہیں ہوتا۔ بس آنسو ہوتے ہیں اور خاموش التجائیں ہوتی ہیں۔

وہ بھی چلی گئی، ہمیشہ کے لیے فہد کو چھوڑ گئی۔ پانچ چھ ماہ بعد سارہ کی شادی ہوگئی۔ سارہ کی جدائی کو فہد نے اسی خندہ پیشانی سے جھیلا، جس محبت سے اس کے حصول کی تمنا کی تھی۔ وہ ایک مضبوط شخص تھا۔ اس کے مذہبی رجحانات اور اس کی اخلاقی اقدار اسے مزید تقویت دیتی تھیں...... ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں ہی فہد نے خود کو مکمل طور پر سنبھال لیا۔ اب وہ لوگ لاہور سے اسلام آباد شفٹ ہو چکے تھے۔ اس واقعے کے بعد مہوش سے بھی اس کا کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا۔ ہاں ایک دو بار چھوٹے چھوٹے کمرشل ایڈز میں اس نے اس کی تصویر ضرور دیکھی۔

اسلام آباد پہنچنے کے بعد فہد کی والدہ نے سرگرمی سے فہد کے لیے رشتہ تلاش کیا اور اس کی شادی ہوگئی۔ فہد کا ہمیشہ سے ایمان تھا کہ انسان کو اس کی نیکی اور بھلائی کا صلہ ضرور ملتا ہے اور ان کڑی آزمائشوں کا صلہ بھی ملتا ہے، جن میں سے وہ ثابت قدمی کے ساتھ گزرتا ہے۔ شادی کے بعد آمنہ کو پا کر فہد کا یہ یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔ وہ مہر و وفا کی تصویر تھی۔ ایک دلکش لڑکی اور ایک مکمل بیوی۔ اس نے فہد کے گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیا...... چار سال کے عرصے میں ان کے آنگن میں دو خوب صورت پھول کھلے۔ ایک بیٹی ایک بیٹا۔ فہد کو لگا کہ وہ ہر طرح سے مکمل ہوگیا ہے...... مکمل اور سرشار۔

☆☆☆

وہ بھی اگست ہی کی ایک ابر آلود شام تھی۔ فہد کے ایک دفتری دوست امتیاز کی شادی تھی۔ امتیاز ملک کی پہلی بیوی شادی کے چند ماہ بعد ہی وفات پا گئی تھی۔ یہ اس کی دوسری شادی تھی۔ امتیاز کی ہونے والی دلہن کی بھی یہ دوسری شادی تھی۔ اس کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ یہ شادی راولپنڈی میں ہونا تھی۔ فہد نے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس شادی میں شرکت کی۔ شادی ہال میں داخل ہوتے ہی اچانک فہد کو ایک ایسا چہرہ نظر آیا جس نے اس کے ذہن میں ہلچل مچا دی۔ فہد کو چار پانچ سال پہلے کی وہ طوفانی شب یاد آگئی جس نے اسے مری کے تنہا بنگلے میں گھیرا تھا...... یہ چہرہ اسی ماڈل گرل مہوش کا تھا۔ وہ اب پہلے سے کچھ فربہ ہو چکی تھی۔ زرتار ساڑی پہنے وہ اسٹیج کی طرف جا رہی تھی جب ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بری طرح چونک گئے۔

ایک ناگوار سی کیفیت فہد کے دل و دماغ میں ابھر آئی۔ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ باہر نکل آیا۔ نماز پڑھنے کے بعد بھی وہ اندر ہال میں نہیں گیا بلکہ باہر اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ ڈنر شروع ہونے میں ابھی دیر تھی۔ ابھی اسے گاڑی میں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے مہوش اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ فہد کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ وہ سیدھی اس کی طرف آئی اور اس نے بے تکلفی سے گاڑی کی کھڑکی پر دستک دی۔ چار و ناچار فہد نے شیشہ اتارا۔

''ہیلو فہد! کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں...... آج اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ تم یہاں کیسے؟''

''سمجھ لیں کہ یہ میری ایک سہیلی کی شادی ہے...... اور آپ؟''

''میرے ایک جاننے والے کی شادی ہے۔''

''کیا ہم کچھ دیر کے لیے بات کر سکتے ہیں؟''

فہد چپ ہوگیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''میں سمجھ گئی۔ شوبز کی ایک خاتون نما لڑکی سے بات کر کے آپ اپنی وائف کو شدید پریشانی میں ڈال دیں گے۔ چلیں کوئی بات نہیں، یہ کارڈ رکھ لیں۔ اس پر میرا فون نمبر ہے۔ اگر ہو سکے تو مجھے صرف ایک بار فون ضرور کیجیے گا۔ میں آپ کو آپ کے ایک بہت اہم سوال کا جواب دینا چاہتی ہوں۔''

اگلے اڑتالیس گھنٹے بہت کشمکش میں گزارنے کے بعد فہد نے رات کے وقت مہوش کے دیے ہوئے نمبر پر فون کیا۔ مہوش شاید اسی کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ رسمی گفتگو کے دوران میں مہوش نے اسے بتایا کہ اس نے ماڈلنگ چھوڑ دی ہے۔ آج کل وہ ایک اکیڈمی میں کلاسیکل ڈانس کی ٹیچر کے طور پر کام کر رہی ہے۔ رسمی گفتگو کے فوراً بعد ہی وہ اصل موضوع پر آگئی۔ اس نے کہا۔ ''فہد! آپ بہت اچھے آدمی ہیں، میں دل کی گہرائی سے آپ کے لیے انس اور ہمدردی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ پانچ سال پہلے میں نے اپنی صوابدید پر آپ کے حوالے سے جو فیصلہ کیا، وہ بالکل درست نکلا۔''

''میرے حوالے سے فیصلہ؟ تم پہیلیوں میں بات کر رہی ہو۔''

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''فہد! میں آج آپ پر یہ انکشاف کرنا چاہتی ہوں کہ اس رات، مری کے اس بنگلے میں ہماری جو ملاقات ہوئی، وہ اتفاقیہ نہیں تھی...... وہ سب...... طے شدہ تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''فہد، میں بات کو طول دینا نہیں چاہتی، آپ سمجھ لیں کہ وہ آپ کی آزمائش تھی...... اور وہ آزمائش آپ کی محبوب...... آپ کی ہونے والی بیوی سارہ نے کی تھی...... وہ آپ کو پرکھنا چاہتی تھی۔ شادی سے پہلے دیکھنا چاہتی تھی کہ آپ اس کی محبت میں کتنے ثابت قدم ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ کتنے مختلف مزاج کی مالک تھی۔''

چند سیکنڈ خاموش رہ کر مہوش نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''یہ سب کچھ شاید آپ کو عجیب لگے لیکن حقیقت میں یہ ایسا ہی ہے۔ سارہ نے اپنی ایک دوست کے ذریعے مجھ سے رابطہ کیا اور سارے معاملات طے کیے۔ ہمارے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ سارہ موقع کی تلاش میں تھی، جو جلد ہی اسے مل گیا۔ آپ مری گئے۔ سارہ جانتی تھی کہ آپ چند دن کے لیے مری کے بنگلے میں تنہا ہیں۔ اس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔''

مہوش بول رہی تھی اور ماضی کی اس رات کی ایک مکمل تصویر فہد کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ وہ سناٹے میں تھا۔ وہ سارہ کی متلون مزاجی کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک والدہ کے سوا کوئی اسے روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی شکی اور کرید رکھنے والی لڑکی تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے اوپر بھی اعتبار نہیں کر پاتی۔ فہد کے دل نے گواہی دی کہ آج پانچ سال بعد مہوش اس رات کے بارے میں جو کچھ بتا رہی ہے وہ عجیب ہونے کے باوجود غلط نہیں ہے...... لیکن...... ایک بات اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر واقعی اس رات سارہ نے اس کی آزمائش کی تھی تو پھر...... پھر ان کی شادی ہو کیوں نہیں سکی تھی؟ وہ اس آزمائش میں تو کامیاب رہا تھا۔ کیا وہ کسی اور آزمائش کے چکر میں پڑ گئی تھی؟

اس سے پہلے کہ فہد کچھ کہتا، مہوش بولی۔ ''فہد میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔ آپ کو بہت اچھی بیوی ملی ہے۔ آپ ایک دوسرے کا نام لے کر جیتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف آپ نے جس سارہ کو کھویا تھا، اس کے حال کا کچھ پتا ہے آپ کو؟''

''نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں۔''

''آپ نے پرسوں اپنے جس جاننے والے کی شادی میں شرکت کی اس کی شادی کا کارڈ شاید آپ نے غور سے نہیں پڑھا۔ اس کی بیوی وہی سارہ ہے جو کبھی آپ کے خیالوں میں تھی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہی ہوا ہے جناب اور آپ کو راز کی ایک اور بات بتاؤں، یہ سارہ کی دوسری نہیں، تیسری شادی ہے۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

''جی ہاں فہد صاحب، یہ اس کی تیسری شادی ہے۔ اس کی پہلی شادی دو سال میں ہی ختم ہوگئی تھی اور اس کے خاتمے کی وجہ بھی وہی حد سے بڑھا ہوا شک اور کرید کی عادت ہی تھی۔ سارہ کے نزدیک اس کا شوہر شادی کے آغاز ہی میں دنیا کا مشکوک ترین شخص ٹھہر گیا تھا۔ اس کی دوسری شادی کوئٹہ میں ہوئی اور رخصتی سے پہلے ہی ختم ہوگئی اور اس کی وجہ بھی اس کی غیر معمولی بے اعتباری ہی تھی۔ اب اللہ بہتر کرے لیکن یہ تیسری شادی بھی مجھے زیادہ دیر چلتی نظر نہیں آتی۔''

شاید آج انکشافات کا دن تھا۔ فہد سکتے کی سی کیفیت میں یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ گفتگو کے اختتام پر مہوش بولی۔ ''آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنا ہے فہد صاحب؟''

''تمہاری باتوں نے مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے مہوش، میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔ پھر بھی یوں لگ رہا ہے کہ تمہاری بہت سی باتیں درست ہیں، لیکن ایک بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی...... بالکل نہیں آ رہی۔''

''کیا؟''

''مہوش! تم نے کہا ہے کہ سارہ نے شادی کے لیے ہاں کرنے سے پہلے میری آزمائش کی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو...... تم جانتی ہو...... میں اس آزمائش پر پورا اترا، پھر وہ مجھ سے دور کیوں ہوئی؟''

مہوش نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''فہد! بے شک میں شوبز کی عورت ہوں مگر اپنے اندر ایک حساس دل بھی رکھتی ہوں، میں نے کہا ہے نا کہ پانچ سال پہلے میں نے آپ کے بارے میں جو فیصلہ کیا، وہ آپ کے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا اور مجھے اس کی بے حد خوشی ہے۔ فہد...... بلاشبہ...... جی ہاں، بلاشبہ آپ اس رات آزمائش پر پورے اترے تھے...... لیکن اس بات کی گواہ تو صرف میں تھی۔ آپ کے حق میں گواہی مجھے دینا تھی اور میں نے یہ گواہی نہیں دی تھی۔ میں سارہ کو اچھی طرح جان چکی تھی فہد۔ میں آپ جیسے بھلے بندے کے ساتھ اتنا برا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔''

فہد مبہوت بیٹھا رہ گیا۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''خدا حافظ...... بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔'' اور فون بند ہوگیا۔

محفلِ شعروسخن

❋ ریاض بٹ......حسن ابدال
اس کو نہ چھو سکیں کبھی رنجِ وبلا کے ہاتھ
سایہ کیے ہوں جس پہ حبیبِ خدا کے ہاتھ

❋ نورالایمان......حافظ آباد
قتل چھپتے تھے کبھی سنگ دیوار کے بیچ
اب تو کھلنے لگے مقتل بھرے بازار کے بیچ
دیکھے جاتے نہ تھے آنسو میرے جس سے محسن
آج ہنستے ہوئے دیکھا اسے اغیار کے بیچ

❋ احسان اللہ بھٹی......سکھیکی
مجھے بھنور میں ہی چھوڑ آتے تو بات تم پر کبھی نہ آتی
یہ تیرا ساحل پہ لا کے ڈبونا کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

❋ ابرار احمد......جامشورو
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

❋ قیصر اعوان......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
مجھ سے بے وفائی کی انتہا کیا پوچھتے ہو یارو
وہ مجھ سے پیار سیکھتا رہا کسی اور کے لیے

❋ بابر عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
تم سے کب ہم نے ملاقات کا وعدہ چاہا
دور رہ کر تجھے کچھ اور زیادہ چاہا
یاد آئی ہے تیری اور بھی شدت سے ہمیں
بھول جانے کا تجھے جب بھی ارادہ چاہا

❋ حسنین عباس، کمیل عباس......گلیانہ روڈ کھاریاں
ذرا یوں آج بے پردہ جمالِ یار ہوجائے
نگاہیں ڈھونڈتی رہ جائیں اور دیدار ہوجائے

❋ محمد اقبال اداس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
رابطوں سے نفرتوں کے راستے گم ہوگئے
اک اِک کر کے دلوں کے فاصلے گم ہوگئے
ترک رسم دوستی ہرگز میرا مسلک نہ تھا
اتفاقاً دوستوں سے رابطے کم ہوگئے



❋ ڈاکٹر وسیم خالق گہیاں......گجرات
میرے دستِ طلب پہ آپ اپنا خالی ہاتھ ہی رکھ دیں
کچھ نہ ملنے سے سائل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

❋ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

❋ محمد افضل خان......پشاور
زلف راتوں سی ہے رنگت ہے اجالوں جیسی
پر طبیعت ہے وہی بھولنے والوں جیسی
اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

❋ رعنا رضوی......مانچسٹر
مانندِ شمع یوں تو جلے ہیں تمام عمر
لیکن ہمارے دل کے اندھیرے نہ کم ہوئے

❋ یاسر علی راجپوت......گوجرہ
کہتے ہیں لوگ تجھ کو مسیحا مگر یہاں
اک شخص مر گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

❋ مسز بابر عباس......گلیانہ روڈ، کھاریاں
شام بھی ہوگئی، دھندلا گئیں آنکھیں بھی میری
بھولنے والے! میں کب تک تیرا رستہ دیکھوں

❋ احسان سحر......میانوالی
ہوتی ہے آج تتلی کو غلط فہمی
سمجھ کر پھول وہ ان کے رخسار پر جا بیٹھی

❋ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص
سمجھ کر کانچ کا ٹکڑا تراشا مجھ کو دنیا نے
بنا پھر بھی نہیں کنگن تیری نازک کلائی کا

❋ ایم افضل کھرل......ننکانہ صاحب
اُف ان لبوں کا دھیرے سے کہنا
کوئی دیکھ نہ لے اب جانے دو

❋ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل کراچی
کبھی ایسے ہی آیا کریں میری آنکھوں میں نظر کو خبر نہ ہو
پُرخلوص پیار سے نواز دے اس کے بعد سحر نہ ہو
کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کر شب کے پھول کو چوم کر
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال چلیں ختم پیار کا سفر نہ ہو

❋ راجا افتخار علی افتی......چوآسدن شاہ
کہاں لے جاؤں گا تجھ کو شبِ تاریک میں اس وقت
اے میری تنہائی میں بے بس ہوں میرے پہلو میں سو جا

❋ حسیب احمد، عظمیٰ احمد......الکڈی کرک
حالات کے سلوک سے دل یوں ہے داغ دار
دیمک لگی ہو جیسے پرانی کتاب کو......

❋ محمد امجد ریاض......ساہیوال
صحن غربت میں قضا دیر سے مت آیا کر
خرچ تدفین کا لگ جاتا ہے بیماری پے

❋ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
اس کا اور میرا تعلق مثل شمس و قمر ہے
کہ رابطہ بھی مسلسل اور فاصلہ بھی مسلسل

❋ مسز رباب کومل، مس مزمل حسین......بھیرہ
اگر اک بار وہ کہہ دیتا "ہاں میں تیرا ہوں"
تو میں لفظ "بے وفا" زمانے بھر سے مٹا دیتا

❋ فخر النساء......سکھیکی
اس کے ہونے سے تو اک شور بپا تھا یارو
اب یہ عالم کہ بھرے شہر میں تنہائی ہے
میں جو روٹھا تھا کبھی مجھ کو منانے کے لیے
آج بھی میرے تعاقب میں صدا آئی ہے

❋ اسد عباس اسد......سرگودھا
آیا نہ فرق اس کی انا میں کبھی کوئی
دنیا بدل گئی میرا کردار دیکھ کر

❋ معظم علی......اسلام آباد
آئی نہ رات بھر کوئی پنگھٹ پہ سانولی
پانی میں چھپ کے بیٹھا رہا بے قرار چاند

❋ نور احمد......کوئٹہ
اس سال جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بہت پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

❋ محمد اظہر......ملیر، کراچی
تم کو فرصت نہ تھی کسی افسانے کو پڑھنے کی
میں تو بکتا رہا تیرے شعروں میں کتابوں کی طرح

❋ تیمور احمد......حافظ آباد
عشق ٹھہرا تو پھر انا کیسی
وہ نہ بدلے تو ہم بدل جائیں

❋ امداد خان......بنوں
مسافر تو بچھڑتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے
محبت زندہ رہتی ہے محبت کب بدلتی ہے

❋ شبیر نازش......اعظم بستی، کراچی
میری روداد ہے کہ آئینہ
یہ کوئی یاد ہے کہ آئینہ

❋ کنول زریں......گلبرگ، لاہور
ضبط کرنا نہ کبھی ضبط میں وحشت کرنا
اتنا آساں بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا

❋ مسعود ناداں......لاہور
درحقیقت تیرے کوچے سے سرِ شام چلا آیا تھا
بس تیری یاد کو اس کے ہونٹوں سے لگا لایا تھا

❋ ثمر فرقان سنی، شاہ حسین......خوشاب
وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

* شوکت علی.....گلبرگ، لاہور

خزاں کی راجدھانی میں گل نایاب جیسا تھا
جسے تم بھول بیٹھے ہو وہی تو خواب جیسا تھا

* طاہرہ یاسمین.....سرگودھا

شام کی نا سمجھ ہوا پوچھ رہی ہے اک پتا
موج ہوائے کوئے یار، کچھ تو میرا خیال بھی

* محمد اقبال.....کورنگی، کراچی

کبھی لہریں ترا چہرہ جو بنانے لگ جائیں
میری آنکھیں مجھے دریا میں بہانے لگ جائیں

* محمد بابر شہزاد خان نیازی.....خوشاب

منسوب تیرے قصے اوروں سے بھی تھے لیکن
وہ بات بہت پھیلی جو بات چلی ہم سے

* اختر شاہ عارف.....ڈھوک جمعہ، جہلم

کوئی روکے اسے جا کر، سراسر ہے یہ پاگل پن
جو بہروں کے محلے میں صدا تقسیم کرتا ہے

* زوہیب احمد ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آجائے
تم یہ کہو، خود تم نے اب تک کتنے دیے جلائے

* جنید احمد ملک.....گلستانِ جوہر، کراچی

عمر بھر کا یاد ہے بس ایک افسانہ مجھے
میں نے پہچانا جسے اس نے نہ پہچانا مجھے

* رحیمہ سرور.....لاہور

رات کی رانی کا جھونکا تھا کسی کی یاد بھی
دیر تک آنگن میں میرے احساس کا مہکا رہا

* امتیاز احمد.....کراچی

دید سے جان دید تک دل سے رخ امید تک
کوئی نہیں ہے درمیاں، شام بخیر شب بخیر

* شاہ رخ.....سیالکوٹ

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی، گل تر کی صورت

* محمد کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی

میری بھی کچھ خطائیں تھیں، قاضی شہر نے مگر
اپنے بھی جتنے جرم تھے، میرے ہی سر لگا دیے

* عاشی نذیر.....سمندری

تم ہی نہ سن سکے اگر قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زبان کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے

* جاوید لودھی.....کراچی

اب ضد پہ آگئے ہو تو یہ کام بھی کرو
خود کو ہمارے نام سے بدنام بھی کرو

* فرحان احمد.....پاک کالونی، کراچی

اس طرح مجھے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو
کیا تم نے کسی کو کبھی پیاسا نہیں دیکھا

* سنسان دل.....جودھپور، کبیروالہ

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

* انیس قائم خانی.....میرپور خاص

پھر کیا ہوا یہ راہ کی دشواریوں سے پوچھ
بس اتنا یاد ہے تری جانب چلا تھا میں

* شاہ حسین.....نور پور تھل، خوشاب

خدا گواہ کہ ان میں وہی ہلاکت ہے
یہ تیغ و تیر یہ خنجر اسی سے ملتے ہیں

* حافظ محمد عقیل احمد کلیار.....میانوالی

صاحب! کیا لائقِ ستم بھی نہیں رہا میں
پتھر بھی گھر میں آئے زمانہ گزر گیا

* ابرار وارث.....سندیلیانوالی

بات بڑھنے کو تو بڑھ جاتی بہت لیکن
کچھ کم گو بہت میں بھی تھا چپ رہنے کی خواہش کی بھی تھی

* ریحانہ وارث.....سندیلیانوالی

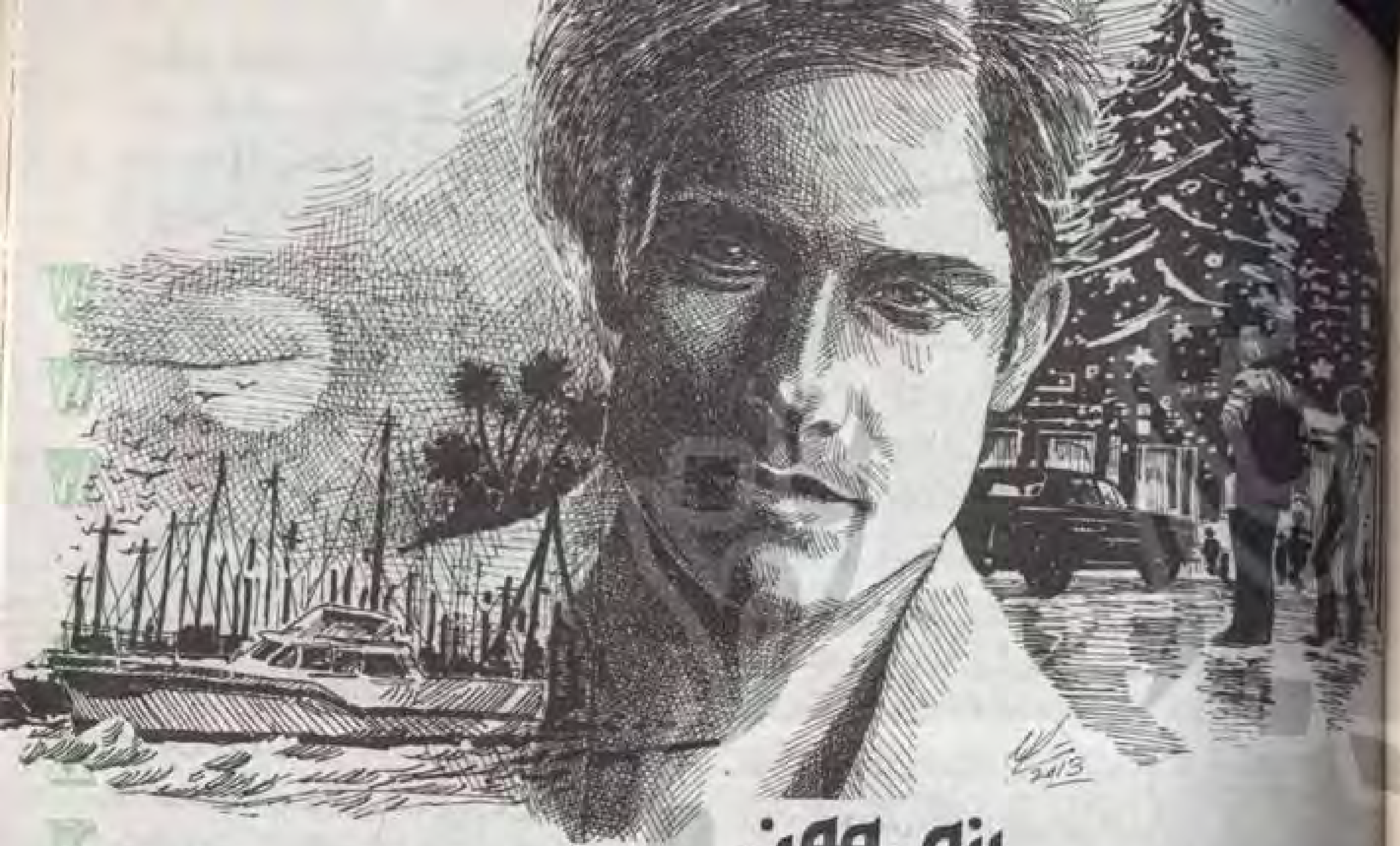
مجھے منزلوں سے عزیز ہیں تیری رہ گزر کی مسافتیں
کہ لکھی ہیں میرے نصیب میں عمر بھر کی مسافتیں

کوپن برائے شمارہ مارچ 2013

مُحفلِ شعر و سُخن

نام : --

پتا : --



ہنی مون

تنویر ریاض

جنّت چاہے احمقوں کی ہو یا شاطروں کی... کسی کا ساتھ مل جائے تو تمام خوابوں کا رنگ ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی مدت سے ایک خواب بسا تھا اور بعض اوقات خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے انسان کو پل صراط سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

خواہش اور آزمائش کے درمیان ایک دلچسپ معرکہ آرائی

موسم بہار میں سارا توگا کی رونق عروج پر ہوتی ہے۔ یہ قصبہ کیلی فورنیا کے مضافات میں واقع ہے گوکہ اس کی آبادی بہت کم یعنی صرف تیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے لیکن اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر یہ قصبہ سیاحوں کے لیے بے حد کشش رکھتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہاں کا موسم ہے۔ سانتا کلارا وادی کے مغرب میں واقع یہ چھوٹا سا قصبہ موسم بہار میں جنت کا منظر پیش کرتا ہے۔ نادر اور قیمتی اشیا سے بھرے بازار، جوئے خانے، ریس کورس، جھیل کے کنارے واقع ریستوران، میوزک شوز، کھیلوں کے مقابلے اور سیاحوں کی دلچسپی کے بے شمار لوازمات اس قصبے کا حسن ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ایک صدی سے یہ علاقہ سیاحوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی رونق میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ ہم دونوں یعنی میں اور میری منگیتر لوسی نے گزشتہ چند سالوں سے یہاں آنا

شروع کیا ہے اور اب ہم گرمیوں کا موسم یہیں گزارتے ہیں کیونکہ یہ جگہ ہمارے کاروبار کے لیے انتہائی مناسب ہے۔ کیونکہ یہاں آنے والوں کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتی ہیں اور وہ اس دولت کو محض اپنی عیاشی کی خاطر بڑی بے دردی سے جوئے خانوں، ریس کورس، قحبہ خانوں، بازاروں اور دیگر تفریحی مقامات پر لٹاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہاں آنے والا ہر شخص کسی نہ کسی مقابلے میں شریک ہوکر راتوں رات دولت مند بن جانا چاہتا ہے۔ اس میں ہم دونوں بھی شامل تھے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ ہم شرطیں لگانے اور جوئے کی مشینوں کے بجائے ان لوگوں کے درمیان رہ کر مال بناتے ہیں جو ریس کورس اور دیگر پرہجوم جگہوں پر اپنی دلچسپیوں میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے والٹ اور پرس کی حفاظت کا خیال بھی نہیں آتا۔

میں اور لوسی، نیویارک میں بھی اس طرح کی کمائی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس شہر میں بھی کئی ایسے مواقع آتے ہیں جب ہمارا کاروبار عروج پر ہوتا ہے۔ مثلاً یوم آزادی کی پریڈ اور بلیک فرائی ڈے کی تقریبات، جہاں لوگوں کا بہت بڑا ہجوم ہوتا ہے یا کرسمس کی تیاری کے دن جب بازاروں میں گاہکوں کا رش ہوتا ہے اور انہیں سامان کے تھیلے سنبھالتے ہوئے اپنی نقدی اور کریڈٹ کارڈز کا بالکل بھی ہوش نہیں ہوتا۔ اسی طرح نئے سال کی شام بھی ہمارے لیے بہت سازگار ہے جب لاکھوں لوگ ٹائمز اسکوائر میں جمع ہوکر نئے سال کا استقبال کرتے ہیں، اسی طرح فلاڈلفیا اور بوسٹن میں ہونے والی مختلف تقریبات بھی ہمارے کاروبار کے لیے بے حد سازگار ہیں لیکن ایسے مواقع سال میں بہت کم آتے ہیں اور بقیہ دنوں میں ہماری آمدنی خطرناک حد تک کم ہوجاتی ہے لیکن جب ہم سال میں ہونے والی آمدنی کا حساب لگاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ کمائی کے لحاظ سے سارا توگا میں گزارا ہوا سیزن سب سے بہترین ہے۔ کیونکہ ہم جیب تراشی کے ذریعے ہی اپنی گزراوقات کرتے ہیں اور اگر دوسرے لوگوں کی طرح آپ کا بھی یہی خیال ہے کہ زندگی گزارنے کا یہ انتہائی گھٹیا طریقہ ہے تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ اس فن کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ مشہور ناول نگار چارلس ڈکنز نے بھی جیب تراشی کو امیر اور غریب کے درمیان فرق دور کرنے کا طریقہ تسلیم کیا ہے۔ اسی لیے اس کے ناول اولیور ٹوئسٹ میں اس کا کردار فیگن، آرٹ فل ڈوجر اور بل سائیک وغیرہ کو لندن کے مرچنٹ اسکوائر میں انگلیوں کے استعمال کا طریقہ سکھاتا ہے۔ یہی کچھ میرے اور لوسی کے ساتھ ہے، ہم دونوں مستقل طور پر ایک دوسرے کو اس فن کے رموز سکھاتے رہتے ہیں اور جو آمدنی ہوتی ہے اسے پوری ایمان داری سے آپس میں برابر بانٹ لیتے ہیں۔

ویسے بھی ڈکنز کے زمانے کے مقابلے میں اب یہ کاروبار بہت حد تک تبدیل ہوچکا ہے۔ بڑے بڑے چور ان چھوٹی موٹی وارداتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے سائنسی انداز میں کام کررہے ہیں۔ ڈیلی نیوز کی رپورٹ کے مطابق ہر سال پچیس کروڑ ڈالرز انٹرنیٹ کے ذریعے چرا لیے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میڈیا کی ساری توجہ انٹرنیٹ سے ہونے والی چوری پر مرکوز رہتی ہے۔ ہمارے پروفیشن میں کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک اچھی علامت ہے کہ کسی بھرے پرے بازار یا پررونق شاپنگ سینٹر میں جیب کٹ جانے کا واقعہ میڈیا کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور اب اس قسم کی خبروں کو اخبار میں بہت کم جگہ ملتی ہے۔ اسی طرح پولیس اور عدالتیں نیٹ چوری کی وارداتوں میں الجھ کر رہ گئی ہیں اور ان کے لیے جیب تراشی کے واقعات ایک مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اول تو جیب تراش پکڑے ہی نہیں جاتے اور اگر کوئی پکڑا جائے تو اسے معمولی سزا یا بعض اوقات محض تنبیہ کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے جبکہ انیسویں صدی میں جیب کاٹنے والوں کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

میرے اور لوسی کے روزمرہ اخراجات بہت معمولی ہیں اور نہ ہی ہم دونوں کو مستقبل کے لیے اپنا بینک بیلنس بڑھانے کی فکر ہے۔ اس لیے ہم دونوں نے کبھی انٹرنیٹ کے ذریعے پیسے چرانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ جیسا کہ میں نے کہا، ہماری ضروریات بہت محدود ہیں اور ہمیں صرف اتنی رقم چاہیے جس سے بلوں کی ادائی ہوسکے اور کچھ پیسے اپنے ہنی مون کے لیے پس انداز کرسکیں جو ہم کیریبین کے ساحل پر منانا چاہتے ہیں۔ اس خواہش کے پورا ہونے میں یہی مسئلہ ہے کہ ہمارے پاس مکان کا کرایہ، بل اور سفری اخراجات کے بعد کچھ نہیں بچتا اور اسی وجہ سے ہمیں اپنی ملازمتوں سے نفرت ہونے لگی تھی جہاں آٹھ گھنٹے سر کھپانے کے بعد بھی ہم اپنی حسرتوں کا ماتم کرتے رہتے تھے۔

جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس وقت لوسی کو ایک ریستوران میں ویٹرس، کیشیئر اور ہوسٹس کے طور پر کام کرتے ہوئے کئی برس ہوچکے تھے اور وہ اس ملازمت سے بےزار ہوچکی تھی۔ کچھ یہی حال میرا بھی تھا۔ میں اکاؤنٹینٹ کے طور پر کام کررہا تھا لیکن آمدنی کم ہونے کی وجہ سے روزانہ کام پر جانا مجھے ایک عذاب لگتا تھا شاید اسی ذہنی کیفیت کے سبب ہم ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرنے لگے۔ اس رات میں اپنی ذہنی پریشانیوں سے وقتی طور پر نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے ریستوران گیا۔ وہ سیاہ اسکرٹ میں ملبوس میری میز پر آئی اور میرے سامنے مینیو رکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔

”تم کیا لینا پسند کروگے؟“

میں نے اس کے لہجے کی کڑواہٹ کو بالکل بھی محسوس نہیں کیا۔ جانتا تھا کہ اس معمولی سی تنخواہ میں دن بھر گاہکوں کو نمٹانے کے بعد کسی ویٹرس سے شیریں کلامی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ میں نے ایک نظر حروف تہجی کے اعتبار سے لکھے جانے والے سوپ کی فہرست پر ڈالی اور بولا۔

”سوپ کے علاوہ کچھ بھی لے آؤ۔ میں سارا دن اپنے آفس کمپیوٹر پر حروف تہجی دیکھ دیکھ کر تھک گیا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ”اور میں سارا دن گاہکوں کو آج کی خصوصی ڈش کے بارے میں بتاتے بتاتے تھک گئی ہوں۔“

”تمہیں یہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں، میں پہلے سے سوچ کر آیا ہوں کہ کیا منگوانا ہے۔“

”میں سمجھ گئی، اسپاگیٹی اور گوشت کی بوٹیاں۔“

میں نے جواب میں ایک ایسا جملہ کہا جسے سن کر وہ ناراض ہوسکتی تھی لیکن اس کے چہرے پر ایک خیر مقدمی مسکراہٹ پھیل گئی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اسے میری تجویز سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور سڑک کے کونے پر واقع بار میں بیٹھ کر اس کی شفٹ ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مستانہ چال چلتی اور مسکراہٹیں بکھیرتی وہاں آ گئی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے بےتکلف ہوگئے اور اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ میرے مقابلے میں زیادہ غیر مطمئن تھی اور جلد از جلد یہ ملازمت چھوڑنا چاہ رہی تھی۔ ہم دیر تک بیٹھے ووڈکا سے شغل کرتے رہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر لوسی کی قربت کے نشے نے مجھے مدہوش کردیا تھا۔ ہماری گفتگو کی ابتدا ملازمت چھوڑنے اور کوئی دوسرا کام شروع کرنے کے حوالے سے ہوئی تھی پھر آہستہ آہستہ اس پر غیر سنجیدگی کا عنصر غالب آتا گیا۔ اس نے نشے میں جھومتے ہوئے تجویز دی کہ ہم دونوں مل کر لوگوں کے پرس چھیننے اور جیبیں کاٹنے کا دھندا شروع کردیں۔

”ہمیں اپنی ملازمت چھوڑنے کے بارے میں بالکل بھی فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری جگہ لینے کے لیے کئی ضرورت مند موجود ہیں۔“

”میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا ہمارے پاس اس ملازمت کو جاری رکھنے کی کوئی معقول وجہ ہے۔“ میں نے اس تجویز پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہم کافی دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ لوسی کا کہنا تھا کہ اس کام میں کمائی بہت ہے جبکہ پکڑے جانے کا امکان برائے نام ہے۔ اگر قسمت ساتھ دے جائے تو ایک ہی واردات میں اتنا کچھ ہاتھ لگ سکتا ہے جو ہم دونوں کی مہینے بھر کی کمائی سے بھی زیادہ ہوگا۔ اگلی دو ملاقاتوں میں ہم دونوں آزمائشی طور پر یہ کام شروع کرنے کے بارے میں متفق ہوچکے تھے کیونکہ دوسرے منصوبوں کے مقابلے میں یہ کام ہمیں زیادہ آسان نظر آیا جس میں پلے سے کچھ خرچ نہیں کرنا تھا جبکہ آمدنی کے مواقع لامحدود تھے۔

ہم نے اپنی پہلی آزمائشی واردات کے لیے اس دن کا انتخاب کیا جب میکرز نامی مشہور باسکٹ بال ٹیم کو میڈیسن اسکوائر گارڈن میں میچ کھیلنا تھا۔ اس پرہجوم جگہ پر ہم بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور بالکل یوں لگا جیسے ہم نے کسی دو سالہ بچے کا لولی پاپ چرا لیا ہو۔ ہمارا نشانہ ایک سفید بالوں والا شخص تھا جس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور دیکھنے میں معزز نظر آرہا تھا۔ لوسی نے اسے باتوں میں الجھا لیا اور میں نے عقب سے جاکر اسے ہلکے سے اس طرح دھکا دیا جیسے اس میں میرے ارادے کو دخل نہ ہو۔ کسی بھی پرہجوم جگہ پر اس طرح کا ٹکراؤ ایک عام سی بات ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھ ساڑھے تین سو ڈالرز آئے جو یقیناً ایک خالص منافع تھا۔

”یہ شکار تو بہت ہی آسان ثابت ہوا۔“ لوسی چہچہاتے ہوئے بولی۔

”کیونکہ تم میرے لیے خوش بختی کی علامت ثابت ہوئی ہو۔“

اس کے بعد میں اور لوسی اپنا بیشتر وقت ایک ساتھ گزارنے لگے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور گھومنا پھرنا سب اکٹھے تھا۔ ہم کوئی بھی واردات کرنے سے پہلے اس کی اچھی طرح منصوبہ بندی کرتے اور ہماری کوشش یہی ہوتی کہ

پرہجوم جگہوں پر شکار تلاش کیا جائے۔ ہر کاروبار کی طرح اس کام میں بھی اچھے اور برے دن دیکھنا پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایک ہی داؤ میں خاصی بڑی رقم ہاتھ لگ جاتی ہے جبکہ بعض اوقات کئی مرتبہ کی کوشش کے باوجود کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مثلاً ایک مرتبہ ساراتوگا کے سیرو ریستوران میں لوسی نے ایک مالدار بیوہ کا پرس اڑایا اور واش روم میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ کیونکہ پانچ سو ڈالرز کی رقم اس بڑھیا کے پرس سے لوسی کی جیب میں منتقل ہوچکی تھی اور وہ عورت سراسیمگی کے عالم میں اپنا پرس تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ مجھے اس عورت کی بے چارگی پر بڑا ترس آیا لیکن لوسی نے یہ کہہ کر مجھے تسلی دی کہ وہ پیسے اس عورت کے نہیں بلکہ ہمارے تھے اسی لیے تو ہمیں مل گئے، اس کے برعکس کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ہم نیویارک کے بارونق کلبوں میں کئی گھنٹے گزارنے کے باوجود خالی ہاتھ واپس آئے۔ اسی لیے ہمیں ساراتوگا پسند تھا جہاں کم ازکم دو مہینے ایسے ضرور ہوتے جب لوگ اپنی جیبوں میں نوٹ بھر کر مختلف قسم کی تفریحات سے لطف اندوز ہورہے ہوتے۔

اس سال کے شروع میں ہی دو ایسے واقعات پیش آئے جب میں اور لوسی جیل جانے سے بال بال بچے۔ یہ جنوری کے مہینے کی بات ہے جب میں جائنٹ اسٹیڈیم کے باہر شکار کی تلاش میں ٹہل رہا تھا کہ میری نظر ایک مقامی کھلاڑی پر گئی جس کا پھولا ہوا بٹوا اس کی جیب سے باہر نکلا ہوا تھا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا اس کے پاس اس میچ کے ٹکٹ ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ انتظامیہ کھلاڑیوں کو محدود تعداد میں ٹکٹ دیتی ہے تاکہ وہ اپنے رشتہ داروں یا دوستوں کو میچ دیکھنے کی دعوت دے سکیں اور کھلاڑی بالعموم یہ ٹکٹ گیٹ کے باہر کھڑے ہوئے تماشائیوں کو فروخت کردیتے ہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور مڑ کر پیچھے کی جانب دیکھنے لگا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اتنی دیر میں میری انگلیاں حرکت میں آچکی تھیں لیکن بدقسمتی سے وہ بٹوا میری جیب میں جانے کے بجائے زمین پر گر گیا۔ جیسے ہی میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا، اس کے پیچھے رہ جانے والے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ شاید بھانپ چکا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اسی لیے وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ اگر میں ان کے ہاتھ آجاتا تو وہ سب مل کر میری اتنی دھنائی کرتے کہ مجھے کئی ہفتے تک اسپتال میں رہنا پڑتا۔ اس لیے میں نے اس بٹوے پر لعنت بھیجی اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سب میرے تعاقب میں تھے۔ میں مجمع کے بیچ میں سے راستہ بناتا تیزی سے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھا اور ایک پک اپ پر چڑھ کر اس کے فرش پر لیٹ گیا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ تعاقب کرنے والے مایوس ہوکر واپس جا چکے ہوں گے تب میں پک اپ سے باہر نکلا لیکن اس کے بعد کئی گھنٹے تک کندھے کے درد نے مجھے بے چین کیے رکھا۔

لوسی کو بھی کئی بار اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک واقعہ جون کے مہینے میں پیش آیا جب اس کے جیل جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس نے کسی کے پرس سے ایک کریڈٹ کارڈ چرایا تھا۔ لوسی کا خیال تھا کہ جب تک کارڈ کے مالک کو اس کی گمشدگی کا علم ہوگا تب تک وہ اس کارڈ سے فائدہ اٹھا چکی ہوگی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آج کل سیل فون کی وجہ سے کارڈ کی گمشدگی کی رپورٹ فوراً ہی کی جاسکتی ہے، چنانچہ جیسے ہی وہ کاؤنٹر پر گئی اور کیشئر نے اس کارڈ کو مشین پر پھیرا تو اسکرین پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ لوسی سمجھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے گوکہ اسے اس قسم کی صورت حال میں اپنی لچھے دار گفتگو سے معاملے کو سنبھالنے کا ہنر آتا تھا لیکن اس وقت اس کے پاس اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کا کوئی موقع نہ تھا لہٰذا اس نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس سے پہلے کہ سیکیورٹی کا عملہ اس کا راستہ روکتا وہ تیزی سے چلتی ہوئی اسٹور سے باہر آئی اور سڑک پار کرکے ایک گلی میں غائب ہوگئی۔

اس رات وہ بہت تھکی ہوئی اور بے زار نظر آرہی تھی۔ اس نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

”میں اس طرز زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”وہ وقت بھول گئیں جب نو سے پانچ اپنی ہڈیاں رگڑتی تھیں اور پھر بھی تمہاری جیب خالی رہتی تھی۔“

”کم ازکم اس کام میں جیل جانے کا خطرہ تو نہیں تھا۔“

”پریشان مت ہو لوسی!“ میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”قسمت ہم پر ضرور مہربان ہوگی اور یہ مت بھولو کہ اگلے مہینے ساراتوگا میں گھوڑوں کی دوڑ ہونے والی ہے۔“

ساراتوگا کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ اس لیے نہیں کہ وہ جگہ ہمارے کاروبار کے لیے بڑی موزوں تھی بلکہ وہاں دلچسپی کا اور بھی سامان تھا جو کسی بھی جوئے کے لیے باعث کشش ہوسکتا تھا۔ مثلاً براڈوے کا علاقہ جو پرانے شہر کے وسط میں واقع تھا جہاں مختلف اشیا سے بھری ہوئی دکانیں قطار در قطار واقع تھیں۔ اس کے علاوہ یورو پین طرز کے کیفے، وکٹورین طرز کے کپڑوں کے بوتیک اور ہاتھ سے بنے ہوئے زیورات کی دکانوں کے علاوہ تازہ پھولوں سے بنے ہوئے بوکے بھی اپنی بہار دکھا رہے ہوتے۔ پھر وہاں ایڈیلفی ہوٹل جیسی رومان پرور جگہ تھی جہاں ہم ہمیشہ قیام کرنا پسند کرتے تھے۔ اس کی خوب صورت لابی میں آرام دہ کرسیاں رکھی ہوتی تھیں جہاں بیٹھ کر آپ دن بھر کی تھکن دور کرسکتے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر کانگریس پارک تھا جہاں ہم رات کے کھانے سے پہلے چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ رات کا کھانا ہم عموماً بغلی سڑک پر واقع ایک ریسٹورنٹ میں کھاتے جہاں دنیا بھر کے خوش ذائقہ کھانے دستیاب تھے۔ اتنی ساری دلچسپیاں اور پھر گھڑدوڑ کے دو میدان، اس سے زیادہ ہمیں زندگی میں اور کیا چاہیے تھا۔

* * *

ساراتوگا ریس کورس گراؤنڈ میں تماشائیوں اور گھڑدوڑ میں شرط لگانے والوں کے لیے نشستیں اس طرح لگائی گئی تھیں کہ وہ اپنے پسندیدہ گھوڑوں اوران پر سوار جوکی کو بہ آسانی دیکھ سکیں، میں نے لوسی کو قائل کرلیا تھا کہ ہمیں اگلی نشستوں پر جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جہاں بیٹھ کر بہ ظاہر تو ہم گھڑدوڑ سے متعلق شیٹ کا مطالعہ کرتے نظر آئیں گے لیکن حقیقت میں اپنے شکار کو ڈھونڈ رہے ہوں گے جس کے ذریعے ہمارے اکاؤنٹ میں مزید کچھ ڈالرز کا اضافہ ہوسکے۔ لوسی نے اپنی نشست پر بیٹھ کر اپنی کمر پشت سے لگا دی اور ٹانگیں پھیلا کر ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک ہی ایک شخص کیمرا لیے ہمارے سامنے آگیا اور اس نے ہماری تصاویر لینا شروع کردیں۔ اس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ مقامی اخبار ”دی ساراتوگیان“ کے لیے ریس میں آنے والے خوش شکل جوڑوں کی تصویریں اتار رہا ہے گوکہ ہمیں اپنے خوش شکل ہونے پر کوئی شک نہیں تھا لیکن میں فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تاکہ اسے اس آزادی کا فائدہ اٹھانے سے روک سکوں لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے اس کے حقوق یاد دلاتا وہ ایک ہی جست میں ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ اگر وہ تصاویر اخبار میں شائع ہوجاتیں تو پھر ہمیں شناخت کرنا آسان ہوجاتا اور ہم ریس کورس میں آئندہ کوئی کارروائی نہیں کرسکتے تھے لہٰذا میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ اس شخص کا تعاقب کرکے وہ تصویریں ضائع کردوں۔ میں وقت ضائع کیے بغیر اس جانب دوڑ پڑا جہاں وہ شخص ہجوم میں گم ہوا تھا۔ لوسی میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

ریس دیکھنے والوں کے درمیان میں سے راستہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بہرحال ہم کسی نہ کسی طرح اس مجمع کو چیرتے ہوئے باہر نکل آئے لیکن تب تک وہ فوٹوگرافر ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ ہم نے اسے ہر جگہ تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں نے مایوسی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے لوسی سے کہا۔ ”لگتا ہے ہمیں ساراتوگا سے فوراً نکلنا ہوگا۔“

”ہمیں یہاں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔“ لوسی منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ابھی تو ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔“

”اگر ان تصویروں میں سے ایک بھی اخبار میں شائع ہوگئی تو ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔“

لوسی بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”لگتا ہے، قسمت ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ہے۔“

”ضروری نہیں۔“ میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ ”اگر یہ تصویریں اخبار میں چھپ گئیں تب بھی مجھے یقین ہے کہ اگلے سال تک کوئی انہیں یاد نہیں رکھے گا پھر بھی ہم احتیاطاً بھیس بدل کر یہاں دوبارہ آسکتے ہیں۔“

میرے لیے اپنے لباس اور وضع قطع میں تبدیلی کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے صرف اتنا کرنا تھا کہ نیلے بلیزر کوٹ کی جگہ اسپورٹس جیکٹ اور سیاہ بوٹ کے بجائے ٹینس شوز پہن لیتا اور اپنے بھورے بالوں کو چھپانے کے لیے سر پر بیس بال کیپ جما لیتا۔ البتہ فیشن کی مناسبت سے لوسی کے لیے یہ ایک بڑا دردسر ہوسکتا تھا۔ میں نے ہمیشہ لوسی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس طرح بن ٹھن کر باہر نہ نکلا کرے کہ ہر ایک کی نظریں اس پر جم کر رہ جائیں لیکن وہ میری کہاں سنتی تھی۔ اسے تو ملکۂ حسن بننے کا شوق تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ اگر بھیس بدلنے کا مرحلہ آیا تو وہ مروجہ فیشن سے جان چھڑا سکے گی۔

ہم دونوں مایوسی کے عالم میں واپسی کے ارادے سے لوٹ رہے تھے کہ اچانک ہی لوسی سامنے والے گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو ڈینی! وہ رہا۔“

لوسی کی تیز نگاہوں نے فوٹوگرافر کو دیکھ لیا تھا اور وہ اپنی انگلی سے اسی کی جانب اشارہ کررہی تھی۔ ہم دونوں تیزی سے اس جانب بڑھے۔ اب ہمارے چہروں کی سختی نرمی میں بدل چکی تھی اور امید ہوچلی تھی کہ شاید ہماری خوش

قسمتی واپس لوٹ آئے۔ ریس دیکھنے والوں کے جھرمٹ میں سے جگہ بناتے ہوئے ہم اس شخص کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب ہم اس سے بہ مشکل چالیس فٹ پیچھے تھے۔ بیرونی گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ ایک کھانے پینے کے اسٹال کے قریب رکا۔ اس نے اپنا کیمرا کندھے پر لٹکایا اور لوگوں کی اس قطار میں شامل ہوگیا جو آرڈر دینے کے انتظار میں لگائی گئی تھی۔

لوسی اور میں بھی اس سے کچھ فاصلے پر رک گئے۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے ریس کی شیٹ سے چھپا لیے پھر میں نے اپنا سر گھما کر لوسی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”کوئی ایسا لڑکا تلاش کرو جسے کچھ پیسے کمانے سے دلچسپی ہو۔ تب تک میں اس شخص پر نظر رکھتا ہوں۔“

لوسی کی آنکھوں میں چمک ابھری جیسے وہ میرے خیال سے پوری طرح متفق ہو پھر دوسرے ہی لمحے وہ بھیڑ میں غائب ہوگئی۔ مجھے اپنے پارٹنر کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ وہ بروقت فیصلہ اور اس پر عمل کرنا جانتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے گفتگو کا ہنر آتا تھا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹوں بعد ہی وہ ایک لڑکے کے ہمراہ میری جانب چلی آرہی تھی۔ اس دوران وہ فوٹو گرافر بھی کاؤنٹر تک پہنچ کر اپنے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دے رہا تھا۔

”یہ لڑکا ہماری مدد کرسکتا ہے۔“ لوسی بولی پھر اس نے لڑکے سے کہا۔ ”ہم اپنے دوست سے ایک چھوٹا سا مذاق کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کرو گے۔ اس چھوٹے سے کام کے عوض بیس ڈالر ملیں گے۔“

”بہت خوب۔“ میں نے اس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ لڑکے کی عمر تیرہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا قد مجھ سے بھی زیادہ تھا اور لمبے لمبے بالوں نے اس کی آنکھوں اور کانوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ لڑکے نے بے یقینی سے کہا۔ شاید وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ایسا کون سا کام ہے جس کے عوض اسے بیس ڈالر مل سکتے ہیں۔

جب میں نے اسے ساری بات سمجھائی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بیس ڈالر کب ملیں گے؟“

میں نے اپنے بٹوے میں سے بیس ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور اسے اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”جیسے ہی تم اپنا کام ختم کرلو گے، یہ رقم تمہیں ادا کر دی جائے گی۔“ یہ کہہ کر میں نے وہ نوٹ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

لڑکے نے پہلے نوٹ اور پھر لوسی کی جانب دیکھا جو مسلسل اس پر مسکراہٹیں نچھاور کررہی تھی پھر بولا۔

”ٹھیک ہے۔“

جیسے ہی میں نے اس فوٹو گرافر کی جانب اشارہ کیا تو لڑکے نے اس کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ شخص کاؤنٹر سے اپنی مطلوبہ اشیا حاصل کرچکا تھا اور کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جہاں بیٹھ کر وہ اپنے لنچ سے لطف اندوز ہوسکے۔ لڑکا کاؤنٹر تک گیا اور وہاں سے رائی کی چٹنی کی بوتل اٹھا کر فوٹو گرافر سے بولا۔

”اگر تم اس چٹنی کے ساتھ ہاٹ ڈاگ کھاؤ گے تو زیادہ مزہ آئے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے پلاسٹک کی بوتل کو اس کے سامنے لے جا کر زور سے دبایا اور دوسرے ہی لمحے فوٹو گرافر کے چہرے اور قمیص پر زرد رنگ کی چٹنی پھیل گئی۔ لڑکا پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا جیسے اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ پر لطف منظر دیکھا ہو۔ فوٹو گرافر نے غصے میں آکر زور سے اسے ہاتھ مارنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اس کے کندھے سے کیمرا پھسل کر زمین پر گر پڑا۔ اس سے پہلے کہ فوٹو گرافر دوبارہ اس پر حملہ کرتا۔ اس لڑکے نے دوڑ لگائی اور ہجوم میں غائب ہوگیا۔

لوسی اور میں نے وہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے فوٹو گرافر کو ہلکا سا دھکا دیا اور لوسی نے لپک کر وہ کیمرا زمین سے اٹھالیا۔ اس کے بعد ہم تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھے اور باہر سڑک پر آگئے۔ وہ لڑکا مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا البتہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ فوٹو گرافر دوڑتا ہوا ہماری جانب آرہا تھا ہم نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا لیکن وہ مسلسل ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ ہمارے بہت قریب آچکا تھا لیکن ہم ابھی تک اس کے ہاتھ نہیں آسکے تھے۔ اس کی سانس بری طرح پھول چکی تھی اور اس کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اور زور سے چلایا۔

”انہیں روکو۔“

اس کے عجیب و غریب حلیے کو دیکھ کر راہ چلتے لوگ اس کی ذہنی حالت پر شبہ کر رہے ہوں گے۔ اس کی چیخ و پکار پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ اس دوران ہم ایک پارکنگ لاٹ میں گھس چکے تھے اور کاروں کے بیچ میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ شخص اب ہمیں نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی اس کے چیخنے چلانے کی آواز سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ اب ہم

دوڑنے کے بجائے تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے تاکہ اس کے اور ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا جائے۔

کچھ دیر بعد ہم درختوں کے ایک جھنڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جو ریس کورس سے چند بلاک کے فاصلے پر تھا۔ اس کے چاروں طرف باڑھ لگی ہوئی تھی۔ ہم ستانے کے لیے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد جب ہماری سانس قابو میں آئی اور یقین ہوگیا کہ فوٹو گرافر ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تو لوسی بولی۔ ”اس لڑکے کے بیس ڈالرز کا کیا ہوگا؟“

”یوں سمجھ لو کہ ہماری دولت میں بیس ڈالرز کا اضافہ ہوگیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کم از کم ہم نے اس لڑکے کو ایک اچھا سبق سکھا دیا۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ لوسی حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”یہی کہ زندگی میں ہار جیت چلتی رہتی ہے۔“

لوسی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی جو میں نہیں سن سکا پھر اس نے اپنا رومال نکالا اور اس سے کیمرے کے کیس پر لگی ہوئی چٹنی صاف کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ بولی۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”میرے خیال میں اب ہمیں یہاں سے جانا ہی ہوگا۔“

یہ تو ہم دونوں ہی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ کیمرے والا اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ یہ اتنی بڑی جگہ نہیں تھی کہ وہ ہمیں تلاش نہ کر پاتا۔ ہمارے لیے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ریس کورس ہی تھا جہاں اب ہمارے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص وہاں روزانہ آئے گا اور صرف اس سیزن میں ہی نہیں بلکہ اگلے سال اور اس سے اگلے سال بھی وہ ہماری تلاش جاری رکھے گا۔

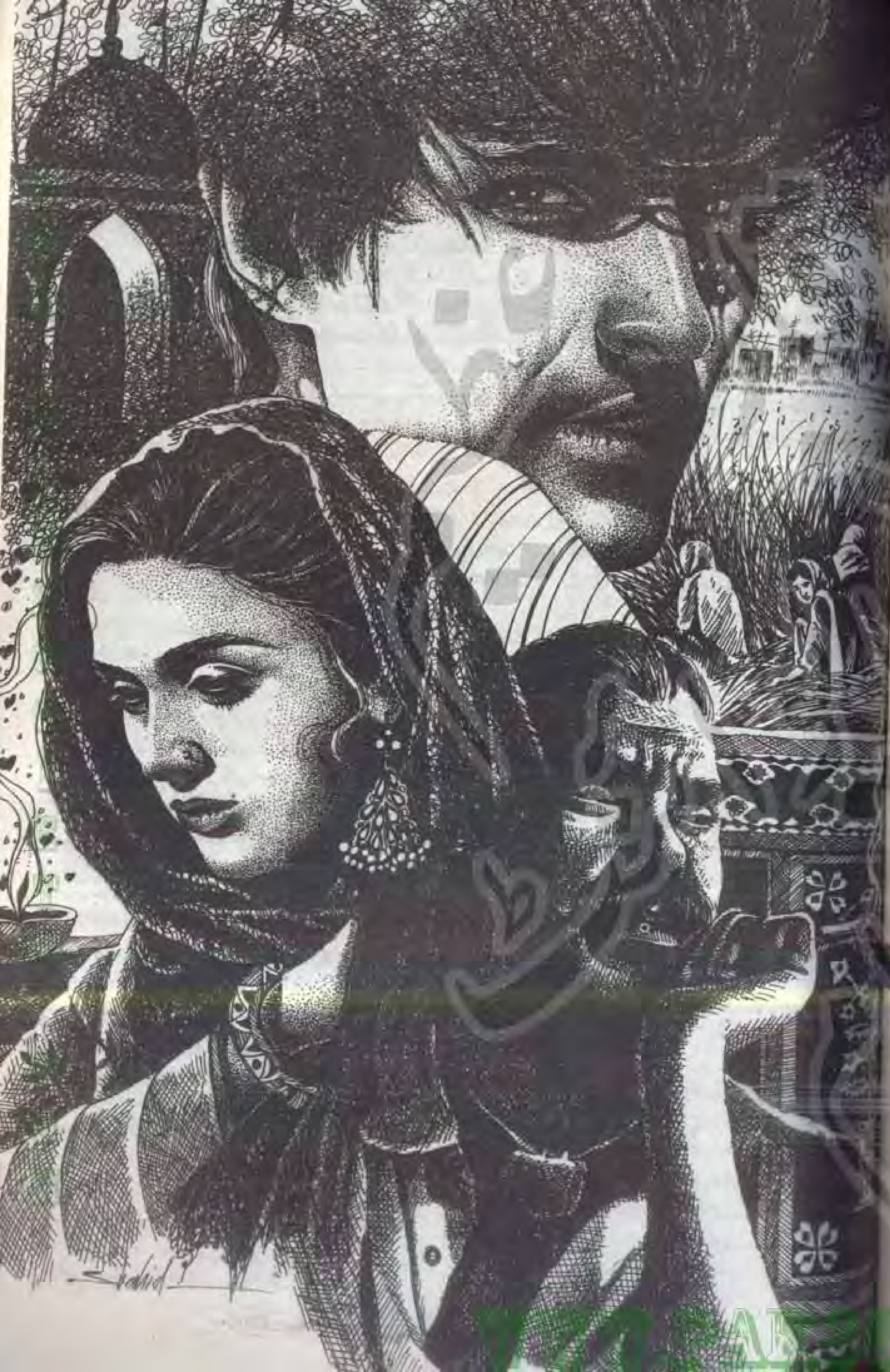
لوسی نے کوئی بحث نہیں کی اور اپنے کپڑوں پر سے گھاس جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بھی کیمرا کندھے سے لٹکایا اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ تھوڑی دور دھوپ میں چلنے کے بعد ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی جس میں بیٹھ کر ہم اسٹیشن چلے آئے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سارا توگا میں ہونے والے نقصان پر دونوں ہی افسردہ تھے اور مسلسل بڑبڑا رہے تھے۔

✈✈✈

نیو یارک میں حالات پہلے سے زیادہ خراب تھے۔ لگتا تھا کہ لوگوں نے جیب میں پیسے رکھنا ہی چھوڑ دیے ہیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں اپنے کاروباری معاملات میں بہت زیادہ سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے کہ ان حالات سے مجبور ہوکر مجھے دکانوں کے شوکیس سے کانوں کی بالیاں، گلے کے ہار اور بریسلیٹ بھی چرانے پڑ گئے۔ یہ جیب تراشی نہیں بلکہ چوری ہے لیکن دل کی تسلی کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس طرح دکان مالک کی جیب کاٹ رہے تھے۔ اس کام میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ چوری کیے ہوئے سامان کو فروخت کر کے نقد رقم میں تبدیل کرنا بھی کسی خطرے سے کم نہیں تھا۔

سارا توگا سے ناکام واپس لوٹنے اور نیو یارک میں لوگوں کی خالی جیبیں ٹٹولنے کے بعد ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ دوبارہ نو سے پانچ بجے کی ملازمت کر کے ایک بار پھر اپنی خواہشات اور ارمانوں کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہوجائیں حالانکہ ہمیں یہ خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی کہ ان حالات میں ہمیں دوبارہ کوئی ملازمت مل سکتی ہے لیکن اس تلخ حقیقت کو قبول کرنے سے ہم اس بات پر متفق ہوچکے تھے کہ بینک کے خصوصی اکاؤنٹ سے تمام رقم نکال کر شادی کے جوڑے خریدیں تاکہ لوسی کو اس منگنی کی انگوٹھی سے نجات مل سکے جو اس کی انگلی میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

ہم نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی ہنی مون منانے کے لیے بہاماس کے ایک خوب صورت جزیرے لاگوراڈیا چلے جائیں گے جہاں ہمارا قیام ساحل پر واقع ایک ہوٹل میں ہوگا جہاں ہم سارا دن نیلگوں پانی میں تیراکی کریں گے اور ہماری شام ان فضول خرچ مردوں اور خوب صورت عورتوں کے درمیان گزرے گی جو جوئے خانے میں اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔ ایک نو بیاہتا جوڑا جو سر سے پاؤں تک ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبا ہوا ہو، اسے بھلا کسی کی جیب یا پرس سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے لیکن جب حالات پوری طرح کاروبار کے لیے سازگار ہوں تو مواقع سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ دو ماہ کے ہنی مون میں ہم نے اتنا کما لیا جو پورے سال کے لیے کافی تھا۔ اب ہم دونوں کو ملازمت پر واپس جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ اگلے سال شادی کی سالگرہ اور تعطیلات منانے کے لیے بھی یہی جزیرہ مناسب رہے گا۔





ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر: 12

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پرادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل وگلزار سے راہِ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی رودادِ حیات

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستانِ سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خونچکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنالیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کردیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص مگر کچھ تو تلے انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر ۔ میں ان سے عملی

تربیت بھی حاصل کررہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہوگیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کردیا جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنادیا۔ جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیرِ علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہوگئی زیناں نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہارِ الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہوگیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کردیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں سب کھالے پر لعن طعن کررہے تھے میں نے اسے معاف کردیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کرلیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آگیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہوگئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہوگیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثرورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔ یہاں سے فارغ ہوکر نور پور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلا ڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیا نامی لڑکی سے ہوئی جس نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہوگیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمتِ عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آگیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرالیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرادی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چاٹنے پر مجبور کردیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ ہم ڈیرے پر پہنچے لیکن وہاں ہمارے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی، وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دل جیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کرکے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کرکے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کرکے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نور پور سے نکال لانا چاہیے لہٰذا ہم نور پور پہنچے لیکن، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو خالی ہاتھ تھا، اسے یوں مایوس دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا اور ایک سابق فوجی ہماری خدمت پر مامور تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نور پور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائیداد کی خاطر، بخت جان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں پیا نے میری تربیت کی اور مجھے فارم ہاؤس میں میڈم سے ملاقات کا حکم ملا لیکن یہ ملاقات

ایک خونی مقابلے کی صورت تھی جس میں، میں بہ مشکل تمام غالب رہا یہ میڈم کے امتحان لینے کا ایک طریقہ تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کردیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی کے سفر میں ہم جب گاڑی میں بیٹھے تو عقب سے ہم پر ... اٹھا لے گئے۔ میڈم نے نہایت ڈرامائی انداز میں ان دونوں کو قابو کرلیا تعارف کرانے پر معلوم ہوا کہ وہ دونوں نامی گرامی ڈاکو تھے۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کرکے رقم وصول کرنے کی ذمہ داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ کردیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے گرگے رنگو قصائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا وہ چہرہ دیکھ کر میرے سارے زخم تازہ ہوگئے لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رنگو قصائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے بس میں گھر جارہا تھا کہ اچانک مجھے اغوا کرلیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا میرے لیے اجنبی نہیں تھا وہ ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے موبی کا دوست زور آور تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے کیوں یرغمال بنا رہا ہے لیکن بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کرچکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہوگیا اس دوران حیدر خان نے استاد ببلو کے ساتھ مجھے خریدنے کی کوشش بھی کی۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہوگئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہد نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ وہ چاچا کی جائیداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکر ادا کرکے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم نے ایک میٹنگ رکھی تھی جہاں اس کے تمام قابلِ اعتماد لوگ شریک تھے۔ میرا تعارف کرایا گیا اور چند ذمے داریاں سونپی گئیں۔ میٹنگ کے بعد میڈم کے ساتھ کچھ رنگین و سنگین لمحات گزرے پھر اسے ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کردی میں نے ضد کرکے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعثِ حیرت نہ تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور پیرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس کے بعد ہمارا ٹکراؤ پولیس سے ہوگیا۔ اس سے گلوخلاصی کے بعد کچھ فرصت کے لمحات میسر آئے تھے کہ میڈم کی چیخ سنائی دی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وقت بدلنے کی کئی وارداتیں سن رکھی تھیں۔ دیکھ بھی رکھی تھیں۔ امیر کو غریب اور غریب کو امیر ہوتے سن رکھا تھا۔ ہنستے کھیلتے انسان کو خون میں لت پت دیکھنے والی آنکھوں کو اتنا تعجب کبھی نہیں ہوا تھا جتنا چند لمحوں میں بدل جانے والے منظر کو دیکھ کر ہوا تھا۔

میں نے اپنا سر جھٹکا اور ریت پر بچھی ہوئی استعجاب انگیز بساط کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں چمکتی ہوئی سیاہ لینڈ کروزر سے چند قدموں کے فاصلے پر، جہاں چند لمحے پیشتر میڈم فرحت انگیز انداز میں ریت کے ٹیلے پر ٹہل رہی تھی، وہاں موجود نہیں تھی بلکہ چند گز دور ریت پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی اور ایک دیوہیکل شخص اُسے ڈنڈوں سے پیٹ رہا تھا۔ میڈم کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ سن کر میں گویا ہوش میں آگیا اور ریت پر کود کر گالیاں دیتا ہوا بگٹٹ دوڑا۔ میری آواز سن کر اس نے اپنا ہاتھ روک لیا، پلٹ کر مجھے دیکھا اور حلق کے بل چیخا۔ ”قریب نہ آنا ورنہ تمہیں بھی جان سے ماردوں گا۔“

میڈم کو تڑپتا ہوا دیکھ کر میں موت کے خوف سے رُک نہیں سکتا تھا۔ آن کی آن میں گاڑی تک پہنچ گیا۔ اس مختصر وقت میں میڈم اس کی ٹانگوں کے بیچ ریت پر تڑپتے تڑپتے ساکت ہوگئی تھی اور وہ خاصا موٹا اور لمبا چوبی ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے گن سیدھی کی، اس کے سینے کا نشانہ لیا اور غرّایا۔ ”ڈنڈا پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کرلو ورنہ گولی ماردوں گا۔“

گن کو دیکھ کر اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے شاید میرے پاس گن کی موجودگی کا اندازہ نہیں تھا۔ اس نے اپنا رُخ بدلا اور بغیر کچھ کہے چوبی ڈنڈا ایک طرف پھینک کر میڈم کے پیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں اس کی اس حرکت کو ہرگز سمجھ نہ پایا تھا۔ تبھی میں نے اُسے ڈانٹا۔ ”گدھے کے بچے! کھڑے ہوجاؤ اور ہاتھ اُٹھالو۔“

اس کی پشت میری جانب تھی۔ وہ اُٹھتے اُٹھتے رُک گیا، پھر قدرے آگے کی جانب کھسک کر بیٹھ گیا۔ اس کے حلق سے ایک قہقہہ برآمد ہوا جو میرے لیے نہایت غیر متوقع تھا۔ ساتھ ہی اُس کی بھاری آواز گونجی۔ ”اب تم اپنی گن پھینک دو ورنہ میں اسے ذبح کردوں گا۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میڈم سخت خطرے میں تھی۔ نہ جانے اسے کہاں اور کتنی گہری چوٹ آئی تھی کہ وہ بے حس پڑی تھی۔ اس پر سوار وحشی شخص کی دھمکی سے عیاں تھا کہ اس کے پاس ڈنڈے کے علاوہ کوئی چاقو یا خنجر بھی موجود تھا جسے وہ میڈم کے نرخرے پر رکھ کر مجھے پسپائی پر مجبور کررہا تھا۔

اب وہ گردن موڑ کر میری طرف خون آشام نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ناکافی روشنی کے باوجود اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے جھلکتی درندگی عیاں ہورہی تھی۔

میں بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ وہ مجھ سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ گولی چلاتا تو وہ مرنے سے قبل میڈم کی شہ رگ کاٹ دیتا۔ کھڑے رہ کر وقت ضائع کر رہا تھا۔ میں نے گن تانے رکھی اور سخت لہجے میں پوچھا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ جواب دینے کے بجائے بھیڑیے کی طرح غرایا۔ ''گن پھینک دو ورنہ......''

میں نے محسوس کیا کہ اس کے دیوانگی آمیز قہقہے اور غراہٹ کے پیچھے درشتی اور دلیری کارفرما نہیں تھی بلکہ آواز کی لرزش سے آشکار ہوتا تھا کہ وہ موت کے خوف اور دہشت سے دوچار تھا اور زندگی کی آخری تگ و دو میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ایسی حالت میں انسان، انسان نہیں رہتا، درندہ بن جاتا ہے۔ تبھی مجھے بڑی احتیاط سے کام لینا تھا۔

میں جواباً غرایا۔ ''تم کھڑے ہو جاؤ ورنہ......''

اسے سمجھ آ گئی کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ نہ وہ میڈم پر ہاتھ چلا کر زندہ رہ سکتا تھا نہ میں اُسے گولی مار کر میڈم کو بچا سکتا تھا۔ نسبتاً کم سخت انداز میں بولا۔ ''کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری ساتھی کی گردن کاٹ دوں؟''

''اور کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارے بدن کو گولیوں سے چھلنی کر دوں؟''

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں دھمکی دی۔ ''تم مجھے جانتے نہیں ہو، میں پیرو ماچھی کا آدمی ہوں۔ یہ علاقہ ہمارا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر تم پیرو کے آدمی ہوتے تو ہم پر ہاتھ نہ اُٹھاتے اور تمہیں یہ علم بھی ہوتا کہ میں کون ہوں۔''

''کون ہو تم؟'' میری توقع کے مطابق وہ تشویش اور تردد کی لپیٹ میں آ گیا۔

''تم مجھے نہیں جانتے، اس لیے بتاتا ہوں کہ میں سردار حیدر خان کا بیٹا ہوں۔ پیرو ماچھی جیسے کئی فراری ہمارے ڈیرے پر پناہ لینے آتے ہیں۔'' میری آواز میں بے پناہ سختی تھی۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرا انداز بالکل ویسا ہی ہو، جیسا سردار حیدر خان کا ہوا کرتا تھا۔ چونکہ چوک قریشی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس نے حیدر خان کا نام ضرور سن رکھا ہوگا۔

ہم دونوں کی پوزیشنیں کمزور تھیں۔ میں پلک جھپکے بغیر اُسے دیکھ رہا تھا۔ میں برق رفتاری سے اس وحشی انسان کو میڈم سے دور ہٹانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ وہ بھی چند لمحوں تک مجھے یک ٹک دیکھتا رہا، آنکھیں گھما کر میری دونوں گنوں کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں استاد پیرو کو بابا کا پیغام اور تحفہ دینے آیا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر اپنی ساتھی سمیت گاڑی چھوڑ کر چھپ گیا۔ وہ حرام زادے میری گاڑی لے کر چلتے بنے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''ریڈ سے واپسی پر ان سے گاڑی حاصل کی۔ پھ نہیں ریڈ کا کیا بنا؟ پیرو ماچھی بچ گیا یا 'ٹیں' ہو گیا۔ سچ بتاؤ، تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو...... یہ ذہن میں رکھو کہ میں تمہیں پیرو ماچھی کے پاس لے کر جاؤں گا اور تمہارا جھوٹ ثابت ہونے پر تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''وہ کسی سے 'ٹیں' نہیں ہوتا۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''ڈیرے پر ریڈ کے وقت میں اکیلا تھا۔ پولیس کو چکر دے کر اس جیپ میں بیٹھ گیا اور اب تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

میرے حلق سے طویل سانس خارج ہو گئی۔ ہم نے پولیس کے جانے کے بعد اپنی گاڑی چیک کی تھی مگر صرف اگلی نشستیں دیکھی تھیں۔ وہ عقبی حصے میں کہیں دبکا بیٹھا تھا، تبھی نظر نہ آیا۔ میں نے گن کی نال جھکا لی اور تنبیہی انداز میں کہا۔ ''اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ بتاؤ، استاد کہاں ہے؟''

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ مجھ پر بھروسا کرے، نہ کرے۔ پھر بولا۔ ''وہ پار گیا ہے۔ یہ لڑکی کون ہے؟''

'پار' سے اس کی مراد دریا کی دوسری جانب کا علاقہ تھی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''بھولے بادشاہ! اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو، پھر کہتے ہو کہ تم پیرو کے آدمی ہو۔ یہ آج کی رات میری ہے۔ کل کسی اور کی ہوگی۔ آج اس کا نام شرمین ہے۔ کل ماریہ ہوگا۔''

وہ میری باتوں میں آ گیا اور آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔ پھر میری طرف مڑا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں لمبے پھل والا چمکدار خنجر دبا ہوا تھا۔ چاروں شانے چت پڑی ہوئی میڈم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر اس کی ضرورت ہے تو ہوش میں لانے کی تدبیر کرو ورنہ اُٹھا کر ڈھنڈ میں پھینک دو۔''

میں نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ''زندہ ہے تو ٹھیک ورنہ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''مراد بخش......'' وہ میڈم کی ٹانگ کو ٹھڈا مار کر میری طرف بڑھا۔ میرے قریب آیا۔ شاید وہ ابھی تک میری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ خنجر میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولا۔ ''غلطی میری نہیں، اس لڑکی کی تھی۔ میں تو اس گاڑی میں پولیس کے ڈر سے چھپا تھا۔ سوچا تھا کہ کہیں موقع پا کر نکل جاؤں گا۔ میں نے پولیس والوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو نہیں تھا، مگر مجھے اندازہ ہو گیا

تھا۔ جب میں نے جیپ کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا تو میدان صاف تھا۔ میں پچھلا دروازہ کھول کر بھاگنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی نے دیکھ لیا اور میرے پیچھے دوڑی۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ میں اس کا دشمن نہیں ہوں مگر اُس نے میری گردن پر مکا دے مارا۔ میرے پاس ڈنڈا تھا۔ میں نے اس کے سر میں دے مارا۔ مجھے علم ہوتا کہ تم لوگ استاد کے مہمان ہو تو میں اُسے ہرگز نہ مارتا۔''

اس کے لہجے میں شرمندگی کا عنصر شامل تھا۔ وہ اپنے لب و لہجے سے ان پڑھ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ گھاگ اور زیرک نہیں تھا اور ہمیں مزید نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس اسلحہ ہے؟''

''نہیں...... کیونکہ مجھے ڈیرے سے جلدی میں بھاگنا پڑا تھا۔''

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم اُدھر گاڑی کے پاس جا کر بیٹھو۔ میں اِسے دیکھتا ہوں، پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر گاڑی کی طرف چل دیا۔ سر دست اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے میں نے گن کندھے سے لٹکائی اور میڈم پر جھک گیا۔ وہ بے ہوش تھی مگر اس کی نبض اور سانسیں معمول کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ خطرے کی بات نہیں تھی۔ زخم کی نوعیت دیکھنے کے لیے اُسے سیدھا کیا اور بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا گاڑی کے سامنے لایا۔ گاڑی کے قریب کھڑے مراد بخش کو مخاطب کیا۔ ''گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کر دو۔''

اس نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے ناب گھما کر ہیڈ لائٹس آن کر دیں۔ میں اور میڈم ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں نہا گئے۔ میں جھکا اور میڈم کو بہ غور دیکھنے لگا۔

اس کا سنہرا ہیئر بینڈ کہیں گر گیا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اردگرد زمین پر نظر دوڑائی۔ چند قدموں کے فاصلے پر بینڈ کے تین چار ٹکڑے بکھرے دکھائی دیے۔ ہیئر بینڈ پر لگنے والی ڈنڈے کی ضرب نے نہ صرف اُسے توڑ پھوڑ دیا تھا بلکہ میڈم کے سر کی جلد بھی پھاڑ دی تھی جہاں سے خون رس کر بالوں میں پھیل چکا تھا۔ سر کو ٹٹولنے سے ایک بڑا سا گومڑ بھی محسوس ہوا۔ میں نے سرسری طور پر تمام جسم کو اور خصوصی طور پر گردن کو بھی دیکھ لیا۔ اسے کوئی اور چوٹ نہیں آئی تھی اور سر کا زخم بھی زیادہ خطرناک نہیں تھا۔

قدرے مطمئن ہو کر میں نے میڈم کو جھنجوڑا۔ اس کے گالوں پر ہولے ہولے چپتیں ماریں، آوازیں دیں مگر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ رہی۔ گردن موڑ کر ڈھنڈ کی طرف دیکھا۔ میڈم کو ہوش میں لانے کے لیے پانی کے چھینٹے مارے جا سکتے تھے۔ خیال آیا کہ خنک رات میں ٹھہرا ہوا پانی بے حد سرد ہوگا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کندھے اُچکا کر کھڑا ہوا۔ مراد بخش نے گاڑی کو ریس دی تو میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ وہ عادتاً پاؤں دبا رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے ڈھنڈ کی طرف بڑھا۔

جونہی میں نے ڈھنڈ کے ٹھہرے ہوئے سرد پانی میں ہاتھ ڈالے، مجھے عقب میں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ مراد بخش کی موقع پرست فطرت نے میرے سبھی اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔ وہ گاڑی کو ریورس کر رہا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی۔ اس نے گاڑی روکنے کے بجائے اچانک پہلے گیئر میں ڈال کر میڈم کے قریب سے گزار کر دریا کی جانب دوڑا دی۔

میں بنا سوچے سمجھے مراد بخش کی شان میں رطب اللسانی کے جوہر بکھیرتا ہوا گاڑی کے پیچھے دوڑ پڑا مگر چند ہی لمحوں میں مجھے باور ہو گیا کہ میں لاحاصل جستجو میں تھا۔ لینڈ کروزر کا طاقت ور انجن لحظہ بہ لحظہ اُسے میری دسترس سے دور کرتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی دونوں گنیں زمین پر گرا دیں اور آخری کوشش کے طور پر فل اسپیڈ دوڑ کی لگائی مگر ایک منٹ کے لگ بھگ دوڑ کر رُک گیا اور ہانپنے لگا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جاتی ہوئی لینڈ کروزر کی ٹیل لائٹس دکھائی دے رہی تھیں اور میں احمقانہ انداز میں پہلوؤں پر ہاتھ رکھے اُسے آنکھوں سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا۔

میں نے حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا تھا اور مراد بخش کو کمزور اور شکست خوردہ سمجھنے کی بھیانک غلطی کا ارتکاب کیا تھا جس کی سزا فی الفور مل گئی تھی۔ پیچ و تاب کھاتا ہوا، خود کو کوستا ہوا پلٹا اور سر جھکائے میڈم کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ میں نے ڈھنڈ کا ٹھنڈا پانی چلو میں بھرا اور میڈم کے چہرے پر چھڑکا۔ میری دوسری تیسری کوشش رنگ لائی اور میڈم نے جھرجھری لی۔ چند ثانیوں بعد آنکھیں کھولیں اور اردگرد دیکھ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ اس کے حلق سے سسکی برآمد ہوئی پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر ریت پر گرنے کے سے انداز میں لیٹ گئی۔ اس کے سر میں لگنے والی چوٹ خاصی تکلیف دہ تھی۔

میں نے ہمدردی سے پوچھا۔ ''میڈم! درد بہت زیادہ ہے؟''

اس نے سر اُٹھایا۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئی اور کئی لمحوں تک مجھے یک ٹک دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی۔ ''گاڑی کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ بے غیرت گاڑی لے کر رفوچکر ہو گیا ہے۔''

''کون؟'' میڈم کے منہ سے استعجاب آمیز لفظ برآمد ہوا۔ ''وہ، جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا؟''

میں نے 'جی' کہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ ریت پر ٹکا کر آہستہ سے کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا کہ تکلیف سے اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ میں نے سہارا دے کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بہ دقت تمام بیٹھنے کے قابل ہوئی تھی۔ اس نے بڑی سختی سے میرا بازو تھام رکھا تھا۔

پھر اپنے سر کو انگلیوں سے ٹٹول کر بولی۔ ''خون رس رہا ہے۔ کم بخت نے پوری قوت سے ڈنڈا دے مارا تھا۔ خیر! بچ گئی ہوں، یہی کافی ہے۔ مگر وہ گاڑی لے کر بھاگ کیسے گیا؟''

میں نے اُسے اپنی حماقت سے آگاہ کیا تو غصے سے بولی۔ ''شہریار! تمہارے پاس دو لوڈڈ گنیں موجود تھیں۔ تم گاڑی کا ٹائر برسٹ کر دیتے۔ اوہ مائی گاڈ! مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔''

میں نے ندامت سے کہا۔ ''دراصل آپ کو بے ہوش دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا اور درست فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔''

وہ چند لمحوں تک خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا جس پر تکلیف کو ضبط کرنے کے واضح اثرات ثبت تھے۔ البتہ آنکھیں بے تاثر تھیں۔ پھر اچانک مسکرا کر بولی۔ ''تمہیں پیاجی نے یہ سبق نہیں دیا تھا کہ ہماری زندگی میں کسی پر بھروسا کرنا ناقابلِ معافی جرم ہے؟''

میرا سر جھک گیا۔ ''جی میڈم! اس نے بتایا تھا مگر......''

''اگر مگر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ وہ حرامزادہ کس طرف گیا ہے؟'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''کیا پیرو ماچھی کے ڈیرے کی طرف گیا ہے؟''

میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ''نہیں...... وہ اس سیدھ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔''

میں نے اُسے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور میری بانہوں میں لڑھک گئی۔ سردی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے تھوڑی دیر یہیں پڑا رہنے دو۔''

ریت بہت ٹھنڈی تھی۔ شکر تھا کہ اس کا لباس خاصا موٹا اور گرم تھا ورنہ اتنی دیر ریت پر پڑا رہنے کی وجہ سے اُسے اب تک نمونیا ہو چکا ہوتا۔ وہ سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئی پھر میری گود میں گر گئی۔ میں نے اُسے سنبھالا دیا پھر اپنی قمیص کا اگلا پلو کھینچ کر گولا سا بنایا اور اس کے سر کے زخم پر رکھ دیا۔ کپڑے کے اُس ننھے سے گولے پر منہ رکھ کر پھونکیں مارنے لگا۔ اس عمل سے ہلکی سی حرارت پیدا ہوئی۔ وہ بولی۔ ''سکون آ رہا ہے، لگے رہو......''

میں نے پھونک مارنے کا عمل مسلسل جاری رکھا۔ وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔ بولی۔ ''مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

ہوا بہت ٹھنڈی تھی اور بدن سے آر پار گزرتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کیا میں آپ کو اُس جھنگی میں لے جاؤں جہاں ہم پولیس کے آنے پر کچھ دیر کے لیے چھپے تھے؟ وہاں یقیناً ہوا نہیں لگے گی۔''

''ہاں! تم مجھے وہاں چھوڑ کر اُس خبیث کے پیچھے جاؤ اور اس سے گاڑی چھین لاؤ۔'' وہ کراہی۔

میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''میڈم! میں اس تک کیسے پہنچوں گا؟ وہ اتنی دیر میں کئی میل دور جا چکا ہوگا۔''

''تو کیا ہم رات یہیں بیٹھ کر گزار دیں گے؟'' وہ قدرے غصے سے بولی۔ ''اگر اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہے تو پھر پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی گاڑی کھڑی ہو یا موٹر سائیکل...... جس پر ہم آگے یا پیچھے کا سفر طے کر سکیں۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''کیا آپ اب چل سکتی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''نہیں...... مجھے اُٹھا کر لے جاؤ۔ میرے سر میں نبض کے ساتھ ساتھ شدید دھمک پڑ رہی ہے۔''

اس نے میری گود سے اپنا سر اُٹھا کر مجھے آزاد کیا تو میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے دونوں گنیں اپنے دونوں کاندھوں پر لٹکا کر کمر کے رُخ دھکیل دیں اور میڈم کو اُٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔ اس کے منہ سے سسکاریاں برآمد ہونے لگیں۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ میرے کندھے پر پڑا تھا جبکہ زیریں حصہ میری بانہوں کے حصار میں تھا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں ڈھنڈ کے کنارے چلتا ہوا جھنگی کی طرف بڑھ رہا تھا، میرے من میں میڈم کے خوب صورت بدن میں چھپی ہوئی قیامت کے لمس کا احساس بیدار ہو گیا۔ زندگی تب قیمتی اور ہیجان آمیز محسوس ہونے لگتی ہے جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم زندہ ہیں۔ موت بھی تبھی بھیانک لگنے لگتی ہے جب انسان بامِ اجل پر کھڑا ہو کر زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے۔ میرے ہاتھ کپکپانے لگے۔ میڈم نے یہ لرزش محسوس کر لی، مستفسر ہوئی۔ ''کیا تم سردی کے مارے کانپنے لگے ہو؟''

ایسا نہیں تھا مگر ایسا ظاہر کرنے میں ہی عافیت تھی۔ میں نے کہا۔ ''جی میڈم! سردی بہت زیادہ ہے۔''

وہ بولی۔ ''مگر جب سے تم نے مجھے اٹھایا ہے، مجھے سردی کا احساس نہیں ہو رہا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اپنی رفتار بڑھا لی۔ شاید اس لیے کہ میں جلد از جلد جھنگی میں پہنچ کر اس کے بولنے والے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے کاندھے پر لادے جھنگی میں داخل ہونا مشکل مرحلہ تھا جسے میں نے جیسے تیسے عبور کیا اور اُسے جھاڑیوں کے بیچ قدرے صاف جگہ پر اُتار کر لٹا دیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ محض بن رہی تھی ورنہ اتنی لاغر اور زخمی نہیں تھی کہ اپنے پیروں پر چل کر یہاں تک نہ آ سکتی۔ اس نے زمین پر لیٹتے ہی ہنس کر میری گردن کے گرد بازو حمائل کر دیے۔ چونکہ مجھے توقع نہیں تھی، اس لیے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اُس پر گر گیا۔ میں جن لمحوں سے بچ کر گزرنا چاہتا تھا، وہ اپنی تمام تر تابناکی سمیت میرے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے۔ تڑپ کر اُس کی گرفت سے نکلنا چاہا مگر اس نے مجھے پوری قوت سے بھینچ لیا۔ بولی۔ ''تم قریب ہوتے ہو تو سردی نہیں لگتی۔ دور جاؤ گے تو کانپنے لگوں گی۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے جانے دیجیے تاکہ میں گاڑی کا بندوبست کر سکوں۔''

وہ بولی۔ ''چند منٹ رکو، پھر چلے جانا۔ مجھے یقین دلاؤ کہ میں زندہ ہوں۔ تم زندہ ہو۔ کیا خبر کہ تمہارے لوٹنے تک مجھے کوئی سانپ بچھو کاٹ کر ٹھنڈا کر دے۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''اللہ نہ کرے میڈم! ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔''

''کیوں؟'' وہ میرے گال پر اپنے ہونٹ رگڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا مجھے موت نہیں آئے گی؟ کیا میں اسی طرح ہمیشہ جوان اور زندہ رہوں گی؟ نہیں...... یہاں کوئی بھی مستقل نہیں ہے۔ کوئی بھی تا حشر ٹھہرنے کا اہل نہیں ہے۔ میں، تم، سبھی...... جانے کے لیے ہی تو آئے ہیں۔''

اس کی آواز بتدریج مدھم اور خمار آلود ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''آپ کا زخم......''

اس نے میری بات کاٹی۔ ''میرا زخم معمولی نوعیت کا ہے۔ تمہارے قرب کے شوق نے اُسے بڑھا دیا تھا ورنہ میں اپنے پیروں پر چل کر بھی یہاں آ سکتی تھی۔ سچ! بہت مزہ آ رہا تھا جب تم مجھے اٹھا کر یہاں لا رہے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ تم ایسے ہی اُٹھا کر واپس ریت کے ٹیلے پر لے جاؤ...... پھر یہاں لوٹو...... بس! رات کا بقیہ پہر اسی طرح تمام ہو جائے۔''

وہ میڈم شکیلہ بن کر میرے حواس پر چھائی رہی تھی۔ چندو کے روپ میں آشکار ہو کر آسان اور اچھی لگنے لگی تھی۔ بیساکھی کے سہارے زندگی کی تھکی ہوئی سانسیں حلق سے اُتارنے والے معذور بڈھے نے مجھے بتا دیا تھا کہ میری میڈم کوئی اپسرائی اور ماورائی مخلوق نہیں تھی بلکہ اس کی ذات کا خمیر میری ہی طرح کچی مٹی سے اُٹھا تھا۔ وہ جھونپڑی سے نکل کر محل اور راج تک پہنچی تھی۔ وہ چندو تھی جس سے وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔ جس سے نفرت کی جا سکتی ہو، اس سے محبت کا تعلق بھی استوار کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اُسے چندو سمجھ کر ہمت کا مظاہرہ کیا اور سر اُٹھا کر اس کے ہیولائے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔ چاندنی جھاڑیوں میں سے چھن کر آ رہی تھی اور اس کے چہرے پر چند سفید دائرے بنا رہی تھی۔ میں چند ثانیوں تک اُسے دیکھتا رہا پھر اس کے جلتے بجھتے ہونٹوں پر جھک گیا۔ پہلے وہ آگ لگا کر لطف اندوز ہوتی تھی۔ سانسیں لیتے ہوئے کھلونے سے کھیلتی تھی اور آسودگی جذب کرتی تھی۔ کھلونے نے اس کے ساتھ کھیلنے کی جرأت کرتے ہوئے آگ کا ننھا سا الاؤ دہکایا تو وہ دھک سے رہ گئی۔ ہاتھوں کی گرفت آنِ واحد میں دم توڑ گئی اور میرے نیچے سے نکلنے کے لیے تڑپی۔ پھر میری طرف پشت کر کے بیٹھی لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ ''ایک گن مجھے دے کر پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''آپ چل سکتی ہیں۔ بہتر ہے کہ میرے ساتھ چلیں ورنہ میں آپ کی طرف سے پریشان رہوں گا۔''

اس نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ ''نہیں...... میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ جو کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کرو۔ ہری اپ...... صبح ہوتے ہی ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اور ہاں! میرا پستول وہیں کہیں گر گیا ہے۔ اُسے بھی ڈھونڈنا۔''

میں نے ایک گن اس کے پہلو میں گھاس پر رکھ دی اور دوسری گن سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہا۔ ''اپنا خیال رکھیے گا۔ یہاں کیڑے مکوڑے پریشان کر سکتے ہیں۔''

''اوکے!''

میں نے اُس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور جھک کر

جھاڑیوں کی اس گھنی جھنگی سے باہر آ گیا۔ میری دھڑکن میڈم کے غیر معمولی قرب کے باعث غیر معتدل تھی اور سردی کا احساس بھی کم ہو گیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پھر سردی لگنے لگے گی۔ شاید اسی خوف کے پیشِ نظر میری رفتار خاصی تیز تھی اور میں جلد از جلد پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں کچھ دیر پہلے مراد بخش میڈم شکیلہ سے نبرد آزما تھا، وہاں تھوڑی سی تلاش بسیار پر مجھے میڈم کا پستول دکھائی دے گیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر پہلو والی جیب میں ڈال دیا اور جس راستے پر پولیس والوں کو جاتے دیکھا تھا، اُسی راستے پر چل پڑا۔ جنگل کے بیچ سے گزرتے ہوئے دونوں اطراف پر نگاہ رکھے ہوئے چل رہا تھا۔ بہ ظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا مگر احتیاط لازم تھی۔

میں دشوار گزار راستے پر کانٹوں سے بچ کر چلتے ہوئے مراد بخش کے بارے سوچ رہا تھا جس نے ہمیں ایک مصیبت سے نکلتے ہی دھر لیا تھا اور نئے مسئلے سے دوچار کر دیا تھا۔ میں نے اُس پر بے وجہ اعتماد کیا تھا ورنہ مجھے چاہیے تھا کہ میڈم کو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیکھنے بھالنے کے بجائے گاڑی کی سیٹ پر لٹاتا اور سیلنگ بلب کی روشنی میں اس کے زخم کا جائزہ لیتا۔ میں عقل مندی سے کام لیتا تو بغیر کسی مشکل کے مراد بخش کو انتا غفیل بھی کر سکتا تھا۔ اُسے وہاں سے بھگا بھی سکتا تھا اور گولی مار کر ہمیشہ کے لیے چھٹکارا بھی حاصل کر سکتا تھا مگر میں نے اُسے زندہ و سلامت رکھنے کے ساتھ ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دے کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی دے ماری تھی جس کی سزا مجھے ملنی بھی چاہیے تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے جاتے ہوئے میڈم پر گاڑی نہیں چڑھا دی تھی ورنہ وہ شدید زخمی ہو جاتی یا بری طرح کچلی جاتی۔

پولیس کے نامراد لوٹنے اور مراد بخش کی دی ہوئی معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں پُریقین تھا کہ پیرو ماچھی کا ڈیرا اِس وقت خالی ہو گا۔ وہاں مجھے کسی کی مڈبھیڑ کا خطرہ نہیں تھا۔ دس منٹ کی تھکا دینے والی مسافت کے بعد جب میں ڈیرے کے سامنے پہنچا تو میرے اِس خیال کو تقویت ملی۔ دو بڑے ناپختہ دیہاتی کمروں والے اس ڈیرے میں کسی ذی نفس کی موجودگی کا شبہ نہیں ہو رہا تھا۔ کمروں کے سامنے خاصا بڑا تھڑا بنا ہوا تھا۔ چار دیواری نہیں تھی جبکہ ڈیرے کو چاروں طرف سے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ میں درختوں کی اوٹ لیتا ہوا محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پولیس والوں نے شاید ایمونیشن کا مہینے بھر کا کوٹہ یہاں انڈیل دیا تھا کیونکہ فضا میں ابھی تک بارود کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔

راستہ ایک ناہموار جگہ پر کمروں کے پچھواڑے میں جا کر ختم ہو گیا۔ چونکہ یہاں پر خونخوار کتوں کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اِس لیے میں کچھ زیادہ ہی محتاط اور چوکس تھا۔ پچھواڑے سے نکل کر کمرے کے پہلو میں پہنچا۔ کم روشنی میں بھی خالی صحن نما تھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اپنی لینڈ کروزر کی یہاں موجودگی کی ذرہ بھر توقع نہیں رہی تھی مگر ڈیرے کی دوسری جانب آم کے قد آور اور گھنے درخت تلے کھڑی ہوئی میڈم کی لینڈ کروزر نظر آ رہی تھی۔ میرے حلق سے اطمینان بھری سانس برآمد ہوئی۔ مراد بخش نے مجھے ڈاج دیا تھا اور کسی دوسرے راستے سے یہاں پہنچ کر چھپ گیا تھا۔ بہ ظاہر بے وقوف اور اجڈ دکھائی دینے والا مراد بخش بہت کائیاں اور زیرک انسان تھا۔

مراد بخش کی موجودگی کے احساس نے میرے تن بدن میں بجلی اور آگ بھر دی۔ میرے رگ و پے میں سرایت کرنے والے احساسِ ندامت نے شدید نوعیت کی برہمی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ میں نے پستول نکالا، چیک کیا تو پتا چلا کہ وہ خالی تھا۔ میں نے منہ بنا کر اُسے دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور گن کاندھے سے اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا اگلی نکڑ تک آیا۔ جھانک کر دیکھا۔ کسی دروازے سے روشنی برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ ایک ہی سیدھ میں بنے ہوئے دونوں کمروں کے علاوہ ایک چھوٹا سا چھپر نما کمرا میرے عین مقابل میں ایستادہ تھا جو اپنی وضع قطع کے اعتبار سے باورچی خانہ محسوس ہو رہا تھا۔ مراد بخش انہی بڑے کمروں میں سے کسی ایک میں موجود تھا۔

ڈھنڈ کے کنارے پر مراد بخش نہتا ملا تھا تبھی میں نے بہ آسانی غلبہ پا لیا تھا۔ یہاں وہ نہ صرف اپنے مورچے میں محفوظ تھا بلکہ اس کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ وہ آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ میں نے اردگرد چوکنی نگاہوں سے دیکھا، پھر کوئی اور چارہ کار نہ پاتے ہوئے دیوار کے ساتھ بلی کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا ایک دروازے کے قریب پہنچا۔ کچھ دیر کان لگائے کھڑا رہا۔ رات کے سناٹے میں سانسوں کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مایوسی ہوئی۔ وہ اس کمرے میں نہیں تھا۔ میں دروازے کے آگے سے گزرنے سے گریزاں تھا۔ اندیشہ تھا کہ اگر وہ اسی کمرے میں ہوا تو مجھے دیکھ کر نہ صرف ہوشیار ہو جائے گا بلکہ میرے عقب میں پہنچ کر گزند پہنچانے کی پوزیشن سنبھال لے گا۔ ڈیرے کے پچھواڑے کا چکر کاٹ کر دوسرے دروازے پر پہنچنا بھی مشکل دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد

میں نے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا اور گن تانے ایک دم دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا جس کی وجہ سے چند لمحوں تک مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی تھوڑی عادی ہوئیں تو پتا چلا کہ مراد بخش کمرے میں نہیں تھا اور کمرے میں سامان، چارپائیاں اور بستر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ پولیس والوں کے ہنرمند ہاتھوں کا اعجاز تھا۔ پیشہ وارانہ تلاشی کے نتیجے میں کمرے میں زلزلے کا ساسماں برپا ہو چکا تھا۔

بجا طور پر مراد بخش دوسرے کمرے میں تھا۔ میں دبے پاؤں اس طرف بڑھا۔ حسبِ سابق دیوار کے ساتھ چپک کر سن گن لی۔ کچھ سنائی نہ دیا۔ یوں لگا جیسے مراد بخش اس کمرے میں بھی نہیں تھا۔ اچانک میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں جل اُٹھیں کہ وہ اس طرف آنے کے بجائے گاڑی میں ہی بیٹھ کر سورج کے طلوع ہونے کا انتظار بھی کر سکتا تھا۔

میں نے اتمامِ حجت کے طور پر کمرے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور گن تانے بجلی کی سی مستعدی سے کمرے میں گھس گیا۔ اس کمرے کا نقشہ بھی پہلے کمرے سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے خالی چارپائیوں اور بکھرے ہوئے سامان کو دیکھ رہا تھا جب اچانک میری کمر میں کسی گن کی نال آن لگی۔ میرے تنے ہوئے اعصاب نے ایک جھٹکا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، میرے کانوں میں مراد بخش کی بھاری اور درشت آواز پڑی۔ ”خبردار! اگر کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔ چلو! گن نیچے پھینک دو...... شاباش...... تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔“

مجھے اس کی آمد پر حیرانی ہوئی۔ میں کمرے میں چند گھڑیاں رکا تھا، اس دوران وہ نہ صرف کہیں سے نکل کر میرے عقب میں پہنچ آیا تھا بلکہ اس نے مجھے بھی کور کر لیا تھا۔ ... نے توجیہہ دی کہ وہ باورچی خانے میں چھپا ہوا تھا میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی دبے پاؤں یہاں ... گیا تھا۔

میں نے اپنی آواز کو بہ سعی توانا اور سخت کرتے ہوئے کہا۔ ”مراد بخش! تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟“

اس نے گن کی نال پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہا ہے کہ گن نیچے پھینک دو۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو فائر کر دوں گا۔ ایک...... دو......“

میں نے آہستگی سے گن اپنے پیروں میں کچے فرش پر پھینک دی اور کہا۔ ”جب یہ طے ہو چکا ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں تو پھر تم یہ ڈراما بازی کیوں کر رہے ہو؟“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا، بولا۔ ”الٹے قدموں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلو۔“

میرے پاس سوائے حکم کی تعمیل کے چارہ نہیں تھا۔ جونہی میں کمرے سے نکلا، وہ غرایا۔ ”دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

اس کے تحکمانہ انداز نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی مگر اپنی کمر سے بار بار ٹکرانے والی گن کی نال مجھے اس کے ہر حکم پر سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا تو اس نے پوچھا۔ ”تمہاری پالتو بلی کہاں ہے؟“

اس کا اشارہ میڈم شکیلہ کی طرف تھا۔ میں نے کہا۔ ”وہ ابھی تک ڈھنڈ پر بے ہوش پڑی ہے۔“

”مجھے اندازہ تھا کہ تم یہاں آؤ گے۔ اس لیے میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“ اس کے لہجے میں گہرا طنز اور فاتحانہ مسرت پنہاں تھی، بولا۔ ”اب تم شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا نام اور یہاں آنے کا مقصد بیان کر دو۔ وہ کہانی نہ سنانا جو تم نے مجھے ڈھنڈ پر سنائی تھی۔“

میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہزیمت اور تضحیک کے احساس سے دوچار تھا۔ قدرے پُراعتماد انداز میں بولا۔ ”میں نے کوئی جھوٹی کہانی نہیں سنائی تھی۔ میں سردار حیدر خان کا بیٹا ہوں اور استاد پیرو سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔“

اس نے نال کا دباؤ بڑھایا اور غرایا۔ ”حرامزادے! کہا تو ہے کہ میں اس کہانی پر یقین نہیں کرتا۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ سچ بولو گے تو شاید تمہیں زندہ چھوڑ دوں تاکہ تم جا کر اپنی پرکٹی لونڈیا سے دو چار گھڑیاں عیش کی گزار سکو۔ ورنہ تمہارا یہ کام بھی مجھے سرانجام دینا پڑے گا۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

میں نے دانت پیسے۔ ”سردار......“

اس نے ایک جھٹکے سے نال میرے دائیں پہلو میں چبھوئی۔ تیز ٹیس جاگی۔

میں نے کہا۔ ”بتا تو رہا ہوں ذلیل آدمی......“

”میں سردار حیدر خان کے سارے خاندان کو جانتا ہوں، اس لیے بکواس کر کے میرا وقت ضائع نہ کرو۔ ٹھیک ٹھیک بولو......“

میرا دماغ بڑی برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور اس کے چنگل سے نکلنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ میرے پاس غلطی کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس پر باور تھا کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں بلکہ اس کے قبیل کا شخص ہوں۔ وہ میری معمولی سی حرکت پر برانگیختہ ہوکر گن کی لبلبی دبا سکتا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سچ کہتا ہوں۔ مجھے پیرو ماچھی کے پاس لے چلو۔ بے شک مجھے تب تک گن پوائنٹ پر رکھو۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں کون ہوں اور میرا پیرو ماچھی سے کیا تعلق ہے۔“

اس کا لہجہ بڑا سفاک تھا۔ ”ٹھیک ہے......“ اس نے ایک ناقابلِ اشاعت گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”پیرو ماچھی کو تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خدا حافظ!“

اس کے لہجے میں نہاں سنگینی نے آنِ واحد میں اس کے خوفناک ارادے کی چغلی کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ گن کا ٹرائیگر دبا تا، میں ایڑی کے بل گھوم گیا اور میں نے اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی آٹومیٹک شارٹ گن کو پکڑ کر اس کا رُخ آسمان کی طرف کر دیا۔ اس دوران اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ ہم دونوں کے بازوؤں کو جھٹکا لگا۔ اس نے گن کو اپنی جانب کھینچا، میں نے اپنی گرفت مضبوط کی مگر کوئی اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اپنا داہنا گھٹنا پوری قوت سے میری ٹانگوں کے بیچ دے مارا۔ میرے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ درد کی کٹیلی لہر نے پورے بدن کا احاطہ کر لیا۔

شکر ہوا کہ گن میری گرفت سے نہ نکل سکی ورنہ اسے فائر کرنے کی مہلت مل چکی تھی۔ میں نے دانت پیسے اور کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کیا۔ میرا نشانہ اس کی ناک تھی۔ وہ چہرے کا رُخ بدل کر میرا وار خطا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے زوردار تھپڑ مجھے رسید کیا جو سیدھا میرے جبڑے پر لگا اور دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ اس کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ میں نے یکبارگی گن کو اپنی جانب جھٹکا دیا۔ اس کی توجہ بٹی تو میں نے اس کا وار لوٹاتے ہوئے اپنا گھٹنا پوری قوت سے زیرِ ناف جڑ دیا۔ وہ بلبلا کر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر رکوع کے انداز میں جھک گیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر گن کو زوردار جھٹکا دیا۔ گن کو نہ چھوڑنے کی پاداش میں وہ لڑکھڑا کر زمیں بوس ہو گیا۔ میں نے اس کے بازو پر زوردار ٹھوکر رسید کی۔ پھر دونوں پیروں پر اُچھل کر اس کے بازو کی مچھلی پر کود گیا۔ وہ بہت سخت جان تھا۔ میری دونوں کوششیں بے کار گئیں اور گن اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔

وہ اُٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے گن کو ایک جھٹکے سے زمین کی طرف موڑا اور اسے چھوڑ کر ہوا میں اچھلا پھر دونوں پیروں کے بل گن پر گرا۔ بھاری آہنی گن اور زمین کے درمیان اس کا ہاتھ بری طرح کچلا گیا جس کے نتیجے میں اس کے منہ سے بھیانک چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر اس کی گردن پر دھپ رسید کی۔ اس کے منہ سے مغلظات کا فوارہ ابل پڑا۔ اس نے پوری قوت صرف کر کے اُٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑے اور سر اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کی ناک زمین سے ٹکرائی اور پورے بدن کو جھٹکا لگا۔ میں نے تب تک اپنے ہاتھوں کو نہیں روکا جب تک اس کی بولتی بند نہیں ہو گئی اور تڑپتا ہوا بدن ساکت نہیں ہو گیا۔

میں پیروں کے بل پیچھے ہٹا۔ اس کی نیم مردہ گرفت سے گن کھینچی اور اُٹھنا چاہا۔ ایسے میں وہ چھلاوے کی طرح اچھلا اور مجھ پر آن گرا۔ اس کا سر زوردار آواز سے میرے سر سے ٹکرایا اور میری آنکھوں کے سامنے پانچ سو والٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ میرے لیے اس کا یوں اوندھے منہ لیٹ کر اسپرنگ کی طرح اچھلنا باعثِ استعجاب تھا مگر اس پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے کا قطعی موقع نہیں تھا۔ گن میرے ہاتھوں سے نکل گئی اور میرا وجود اس کے گرانڈیل جسم کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے گھٹنوں کی مشینی ٹھوکریں میری رانوں اور گھٹنوں پر آہنی گرزوں کی طرح لگنے لگیں۔ چند ہی لمحوں میں اس نے میرا ابھر کس نکال کر رکھ دیا۔ اس کے چاروں ہاتھ پیر چل رہے تھے اور مجھے مسلسل زدوکوب کر رہے تھے۔ میں نے اپنے اوسان ٹھکانے رکھنے کی کوشش کی، سر جھٹکا، پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے چہرے پر جمائے۔ میری انگلیاں اس کی آنکھوں پر جا ٹکیں۔ میں نے ساعت بھر تاخیر نہیں کی اور پوری قوت سے اس کی آنکھوں میں انگلیاں پیوست کر دیں۔ اس نے چیخ کر اپنا سر اِدھر اُدھر پٹخا۔ ایک آنکھ پر سے میری انگلیاں پھسل گئیں۔ دوسری آنکھ میں دو انگلیاں کھب گئیں اور آنکھ کا ڈیلا میری گرفت میں آ گیا۔

عرصہ پہلے سائیں دل جیت کے ساتھ ہونے والی معرکہ آرائی میں میرا ایسا ہی وار فیصلہ کن ثابت ہوا تھا۔ میں نے جب اس کی آنکھ کا ڈیلا باہر نکالا تھا، تب اس کی دل دوز چیخوں نے میری سماعت کو دہلا کر رکھ دیا تھا اور مجھے اس تکلیف سے آشنائی ہوئی تھی جو انسان کا مادہ جھنجھوڑ دیتی ہے

بدن کی تمام تر مدافعاتی فصیلیں چیر دیتی ہے۔

مجھ پر خون سوار ہو گیا۔ میں نے اپنے بدن کی تمام تر طاقت کو انگلیوں میں مرتکز کرتے ہوئے اس کی آنکھ کا ڈیلا نوچ لیا۔ میرا ہاتھ لیس دار رطوبت یا خون سے لجلجا گیا۔ ڈیلا میری انگلیوں میں دبا ہوا تھا جبکہ دھاگا نما عصبی ریشے میرے ہاتھ سے لپٹ گئے تھے۔ اس کی دل دہلا دینے والی چیخ سے فضا کانپ اُٹھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی بھیانک آواز میڈم کے کانوں تک ضرور پہنچی ہو گی۔

اس کا جسم بری طرح کپکپانے لگا۔ میں نے اسے بہ یک وقت تمام اپنے وجود پر سے جھٹکا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گر کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے اچھل کر اس کے سر کے عقبی حصے میں پیروں کی پُرقوت ضرب لگائی۔ ’کٹک‘ کی گھٹی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور نرخرہ بجنے لگا تھا۔ میں نے بے ساختہ اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ مراد بخش کی آنکھ کا ڈھیلا دکھائی نہیں دیا البتہ خون اور ریشے ہاتھ سے چپکے ہوئے تھے۔ میں نے کراہت کے مارے پوری قوت سے ہاتھ جھٹکا مگر ان سے گلوخلاصی نہ ہوئی۔

ایسے میں مراد بخش اچانک اُٹھا اور چیختا ہوا کھڑا ہو کر میری جانب لہرایا۔ میں نے اس کے پیٹ میں زوردار مکا مارا۔ وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے، مجھ سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح مجھے نوچنے لگا۔ اس کی دیوانگی آشکار کرنے لگی تھی کہ وہ میری آنکھ کا ڈیلا نکالنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اچھل کر اس کی زخمی ناک پر سر کی ٹکر ماری۔ وہ ڈکرا کر کمر کے بل دروازے کے بیچوں بیچ گرا اور اس کا سر میری گن سے زوردار آواز کے ساتھ ٹکرایا۔ چوٹ خاصی خطرناک تھی۔ وہ چند لمحوں تک تڑپا پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی بانہیں پوری وسعت میں پھیل گئیں اور بدن تادیر جھٹکے لیتا رہا پھر ایک دم ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کی قمیص سے اپنا ہاتھ پونچھا۔ پھر اس کے دل کی دھڑکن اور نبض چیک کی۔ وہ زندہ تھا مگر اس کا زندہ رہنا کارِعبث تھا۔ لحظہ بہ لحظہ ڈوبتی ہوئی دھڑکن چغلی کرتی تھی کہ وہ مر رہا تھا۔ میں نے چند گھڑیاں انتظار کیا۔ شاید کہ سنبھل جائے، مگر ایسا نہیں ہوا اور اس کا دل رُک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آنکھ کے زخم کی وجہ سے نہیں، کھوپڑی کے عقبی حصے میں آنے والی چوٹ کے سبب جان کی بازی ہار گیا تھا۔

میں نے اپنی گن اس کے سر کے نیچے سے کھسکائی۔ اس پر خون لگا ہوتا تھا۔ اسے چارپائی پر پڑی ہوئی میلی سی چادر کے ساتھ پونچھا اور کاندھے پر ڈال لیا۔ مراد بخش کے مردہ وجود پر ایک نگاہِ تنفر ڈالی اور صحن میں آ گیا۔ اس کی گن اُٹھا کر چیک کی۔ وہ جدید طرز کی گن تھی۔ سنگل شوٹ اور برسٹ شوٹ کے آپشن رکھتی تھی۔ اپنی مختصر جسامت کے سبب بہت آئیڈیل گن تھی۔ میں نے اُسے بھی اپنی تحویل میں لے لیا اور اردگرد دیکھتا ہوا لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔

میرے روئیں روئیں سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اس نے گھٹنوں اور مکوں کی جو دیوانہ وار ضربیں مجھے پہنچائی تھیں، وہ بہت تکلیف رساں تھیں۔ گاڑی کا دروازہ مقفل تھا۔ مجھے لوٹ کر مراد بخش کے پاس آنا پڑا۔ اس کی جامہ تلاشی لینے پر گاڑی کی چابیاں مل گئیں۔

گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور بڑی مشکل سے صحن سے گزار کر دریا کی طرف جانے والے راستے پر ڈالنے میں کامیاب ہوا۔ چونکہ میں لینڈ کروزر کو پہلی مرتبہ ڈرائیو کر رہا تھا، اس لیے دقت محسوس کر رہا تھا۔ کھالے کی ویگن اور میڈم کی لینڈ کروزر میں زمین و آسمان کا فرق تھا مگر میں نے غیر معمولی کم وقت میں گاڑی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ ڈھنڈ کے پار جھنگی کے قریب گاڑی روک کر میں نے شیشہ اُتارا اور آواز دی۔ ”میڈم! باہر آ جائیں، میں گاڑی لے آیا ہوں۔“

کوئی جواب نہ پا کر میں گاڑی سے اُترا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا جھنگی میں داخل ہوا۔ وہ اسی جگہ پر پہلو کے بل لیٹی ہوئی تھی جہاں میں نے اُسے لٹایا تھا۔ آواز دینے پر اس نے ایک ذرا سر اُٹھایا پھر گردن ڈال دی۔ میں اس کے پاس زمین پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ دیکھا کہ اس کے دانت بج رہے تھے اور جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ یہ سردی کا اعجاز تھا۔ چونکہ میں اپنی حماقت پر مشن میں کامیابی کا پردہ ڈال کر لوٹا تھا، اس لیے اسے یوں کانپتے دیکھ کر قدرے شوخی سے بولا۔ ”یہ آپ کو کس نے وائبریشن پر لگا دیا ہے؟“

اس نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا پھر سر اُٹھا کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مم...... مجھے س...... سردی لگ رہی ہے۔“

میں نے اس کی بانہہ تھامی۔ پتا چلا وہ تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق بخار کی شدت ایک سو تین چار تک پہنچ چکی تھی۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”اوہ میرے خدا!“

اُسے اُٹھانے کی کوشش کی مگر اس کے بدن نے میری کوشش کا ساتھ نہیں دیا۔ نتیجتاً وہ ایک جانب لڑھک گئی۔ تیز تیز سانسوں کے درمیان بولی۔ ”مم...... مجھے اُٹھا کر

گگ...... گاڑی میں لے جاؤ...... گاڑی لے آئے ہوناں؟"

میں نے اُسے پہلے کی طرح اُٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور بھاگنے کے سے انداز میں جھگی سے نکل کر گاڑی کے پاس گیا۔ اُسے اگلی سیٹ پر بٹھایا اور سرعت سے ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ پوچھا۔ "میڈم! کہاں چلوں؟"

وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ بڑبڑائی۔ "چلو......"

میں نے پریشانی کے عالم میں اُسے دیکھا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کہاں چلوں کیونکہ وہ شاید یہ بتانے کی حالت میں نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ ڈاکٹر منور علی شاہ کی صحبت نے مجھے یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ بخار کی خطرناک اسٹیج پر پہنچ چکی تھی۔ ایک سو چار پر دماغی صلاحیت متاثر ہونے لگتی ہے۔ ایک ہندسہ عبور کرتے ہی انسان زندگی کی آخری سرحد پر پہنچ جاتا ہے۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ کلائی تپ رہی تھی۔ نبض بہت تیز چل رہی تھی۔ سانسیں بھی گرم تھیں۔ میری دانست کے مطابق اُسے فوری طور پر کسی اسپتال یا کلینک پہنچانا ضروری تھا۔

اس کا سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ جونہی میں نے گاڑی بڑھائی، وہ کراہی۔ "پ...... پانی...... شہریار! پانی لاؤ...... مجھے گیلا کرو......"

میں نے فوراً گاڑی روک دی۔ جلدی سے اُترا اور ڈھنڈ کی طرف بھاگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اتنی سخت سردی میں اُسے گیلا کرنا چاہیے تھا یا نہیں...... مگر اس کا حکم ماننا ضروری تھا۔ میں نے چلو میں پانی بھرا اور بھاگتا ہوا واپس آیا۔ ایسی حالت میں گیٹ نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ میری مشکل بھانپ گئی اور اس نے گیٹ کھول دیا۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی۔ میں نے ہاتھوں کا پیالہ اُس کے لبوں سے لگا دیا۔ اس نے چند گھونٹ پیے پھر اپنا ایک ہاتھ پانی میں ڈال دیا۔ کچھ پانی بہہ گیا۔ باقی پانی میں اُس نے باری باری دونوں ہاتھوں کو بھگویا اور ماتھے اور گالوں کو گیلا کیا۔ "گاڑی میں کوئی بوتل نہیں پڑی؟"

میں نے عجلت میں گاڑی کے اندر دیکھا۔ بوتل دکھائی نہیں دی۔ نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "اور لاؤ...... پانی اور لاؤ......"

میں نے اگلی سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا 'سابز' اُٹھایا اور ڈھنڈ کی طرف بھاگا۔ کپڑا بھگویا اور چلو میں پانی بھرا۔ واپس آیا تو وہ سیٹ پر نڈھال پڑی تھی۔ میری آواز پر اُس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔ میں کوئی نتیجہ اخذ نہ کرتے ہوئے گومگو کی حالت میں کھڑا رہا۔ اس نے کپڑا میرے بازو پر سے اُٹھایا اور دیوانہ وار اپنے چہرے پر رگڑنا شروع کر دیا۔ ایسے میں اس کے حلق سے تیز تیز کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کی بانہہ پکڑی۔ یخ بستہ پانی نے اس کا ٹمپریچر کسی حد تک کم کر دیا تھا مگر بخار کا زور ٹوٹا نہیں تھا۔

اس نے لیور کھینچ کر سیٹ کو پیچھے کیا اور نیم دراز ہو گئی۔ پھر کپڑے کو ماتھے پر رکھ کر سیٹ پر سر ٹکاتے ہوئے بولی۔ "شہریار! جلدی چلو...... میرا جسم سن ہونے لگا ہے۔"

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور واپسی کی راہ اختیار کی۔ چند لمحوں بعد اُس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر بولی۔ "میرا موبائل فون گر گیا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے بریک لگا دیے۔

"وہیں...... جہاں سے مجھے اُٹھا کر لائے ہو۔" اس کی آواز شدید کپکپاہٹ کا شکار تھی۔

میں نے ٹرن لیا اور چند لمحوں بعد جھگی کے سامنے رُک کر اُتر گیا۔ کسی تگ و دو کے بغیر مجھے اس کا موبائل فون جھگی کے باہر ریتلی زمین پر گرا ہوا مل گیا۔ میں جب اُسے کندھے پر ڈال کر جھگی سے باہر لا رہا تھا، اس وقت ہی اس کے کوٹ کی جیب سے نکل کر گر گیا تھا۔ شکر کرتے ہوئے کہ فون جلد مل گیا، دوڑتا ہوا واپس آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

راستہ ناہموار اور دشوار گزار تھا۔ میں جتنی تیزی رفتاری کا مظاہرہ کر سکتا تھا، کر رہا تھا اور جلد از جلد اس پُرعذاب علاقے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں اس جگہ پر پہنچا جہاں سے مڑ کر ہم سیمو اور اس کی بوڑھی مغویہ ماں کی تلاش میں بڈھے معذور شخص کے خستہ حال گھر میں گئے تھے اور خون میں لت پت کئی لاشیں بچھا کر آگے بڑھ گئے تھے۔ قرائن بتاتے تھے کہ پولیس کو وہاں کھیلے جانے خونیں کھیل کی خبر نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ پیرو ماچھی کے ڈیرے پر ریڈ کرنے سے پہلے یہاں پہنچتی اور حسب ضابطہ کارروائی عمل میں لاتے ہوئے ہمارے کیے دھرے کو اپنے کھاتے ڈال کر تمغوں کی طرف لپکنے میں مصروف ہو جاتی۔ پولیس اہلکار واپسی پر یہاں سے ہو کر گئے ہوں، یہ بات زیادہ دل کو نہیں لگتی تھی کیونکہ اس صورت میں یہاں ہلچل کے آثار نظر آتے۔ میری نظروں کے سامنے زبوں حال بڈھا گھوم گیا جس کے خیال سے میں نے سر جھٹک کر نجات حاصل کی اور اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کی۔

ادھر آتے ہوئے میں نے راستے میں ایک سرکاری اسپتال دیکھا تھا۔ دیہاتوں کے اسپتال میں بہت کم تعداد میں

اسٹاف کام کرتا ہے۔ رات کو اسپتال میں کسی کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔ نور پور کا سرکاری اسپتال بھی اسی نوع کا تھا۔ چونکہ وہاں ڈاکٹر منور علی شاہ رہائش پذیر تھا، اِس لیے رات کو لائے جانے والے مریضوں کو علاج معالجے کی سہولت مل جاتی تھی۔

میں اپنی غیر ماہرانہ ڈرائیونگ کے باوجود لینڈ کروزر کو اِس لیے تیز چلا رہا تھا کہ میڈم کو پونگا کے سرکاری اسپتال تک جلد از جلد پہنچا دوں۔ اس موہوم سی امید کے سہارے کہ اسپتال کی رہائشی کالونی میں شاید کوئی ڈاکٹر یا ڈسپنسر رہائش پذیر ہو جو ان نامساعد حالات میں ہماری مدد کر دے اور میڈم کا بخار ٹوٹ جائے۔ مجھے خدشہ تھا کہ شجاع آباد یا ملتان کے اسپتال تک پہنچتے پہنچتے میڈم کی حالت خطرے کی حدود میں پہنچ سکتی تھی۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نہ صرف میڈم کے پھیلے ہوئے بازو کے لمس سے بخار کی حدت کا اندازہ کر لیتا تھا بلکہ اس کے سرخ اور بے قرار چہرے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد میں اسپتال پہنچ گیا۔ بند گیٹ پر گاڑی روک دی۔ آہنی سلاخوں والا گیٹ مقفل تھا۔ میں نے ہارن بجایا۔ پھر اُس وقت تک ہارن بجائے چلا گیا جب تک مین روڈ کی سمت والے پہلے کوارٹر کے بیرونی برآمدے کا سو واٹ کا بلب روشن نہیں ہوا۔ برآمدے میں ایک شخص دکھائی دیا جس نے اپنے جسم کو سیاہ چادر یا کھیس میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ وہیں رک کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں گاڑی سے اُتر کر سلاخوں والے آہنی گیٹ سے چپک کر کھڑا ہو گیا اور قدرے تیز آواز میں بولا۔ "گیٹ کھولو...... مریض کی حالت خراب ہے۔"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ "تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔ "سوال جواب میں وقت ضائع نہ کرو۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم گیٹ کا تالا تو کھولو اور مجھے مریض کو اندر لانے دو۔"

"مگر یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔" وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ "تم جیپ پر ہو، وقت ضائع نہ کرو اور اپنے مریض کو شجاع آباد لے جاؤ۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "یار! تم ادھر تو آؤ۔"

وہ بادل ناخواستہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا گیٹ کے پاس آیا۔ گیٹ کی مقفل زنجیر کھولتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ یہاں ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ نو بجے کے بعد آتا ہے۔"

"تم ڈسپنسر ہو؟" مجھے اُس کی سست روی پر غصہ آ رہا تھا۔

"نہیں۔ میں واپڈا میں لائن مین ہوں۔" اس نے گیٹ کھول دیا اور مجھے، پھر گاڑی میں آنکھیں موندے لیٹی ہوئی میڈم شکیلہ کو بہ غور دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم اس علاقے کے نہیں لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو اور اس کو کیا ہوا ہے؟" اس کا اشارہ میڈم کی طرف تھا۔

میں نے اس کے سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کوارٹروں میں کوئی ڈسپنسر یا ایل ایچ وی رہائش پذیر نہیں ہے؟"

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالی، سلگائی اور بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرے ساتھ والے کوارٹر میں ایل ایچ وی رہتی ہے۔ مس عالیہ...... کیا اُسے جگا دوں؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں! تم اُسے جگاؤ، میں گاڑی اندر لاتا ہوں۔"

میں نے اس دوران میڈم کا جائزہ لیا۔ وہ غنودگی کی یورش کا شکار ہو چکی تھی اور گیٹ کے شیشے سے سر ٹکائے گہری نیند میں یا بے ہوشی میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کا تنفس بہت تیز ہو چکا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر کی جانب اُمڈتے ہوئے میڈم شکیلہ کے بخار میں پھنکتے ہوئے بدن کو سنبھال لیا۔ میرے عقب میں لائن مین کی آواز گونجی۔ "اپنی مریضہ کو ادھر ہی لے آؤ بھئی!"

میں نے گردن موڑ کر برآمدے میں دیکھا۔ بلب کی روشنی میں لائن مین کے ساتھ ایک اور ٹھگنے قد کا شخص کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے میڈم کو اُٹھایا اور برآمدے میں آ گیا۔ لائن مین بولا۔ "ادھر کمرے میں لے جاؤ۔ اپنی بیوی کو...... مس صاحبہ اسے چیک کرتی ہیں۔"

میں میڈم کو اُٹھائے کوارٹر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ مس عالیہ نام کی ایل ایچ وی نے اپنے ڈرائنگ روم کو کلینک میں بدل رکھا تھا۔ ایک چوبی الماری دوائیوں سے بھری ہوئی تھی جبکہ اسپتال کا ایک سرکاری بیڈ بھی کمرے کے وسط میں پڑا تھا جس کے پہلو میں ڈرپ اسٹینڈ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے میڈم کو آہستگی سے بیڈ پر لٹا دیا۔ ٹھگنے قد اور سیاہ رنگت والے شخص نے میڈم کو بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنی کوے جیسی آواز میں دریافت کیا۔ "یہ تمہاری بیوی ہے جوان؟"

میں نے اس کے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے کہہ دیا۔ "ہاں! ہم ادھر اپنے رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو بخار نے انہیں آن لیا۔ یہ پتا نہیں تھا کہ بخار اتنا تیز ہو جائے گا کہ صبح سے پہلے اسپتال کا منہ دیکھنا پڑ

جائے گا۔ مس صاحبہ جاگ رہی ہیں؟"

اس کوے نما انسان نے مجھے سرتا پا گھورا پھر کمرے کے اندر کھلنے والے دوسرے دروازے میں گھس گیا۔ لائن مین برآمدے میں رک گیا تھا۔ شاید وہ بھی میڈم کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا اور رات کے اس پہر میں مفت ملنے والے دیدارِ حسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میڈم کراہی، کروٹ بدل کر بڑبڑائی۔ اس نے کچھ کہا تھا مگر میری سمجھ نہ آیا تھا۔ میں اس پر جھکا۔ اچانک اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یک ٹک دیکھتی رہی پھر کمزور آواز میں بڑبڑائی۔ "میرا جسم شل ہو رہا ہے......"

میں نے اس کا ہاتھ تھاما، سہلایا اور کہا۔ "فکر نہ کریں میڈم! آپ تھوڑی دیر میں ہی تندرست ہو جائیں گی۔"

میرے عقب میں مترنم نسوانی آواز ابھری۔ "بھائی! کیا ہوا ہے آپ کی مریضہ کو؟"

میں نے چونک کر شیریں اور شائستہ انداز میں بولنے والی کو دیکھا۔ اس کی آواز بہت خوب صورت تھی اور شکل آواز سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "انہیں بخار ہوا ہے۔"

ساتھ ہی میں نے بیڈ چھوڑ دیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میڈم کا بہ آسانی چیک اَپ کر لے۔ اس نے نبض دیکھی، تھرما میٹر لگا کا درجہ حرارت چیک کیا پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "بخار تو اتنا زیادہ نہیں ہے، جتنی زیادہ غنودگی طاری ہے۔ کوئی اور مرض تو نہیں ہے انہیں؟"

میں نے اردگرد دیکھا۔ میں نے آواز قدرے دھیمی رکھتے ہوئے کہا۔ "ان کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ وہ بھی دیکھ لیجیے۔"

اس نے میری نشاندہی پر سر کا زخم دیکھا۔ بولی۔ "یہ تو خاصا بڑا زخم ہے۔ یہ کیسے آیا؟"

میں نے بات بنائی۔ "پھسل کر کھاڈے میں گر گئی تھیں۔"

'کھاڈا' مقامی زبان میں اُس چھوٹی سی حوض نما جگہ کو کہتے ہیں جس میں نلکا ایستادہ ہوتا ہے۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "کھاڈے میں گرنے سے پیشانی پر چوٹ لگتی ہے۔ خیر! مجھے کیا......"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے میڈم پر جھک کر بال ہٹانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد زخم ننگا ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک دیکھتی رہی پھر اپنی دوائیوں والی چوبی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے پانچ سو ملی لیٹر والی گلوکوز ڈرپ تیار کی، اسٹینڈ پر لگائی اور میڈم کے بازو میں لگا دی۔ پھر میڈم کے سر کے زخم کی صفائی کرنے میں مصروف ہو گئی۔

مجھے متنبہ کرتے ہوئے بولی۔ "رات کو آنے والے مریضوں سے میں ڈبل فیس لیتی ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ فیس کی فکر نہ کریں۔ جتنی کہیں گی، اس سے بھی ڈبل ادا کروں گا۔ آپ انہیں ٹھیک کر دیں۔"

وہ مسکرائی۔ "کیا یہ آپ کی وائف ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جی!"

"آپ کہاں رہتے ہیں؟" اس نے کاٹن گاز بناتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ آپ کو پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا میں نے...... دو سال پورے ہو گئے ہیں مجھے یہاں ڈیوٹی دیتے ہوئے۔"

"جی! ہم ملتان سے آئے ہیں۔"

"کس کے ہاں ٹھہرے ہیں؟" ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی مسلسل چل رہی تھی۔

"ادھر بیٹ میں...... دریا کے پاس، احمد علی کے گھر......" میں نے ایک فرضی نام بتا دیا۔

وہ حیرت سے بولی۔ "احمد علی؟ وہ کون ہے؟"

میڈم کے کراہنے کے سبب اس کی توجہ مجھ پر سے ہٹ گئی اور میں دوسرا جھوٹ بولنے سے بچ گیا۔ میں نے میڈم کی کلائی تھامی۔ بخار اُتر گیا تھا۔ مجھے ایک ذرا طمانیت ہوئی۔ میں نے خوب رُو ایل ایچ وی کو مخاطب کر کے کہا۔ "مس! بخار اُتر گیا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ میڈم شکیلہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ تھوڑی دیر بعد، جونہی اس کی حالتِ زار سے کچھ مطمئن ہوئی، اس نے ڈرپ نیڈل نکال دی اور کہا۔ "یہ اب خطرے سے باہر ہیں۔ سر کے زخم کی وجہ سے معمولی ٹمپریچر ہے۔ گھنٹے بھر میں اُتر جائے گا۔"

اس نے درست کہا تھا۔ میڈم کی حالت سنبھل چکی تھی۔ رات بھر کی اچھل کود اور بے آرامی کے بعد اب گہری نیند میں تھی۔ کپکپاہٹ بھی رُک گئی تھی اور چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا انہیں ملتان لے جاؤں؟"

ایل ایچ وی چونکی، بولی۔ "میرا خیال ہے کہ انہیں کچھ دیر آرام کرنے دیجیے۔"

وہ مجھے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے میں گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھگنے قد والا شخص رضائی اُٹھائے وارد ہوا۔ میں نے اس سے رضائی لے کر میڈم پر اوڑھا دی۔

وہ بولا۔ "دوسری رضائی نہیں ہے۔ چاہو تو اِدھر گھس جاؤ۔" اس نے میڈم کی پائنتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چونکہ میں نے خود کو میڈم کا شوہر ظاہر کیا تھا، اس لیے اس کا یہ کہنا عجیب اور غیر فطری نہیں تھا۔ اندرونی کمرے سے ایل ایچ وی کی آواز سنائی دی۔ "صدیق! باہر والا دروازہ بند کر دینا۔"

"اچھا......" اس نے بلند آواز میں کہا۔ مجھے علم ہو گیا کہ اس بدوضع اور کرخت آواز والے شخص کا نام 'صدیق' تھا۔ میں نے ازراہِ گفتگو دریافت کیا۔ "کیا مس صاحبہ آپ کی بیوی ہیں؟"

"ہاں! میری بیوی ہے۔ یہ اسپتال میں لیڈی ہیلتھ وزیٹر ہے۔ میں پرائمری سکول میں ٹیچر ہوں۔"

"تو پھر انہیں آپ لوگ مس کیوں کہتے ہیں؟" مجھے تعجب ہوا۔

وہ مسکرایا، اس کی مسکراہٹ پیلے اور بدنما دانتوں کے سبب خاصی بدصورت تھی، بولا۔ "یہ دیہاتی علاقہ ہے۔ یہاں لیڈی ٹیچر اور ایل ایچ وی کو 'مس' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے، خواہ وہ چار بچوں کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔" اس نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا، پھر برآمدے میں کھڑے ہوئے لائن مین سے مخاطب ہوا۔ "تیری مہربانی بھائی! جا کر آرام کرو۔ خیر سلا ہے۔"

لائن مین بنا کوئی جواب دیے برآمدے کی سیڑھیاں اُتر گیا۔ صدیق نے دروازہ بند کیا، چٹخنی چڑھائی اور اندرونی دروازے کی طرف جاتے جاتے رُک کر پوچھا۔ "تم کیا کام کرتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ادھر ملتان میں اپنا بزنس ہے میرا۔"

"لگتا ہے کہ تمہاری مریضہ اب بالکل ٹھیک ہے۔"

"جی!" میں نے اس کا اور مس عالیہ کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔ "اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔ بیماری میں رات دن کی بات کیا، کوئی کسی بھی وقت بیمار ہو سکتا ہے۔ عالیہ اپنے مریضوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔" تھوڑے توقف کے بعد بولا۔ "کسی چیز کی طلب ہو تو بتاؤ، پھر ہم سو جائیں گے۔"

مجھے کسی شے کی طلب نہیں تھی۔ وہ بھی مس عالیہ کے پیچھے دوسرے کمرے میں گھس گیا تو میں میڈم کے پہلو میں بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دیدار کی عبادت کرنے لگا۔

دنیا دم بہ دم بدلتی ہے۔ میڈم کتنی بااختیار اور دولت مند تھی۔ اس کی آنکھ کے اشارے پر بیسیوں لوگ مرنے کٹنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ کسی کی سانسوں کی ڈوریوں کو کاٹنے کا اس بے دردی سے حکم دیتی تھی کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے مگر اس سرد رات کے دامن میں وہ کتنی کسمپرسی اور بے بسی سے سرکاری بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ شانت، آنکھیں بند اور سانسیں معتدل ہو گئی تھیں۔ قیامت آگیں رات کی کوئی تحریر اس کے چہرے پر نقش نہیں تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس خوب صورت اور دل افزا چہرے کی معصومیت محض دکھاوا تھی۔ باوجود کہ میں اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی بربریت کو دیکھ چکا تھا، اس کے دل آویز بہروپ کا شکار ہو چکا تھا۔

عورت ایک پہیلی ہے۔ اسے سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ میرے پاس لیٹی ہوئی بارسوخ عورت حسن پرست تھی۔ اسے زندگی کی طرف لوٹانے والی عالیہ بھی حسن کا شاہکار تھی مگر اس نے جسے اپنا جیون ساتھی چنا تھا، وہ نہایت بدصورت، سیاہ فام اور پستہ قامت تھا۔ بڑا بے جوڑ بندھن تھا۔

وہ کالا کوا، صدیق، مجھ سے کہہ گیا تھا کہ عالیہ اپنے مریضوں کا بہت خیال رکھتی ہے جبکہ مس عالیہ نے ازخود بتایا تھا کہ وہ رات کو ڈبل فیس وصول کرتی ہے۔ دونوں کے بیانات میں تضاد تھا۔ اس غریب اور دور اُفتادہ علاقے میں چہار سو غربت برہنہ ناچتی تھی۔

کمرا بند تھا مگر سردی کا احساس دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ میں خود کو میڈم شکیلہ کا شوہر ظاہر کر کے پھنس گیا تھا۔ اب نہ تو میں میڈم کے بستر میں گھس سکتا تھا اور نہ ہی دوسری رضائی اور چارپائی کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ کمرے میں گھڑی نہیں تھی۔ وقت کا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم نے کروٹ بدلی اور اس کے حلق سے 'آہ' کی مدھم سی آواز برآمد ہوئی۔ میں جلدی سے چارپائی پر سے اُتر کر قریب ہو گیا۔ پوچھا۔ "میڈم! کیا بات ہے؟"

میری آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے مجھے گھورتی رہی، پھر شناسائی کا احساس پا کر ہولے سے بولی۔ "ایسے کیوں جھکے کھڑے ہو؟"

میں نے بتایا۔ "آپ کے منہ سے آہ نکلی تھی۔"

"ہاں!" اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ بولی۔ "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تھوڑا دبا دو۔"

میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبانے لگا۔ وہ بولی۔ "صبح نہیں ہوئی؟"

"نہیں میڈم! ابھی تو کسی طرف سے اذان کی آواز

کانوں میں نہیں پڑی۔"

"ادھر بیٹھ جاؤ، لحاف میں، کم آن!" اسے شاید غیر معمولی سردی کا احساس ہو گیا تھا۔

میں نے کہا کہ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں تو وہ قدرے سخت لہجے میں بولی، "کہا ناں ...... ادھر آجاؤ......" ساتھ ہی اُس نے تھوڑا پرے ہٹ کر میرے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور بولی۔ "تم بہت اچھے ہو شہر یار! آئی لو یو...... تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں یقیناً سردی میں کانپ کانپ کر مرچکی ہوتی۔ تھینکس آلاٹ......"

اسے شکریہ ادا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں اُس کا تنخواہ دار تھا۔ میں نے احساسِ ممنونیت سے مغلوب ہو کر کہا۔ "میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ جو نتیجہ بھی اخذ کرنا چاہیں، کر سکتی ہیں۔"

میں نے جوتے اُتارے اور اس کے بالکل قریب ہو کر رضائی میں پاؤں ڈال کر، عقب میں بیڈ کے گول پائپ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا ماتھا سہلانے لگا۔ وہ اپنی گہری آنکھیں مجھ پر مرتکز کیے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ میں نے اس کا زخم بچاتے ہوئے سر کو دبایا تو اس نے جھوٹ کہا۔ "نہیں ...... ایسے نہیں، بالوں میں انگلیاں پھیرو۔ جانتے ہو، بالوں میں انگلیاں پھیرنے اور سر دبانے میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ایک ذرا مسکرائی اور آنکھوں کو تھوڑا سا میچ کر بولی۔ "مریض کا سر دبایا جاتا ہے۔ محبوب کے بالوں میں انگلیاں پھیری جاتی ہیں۔ میں مریض نہیں بننا چاہتی کیونکہ مجھے ہمدردی کے اظہار سے بیزاری ہوتی ہے۔"

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ میری حیثیت کو پسِ پشت ڈال کر بڑی بات کہہ رہی تھی۔ میرے پیر اس کے بدن کو چھو رہے تھے۔ ایک ہی رضائی میں وہ ٹھوڑی تک جبکہ میں کمر تک دبکا ہوا تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرا دل گدگدانے لگا۔ اس کے بدن کی حرارت مجھ پر حملہ آور ہونے لگی تھی۔ اپنی توجہ ہٹانے کی غرض سے کہا۔ "میڈم! آپ کی طبیعت خاصی سنبھل گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔"

ایسے ہی وقت میں میرے کانوں میں دور کسی مسجد کے اسپیکرز سے پھوٹنے والی اذان کی آواز پڑی۔ صبح ہو گئی تھی۔ تھکا دینے والی طویل اور خون منجمد کر دینے والی سرد رات رخصت ہونے کو تھی۔

میڈم میرے داہنے پہلو میں لیٹی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اور شاید جی ہی جی میں شب بھر کی ریاضت اور سود و زیاں کا شمار کر رہی تھی۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا اور میں نے اپنا سوال دہرا کر اس کے انہماک کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک اُس نے طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور گویا ہوئی۔ "شہر یار! ہمیں ملتان جانا چاہیے یا پیرو ماچھی کے تعاقب میں نکلنا چاہیے؟"

میں نے کہا۔ "آپ بہتر سمجھتی ہیں۔"

"تمہیں گاڑی کہاں سے ملی؟"

میں نے اُسے دھیمی آواز میں پوری رپورٹ دی۔ وہ انہماک سے سنتی رہی پھر بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس مردود سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ اس کے پاس بتانے کے لیے ایسا کچھ نہیں تھا جو ہمیں فائدہ دیتا۔ پیرو ماچھی کے ڈیرے کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

میں نے اُسے پیرو ماچھی کے ویران حال ڈیرے کے بارے میں بتایا۔ میرے خاموش ہونے پر ستائش بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟"

"تم لحہ بہ لحہ اپنی پوزیشن بہتر کرتے جاتے ہو۔"

"میری قسمت میرا ساتھ دے جاتی ہے ورنہ میں اتنا مضبوط نہیں ہوں۔"

اس نے بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بولی۔ "یہ میں جانتی ہوں کہ تم کتنے مضبوط ہو۔" اس کی نظروں کی تاب بڑی جاندار تھی۔

"میں کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے انداز میں بولی۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں پیرو ماچھی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہیے اور اس کا تعاقب کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے دیر کی تو وہ چھپ جائے گا۔ یقیناً اس نے کسی اور کے لیے اماں اور سیمو کو اغوا کیا ہے اور ان دونوں کو فوری طور پر کہیں پہنچا دیا ہے۔ ہمیں پیرو ماچھی سے اُس کی خدمات حاصل کرنے والے شخص کا نام دریافت کرنا ہے۔" تھوڑے توقف کے بعد بولی۔ "شہر یار! یہ شروعات تھی۔ اصل معرکہ آگے ہے۔ ہم نے دونوں مغویوں کو بہ حفاظت بازیاب کرانا ہے۔"

میں نے ایک ذرا جھجک کر کہا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم ملتان لوٹ جاتے ہیں۔ آپ تندرست ہونے تک آرام کریں اور میں کسی کو ساتھ لے کر پیرو ماچھی کی

گردن ناپنے نکل جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے مطلوبہ افراد کو دشمنوں کے چنگل سے نکال لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

"مجھے تم پر بھروسا ہے مگر......" وہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔

"مگر کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اگر آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ میں اس معاملے کو اس سنجیدگی سے نہیں لوں گا جس سنجیدگی سے آپ لیں گی...... تو یہ آپ کی غلطی ہوگی۔"

"نہیں شہر یار! تم بہت اچھے ہو...... جانتی ہوں کہ تم میرے دکھ کو اپنا دکھ سمجھو گے مگر چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ میرے علاوہ تم تک محدود رہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اکیلا چلا جاؤں گا۔"

"نہیں...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم یہاں سے پیرو ماچھی کے پیچھے جائیں گے۔ اس پر کوئی دو رائے نہیں ہیں۔" اس نے فیصلہ کن انداز کیا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ پھر ہمارے درمیان طویل خاموشی حائل ہو گئی۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ پل میں ماشہ، پل میں تولہ...... اور دیکھنے والے کو اپنی ذات کی بھول بھلیوں اور غلام گردشوں میں گم کر دیتی تھی۔ دل کو یقین نہیں آتا تھا کہ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے شہر کے بیوروکریٹس اور نامی گرامی سیاست دان بے تاب رہتے تھے، وہ نہ صرف شب بھر میرے ساتھ رہی تھی بلکہ اس وقت بھی میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔ "میں بہت خوش بخت ہوں...... بہت زیادہ...... اتنا کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔"

میرا جملہ اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے مہمل تھا۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور پوچھا۔ "کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

میں جھینپ گیا۔ اپنے خیالات میں بہکتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ وہ تاڑ گئی کہ مجھ سے بات بنائے نہیں بن رہی تھی تبھی مستفسر ہوئی۔ "کیا سوچ رہے تھے؟"

ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے آنکھیں موند کر جواب دیا۔ "میں آپ کے قرب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرا لفند ہو کر آپ کے ساتھ آنا آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ اس لیے خود کو خوش بخت قرار دے رہا تھا۔"

بعض اظہار ایسے ہوتے ہیں جو مقابل کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر کیے جاتے ہیں۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں پر میرا ہاتھ رکھا اور کہا۔ "شہر یار! میں کتنی طاقت ور ہوں، تم نہیں جانتے۔ میرا اندر کتنا کمزور ہے، تم یہ بھی نہیں جانتے۔ تم سادہ فطرت دیہاتی انسان ہو...... میں نے انہی فضاؤں میں جنم لیا تھا۔ جہاں میں اِس وقت پڑی ہوں، تم بھی۔ یہ علاقہ مجھ سے میرا بچپن اور لڑکپن چھیننے والا ہے۔ تم نے سنا تھا، وہ بڈھا مجھے چندو کہہ رہا تھا...... دیکھا تھا، وہ مجھ سے کتنی نفرت کرتا تھا...... ہے نا؟ کتنی حیرت کی بات ہوگی تمہارے لیے کہ وہ میرا رشتہ دار نہیں، سگا نہیں۔ تم شاید اس کے رویے کو دیکھ کر اسے میرا باپ سمجھ رہے ہو...... نہیں...... وہ میرا باپ تو کجا، میرا کچھ بھی نہیں لگتا مگر میرا سب کچھ وہی تھا۔ میں اُسے بابا کہتی تھی۔ اس کی بیوی کو ماں اور اس کے بیٹے کو اپنا سگا بھائی سمجھتی ہوں۔ اسی لیے اس خاندان پر آنے والی مصیبت کو اپنے تن کی آگ سمجھ کر بے چین ہو رہی ہوں۔"

میں اُسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھوں پر میرا اور اس کا اپنا ہاتھ دھرا ہوا تھا۔ وہ عجیب عالمِ جذب میں بول رہی تھی۔ "شہر یار! یہ بڈھا جوانی میں مچھیرا ہوا کرتا تھا۔ دریا اور ڈھنڈ سے مچھلیاں پکڑ کر شجاع آباد میں بیچنے جایا کرتا تھا۔ تب یہ ادھیڑ عمر ہوا کرتا تھا۔ مجھے کندھوں پر بٹھا کر بیٹ کے پرائمری سکول میں چھوڑ آیا کرتا تھا۔ تب میں اسے بہت پیاری ہوا کرتی تھی۔"

میں حیرت پاش نظروں سے میڈم کے نیم خوابیدہ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی بڑی بات کتنے عام سے انداز میں بتا رہی تھی۔ بولی۔ "ہاں شہر یار! دنیا ایسی ہی تو ہے۔ دینے پر آتی ہے تو اپنی رگوں سے خون نچوڑ کر حلق میں ٹپکا دیتی ہے۔ چھیننے پر آتی ہے تو سانسوں پر ہاتھ ڈالنے سے بھی نہیں چوکتی۔ اس بڈھے کا نام غلام محمد ہے جسے لوگوں نے بگاڑ کر گامن بنا رکھا ہے۔ اس کی بیوی کا نام تاجاں ہے۔ بیٹے کا نام وسیم عرف سیمو ہے۔ اس کی بڑی بیٹی کا نام سرداراں ہے۔ وہ صرف نام کی سرداراں ہے ورنہ تو شاید کہیں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ رہی ہوگی۔ اس کوڑی کوڑی کو محتاج گھرانے نے محبت کے وہ خزانے مجھ پر لٹائے جن کے دہانے دولت والوں کی دنیا میں کہیں نہیں کھلتے۔"

وہ رک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ ایسے ہی وقت میں، جب اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا تھا، ڈرائنگ روم کم کلینک کا اندرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میڈم نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے دروازے کی سمت دیکھا۔ صدیق دروازے میں کھڑا اشتیاق بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر بولا۔ "کیوں بھئی جوان! کیا تمہاری بیوی ٹھیک ہو گئی ہے؟"

میں نے میڈم کی طرف شرمسار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! افاقہ لگتا ہے۔“

”تم لوگ ناشتا کس چیز کے ساتھ کرتے ہو؟“

مجھے سمجھ نہ آئی کہ اس نے یہ بے موقع سوال کیوں کیا تھا، کہا۔ ”میں سمجھا نہیں!“

”میں دودھ اور دہی لینے کے لیے جا رہا ہوں۔ ہم دہی پراٹھوں سے ناشتا کرتے ہیں۔ تم کچھ اور منگوانا چاہو تو بتا دو۔“ وہ بیرونی دروازے کی چٹخنی اُتارتے ہوئے بولا۔

میڈم نے جلدی سے کہا۔ ”آپ تکلف نہ کریں، ہم نکل رہے ہیں۔“

”کیا مس عالیہ کے جاگنے تک نہیں رکیں گے؟“ وہ استعجاب آمیز انداز میں بولا۔ ”بہتر ہے کہ چیک اَپ کروا کر جائیں۔“

میڈم خاموش ہوگئی۔ میں نے کالے کلوٹے اور فرماں بردار قسم کے شوہر صدیق کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم بس چائے پییں گے۔“

وہ باہر چلا گیا۔ میڈم بولی۔ ”یہ تمہیں میرا شوہر کیوں قرار دے رہا تھا؟“

میں نے کہا، ”وہ دراصل...... ان دونوں نے ہمیں میاں بیوی سمجھنے کی غلطی کی اور میں نے ان کی تصحیح کرنی مناسب نہیں سمجھی ورنہ وہ ہمیں مشکوک خیال کرتے ہوئے باہر سے ہی ٹرخا دیتے۔“

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورا اور ایک دم دل آویز انداز میں مسکرانے لگی۔ بولی۔ ”کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں جوان اور خوب صورت ہیں۔ دیکھنے میں شاید تو بیاہتا میاں بیوی محسوس ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ہے ناں؟“

میرے پاس اس کے طفلانہ سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں نے یاد دلایا۔ ”آپ غلام محمد عرف گامن کے بارے میں بتا رہی تھیں۔“

”ہاں! گامنوں بڑا جفاکش انسان تھا۔ معذور ہونے سے قبل ایک من یعنی چالیس کلوگرام مچھلی کاندھے پر اُٹھا کر بیچنے کی غرض سے ہر صبح شہر جایا کرتا تھا۔ دوسرے کاندھے پر اس نے مجھے بٹھا رکھا ہوتا تھا۔ میرا اسکول راستے میں پڑتا تھا۔ واپسی پر مجھے اسکول سے لے لیا کرتا تھا۔“

میں اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ لفظ کو سمیٹ کر دماغ میں نقش کر رہا تھا۔ ایک ذرا طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”بابا نے میرا نام چاند ماہی رکھا تھا۔ ماہی مچھلی کو کہتے ہیں۔ ایک مچھیرے کو مچھلی سے زیادہ کون سی چیز پیاری ہو سکتی ہے...... ہے ناں؟ پھر سب مجھے 'چندو' کہنے لگے۔ پانچویں کلاس کے بعد مجھے اس نے اپنے ساتھ گدھا ریہڑی پر شہر لے جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ مچھلی بیچنے کے بعد شہر میں ریہڑی پر مزدوری کرتا اور جب مجھے اسکول سے چھٹی ہوتی تو لینے کے لیے پہنچ جاتا۔ ہم دونوں ریہڑی پر بیٹھ کر گھر لوٹ آتے۔ یہ ہماری زندگی کے سنہرے دن تھے کیونکہ ان دنوں گھر میں بابا کی دہری مزدوری کی وجہ سے پیسے کی ریل پیل تھی اور پھر......“

اس کی مدھم لہجے میں رواں دواں زبان کو بریک لگ گئے کیونکہ ہم دونوں کو بہ یک وقت دروازے میں کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی مس عالیہ دکھائی دے گئی تھی۔ اس نے شاید ایک آدھ جملہ سن بھی لیا تھا۔ جماہیاں لیتی ہوئے بیڈ کے پاس آ کر رُک گئی۔ بولی۔ ”آپ کی طبیعت کیسی ہے اَب؟“

اس نے میڈم کو مخاطب کیا تھا۔ میڈم نے ہی جواب دیا۔ ”میرے سر میں عجیب سی دھمک پڑ رہی ہے۔ بخار اُتر گیا ہے مگر جسم دکھ رہا ہے۔“

عالیہ نے اس کی نبض چیک کی۔ پھر سر کا زخم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بیڈ سے اُتر کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور وہ پیشہ ورانہ انداز میں اس کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔ میں سر کے زخم کا عذاب بھگت چکا تھا۔ باجود کہ اس کے زخم کی نوعیت سنگین نہیں تھی اور محض جلد پھٹی تھی، وہ درد سے بے حال ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ کھوپڑی کی ہڈی تک بھی ضرب کا اثر پہنچا ہو مگر ٹانکے لگانے یا گاز رکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مس عالیہ کی چھیڑ چھاڑ سے اس کے لبوں سے سسکیاں برآمد ہو رہی تھیں۔

میں نے بیرونی دروازہ کھول کر دیکھا۔ صبح ہو چکی تھی اور دیہاتی زندگی اپنے معمول کے مطابق ہڑبڑا کر نہ صرف بیدار بلکہ متحرک ہو گئی تھی۔ برآمدے سے کچھ فاصلے پر اینٹوں کے سالخوردہ سولنگ پر کھڑی ہوئی گاڑی کا کیچڑ سے برا حال ہو چکا تھا اور اس کی تاب و تمکنت رخصت ہو چکی تھی۔ اسپتال کی چاردیواری کے باہر سے گزرتی ہوئی کچی سڑک پر گوالوں کی سائیکلیں، موٹر سائیکلیں اور چھوٹی بڑی ریہڑیاں رواں دواں تھیں۔ سلاخوں والے گیٹ کے عین سامنے واقع کریانے کی دکان کھل چکی تھی اور ایک دیہاتی عورت اور چند میلے کچیلے بچے شاپنگ میں مشغول تھے۔ صدیق بھی اسی دکان پر کھڑا تھا۔ دکان سے ملحقہ بڑا سا کمرا اپنی ساخت کے اعتبار سے آٹا پیسنے والی چکی معلوم ہو رہا تھا۔

اطراف کے یک نظری جائزے نے ہی باور کیا کہ یہ جگہ رہائش کے لیے نہایت موزوں تھی۔ بے بہا قدرتی حسن جلوہ افروز تھا...... دیہاتوں کے سرکاری اسپتالوں میں رہائش پذیر ہونا بڑا خوش آئند ہوتا ہے مگر نہیں معلوم کیوں ڈاکٹرز اور اسپتالوں کا عملہ یہاں رہنے سے گریزاں ہوتا ہے۔ نور پور کا سرکاری اسپتال بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ وہاں بھی غیر معمولی ہریالی دل کو اپنی جانب کھینچتی تھی مگر ڈاکٹر منور علی شاہ کے علاوہ کوئی بھی ڈاکٹر وہاں قیام پذیر نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ کہا کرتا تھا کہ وہ جہاں بھی جائے گا، ایسی ہی کوٹھی اور اسپتال اس کا منتظر ہوگا مگر آنے والا ڈاکٹر نور پور میں دلچسپی نہیں رکھتا ہوگا۔ اس نے بجا کہا تھا۔ وہ جہاں پہنچا ہوگا، اس نے اپنی دنیا بسا لی ہوگی۔ مگر نور پور کے لوگوں کو دوسرا مسیحا نہیں ملا ہوگا۔

سورج نکلتے ہی ایک خاکروب نے اسپتال کے سولنگ پر بڑا سا جھاڑو پھیرنا شروع کر دیا۔ مرکزی عمارت کا دروازہ کھول کر اس نے فرش بھی صاف کر دیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے چند عورتیں اپنے بچوں کے ہمراہ اسپتال کے احاطے میں داخل ہوئیں اور تمسخنی انداز میں چلتی ہوئی اسپتال اور رہائشی کوارٹروں کے تقریباً درمیان میں درختوں تلے رکھے ہوئے چوبی بنچوں پر بیٹھ گئیں۔ شاید وہ دن بچوں کی ویکسی نیشن کے لیے مختص ہوگا۔

میرے عقب میں میڈم اور مس عالیہ محوِ کلام تھیں جبکہ میں ان کے مابین ہونے والی گفتگو سے بے نیاز ماحول کا مشاہدہ کرنے اور بغیر کسی وجہ کے اس اسپتال کا نور پور کے اسپتال سے موازنہ کرنے میں محو تھا۔ اسی بہانے اپنے گاؤں کو یاد کر رہا تھا۔ میرے لیے یہی حوصلہ افزا بات تھی کہ میرا یار کھالا نور پور میں پہنچ گیا تھا۔ وہ میری عدم موجودگی میں میری پھوپی اور غزالہ کا خیال رکھ سکتا تھا۔

مجھے غزالہ کے ساتھ ساتھ چنچل سی خالدہ عرف بلو کی تصوراتی شبیہوں نے بے چین کیا۔ میری دھڑکنیں ماسٹر جی اور زیناں کی یاد کے ساتھ ایک مرتبہ غیر معتدل ہوئیں۔ ہائے! میرا بھرا پُرا نور پور اُجڑ گیا تھا...... میری بھی سنوری جنت بکھر گئی تھی۔ کم بخت سائیں دل جیت شاہ کی غیرت پاش حرکات نے ساری رونقیں پامال کر دی تھیں۔ اگر مجھے میڈم شکیلہ کے دستِ راست میرو شاہ کی صورت میں غیبی امداد میسر نہ آتی تو میں شاید سر چھپانے کی جگہ بھی حاصل نہ کر سکتا اور دنیا کی ٹھوکروں کی زد میں نیست و نابود ہو چکا ہوتا۔

اس کے باوجود کہ مجھے پروین کے اغوا کے بعد سے اَب تک اس کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی اور نہ ہی کوئی مضبوط کلیو ملا تھا، میرے والدین کے قاتل دنیا میں دندناتے پھرتے تھے، میرے چاچا اور چاچی کے قاتلوں کو اسلحے سے لیس کر کے روانہ کرنے والا سردار حیدر خان اپنی مونچھوں کو بل دیتا پھرتا تھا، میں بکھرا نہیں تھا۔ شاید یہ فرزانہ، شبانہ اور موجو کی زندہ و سلامت موجودگی کے احساس کے باعث تھا یا میڈم شکیلہ کے فرحت آگیں قرب کا اعجاز تھا، میں اتنا بے کل اور پریشان نہیں رہا تھا جتنا تباہی کے اولین دورانیے میں تھا۔

صدیق ناشتے کے لوازمات سے لدا پھندا میرے قریب سے گزر کر کوارٹر کے اندر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس نے پکارا۔ وہ مجھے ناشتا کرنے کے لیے بلا رہا تھا۔ میں میڈم کے پاس آ گیا۔ صدیق نے بیڈ پر ہی بڑی سی اسٹیل کی ٹرے رکھ چھوڑی تھی جس میں پراٹھے، دہی اور انڈوں کے آملیٹ رکھے ہوئے تھے۔ میڈم بولی۔ ”تم لوگوں نے تکلف کیا ہے۔“

صدیق کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔ ”نہیں جی! آپ کو قدرت نے مصیبت میں ہمارے پاس پہنچایا ہے مگر ہم نے آپ کو اپنا مہمان سمجھا ہے۔“

صدیق کے رویے میں اس قدر جاگزیں ہونے والا تغیر میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔ ہم ابھی ناشتا کر ہی رہے تھے کہ مس عالیہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے آ گئی۔ اس نے ٹرے بیڈ پر رکھی اور خود ایک اسٹول گھسیٹ کر میڈم کے قریب بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”آپ تکلف کریں گی تو مجھے دکھ ہوگا۔“

وہ بہت نرم خو عورت تھی۔ ہمارے ساتھ اس کا برتاؤ شروع سے ہی محبت آمیز تھا مگر مجھے اس کے لہجے میں خوشامد کی آمیزش کھٹکی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میڈم نے اُسے اپنی امارت اور شخصیت کے رعب میں مبتلا کر دیا تھا۔ حالات کیسے بھی ہوں، نئے ماڈل کی لینڈ کروزر میں اسپتال لائی جانے والی، قیمتی اور جدید وضع کے سوٹ میں ملبوس میڈم شکیلہ اپنی وجاہت اور خوبروئی میں بھی یکتا تھی۔ دیکھنے والا اس کی شخصیت کے دبدبے میں آ جاتا تھا۔ مس عالیہ بینا تھی، دانا تھی، جان گئی تھی کہ وہ کوئی معمولی حیثیت کی عورت نہیں ہے۔ تبھی اس کا لہجہ مزید نرم اور شائستہ ہو گیا تھا۔

میڈم شکیلہ نے چائے کا کپ اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”عالیہ! کیا تم نے لو میرج کی ہے؟“

عالیہ اس غیر متوقع سوال پر ٹھٹکی، پھر شرما کر صدیق کی طرف دیکھنے لگی جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا، بولی۔ ”جی! ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔“

میڈم کے ساتھ ساتھ میں بھی بری طرح چونکا۔ مجھے مس عالیہ کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔ صدیق حور کے پہلو میں لنگور جیسا لگتا تھا۔ وہ جتنی خوب صورت اور نرم و نازک عورت تھی، صدیق اتنا ہی بدصورت، کالا اور کھردرے نین ونقوش والا مرد تھا۔ پھر لو میرج......؟ میڈم نے ایک نظر صدیق کو دیکھا، پھر اپنی حیرت کو دباتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں کے خاندانوں نے تمہاری اس دلیری کو برداشت کرلیا؟''

عالیہ بولی۔ ''صدیق کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ میرے گھر والوں نے میرا فیصلہ قبول نہ کیا اور مجھ پر دروازے ہمیشہ کے لیے بند کردیے۔ میں پانچ سالوں میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو منا نہیں سکی۔'' عالیہ کی آواز مرتعش ہوگئی۔ گہرے دکھ کی دبیز نمی اس کے حلق میں اُتر آئی، بولی۔ ''سبھی نے صدیق کی شکل دیکھی۔ سبھی نے اس کا فیملی بیک گراؤنڈ دیکھا۔ سبھی نے اس کے نین ونقوش اور قد بت دیکھا مگر کسی نے بھی اس کے اندر کی اجلی اور شفاف دنیا کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اگر میں نے اسے اپنا جیون ساتھی بنا ہی لیا تو کیا قیامت آگئی...... کیا دنیا میں صورت وشکل ہی سب کچھ ہوتی ہے؟...... ہائے! نہ جانے کیوں مجھے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ میں نے ایک کالے شخص کو اپنا شریکِ حیات منتخب کرکے بہت بڑی حماقت کرڈالی ہے...... میں آپ کی نہیں، اس سارے زمانے کی بات کررہی ہوں۔ ان لوگوں کو کوستی ہوں جو ہمیں دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگتے ہیں۔''

وہ روہانسی ہوگئی۔ صدیق نے موقع غنیمت جانا اور اس کے کاندھے پر تھپکی دے کر باہر چلا گیا۔ میڈم نے عالیہ کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولی۔ ''عالیہ! میرا پوچھنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم نے اپنے دل کا کہنا مانا، بڑی بات ہے۔ اس دنیا میں ایک دل ہی تو ہے جو زندگی کی آخری سانس تک ہمارا ساتھ نبھاتا ہے...... ہاں! لوگوں کا تعجب اپنی جگہ، تمہارا فیصلہ اپنی جگہ درست...... دل میلا نہ کیا کرو۔''

وہ بولی۔ ''آپ دونوں بھی میاں بیوی ہیں۔ دونوں بلاشبہ ایک دوسرے سے بڑھ کر خوب صورت ہیں مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جونہی رات کو بیڈ روم کی بتی بجھ جاتی ہے، تمام رنگ روپ دھندلا جاتے ہیں۔ کالے گورے، سب اندھیرے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میں نے دنیا کو ناراض کیا۔ شاید اللہ کو بھی ناراض کردیا ہے۔ پانچ سال ہوگئے، اس نے میری گود نہیں بھری۔ میرے پاس ہر دوسرے روز کوئی نہ کوئی عورت آتی ہے اور بچہ جنم کر خوشی خوشی گھر لے جاتی ہے۔ میں دیکھتی رہتی ہوں۔ سب کی مدد کرتی ہوں مگر میرے دکھ کا درماں کوئی نہیں کرتا۔ مجھے ایک بچہ نہیں دیتا۔ پانچ سال...... بڑا عرصہ ہے بیگم صاحبہ! اب تو زندگی ویران لگنے لگی ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔ میرا سوہنا رب مجھ پر راضی ہوجائے۔''

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز بھرا گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میڈم کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ اس کی حالتِ زار دیکھ کر میڈم کے منہ سے ہمدردی کا ایک کلمہ بھی برآمد نہیں ہوسکا۔ بہ دقت تمام بولی۔ ''تم دونوں اپنا چیک اَپ کراؤ۔ ہوسکتا ہے کوئی معمولی رکاوٹ حائل ہو۔''

عالیہ نے اپنا سر گھٹنوں پر ڈال دیا۔ سسکتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ''الماری بھری پڑی ہے مختلف اسپتالوں کی رپورٹوں سے۔ رپورٹیں کہتی ہیں کہ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں۔ کسی اللہ والے کی راہ بھاتے ہیں کہ مایوس نہ ہو، اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ اللہ والے کی تلاش میں نکلی تو مجھ بختوں جلی کو ہر جگہ بھیڑیے جیسی آنکھوں والے پیر فقیر ملے۔ ہائے بیگم صاحبہ! ہر کوئی کہتا ہے کہ میں نے ماں باپ کی بات نہ مان کر ان کا دل دکھایا ہے۔ اس لیے ان کی بددعائیں میرا سہاگ چاٹنے لگی ہیں۔'' وہ اب ہچکیاں لینے لگی تھی اور اس کی آواز بھی ٹوٹنے لگی تھی، کہہ رہی تھی۔ ''بیگم صاحبہ! میں پچھلے ماہ میکے گئی تھی۔ ماں اور باپ کے پیروں میں سر رکھ کر روئی تھی اور ان سے معافی مانگی تھی۔ باپ نے منہ پھیر لیا۔ ماں نے چہرہ چھپالیا۔ ایک بھائی ملا تھا۔ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ سنگدلی سے بولا کہ آج آگئی ہو، زندگی کی خیر مناؤ اور آئندہ یہاں قدم نہ رکھنا۔ ہم اگر ان جوتوں کو بھول گئے جو لوگوں نے بہن کے منہ کالا کر جاتے پر ہمیں مارے تھے تو ہم تمہارے لیے دعا کردیں گے۔ بہنوں کو زبردستی سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی مگر ان کی آنکھوں سے ایک قطرہ تک نہیں ٹپکا۔''

میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میڈم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور مس عالیہ زار وقطار رو رہی تھی۔ میں نے میڈم کو امید طلب نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''آپ اسے چپ کرائیں ناں!''

اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بولی۔ ''میرے پاس اسے دینے کے لیے ایک بھی تقویت بھرا لفظ نہیں ہے، کیا دوں؟''

میں ہمت کرکے اُٹھا۔ اسٹول پر گھٹنوں میں سر ڈال کر ٹوٹ کر روتی بکھرتی مس عالیہ کے بالوں میں چھپے ہوئے

کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر سر اُٹھایا اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ 'کیا بات ہے؟' ......

میں نے ہمدردی آمیز انداز میں کہا۔ ''مس عالیہ! غم نہ کرو۔ ابھی تمہاری شادی کو محض پانچ سال ہوئے ہیں۔ خدا جب راضی ہوتا ہے تو ایک پل میں زندگی بھر کے گلے شکوے دور کردیتا ہے۔ رہی بات ماں باپ کی ناراضی کی؛ تو وہ بھی ایک نہ ایک دن مان جائیں گے اور تمہیں گلے سے لگالیں گے۔ لوگ غلط کہتے ہیں۔ ماں باپ بددعا نہیں دیتے۔ وہ روٹھ کر بھی رب سے اپنی اولاد کی تندرستی اور سلامتی مانگتے رہتے ہیں۔ اولاد اور والدین میں یہی فرق ہوتا ہے۔ بہن بھائی ایک نہ ایک دن مان جاتے ہیں۔ تب تک تم مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ میں تمہیں بھائی کا پیار دوں گا اور کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔ میڈم صاحبہ کو تم اپنی بہن سمجھو۔ وی لو یو...... وی کیئر اباؤٹ یو......''

اس کی آنکھوں میں موہوم سی چمک پیدا ہوئی۔ کھڑی ہوگئی اور اپنی مخروطی انگلیوں سے زیرِ چشم جلد کو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''کسی عورت کو بہن کہنا بہت آسان ہے مگر نبھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیا آپ یہ سوچ کر کہہ رہے ہیں؟''

میڈم بولی۔ ''ہاں...... یہ بھی اور میں بھی......''

اس نے ایک نظر میڈم کو دیکھا پھر مجھے اور ایک جھٹکے سے بڑھی اور مجھ سے دیوانہ وار چمٹ گئی۔ ایسے میں وہ کچھ کہہ بھی رہی تھی مگر مجھے اس کی بے ربط باتوں کی سرے سے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والا ایک لفظ 'بھائی' اس کے من میں پیدا ہونے والی ہلچل کو عیاں کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا۔ وہ مجھ سے علیحدہ ہوکر میڈم کی طرف گئی۔ میڈم نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ سینے سے پھسل کر جھولی میں گر گئی اور رونے لگی۔ میڈم نے اس کی پیٹھ تھپکی، بالوں کو سہلایا اور بولی۔ ''تم نے ڈاکٹر بن کر ڈبل فیس مانگی تھی۔ میں بہن بن کر دس گنا فیس دے کر جاؤں گی۔ بتاؤ، تمہاری فیس کتنی ہے؟''

اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا، بولی۔ ''نہیں بیگم صاحبہ! میری کوئی فیس نہیں ہے۔ وہ تو میں نے ایسے ہی کہا تھا۔''

میڈم مسکرائی۔ وہ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی غم و اندوہ کی دھند کو ایک لمحے میں ہٹانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

مس عالیہ نے سر اُٹھایا، بولی۔ ''مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت امیر اور بڑے گھر کے لوگ ہیں جبکہ میں بہت کمزور اور چھوٹی ہوں۔ اتنی کہ محض چند روپوں کی نوکری پر اترانے لگتی ہوں۔ آپ بڑی ہیں۔ کروڑوں پتی ہوکر بھی خاموش رہتی ہیں۔ میں اس وقت بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ آپ میری مدد کریں۔''

نہ صرف اس کے آنسو تھم گئے تھے بلکہ وہ پوری طرح سنبھل گئی تھی۔ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پل میں خوش، پل میں غم بار...... ان کی دنیا خوشی اور غمی کے جذبوں پر گھومتی رہتی ہے۔

میڈم نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''ہاں بولو! مجھ سے جو بھی ہوسکا، تمہارے لیے کروں گی۔ کیا نوکری کے معاملے میں کوئی پرابلم ہے؟''

وہ بولی۔ ''نہیں...... میں نوکری کو نوکری سمجھ کر کرتی ہوں۔ میرا میڈیکل آفیسر بھی بہت شریف انسان ہے۔ وہ یہاں آنے والے افسروں کو خود ہی مطمئن کردیتا ہے۔ مجھے دیکھ کر للچانے والوں کی آنکھوں میں سرمہ سلائی ڈال کر مجھے اوجھل کردیتا ہے اور مجھ تک کسی کو پہنچنے نہیں دیتا۔''

''پھر؟'' میڈم نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا۔ ''پھر ایسی کیا مشکل ہے جس میں تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا پیسے چاہئیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بیڈ سے اُتر کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس نے صدیق کو آواز دی اور بہت دھیمی آواز میں اس سے باتیں کرنے لگی۔ محسوس ہوا کہ دونوں میاں بیوی مشاورت کرنے لگے تھے کہ وہ اپنی مشکل ہم پر آشکار کریں یا نہیں۔ فیصلہ کرلینے پر مس عالیہ پلٹ کر آئی اور بولی۔ ''صدیق نے آج اسکول سے چھٹی کی ہے۔ میں نے اُسے باہر رکنے اور کسی کو ادھر نہ آنے کا کہہ دیا ہے۔ بات ہی کچھ ایسی ہے بیگم صاحبہ! جس کے لیے راز داری بہت ضروری ہے۔''

میں اس کے جملے اور چہرے پر ثبت ہونے والی گمبھیرتا کو دیکھ کر چونک گیا۔ حزن وملال کی جگہ عجیب سی سنجیدگی اور کشمکش اُس کے چہرے پر تحریر ہوگئی تھی۔

میڈم نے کہا۔ ''اب جبکہ میں نے تمہیں اپنی بہن بنالیا ہے، تم مجھے بیگم صاحبہ کہہ کر مت پکارو۔''

اس نے ممنون انداز میں سر ہلایا اور دونوں دروازے بند کرکے اسٹول میڈم کے بہت قریب کھینچ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''بیگم صاحبہ......''

''کہا ناں کہ مجھے بیگم صاحبہ مت کہو۔'' میڈم نے پیار سے ڈانٹا۔ ''تم مجھے 'باجی' کہہ سکتی ہو۔ میرا نام شکیلہ ہے، یعنی تمہارے لیے باجی شکیلہ۔ کوئی بھی عورت عمر میں بڑی

کہلانا پسند نہیں کرتی۔ میں عمر میں تم سے چھوٹی ہونے کے باوجود تمہاری بڑی بہن بننے کو تیار ہوں۔''

مجھے اس گھڑی میڈم شکیلہ بہت بھلی لگی۔ وہ کسی نہ کسی انداز میں اپنی برتری ثابت کرلیتی تھی۔ مس عالیہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگئی۔ شاید اس کا دماغ گومگو کی کیفیت میں تھا کہ بولے یا نہ بولے۔ میڈم کے انکار کا بھی اندیشہ تھا اور اُمید بھرے دل کے لیے ہر انکار اذیت انگیز ہوتا ہے۔

''میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔'' کچھ دیر بعد مس عالیہ نے سر اُٹھایا اور فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔ ''میرا شوہر آپ کی بڑی سی جیپ دیکھ کر ڈر گیا تھا کیونکہ ایسی گاڑیاں یہاں وڈیروں اور بڑے سیاست دانوں کے پاس ہوتی ہیں۔ کوئی بڑا جب ہم چھوٹوں کی دہلیز پر آتا ہے تو خیر نہیں ہوتی۔ پھر جب ہمسائے لائن مین نے بتایا کہ گاڑی میں ایک مریضہ ہے تو ہماری ہمت بندھی۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ ہم میاں بیوی کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ جس کا کوئی نہ ہو، اس کا ہر کوئی دشمن ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا مگر ہونے والا ہے۔ اَب یا کچھ دیر بعد یا پھر کچھ دنوں بعد...... کیونکہ مجھ سے ایک جرم سرزد ہوگیا ہے۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے یقیناً کوئی بہت بڑی بات اَب تک چھپا رکھی تھی جو اُسے نہ صرف بے چین کررہی تھی بلکہ اندر ہی اندر اُسے کاٹ رہی تھی۔ مجھے یہ حیرت بھی ہوئی کہ بہ ظاہر بہت مطمئن اور آسودہ دکھائی دینے والی عالیہ کسی بہت بڑے حادثے یا واقعے سے نبرد آزما تھی۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم غیر ضروری تمہید کو چھوڑ کر اپنی پریشانی کا تذکرہ کرو۔ اگر ہم کوئی مدد کرسکے تو ضرور کریں گے۔''

میں نے اُسے ٹوکنا مناسب سمجھا تاکہ ہمارا وقت بچ جائے۔ وہ ایک نگاہِ شکایت مجھ پر ڈال کر بولی۔ ''وہی تو بتانے لگی ہوں۔ یہاں سے چار پانچ کلومیٹر دور دریا کے کنارے پر ایک بستی واقع ہے سمن...... دریائی بستیوں کی طرح یہ بھی کچے پکے مکانوں اور اونچی نیچی ڈھلانوں پر مشتمل ہے۔ وہاں ایک شخص سجن بھٹی رہتا تھا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی بارہ ایکڑ کی وراثتی زمین میں اسے نصف حصہ چھ ایکڑ ملا۔ چھوٹا بھائی نوروز بھٹی اوباش فطرت انسان تھا۔ اس نے باپ کے مرنے کے بعد اپنی جائداد اللوں تللوں کی نذر کردی اور علاقے بھر کے لیے وبالِ جان بن گیا مگر اس نے بڑے بھائی کے خوف سے اُس کے لیے زندگی میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی۔ چھ ایکڑ اراضی کافی نہیں ہوتی۔ سجن بھٹی نے محنت مزدوریاں کیں، بہت ہاتھ پیر مارے اور...... بالآخر اپنی بیوی کو لے کر کینیڈا سدھار گیا جہاں اس نے عروج دیکھا۔ بہت دولت کمائی۔ اس نے اپنے بھائی کو بھی دولت سے نہلا دیا مگر وہ عیاش روی کے سبب بغیر کسی محنت کے ہاتھ لگنے والی دولت کو دونوں ہاتھوں لٹاتا رہا۔''

وہ اپنی پریشانی کو آشکار کرنے کے لیے تفصیل سے وہ کہانی سنا رہی تھی جس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور بہ ظاہر اس سے متعلقہ بھی نہیں تھی مگر ہم سننے پر مجبور تھے۔ اس کے شوہر نے ہمیں بہترین تخلیہ فراہم کردیا تھا اور ابھی تک کسی نے داستانِ رواں دواں میں دخل نہیں دیا تھا۔ مس عالیہ کی زبان پھر چل پڑی۔ اس کی سنائی ہوئی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔

''باجی! نوروز بھٹی نے ایک اچھا کام کیا۔ اس نے بڑے بھائی کی بھیجی ہوئی رقم کو ہمیشہ ایمانداری سے دو حصوں میں بانٹا اور ہر آدھی رقم سے بھائی کے نام پر رقبہ خریدتا گیا۔ یوں آج سے سال بھر پہلے تک سجن بھٹی کے نام بستی سمن میں بیالیس ایکڑ اراضی منتقل ہوگئی جبکہ نوروز بھٹی اپنے لیے فقط اپنی بچی ہوئی چھ ایکڑ اراضی ہی واگزار کرا سکا۔ سجن بھٹی کینیڈا میں مقیم رہا۔ اس کی ایک بیٹی اور بیٹا وہیں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دو چار سالوں بعد سمن آتے اور چند دن بستی میں گزار کر واپس چلے جاتے۔ یہ سلسلہ گزشتہ ماہ تک چلتا رہا۔

نوروز بھٹی کی فیملی کو بیٹھے بٹھائے ہزاروں ڈالرز ملتے رہتے تھے اس لیے وہ اپنے چچا اور اس کے خاندان کو آنکھوں پر بٹھاتے اور روتی ہوئی آنکھوں سے الوداع کہتے۔ یہ پیار بھری کہانی شاید کسی اچھے انجام تک پہنچ جاتی مگر قسمت کے ایک وار نے ہی ساری بساط الٹ کر رکھ دی۔ نگینہ اور سلامت بھٹی پچھلے مہینے کی تیرہ تاریخ کو پاکستان آئے اور نوروز بھٹی اپنے دونوں بیٹوں سمیت بھتیجی اور بھتیجے کو لاہور ایئرپورٹ سے سیدھا اپنے گھر لے آیا۔ ہر بار ایسے ہی ہوتا تھا۔ دونوں بہن بھائی خوش خوش اپنے چچا اور عم زادوں کے ہمراہ سمن میں آئے اور حسبِ سابق ناز برداریوں میں اپنی آبائی بستی کی کھلی فضاؤں میں کھیلنے کودنے لگے۔ چچا کے خاندان سے ملنے والی غیر معمولی اور بے پایاں محبت کے باعث انہیں کبھی بستی کی گلیاں، صحن اور ماحول گندا محسوس نہیں ہوا تھا۔

قسمت نے اپنا کھیل کھیلا اور اس ماہ کی تین تاریخ کو سجن بھٹی اور اس کی اہلیہ کینیڈا میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ کی نذر ہوگئے۔ جونہی ان دونوں کی ناگہانی موت کی اطلاع بستی

ممن پہنچی، ایک کہرام مچ گیا۔ دونوں بہن بھائی خبر سنتے ہی کینیڈا جانا چاہتے تھے مگر نوروز بھٹی کے خاندان نے اُنہیں پیار کی زنجیروں میں باندھ دیا اور کینیڈا نہ جانے دیا۔ پھر نگینہ اور سلامت بھٹی کے والدین کے تابوت بستی پہنچ گئے۔

ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد جونہی بہن بھائی نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا، نوروز بھٹی اور اس کے دونوں بیٹے ان کی راہ میں حائل ہو گئے۔ ان کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ ان کی جوان بیٹی کینیڈا کے اخلاق سوز ماحول میں رہے۔ پہلے اور بات تھی۔ غیرت کا قانون بے بس پر لاگو ہوتا ہے۔ لاوارثوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ سجن بھٹی کے جیتے جی خاندان کو غیرت کا مسئلہ درپیش نہیں ہوا تھا۔ اس کے مرتے ہی ترجیحات بدل گئی تھیں۔

نگینہ اور سلامت بھٹی جب واپسی پر مصر ہو گئے تو نوروز بھٹی کے خاندان نے آنکھیں پھیر لیں اور انتہائی درشت رویہ اپنا لیا۔ وہ کسی بھی قیمت پر دونوں کو کینیڈا روانہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بات بڑھتے بڑھتے لڑائی جھگڑے تک پہنچی۔ پیروں تلے ہتھیلیاں بچھانے والوں کے جھوٹے اور کچے رنگ اُتر گئے اور آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ گئی۔

ایک رات، آج سے پانچ دن قبل، نوروز بھٹی کے دونوں بیٹوں نے سلامت بھٹی کو قتل کر دیا۔ نگینہ نے بھائی کو قتل ہوتے دیکھا تو مارے خوف اور رنج کے بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آئی تو اسے پتا چلا کہ اس کے چچا نے گھر میں ڈاکوؤں کی آمد کی کہانی سنا کر قانون کو مطمئن کر دیا تھا۔ اپنی کہانی پر نوٹوں کی تصدیق بھی چپکا دی تھی تبھی ناحق بہنے والے خون کی پکار گلیوں میں چکراتی رہ گئی اور سلامت بھٹی منوں مٹی تلے دب گیا۔

نگینہ کی دنیا اُجڑ گئی تھی۔ ماں باپ حادثے کی نذر ہو گئے۔ چار سال چھوٹے بھائی کو، جس کی عمر محض پندرہ سال تھی، جائداد کے لالچ میں انسان سے بھیڑیا بننے والے رشتہ داروں نے قتل کر دیا تھا نگینہ وقفے وقفے سے ہوش میں آتی تھی، پھٹی پھٹی نظروں سے قاتل رشتہ داروں کے چہرے دیکھتی تھی اور پھر خوف اور غم سے بے ہوش ہو جاتی تھی۔ اس کی حالت ہفتہ بھر تک یہی رہی پھر اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ نوروز بھٹی نے اس سے پوچھے بنا اس کا نکاح اپنے بڑے بیٹے رفاقت بھٹی سے پڑھوا دیا۔ وہ چیخی چلاتی رہی مگر کوئی مدد کرنے والا قریب ہوتا تو اس کی مدد کو آتا......

جواں سال بھائی کے خون میں تر سہاگ رات اس نے بے ہوشی کے عالم میں گزار دی۔ اگلی رات کو دس بجے کے قریب وہ خطرات مول لیتی ہوئی گھر سے چوری چھپے نکل بھاگی۔ اسے نہ تو رستوں کا علم تھا اور نہ ہی اس کے ذہن میں کوئی منزل متعین تھی۔ وہ تو بس بھاگ رہی تھی اور بھیانک چہروں والے رشتہ داروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح بھاگتی ہوئی وہ ڈیڑھ بجے کے قریب میرے کوارٹر کے عقبی دروازے اور اسپتال کی باؤنڈری کے درمیان آن چھپی۔ وہاں ہم گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔ اُس بے چاری کی بدبختی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اس کو کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا۔ اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ میں اس وقت ایک ڈیلیوری کیس کر رہی تھی۔ میں نے صدیق کو اس طرف بھیجا۔ وہ اُسے سہارا دے کر چلاتا ہوا میرے پاس لے آیا۔ میں اس کی حالتِ زار دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ ننگے پیر کانٹوں اور کانچ کے ٹکڑوں سے چھلنی تھے جبکہ عروسی لباس بھی کئی جگہوں سے اُدھڑ گیا تھا۔ میں نے ڈیلیوری کیس سے فارغ ہوتے ہی اس کی ٹریٹ منٹ کی۔ وہ سنبھلی تو اس نے مجھے اپنی رام کہانی سنا کر مدد طلب کی۔ میں نے اُسے اپنے کوارٹر میں چھپا دیا۔

اس کے خاندان نے پورا علاقہ چھان مارا مگر وہ اس کا سراغ پانے میں ناکام رہے۔ میں اور میرے شوہر صدیق نے ہمسائے لائن مین اور اس کی بیوی کے کانوں میں بھی اس واقعے کی بھنک تک نہیں پڑنے دی ورنہ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح علاقے بھر میں پھیل جاتی اور وہ خونخوار درندوں کی طرح ہم پر پل پڑتے۔ نگینہ کئی راتوں سے یہاں بہ حفاظت چھپی ہوئی ہے اور ہماری احتیاط کے سبب زندہ و سلامت ہے۔"

مس عالیہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گئی اور باری باری ہم دونوں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ میرا دورانِ خون تیز تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت اس ظالم بستی میں جاؤں اور نوروز بھٹی کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں جنہوں نے جائداد کے لالچ میں اپنے ہی خاندان کا چراغ گل کر دیا تھا۔ سجن بھٹی کی دولت کینیڈا میں محفوظ تھی جس کے وارث سلامت بھٹی اور نگینہ تھے۔ ظالموں نے سلامت بھٹی کو مٹی تلے سلا دیا تھا اور نگینہ کو نکاح کی زنجیر میں باندھ کر ساری جائداد ہڑپ کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

میڈم کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "عالیہ! یہ تو بہت بڑی ٹریجڈی ہے، نگینہ کے ساتھ...... کیا نوروز بھٹی اس سونے کی چڑیا کا پتا کرنے یہاں نہیں آیا؟"

"نہیں باجی!" عالیہ پورے وثوق سے بولی۔ "ابھی تک کسی کو سوائے میرے اور صدیق کے، نگینہ کی یہاں موجودگی کی خبر نہیں ہے مگر ہم اتنے بڑے راز کو کب تک چھپا سکتے ہیں۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور کان سے کان ملا ہوا ہوتا ہے۔ نوروز بھٹی کو میں نہیں جانتی، اس کے بیٹوں کو میں نے نہیں دیکھا مگر صدیق بتاتا ہے وہ بہت ظالم اور بدمعاش فطرت لوگ ہیں۔ ہم دونوں کا آگے پیچھے کوئی نہیں، وہ ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹ پھینکیں گے اور نگینہ کو چھین لے جائیں گے۔ باجی! ڈر کے مارے مجھے ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔ نگینہ کے آنسو دیکھتی ہوں تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسے دھکا بھی نہیں دے سکتی۔ وہ جوان ہے۔ خوب صورت ہے۔ امیر زادی ہے۔ باہر نکلے گی تو اسے ہر شخص لالچ بھری خونیں نظروں سے دیکھے گا اور وہ دربدر بھٹکتی ہوئی کسی اندوہ ناک موت کا شکار ہو جائے گی۔ اگر اپنے چچازاد اوباشوں کے ہاتھ لگ گئی تو اپنے نوعمر بھائی کی طرح گمنام موت ماردی جائے گی۔ پلیز باجی! آپ میری مدد کریں اور نگینہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔"

عالیہ رونے لگی۔ میڈم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پیار سے بولی۔ "تم فکر نہ کرو عالیہ! آج کے بعد تم یہ سمجھنا چھوڑ دو کہ تمہارا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ میں ہوں ناں...... کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھے گا تو اس کی آنکھ نکال دوں گی۔ رہی بات نگینہ کی، تو میں نے تم سے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ میں اسے ابھی اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ وہ دربدر نہیں ہوگی اور لاوارثوں کی طرح لالچی رشتہ داروں کی بھینٹ نہیں چڑھے گی۔ مگر یہ بتاؤ، وہ کیا چاہتی ہے؟"

"وہ کیا چاہے گی؟ وہ کینیڈا جانا چاہتی ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ وہ وہاں جا کر ان ظالموں کے شر سے محفوظ ہو جائے گی۔"

"ہوں...... کیا وہ اپنے ساتھ سفری کاغذات لائی ہے؟" میڈم نے پوچھا۔

"پاسپورٹ؟" عالیہ نے پوچھا۔

"ہاں...... شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور ریٹرن ٹکٹ وغیرہ؟"

"نہیں...... میرا خیال ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بے چاری بہ مشکل اپنی جان بچا لائی ہے وہاں سے۔" عالیہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

میڈم نے مجھے دیکھا۔ "شہریار! تم کیا کہتے ہو؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ مرضی کی مالک ہیں۔" میں نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ نگینہ کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ عالیہ اتنی مضبوط نہیں ہے کہ زیادہ عرصہ تک اُسے پناہ دے سکے۔"

میڈم بولی۔ "میں نے نگینہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"تو پھر مجھ سے کیا پوچھتی ہیں؟"

"تم میرے ساتھی ہو۔" میڈم نے 'ساتھی' لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اپنے ساتھی کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے۔"

میری زبان خاموش رہی مگر میری آنکھوں نے اُسے بتا دیا کہ آپ کے فیصلے کو تقویت دینے کے لیے میری جان بھی حاضر ہے...... وہ بولی۔ "اوکے! ہم آگے کے بجائے، واپس ملتان جائیں گے۔" پھر عالیہ سے مخاطب ہوئی۔ "عالیہ! جاؤ، نگینہ سے بات کرو۔ اُسے اعتماد میں لو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ میرے ساتھ ملتان جانے پر رضامند ہی نہ ہو۔"

"نہیں باجی! اس نے دروازے کی جھری سے آپ کو دیکھا ہے۔ ونڈو کی جالی سے آپ کی گاڑی کو دیکھا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ اسے اس علاقے سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر لے جا سکتی ہیں۔ میں نے اس کے کہنے پر آپ سے بات کی ہے۔"

میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی پوری طرح فٹ نہیں تھی مگر پہلے سے کہیں بہتر حالت میں تھی۔ اس نے بھرپور انگڑائی لی، سردی سے تھمے ہوئے اعضا کو حرکت دی اور بولی۔ "شہریار! تم گاڑی اسٹارٹ کرو، میں نگینہ کو لے کر آتی ہوں۔ چلو عالیہ! اپنی مظلوم پناہ گزین سے ملواؤ۔"

عالیہ کے چہرے پر خوشی کے عکس لرزنے لگے۔ نگینہ کے چھپے ہوئے جوان وجود نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون لوٹ رکھا تھا۔ اس امتحان سے سرخرو ہونے والی تھی تبھی خوش تھی۔ میں ڈرائنگ روم کم کلینک سے باہر نکلا۔ لینڈ کروزر سے کچھ فاصلے پر نوخیز دھوپ میں کرسی بچھائے بیٹھے صدیق کو پاس بلایا۔ اس نے آنے میں دیر نہیں کی۔ قریب آ کر بولا۔ "کیا وہ بھی جا رہی ہے؟"

اس کا اشارہ نگینہ کی طرف تھا۔ میں نے کہا۔ "ہاں! اب ہم جائیں اور وہ کمینہ نوروز بھٹی جانے، تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے ممنون نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا، اسٹارٹ کی اور برآمدے کے نہایت قریب لے گیا۔ نگینہ کم سے کم وقت کے لیے کوارٹر کے باہر کھڑی ہو۔

میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ بعید نہ تھا کہ کوئی نگینہ کو پہچان لیتا اور ہمارے جانے کے بعد عالیہ اور صدیق کی شامت آجاتی۔ صدیق گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا آیا۔ میں نیچے اُترا تو صدیق کو پھٹی پھٹی نظروں سے گاڑی کے اندر جھانکتے دیکھا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز کو بھانپتے ہی مجھے اس کے غیر معمولی خوف کا سبب معلوم ہوگیا۔ اس کی نظریں گاڑی کے فرش پر پڑی ہوئی خوف ناک گنوں پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ڈرو مت دوست! یہ دوستوں کے لیے نہیں، دشمنوں کے لیے رکھی ہیں۔“

وہ ہکلایا۔ ”ج ...... جی ......“

اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ تشویش کے ڈورے تیرنے لگے۔ شاید وہ اس اندیشے میں مبتلا ہوگیا تھا کہ نگینہ کہیں غلط ہاتھوں میں نہ چلی جائے۔ سہمی سہمی آواز میں بولا۔ ”نن ...... نگینہ یتیم مسکین لڑکی ہے۔ اس کی بددعا سیدھی عرش پر جائے گی۔“

میں نے مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ”صدیق! کہا نا، فکر نہ کرو۔ وہ اب ہماری ذمّے داری ہے۔ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔“

وہ بہ ظاہر مطمئن ہوگیا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم اور عالیہ برآمدے میں دکھائی دیں۔ ان کے ساتھ ایک اور قیامت بھی جلوہ افروز تھی۔ میں نے اُسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ کسی بھی طور سے میڈم اور عالیہ سے کم نہیں تھی۔ اس نے میری پہلی نظر کو ہی سلگا کر رکھ دیا تھا۔ میڈم نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا اور عالیہ سے مخاطب ہوئی۔ ”میں نے تمہیں اپنا نمبر دے دیا ہے۔ اگر کوئی پرابلم ہو، کچھ کہنا ہو تو فون کر لینا۔“

عالیہ ممنونانہ وارفتگی سے میڈم سے لپٹ گئی اور کلمۂ تشکر دہرا کر بولی۔ ”یہاں فون کی سہولت نہیں ہے۔ میں جب بھی شہر جاؤں گی، آپ سے رابطہ کروں گی۔“

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نگینہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سبز اور زرد رنگوں کا امتزاجی لباس اس کی شخصیت پر جچ رہا تھا مگر بہ غور دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ وہ سوٹ اس کا نہیں تھا۔ قدرے چھوٹا اور تنگ تھا۔ میں نے ایک نظر عالیہ کو دیکھا۔ سمجھ میں آ گیا کہ عالیہ نے نگینہ کو اپنا سوٹ پہنا رکھا تھا۔ وہ نگینہ سے قد میں کچھ چھوٹی تھی۔

میں نے عقب نما میں سر جھکائے بیٹھی نگینہ کو دیکھا۔ سنہرے بال، شوخ گلابی اور چمکتی ہوئی جلد، قدرے موٹے مگر سرخ تر ہونٹ...... اس کا نام دیسی تھا مگر وہ پوری کی پوری ولائتی دکھائی دیتی تھی۔

میں نے کہا۔ ”نگینہ! تم اپنا چہرہ نیچے رکھو گی تاکہ کوئی تمہیں دیکھ نہ پائے۔ مس عالیہ کے لیے ہمیں یہ احتیاط برتنا ہوگی۔ اوکے؟“

اس کی باریک اور مترنم آواز گاڑی میں گونجی ”یا...... سر! آئی شیل کیئر اباؤٹ اِٹ......“

وہ نہ صرف خوب رُو تھی بلکہ خوش گلو بھی تھی۔ ایسے ہی وقت میں میڈم میرے برابر آن بیٹھی اور ہاتھ کے اشارے سے چلنے کا حکم دیتے ہوئے ہاتھ لہرا کر عالیہ اور صدیق کو ’بائے بائے‘ کرنے لگی۔ میں نے گاڑی ریورس کی۔ اسپتال کے برآمدے کے قریب روکی اور ٹرن لے کر سلاخوں والا دروازہ عبور کر لیا۔ میرا رُخ شجاع آباد کی اسپیڈ بریکروں والی رابطہ سڑک کی طرف تھا۔

میڈم نے آہ بھر کر کہا۔ ”دنیا بڑی ظالم ہے شہر یار! یہ محض چھیننا جانتی ہے۔ عطا کرنا اس کی سرشت میں نہیں ہے۔“

”جی میڈم!“ میں نے تائید آمیز انداز میں کہا۔

وہ پہلو بدل کر نگینہ سے باتیں کرنے لگی۔ نگینہ جھجکی جھجکی بیٹھی جواب دینے لگی۔ نگینہ کئی مرتبہ پاکستان آچکی تھی مگر اس کے لب و لہجے پر انگریزی غالب تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتی تھی مگر اپنا مدعا سمجھانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ میں نے عقب نما میں اسے دیکھا۔ زیرِ لب مسکرایا۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

مجھے راستہ یاد تھا۔ جونہی لینڈ کروزر مین روڈ پر چڑھی، میڈم نے کہا، ”ہم کوٹھی پر جا رہے ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کی رفتار بڑھا لی۔ میڈم بولی۔ ”نگینہ! اب تم سر اُٹھا کر بھاگتی دوڑتی ہوئی دنیا کو دیکھ سکتی ہو۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب اگر کسی نے تمہیں دیکھ بھی لیا تو وہ تمہارے غیاب کا تعلق عالیہ سے نہیں جوڑ سکے گا۔“

”تھینکس آلاٹ میڈم!“ نگینہ نے متشکر انداز میں کہا اور پیچھے ہٹ کر، سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ چونکہ اس نے مجھے ’میڈم‘ کہتے ہوئے سنا تھا، اس لیے آپوں آپ ہی اُسے ’میڈم‘ کہنے لگی تھی۔

میں نے رواں دواں ٹریفک پر توجہ مرکوز رکھی جبکہ میڈم پہلو کے بل بیٹھ کر نگینہ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ نوروز بھٹی اور اس کے خاندان کے بارے میں کرید رہی تھی اور نگینہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتا رہی تھی۔ جونہی اُس کے لبوں پر اس کے بھائی سلامت بھٹی کا تذکرہ آیا، وہ آبدیدہ ہوگئی اور ہچکیاں لینے لگی۔ میڈم نے کہا۔ ”غم نہ کرو نگینہ...... بجا کہ

جانے والے کبھی واپس نہیں آتے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسی بے بسی کی موت مار دیے جانے والوں کا بھرپور انتقام لے لیا جائے تو دکھ کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں اپنا دکھ کم کرنے کا موقع ضرور دوں گی۔ ان بے غیرتوں کی آخری ہچکیاں تمہارے کانوں میں ضرور گونجیں گی۔“

وہ روتے روتے تھم گئی۔ دانت پیس کر بولی۔ ”میڈم! میں اتنا ویک نہیں تھی...... مگر اُس ماحول میں، والدین کی اچانک موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ پھر مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں تھا کہ وہ اتنا انتہائی قدم اُٹھائیں گے اور میرے بھائی کو خون میں نہلا دیں گے ورنہ میں اپنے بھائی کو مرنے نہ دیتی۔ انہیں سمجھنے کی غلطی کر بیٹھی۔“

وہ انگریزی اور اردو کے ملے جلے لہجے میں اپنا غبارِ خاطر تحلیل کر رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ نازوں پلی ہوئی نازک اندام لڑکی تھی جو نوروز بھٹی کے دیہاتی بود و باش والے خطرناک گھرانے کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کی تعلیم، دولت، خود اعتمادی...... اس ماحول میں اس کے کسی کام آنے والی نہیں تھی۔

میڈم بولی۔ ”کیا اب تم کینیڈا واپس جانا چاہتی ہو؟“

وہ متذبذب ہوگئی۔ بولی۔ ”آں...... شاید...... یا شاید یہاں رہنا چاہتی ہوں کیونکہ وہاں اَب پاپا اور ماما نہیں ہیں۔ پراپرٹی کے علاوہ وہاں میرا کچھ بھی نہیں ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت میرے بھائی کی آخری شبیہ لہراتی رہتی ہے۔ میں نارمل نہیں رہی۔ ابھی میں کوئی صحت مند فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔“

میڈم تھوڑی بے رحمی سے مسکرائی۔ ”تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک واپسی کا دوسرا انتقام کا...... کس راستے کو اپنانا ہے؛ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ میں دونوں صورتوں میں تمہاری مدد کروں گی۔ اس مدد کی قیمت بھی وصول کروں گی۔“

وہ چونکی۔ ”قیمت؟“

”ہاں نگینہ......“ میڈم نے بے حد سنجیدگی سے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”دنیا میں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ ہر چیز کی قیمت چکانا پڑتی ہے؛ کم یا زیادہ...... قیمت کا تعین ضرورت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کوئی شخص مفت میں سب کچھ دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر وہ بنا طے کیے زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کے چکر میں ہوتا ہے۔ میں لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے کی عادی ہوں۔ تمہاری مدد کروں گی مگر معاوضہ لوں گی۔ کیا؟ یہ وقت آنے پر بتاؤں گی۔ تمہیں قبول ہوگا تو تمہارا ساتھ دوں گی۔ نامنظور کرو گی تو ذرہ بھر دباؤ نہیں ڈالوں گی بلکہ ایسے ’سی آف‘ کروں گی جیسے کسی پیارے سے مہمان کو کیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟“

مجھے میڈم کی سمجھ نہیں آئی۔ وہ اُس سے کیا معاوضہ لینا چاہتی تھی؟ میرے دیکھنے میں تو یہ آیا تھا کہ وہ اس کینیڈین نیشنلٹی ہولڈر حسینہ سے کہیں زیادہ امیر تھی۔ بااختیار تھی۔ دو چار لاکھ...... کروڑ...... کتنی رقم وصول کر لیتی اور اگر کر بھی لیتی تو کیا یہ اس کے لیے معقول بات ہوتی...... میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بے نیازانہ باتیں کرتی رہی۔ اچانک میڈم نے مجھے مخاطب کر لیا۔ ”میرا موبائل تمہارے پاس ہے؟“

”جی میڈم!“ میں نے موبائل نکال کر اُسے تھما دیا۔

اس نے مایوسی کے عالم میں سر ہلایا اور بولی۔ ”بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا ہے۔“

”میں اپنا موبائل دوں؟“

”نہیں......“ اس نے اپنا فون ڈیش بورڈ پر بے پروائی سے ڈال دیا اور بولی۔ ”جہاں سگنلز نہیں تھے، وہاں چلتا تھا۔ جہاں سگنلز موجود ہیں، وہاں بیٹری جواب دے گئی ہے۔ زندگی اسی طرح اتفاقات کے سہارے گزرتی رہتی ہے۔ خیر......“

دس بجنے والے تھے جب میں نے میڈم شکیلہ کی محل نما کوٹھی کی پارکنگ میں گاڑی روکی۔ میڈم نے مؤدبانہ انداز میں گیٹ کھولنے والے گن مین کو تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”ڈرائیور کہاں ہے؟“

”جی! وہ سرونٹ کوارٹر میں ہے۔“

”اُسے کہو کہ وہ میروشاہ کو فوراً اُٹھا لائے۔“

”جی میڈم...... میں ابھی اُسے روانہ کرتا ہوں۔“

میڈم نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کینیڈا پلٹ حسینہ کا ہاتھ تھامے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر گھس گئی جبکہ میں کچھ دیر تک برآمدے میں ٹھہرا رہا، پھر گیسٹ روم میں چلا گیا۔ کوٹھی کا مین گیٹ زوار نے کھولا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ظاہر خان شبانہ پہرے داری کے بعد آرام کرنے کی غرض سے چلا گیا تھا۔

کوئی نصف گھنٹے بعد گیسٹ ہاؤس کے باورچی نے ناشتا میرے سامنے میز پر چن دیا۔ ساتھ ہی اُس نے میڈم کا پیغام دیا۔ ”میڈم جی نے کہا ہے کہ آپ تیاری کر لیں کیونکہ گھنٹا بھر کے بعد انہیں اور آپ کو یہاں سے نکلنا ہے۔“

مجھے اچنبھا ہوا۔ میڈم نے حسبِ روایت کوٹھی میں پہنچتے ہی مجھ سے روایتی نوعیت کا صرفِ نظر برتنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اس کا یوں نظرانداز کرنا بُرا لگا مگر میں نے زیادہ سوچنے اور کڑھنے کے بجائے ناشتا کرنے اور باتھ روم میں گھس کر

تروتازہ ہونے میں عافیت سمجھی۔ ٹوتھ برش اور شیو کرنے، پھر بھرپور انداز میں شاور لینے میں کافی وقت صرف ہوگیا۔ اپنے مخصوص دیہاتی انداز میں سر میں سرسوں کا تیل ملتا ہوا باتھ روم سے نکلا تو بیڈ پر نیا سوٹ پڑا دکھائی دیا۔ دل ہی دل میں میڈم شکیلہ کے حسنِ انتظام کو سراہتا ہوا جدید وضع کے مہنگے، نفیس اور دیدہ زیب لباس کا جائزہ لینے لگا۔ میڈم شکیلہ کے ہاں ایسے چھوٹے چھوٹے کام مشینی انداز میں سرانجام دیے جاتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے انٹر کام پر محض 'شہریار کی تیاری میں مدد کرو' کا جملہ کہا ہوگا جس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے متعلقہ شخص نے ہتھیلی پر سرسوں جما دکھائی تھی۔

میں نے چینج کرنے کے بعد باتھ روم میں نصب قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ قدرت نے میری شخصیت سازی میں فیاضانہ رغبت سے کام لیا تھا۔ میروشاہ اگر مجھے چھیڑنے کے لیے کہا کرتا تھا کہ میڈم میری وجاہت پر مرمٹی ہے، تو شاید غلط نہیں کہتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں کوٹھی کی پارکنگ میں کوئی گاڑی داخل ہوئی۔ چند لمحوں بعد میروشاہ کی آواز میرے کانوں پڑی۔ وہ ہنگامی انداز میں بلائے جانے پر خاصا برہم تھا اور بلند آواز میں خود کو کوستا ہوا حاضری دینے آن پہنچا تھا۔ اس نے سیدھا میڈم کے کمرے کا رُخ کیا تھا۔

بیڈ پر نیم دراز ہونے اور چائے سے لطف اندوز ہونے کے دوران میں نے درپیش آنے والے حالات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ میڈم جن حالات سے گزر رہی تھی، ان حالات کا تقاضا بہ خوبی نبھاتے ہوئے بجلی کی مستعدی سے آگے بڑھ رہی تھی مگر غیر معمولی خنک رات کے گزرنے پر یہ احساس بڑا مایوس کن تھا کہ ہم کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پائے تھے۔ پیرو ماچھی کا خطرناک گینگ ہمارے ہاتھوں تباہ ہوگیا تھا۔ اس کے بہادر اور جنگجو ساتھی موت سے ہمکنار ہوگئے تھے۔ آخری شخص بھی اپنی حماقت کی بدولت لقمۂ اجل بن گیا تھا۔ اس سے ملنے والی ناکافی معلومات کے مطابق پیرو ماچھی اس وقت تنہا تھا اور دریا کے پار محفلِ یاراں میں مدہوش پڑا تھا مگر ہم کامیابی کی طرف محض ایک گام چل پائے تھے۔

شاید اُسے اب تک اپنے گینگ پر پڑنے والے شب خون کا علم نہیں ہوا تھا اور وہ موج و مستی میں غرقاں تھا۔ دریائی علاقے میں موبائل فون کا نیٹ ورک نہیں تھا اس لیے خبر رسانی کا معیار بہت کمزور تھا۔ بیٹ کے برعکس بڑے شہروں یا قدرے موڈریٹ علاقوں میں خبر کا تیز ترین رشتہ بٹن سے بندھ چکا تھا۔ میرا اندازہ قوی تھا کہ پیرو ماچھی کو پولیس کے چھاپے کی خبر بھی نہیں ملی ہوگی۔ اس کے بارے میں یہ رائے بھی قائم کی جاسکتی تھی کہ وہ علی الصباح دریا کے اس پار آ گیا ہو اور اسے نہ صرف اپنے ڈیرے کی بربادی بلکہ اپنے تمام کارندوں کی ہلاکت کا بھی علم ہوگیا ہو۔ ایسی حالت میں وہ اپنا منہ نوچ رہا ہوگا اور اس کے دونوں پیر ہر آن انگاروں پر پڑ رہے ہوں گے۔ نہ صرف ہم نے بلکہ پولیس اہلکاروں نے بھی اپنی آمد کا کوئی ثبوت ڈیرے پر نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے دشمن کو نہ پہچان پانے کی وجہ سے وہ بھوکے درندے کی طرح غراتا پھر رہا ہوگا۔ میں اس قضیے پر اس لیے زیادہ غور و خوض کر رہا تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے میڈم کے ساتھ پیرو ماچھی کو ٹریس کرنے کے مشن پر نکلنا تھا۔ تجربے سے پتا چلا تھا کہ میڈم اپنے پیاروں کی تلاش میں جذباتی انداز میں سوچتی تھی جبکہ ان حالات میں بڑی صبر آزمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔ نہ صرف پیرو ماچھی کے کامیاب تعاقب کا پلان مرتب کرنا تھا بلکہ میڈم شکیلہ کے جذباتی رویے اور اندھے اقدامات کا بھی خیال رکھنا تھا۔

ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو چکا تھا مگر میڈم نیچے نہیں آئی تھی۔ میں انتظار کی کوفت میں مبتلا تھا جب گیسٹ ہاؤس میں میروشاہ کی مخصوص آواز ابھری۔ وہ زوار سے الجھتا ہوا میرے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ پان خوری کی وجہ سے باچھیں سرخ تھیں جو مجھے دیکھتے ہی کانوں تک پھیل گئیں۔ شوخ آواز کمرے میں گونج گئی۔ ''اڑے لاڈے میاں! اونچی پرواجاں (پروازیں) پر اڑے جاوت ہے...... کیا بات ہووت غنچے کی...... ہیں! ماڑا غنچہ ایک دم فسٹ کلاس پھول بن جاوت اور مہارانی کو اپنی خوشبو کی لپیٹ میں لے لیوت ہے......''

تیز کار زبان کی طرح اس کے منحنی وجود میں بھی بلا کی مستعدی بھری ہوئی تھی۔ چہرہ بھلے جھریوں سے بھرا ہوا تھا مگر آج تک اس پر تھکن یا نقاہت کو ثبت نہیں دیکھا گیا تھا۔ میں نے اُسے رسمی انداز میں خوش آمدید کہا تو وہ بولا۔ ''جندہ باد ماڑے لاڈے خان! ماڑی مہارانی جی تیرے پر جی جان سے صدقے واری جاوت...... وہ کیا بولت ہیں کہ فریفتہ...... ہیں؟ وہ لاڈی ماڑے غنچے پر فریفتہ ہو جاوت ہے...... بولت کہ شہریار سے بہادر تو جالم دنیا میں کوئی نہ ہووت ہے......''

اس کی بچوں جیسی گول گول آنکھوں میں شرارت اور ستائش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میرے بازوؤں کی مچھلیوں کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ ''اڑے غنچے! ماڑی جگہ رکھ لیوت...... یہ نہ ہووت کہ تم مہارانی کو آنکھ مٹکے میں چت کر لیوت اور ماڑی روٹی روجی (روزی) اور دانہ پانی ایک دم بند ہو جاوت......''

میں نے تڑپ کر کہا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو شاہ جی! میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ جانتا ہوں کہ میں جتنی اونچی پرواز بھی کرلوں، جہاں تم ہو، وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ میڈم شکیلہ تمہاری بہت زیادہ قدر کرتی ہے۔''

''وہ سالی ماڑی خاک قدر کرت ہے!'' میروشاہ نے مصنوعی نخوت اور خفگی سے کہا۔ ''جرورتیں (ضرورتیں) ایک دوجے کے پاس کھینچ لاوت وگرنہ...... ماڑی شکل سوہنی، ماڑا پنڈا لوہے مافق، ماڑی دولت سات سمندر پار تک پھیلی ہووت...... کچھ بھی تو نہ ہووت ماڑے پاس...... لاڈے! یہ جرورت ہووت جو میڈم میرا دم بھرت ہے...... اس غلط فہمی کو دل میں جگہ نہ دیوت کہ تیرے کو قدرت نے بہت سوہنی شکل دے رکھت ...... نہیں لاڈے نہیں! یہ جالم دنیا جرورتوں کی ماری ہووت...... جرورت کا کھیل خلاص...... یاری خلاص......بس!''

وہ دانشوروں کے انداز میں ہاتھ لہرا لہرا کر مجھے سمجھا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس گھڑی اس کی آنکھوں میں عجیب یاسیت اور شکست خوردگی کے پرتو جھلملا رہے تھے۔ شاید وہ اپنے کسی دکھ کی دہلیز پر شکستہ جان کھڑا تھا مگر قوتِ بیان نہیں رکھتا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ ''ہاں شاہ جی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ دنیا اپنی اپنی ضرورتوں کو مدنظر رکھتی ہے۔ میڈم کو مجھ سے یا تم سے پیار نہیں ہے بلکہ اسے اپنی دولت کے عفریت کو فیڈ کرنے کے لیے ہماری ضرورت ہے۔''

''گھوڑا یا کتا...... دونوں اگر جوان اور طاقتور ہوویں تو مالک کو بھاویں۔ جرا مجبور (ذرا کمزور) یا لنگڑے لولے ہو جاویں تو گولی سے ٹھنڈے ہو جاویں...... میروشاہ بڈھا تھارو برینڈ گھوڑا ہووت، شہریار چھریرا گل ٹیریا (بل ٹیریر)...... دونوں میدان کے شاہ جور (زور)، مالک کے وفادار۔ تم باجی (بازی) ہار جاوے، میروشاہ ریس ہار جاوے...... نہ آگے کے نہ پیچھے کے...... ٹھشوں......'' اس نے دائیں ہاتھ سے پستول کا مخصوص نشان بنایا اور منہ سے فائر کی آواز نکالی، پھر لبوں سے نکل کر تھوڑی پر پھیلتا ہوا نیم سرخ لعاب ہاتھ کی پشت سے پونچھ کر، آہ بھر کر بولا۔ ''ماڑی رانی بڑا پیار کرت تمیں لاڈے...... ہائے! تیرا ناج (ناز) نخرا اُٹھاوت پر کب تک؟ جب تک رگوں میں جوانی دوڑت۔ پہلے کہوت تھی کہ جور آور (زور آور) بڑا جور آور ہووت۔ بھرے ملتان میں کوئی اُس سالے جیسا کہاں؟ اَب بولت کہ شہریار تو جور آور کا توڑ ہووت...... اَب سالی گنا چوپے۔ ایک دن پھوگ پھینکے گی۔ ہائے! اشالا جگ میں عورت کا رنگ روپ نہ اُجڑت...... شالا گبھرو کی جوانی نہ روٹھت......''

میں میروشاہ کی شخصیت کے بارے میں بہت متجسس تھا۔ بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا مگر کبھی اتنی مہلت نہیں ملی تھی۔ اگر کبھی مل بیٹھے بھی تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آئیں۔ بہت باتونی تھا۔ بولتا تھا تو سننے والا آپوں آپ اس کی طرف متوجہ رہتا تھا کیونکہ وہ خاصا بے ربط بولتا تھا۔ اس کا اندازِ گویائی ایسا تھا کہ اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں کے بطن سے متن اخذ کرنا بسا اوقات مشکل تر ہو جاتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس حلق میں اُتاری اور کہا۔ ''تمہیں میڈم نے بلایا تھا۔ کیا کہا؟''

''کیا بولت ...... پریشان بوتھی بنا کے بولت کہ اس کی اماں اور بھائی کو پیرو ماچھی نے اغوا کر لیوت۔ چھڑانے جاوت، ماڑے لاڈے کو ساتھ لے کر۔ ماڑی کھوپڑی بولت کہ جس اُنگنے سے واسطہ تعلق نہ رہوت، اس کی راہ پر کیوں جاوت پر سالی کی کھوپڑی کے سوراخ بند ہو جاوت ...... بولے ہے کہ جاوت۔ ماڑے روکے سے نہ رکت۔ میروشاہ غصے سے بولت کہ پھر جاوے...... اور موت کے منہ میں ہاتھ ڈالت......''

میروشاہ کے ناتواں وجود پر برہمی آ سوار ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ میڈم نے اس کی بات نہیں مانی تھی بلکہ پیرو ماچھی کے تعاقب میں جانے پر کمربستہ تھی۔ تبھی میروشاہ برہم ہوگیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تمہارے خیال میں میڈم کو اپنے خاندان کو پیرو ماچھی کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہیے؟''

''تو اور کیا...... وہ سالے کیا لاگت ہیں ماڑی رانی کے؟'' میروشاہ نے تڑپ کر کہا۔

''وہ میڈم کے رشتہ دار ہیں اور میرے دیکھنے میں آیا ہے کہ انہیں میڈم کی رشتہ داری کی پاداش میں اغوا کیا گیا ہے۔''

''لاڈے میاں! جس کنبے کو اپنی کم جوری بناوت۔ دشمن اُس کے پیچھے لگ جاوت۔''

''شاہ جی! کمزوریوں سے جان چھڑائی جاسکتی ہے مگر اپنے پیاروں کو کیسے زندگی سے نکالا جاسکتا ہے؟'' مجھے اچنبھا ہوا۔

''اڑے کیا بولت غنچہ؟'' وہ بھنا کر بولا۔ ''سالی کی

طرف داری کرت...... ہے ناں؟ پَر بول دیوت کہ جالم دنیا میں کون سالا رشتہ دار ہووت، کون یار ہووت؟ سب اپنی اپنی حیاتی گجارت (گزارت)۔ ہر جان کا وارث سوہنا رب ہووت ناں کہ میرو شاہ ٹھیکیدار......"

میں نے کندھے اُچکائے اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولا۔ "چھوڑ دیوت لاڈے میاں ان موئی باتوں کو اور کان کھول کر سن لیوت...... ماڑی مہارانی موت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کو پر تولت۔ تیرے کو بھی ساتھ میں جانے پر جد (ضد) کرت۔ تم جاوے پَر یہ دھیان رکھ لیوے کہ میرو شاہ کی جان اس کملی رانی میں اَٹکی ہووت۔ اسے کچھ ہووت تو پھر نہ تم جندہ رہوت، نہ میرو شاہ اور نہ یہ جالم دنیا...... میرو شاہ سب کچھ برباد کر دیوت ہے رانی کے نام پر...... سمجھ میں آوت ناں؟"

میں زیرِ لب مسکرایا، دل میں بولا۔ "اب تو میری جان بھی اس پری وش کے وجود میں ہی کہیں اَٹک گئی ہے میرو شاہ!"...... اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "تم فکر نہ کرو شاہ جی! میرے مرنے کے بعد کوئی اُس پر ہاتھ اُٹھائے تو اُٹھائے ورنہ میرے جیتے جی یہ جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔"

اس نے میرا کندھا تھپتھپایا اور کمال فخر و محبت سے بولا۔ "جندہ باد ماڑے لاڈے...... جندہ رہو اور ماڑی رانی کو بھی جندہ رکھو...... اللہ حاجُ (حافظ)...... ماڑے کو جانے کا ہووت...... اللہ حاجُ!"

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا اور مجھے تنبیہی نظروں سے دیکھ کر ہاتھ ملاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ وہ اب تک کئی مرتبہ یہ تنبیہ کر چکا تھا اور مجھ پر باور کر چکا تھا کہ میڈم شکیلہ کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اس پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ اگر کچھ ہوا تو اس کی تمام تر ذمے داری مجھ پر عائد کی جائے گی اور میرو شاہ کے نزدیک اس جرم کی سزا موت سے کم نہیں تھی۔ میں کہنا تو چاہتا تھا کہ اگر میڈم کی زندگی اتنی ہی قیمتی ہے تو پھر اُسے کوٹھی سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہیے، مگر کہہ نہ پایا۔ حقیقت یہ تھی کہ گھر کے باہر عام آدمی کے لیے بھی قدم قدم پر موت اپنا خوف ناک دہانہ کھولے کھڑی تھی جبکہ ہم تو صبح تا شام گولیوں کے سائے میں چلتے تھے۔ کسی بھی وقت زندگی کی ڈور کٹ سکتی تھی۔ کسی بھی لمحے سانسوں کا رواں سلسلہ ٹوٹ سکتا تھا۔

سیمو اور اس کی بوڑھی ماں کو تلاش کرنے اور بازیاب کرانے کے مشن میں میرے ساتھ میڈم کے بجائے عقیل، پیا جی یا تخی محمد بھی جا سکتا تھا جن کی زندگیاں میرو شاہ کے نزدیک میڈم جتنی قیمتی نہیں تھیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ مجھے ایک وقت میں دو محاذوں پر لڑنا نہ پڑتا اور میری یکسوئی مشن کی تکمیل کو حاصل رہتی مگر میرو شاہ سے یہ باتیں نہ کر پایا۔ میں ہاتھ کمر پر باندھے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ دل میں ننھی سی چبھن جاگ اُٹھی تھی۔ ذہن میں خیالات گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ مجھے اپنی بے بسی اور میڈم کی جذباتی کیفیت کے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ سیمو اور اس کی ماں، بقول میڈم کے، اس کے کچھ بھی نہیں لگتے تھے مگر ان کے اغوا کی بھنک ملتے ہی وہ مسلسل بے چین اور مضطرب تھی اور ہر آن اغوا کاروں تک پہنچنا چاہتی تھی۔ جونہی اُسے پتا چلا کہ وہ دونوں کس کی تحویل میں ہیں، بجلی کی طرح کڑکے گی اور آنِ واحد میں اغوا کار کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ ایک میں تھا جو ابھی تک اپنی بہن کے اغوا کار کی تلاش میں کشتیاں جلا کر نہیں نکلا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی یا زندگی کی بساط پر اپنا خون بہا کر دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ میرے والدین کے قاتل رنگو قسائی اور سردار حیدر خان دھرتی کے سینے پر دندناتے پھرتے تھے مگر میں نے ابھی تک ان پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ میری طرح میرا یار کھالا خانزادی اسما کی دید کو ترس رہا تھا اور ایس پی کا بیٹا شاہد سلیم اپنی محبوبہ عشرت عرف عاشی کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتا پھرتا تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ میڈم شکیلہ خود مختار تھی جبکہ میں اس کے دستِ نگر تھا۔ میری طرح کھالا اور شہزاد سلیم بھی بے دست و پا تھے۔ یا کم از کم میڈم شکیلہ کی طرح خود مختار اور بارسوخ نہیں تھے۔

میڈم نے تیار ہونے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔ اس کی مصروفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے فوجی اختر سے فون پر رابطہ کیا۔ گھر کے حالات کے بارے میں آگہی حاصل کی۔ فوجی اختر نے بتایا کہ مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ میں اپنی توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھوں۔ اس نے شانو سے میری بات کرائی۔ وہ حسبِ عادت چیخ چلا کر اپنا غصہ فرو کرنے لگی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میرے گھر والے باخیریت تھے۔

گیلری میں قدموں کی چاپ اُبھری۔ زندگی دلہن کی طرح گھونگٹ اُٹھاتی ہے تو اپنی خیرگی کو دیکھنے والے کی فہم و فراست کا تحفہ دیتی ہے۔ میں عجیب خالی الذہنی کی سی کیفیت میں کھڑا پھٹی پھٹی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں میڈم اپنے حسن کی تمام تر جلوہ سامانیوں سمیت سر بلند کھڑی تھی۔ وہ آف وائٹ کلر کے شاندار سوٹ میں ملبوس تھی۔ اسی رنگ کے بکل والے بند جوتے، دستانے، فر کا دبیز کوٹ اور ہیٹ نما جالی دار اونی ٹوپی اس کی شخصیت کو اپسرائی بنا رہے تھے۔ کوٹ کے کالر کھڑے تھے جنہوں نے اس کے چہرے کو ٹھوڑی تک چھپا لیا تھا۔ دکھائی دینے والا آدھا چہرہ چاند کی طرح جگمگا رہا تھا۔ گزشتہ شب کی تمام تر تھکن چہرے کی تر و تازگی اور تاب و تمکنت میں چھپ گئی تھی۔ وہ میرے غیر معمولی انہماک کو تاڑ گئی، بولی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے جھینپ کر کہا۔ "آپ بہت خوب صورت ہیں تبھی نظر ہٹائے سے نہیں ہٹتی۔"

اس کے لبوں پر فاخرانہ مسکراہٹ اُبھری۔ "ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں واقعی خوب صورت ہوں۔"

یہی بات اگر میں نے غزالہ سے کہی ہوتی تو کئی منٹوں تک شرماتی اور منہ چھپاتی رہتی۔ وہ دروازے میں ٹھہر گئی تھی۔ بولی۔ "کافی سارا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ اگر تمہارا شوقِ دید پورا ہو گیا ہو تو ہمیں مزید وقت ضائع کیے بغیر نکل پڑنا چاہیے۔"

اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا مگر میں شرمسار ہو گیا۔ "میں تیار ہوں میڈم! چلیں۔"

وہ ایڑیوں کے بل گھوم گئی اور تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو باندھ کر کوٹ کے اندر ڈال رکھا تھا تبھی ایک لٹ بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم گیٹ وے میں آ کر رک گئے۔ ڈرائیور پارکنگ میں سے لینڈ کروزر نکال لایا اور حکم کا منتظر ہوا۔ میڈم نے اسے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ "تم نے گاڑی کو اچھی طرح چیک کر لیا ناں؟"

"جی میڈم!" ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "فیول کم ہے۔ راستے سے ڈلوا لیجیے گا۔"

میڈم نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا اور کڑی نظروں سے لینڈ کروزر کے عقبی حصے میں رکھے گئے دیگر جنسی سامان کا جائزہ لینے لگی۔ مطمئن ہو کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری جھولی میں پھینکتے ہوئے بولی۔ "فیول ٹینک فل کروا لینا۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "کیا ہم اسلحہ نہیں لیں گے؟"

وہ مسکرائی۔ "ایک شارٹ گن، ایک کے کے گن اور دو عدد جرمن پستول...... فل امونیشن کے ساتھ ڈگی میں پڑے ہیں۔ چاہو تو ابھی اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لو۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں میڈم! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو محض یاد دلانا چاہتا تھا تاکہ بھول جانے کی صورت میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے۔"

اس نے بہ غور میری آنکھوں میں جھانکا اور بڑے دلفریب انداز میں مسکرائی۔ "تم نے اپنی منگیتر کے سوا کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تبھی مجھے دیکھ کر حیران ہو جاتے ہو اور کہتے ہو کہ 'آپ بہت خوب صورت ہیں'...... ہیں؟ مگر میں نے بہت سے مردوں کو دیکھا ہے۔ یہ شہر حسن سے معمور ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر یہاں نظر آتا ہے۔ میں پھر بھی تمہیں دیکھ کر دیکھتے رہنا چاہتی ہوں اور کہتی ہوں کہ 'یو آر ویری ہینڈسم'...... ایسا کیوں ہے؟"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گیٹ سے نکال کر روڈ پر ڈال دی، کہا۔ "میڈم! میں دیہاتی ہوں۔ دیہاتی ہینڈسم نہیں ہوتے، مضبوط اور فولادی جسم کے مالک ہوتے ہیں۔ میری شخصیت میں دکھائی دینے والی ظاہری خوب صورتی آپ کی دین ہے۔ انسان کو اپنی چیزیں مانوس اور اچھی لگتی ہیں۔"

اس کی ہنسی جلترنگ کی طرح گاڑی میں گونج گئی، بہ وقت ہنسی روک کر بولی۔ "لباس کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ یہ نہ خوب صورت ہوتا ہے اور نہ بدصورت...... اس کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ جو پہنتا ہے، اس کے جیسا دکھائی دینے لگتا ہے۔"

میں نے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہ کھلی کھلی اور شوخ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی توجہ اس کے حسنِ حشر ساماں سے ہٹانے کے لیے موضوع بدلا، پوچھا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیں۔"

"ہوں......" اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے، کچھ سوچ کر بولی۔ "میں نے کینیڈا پلٹ لڑکی کا کیس میرو شاہ کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ اس کے چچا اور چچا زاد بھائیوں، جن میں سے ایک اس کی مرضی کے خلاف اس کا شوہر نامدار بن چکا ہے، کے بارے میں معلومات اکٹھی کرے گا۔ واپسی پر مجھے رپورٹ دے گا۔"

"میں نے آپ کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھا تھا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" وہ بولی۔ "میرا خیال تھا کہ اماں اور سیمو کو اپنی تحویل میں رکھنے والا دوبارہ فون پر رابطہ کرے گا مگر ابھی تک اس کی کال نہیں آئی۔ میں نے دو تین مرتبہ اس کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر فون 'پاورڈ آف

ملا۔ ہوسکتا ہے کہ اَب تب میں کسی وقت اس کی کال آ جائے۔" اس نے تھوڑا توقف کیا، پھر بولی۔ "میں نے سخی محمد کو بیٹ میں بھیج دیا ہے۔ وہ بابا کے گھر کی صفائی کرے گا اگر اس کے جانے تک پولیس وہاں نہ پہنچ گئی۔ وہاں سے جنگ وجدل کے ثبوت اور لاشوں کو ہٹا دے گا اور بابا کو 'اغوا' کر کے ملتان لے آئے گا۔" اس نے 'اغوا' لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "رہی بات ہماری...... ہم کیا کریں گے؟ یہ ابھی طے کر لیتے ہیں۔ تم گاڑی ناگ شاہ چوک کی طرف ڈال دو۔ اگر ہمیں مظفر گڑھ جانا ہوا تو دائیں ہاتھ مڑ جائیں گے۔ اگر بیٹ خیر پور جانے کا پروگرام بنا تو سیدھا نکل چلیں گے۔ ہمارا چناؤ اغوا کار کی فون کال پر منحصر ہوگا۔ اِز اِٹ اوکے؟"

"یس میڈم!" میں نے تائید کی اور عزیز ہوٹل کی طرف جانے والی سڑک پر ٹرن لیا۔ کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں بیٹ خیر پور کی طرف جانا چاہیے۔ پیرو ماچھی کو اب تک اپنے گینگ کے حشر نشر کی خبر مل گئی ہوگی اور وہ اپنی باقیات سنبھالنے کے لیے ڈیرے پر آ چکا ہوگا۔ بہ فرضِ محال، ایسا نہ بھی ہوا تو ہم دریا پار کر کے اس تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

بابا کے ڈیرے پر آخری سانسوں کے درمیان پیرو ماچھی کے دستِ راست اللہ دتہ عرف دتے ماچھی نے بتایا تھا کہ وہ روہیلانوالی بستی کے قریب واقع جھوک لوری میں اپنے یارِ خاص جمیل دتی کے پاس گیا تھا۔ اس قماش کے لوگ کوئی بڑا ہاتھ مار کر دیسی شراب کے مزے لوٹنے کے لیے محفل جماتے ہیں اور ٹن ہو کر بڑھکیں مارتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی جشن منانے کے لیے دریا کے پار جمیل دتی کے ڈیرے پر پہنچا ہوا تھا۔ اسے قسمت کے وار کی خبر نہیں تھی جو اس کی عدم موجودگی میں اس کا بنا بنایا گروہ تہس نہس کر دے گا۔ میڈم بولی۔ "تمہاری بات میرے دل کو لگی ہے۔ ٹھیک ہے، ہم فی الحال بیٹ خیر پور کی طرف جا رہے ہیں۔"

"میڈم! کیا آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پولیس نے کیوں ریڈ کیا؟"

اس نے کندھے اُچکائے۔ "نہیں معلوم...... یہ چھوٹے کریمنل گینگ اس وقت پولیس کا تختۂ مشق بنتے ہیں جب وہ اپنے مربی جاگیردار کو ناراض کر بیٹھتے ہیں یا پولیس حکام کی بھوک نہیں مٹا پاتے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ پولیس نے کسی درخواست گزار کی استدعا پر کارروائی کی ہو؟"

اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ "نہیں ڈیئر! پولیس اہلکاروں کے نزدیک حکام بالا، جاگیردار اور پٹے دار بدمعاش پہلی ترجیح ہوتے ہیں۔ عوام الناس کی حیثیت محض پولیس کے نزدیک کھلانے پلانے اور جی حضوری کی ہوتی ہے۔"

میں نے پرانا شجاع آباد روڈ پر رواں دواں ہجوم میں گاڑی شامل کی اور حیرت سے کہا۔ "پھر لاء اینڈ آرڈر کا نظام کیسے چلتا ہے؟"

وہ ہنسی اور تمسخرانہ لہجے میں بولی۔ "لاء اینڈ آرڈر کیا ہوتا ہے؟ نہ تو یہاں کی عوام جانتی ہے اور نہ ہی حکام بالا...... رہی بات نظام کی...... یہاں کوئی نظم نہیں ہے، کوئی نظام نہیں ہے۔ کیا تم نے کوئی قتل نہیں کیا؟ کیا تم نے کوئی جرم نہیں کیا؟...... تم دندناتے پھرتے ہو جبکہ لین دین کے تنازعے میں گالی گلوچ کرنے والے، ریڑھی سے فروٹ چوری کرنے والے اور معمولی جرائم کرنے والے آئے روز حوالات کی سیر کرتے ہیں۔ تم لینڈ کروزر میں گھوم رہے ہو۔ کوئی وردی پوش تمہیں روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اپنی چھوڑو، حیدر خان کی زندگی کو دیکھو۔ اس نے ظلم و بربریت کا جل تھل ایک کر رکھا ہے۔ کوئی ہے جو اس پر ہاتھ ڈالے؟ اگر کوئی نظام چل رہا ہوتا تو اس کے نتھنوں میں نکیل ڈال دی جاتی...... یہاں اسے پھانسی کی سزا ملتی ہے جس کے گلے میں پھندا فٹ آ جاتا ہے۔ اسے جیل بھیجا جاتا ہے جس کے سر پر چھت نہیں ہوتی۔ شہر یار! جہاں ایک چپڑاسی سے لے کر آخری عہدے دار تک، سب رشوت خور اور لالچی ہوں، خواہشوں کے غلام ہوں، وہاں کوئی نظام نہیں چلتا، نوٹ چلتے ہیں اور نوٹ اندھے اور بے حس ہوتے ہیں۔"

وہ بڑے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "میڈم! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ معاشرہ اپنی قدریں کھو چکا ہے۔"

"نہیں...... محض یہ معاشرہ نہیں...... سبھی معاشرے اپنی آخری ثقافتی سانسیں شمار کرنے پر مامور ہیں۔ یہ تاجرانہ اور سرمایہ دارانہ نظام قدرتی اور فطری رویوں کو نگلتا جا رہا ہے۔ انسان کو بڑی تگ و دو کے بعد مشین بنانے کے بعد ریشم کے کیڑے کی طرح ترقی کے نام پر اپنے گرد دنیا ریشم بُننے لگی ہے۔ ایک دن آئے گا جب سانس کی آخری درز بھی بند ہو جائے گی اور یہ دنیا...... ایک لمحے میں...... ٹائیں ٹائیں فش!"

میڈم نے بڑی بے رحمی سے تجزیہ پیش کر دیا اور سر جھٹک کر شیشے کے باہر زندگی کے متحرک مہروں کو دیکھنے لگی۔

اس تنگ سڑک پر بہت زیادہ ہجوم تھا۔ سڑک کی تنگی میں خوانچہ فروشوں اور ہتھ ریڑھیوں نے خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔ پیدل چلنے والوں کا جمِ غفیر، سستی سبزیوں اور پھلوں کی تیز آواز میں دی جانے والی مسلسل ترغیب دہندہ آوازوں نے ماحول کو خاصا پیچیدہ بنا رکھا تھا۔ مجھے ڈرائیونگ میں خاصی دقت پیش آ رہی تھی۔ علی الصباح، جب میں اس سڑک پر سے گزرا تھا، یہاں اتنا ہجوم نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے میں اس سبزی منڈی جیسے ہنگام پرور علاقے سے نکلا تو ایکسی لیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

میڈم چونکی۔ "ہاں! کہو، کیا بات ہے؟"

میں نے چند لمحے سوچا، پھر کہا۔ "میڈم! مجھے یقین ہے کہ جب ہم اس مشن سے لوٹیں گے تو سیمو اور اماں ہمارے ساتھ ہوں گے......"

"تمہید کو چھوڑو، کام کی بات کرو۔" میڈم نے میری بات کاٹ دی۔

"جی وہ...... میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس مشن کے بعد میں اپنی بہن کی تلاش میں نکلنا چاہتا ہوں۔ میڈم! جب بھی مجھے پروین کی یاد آتی ہے، میں ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھ پر عجیب طرح کی مایوسی سوار ہو جاتی ہے۔" میں نے امید بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

وہ بولی۔ "شہر یار! تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری بہن والا معاملہ فراموش ہو گیا ہے؟ نہیں...... ایسا نہیں ہے۔ اگر میں اتنی ہی بھلکو ہوتی تو اتنا بڑا نیٹ ورک نہ چلا رہی ہوتی بلکہ کسی جاگیردار کا پہلو گرما رہی ہوتی، اس کی خوشامدیں کر رہی ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ تم حالات کی کس ڈگر پر مجھے ملے تھے۔ تمہیں ماں باپ کے اندوہ ناک قتل کا انتقام لینا ہے۔ تمہیں اپنے چچا اور چچی کے قاتل تک پہنچنا ہے۔ تمہیں اپنی بہن اور اسے اغوا کرنے والے تک پہنچنا ہے...... مگر شہر یار! تمہارے سامنے سردار حیدر خان کے سوا کوئی چہرہ نہیں ہے۔ تمہارا دوست امیر نواز گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہے۔ خالد نور پور جا کر تمہیں بھول بیٹھا ہے۔ سوائے انتظار کے، سرِدست کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ بہر حال! تم فکر نہ کرو۔ واپسی پر تمہیں بھرپور موقع دوں گی۔"

میں نے احساسِ تشکر سے مغلوب ہو کر کہا۔ "شکریہ میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔"

کوئی دس منٹ بعد ہم ناگ شاہ چوک پہنچ گئے۔ میں نے ایک پیٹرول پمپ سے فیول ٹینک فل کرایا۔ ادائیگی کی اور مستفسر نگاہوں سے میڈم کو دیکھا۔ وہ بولی۔ "سیدھا چلو...... ہمیں بیٹ خیر پور جانا چاہیے۔"

"کیا سخی محمد بیٹ روانہ ہو چکا ہے؟"

"ہاں! وہ ہم سے آدھا گھنٹا پہلے نکلا تھا۔ اب وہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"کیا اس نے ڈیرا دیکھ رکھا ہے؟"

"نہیں...... مگر چالاک آدمی ہے۔ پہنچ جائے گا۔"

"کیا وہ اکیلا گیا ہے؟" مجھے تشویش ہوئی۔

"نہیں...... میرو شاہ نے اس کے ساتھ دو آدمیوں کو تیار کیا تھا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے اپنی داہنی شہادت انگلی کی انگلی پور نچلے ہونٹ کے داہنے گوشے پر رکھی اور سلوموشن کے انداز میں بڑھاتے ہوئے بائیں گوشے تک لے گئی پھر واپس ہونٹ کے دونوں جزیرہ نما ابھاروں کے درمیان تک لائی اور انگلی کی پور کو چوم کر مسکرانے لگی۔ اپنی ہی اداؤں میں وارفتگی سے کھوئی ہوئی میڈم شکیلہ نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ دل نے تڑپ کر کہا۔ "میڈم زمانے سے مختلف ہے"...... دماغ نے کچوکا دیا، "نہیں...... زمانہ ہر نئی ادا سیکھنے کے لیے اس کے پاس آن ٹھہرتا ہے"......

ہم ڈابر نامی اڈے پر پہنچے تھے کہ میڈم کے فون کا بزر بجنے لگا۔ میڈم نے فون نکالا۔ اسکرین پر بلنک کرنے والا نمبر دیکھا اور تیزی سے بولی۔ "شہر یار! گاڑی روڈ سائڈ پر روک دو۔"

میں نے گاڑی روک دی۔ اس نے کال ریسیو کرنے والا بٹن پش کیا اور فون کان سے لگا کر خاموشی سے کال کرنے والے کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ "ہاں! بول رہی ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ میڈم کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے۔ وہ اب نٹ کھٹ حسینہ دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ عجیب حیرت انگیز سختی اس کے اعصاب میں رچاؤ کر چکی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میڈم کو جس شخص کی کال کا انتظار تھا، شعلہ بار آنکھوں سے ڈیش بورڈ کو گھورتے ہوئے اسی کی آواز سن رہی تھی۔ کوئی منٹ بھر کے بعد بولی۔ "نہیں...... میں تمہارا مطالبہ نہیں پوچھوں گی کیونکہ میں تمہاری کوئی بھی ڈیمانڈ پوری کرنے کی روادار نہیں ہوں۔ رہی بات ان لوگوں کی، جنہیں تم نے اغوا کر رکھا ہے، ان سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چاہو تو انہیں گولی مار کر پھینک دو، چاہو تو انہیں ان کے گھر پہنچا دو۔"

دوسری طرف سے ایسا کچھ کہا گیا کہ میڈم کا چہرہ غصے

سے سرخ ہوگیا، دانت پیس کر بولی۔ ”کہا ناں کہ مجھے تمہاری یا ان لوگوں کی کوئی پروا نہیں۔ تم دلیر دشمن نہیں ہو۔ بزدل شخص ہو ورنہ آواز بدل کر باتیں نہ کرتے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم ہمیشہ میری نظروں سے چھپے رہو گے، نہیں...... اگر چاہوں تو تمہیں آدھے گھنٹے میں پاتال سے کھینچ نکالوں مگر میرے نزدیک تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

میں کوشش کے باوجود فون سے پھوٹنے والی بھنبھناہٹ کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میڈم نے فون سیٹ کے عقب میں نصب ننھے سے اسپیکر پر اپنی ہتھیلی رکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے آواز محض اس کے کان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی آواز سے بیزاری مترشح کرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو! میں اس وقت ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے جا رہی ہوں۔ تم پھر کسی وقت فون کرنا اور اپنا مطالبہ پیش کرنے کا شوق پورا کر لینا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے فون کان سے ہٹایا اور کال منقطع کر دی۔ مجھے گاڑی چلانے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”باسٹرڈ! تم میرا انتظار کرو، میں خود ہی تمہاری ڈیمانڈ شیٹ لینے کے لیے آ رہی ہوں...... ویٹ فار واڈ۔تھ......“

میں نے پوچھا۔ ”کون تھا میڈم؟“

”میں اُسے پہچان نہیں پائی۔ کم بخت آواز بدل کر بول رہا تھا۔“ وہ برہمی سے بولی۔

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ناگاہ میری نگاہ عقب نما آئینے پر پڑی۔ میں چونک گیا۔ میرے عقب میں گہرے نیلے رنگ کی ٹویوٹا کرولا چلی آ رہی تھی۔ گاڑی کو پہچانتے ہی میری رگوں کا خون میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ میں اس گاڑی اور اس کے مالک کو کبھی بھی بھول نہیں سکتا تھا۔ یہ زور آور کی کار تھی۔ میں نے میڈم سے کہا۔ ”زور آور کی گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ زور آور کی کار اچانک کس طرف سے نکل کر ہمارے عین عقب میں آن پہنچی تھی۔ میں ناگ شاہ پہنچنے تک خاصا محتاط رہا تھا اور اپنے پیچھے آنے والی ٹریفک کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تب تک یہ کار مجھے دکھائی نہیں دی تھی۔ زور آور خطرناک شخص تھا اور اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ اس سے بچنا ضروری تھا۔

میڈم نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ بولی۔ ”اسے اوور ٹیک نہ کرنے دینا ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔ ہم فائٹنگ پوزیشن میں نہیں ہیں کیونکہ ہمارا اسلحہ ڈگی میں پڑا ہے۔“

میں نے تیزی سے کہا۔ ”وہ ہمارا ٹائر برسٹ کر سکتا ہے۔“

ہم سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ ہمیں چاہیے تھا کہ گنیں اور پستول اپنی دسترس میں رکھتے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورتِ حال میں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں لینڈ کروزر کی رفتار بڑھا دی کیونکہ میں یا میڈم فی الفور ڈگی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ڈارک بلیو کار کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ میں نے بیک مرر میں کار میں بیٹھے ہوؤں کی شکلیں دیکھنے کی کوشش کی مگر کار کی فرنٹ اسکرین پر پڑنے والی روشنی کے انعکاس کے باعث کار کے اندر جھانکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سڑک خالی تھی جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں اسپیڈو میٹر کی سوئی کو ایک سو تیس کے ہندسے پر تھرکانے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر عقب نما میں دکھائی دیتی ہوئی ڈارک بلیو کار مسلسل خطرے کی گھنٹی بجاتی چلی آ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں میڈم کے فون کا بزر بجا۔ اس نے اسکرین پر جگمگانے والے ہندسوں کو بہ غور دیکھا اور بڑبڑائی۔ ”زور آور فون کر رہا ہے۔“

ساتھ ہی اس نے کال ریسیو کر لی، بولی۔ ”ہیلو ینگ مین! کیسے میری یاد آ گئی؟“

زور آور کی بات سنتی رہی، پھر مجھے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روکنے کا حکم دیتے ہوئے بولی۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ لو! میں نے گاڑی رکوا دی ہے۔“

لینڈ کروزر رک گئی۔ ڈارک بلیو کار ہمارے عقب میں آن رکی اور زور آور ڈرائیونگ گیٹ کھول کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میڈم کے طرف بڑھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میڈم نے شیشہ اُتارا اور اپنا دستانے میں ملفوف ہاتھ باہر نکالا۔ ”ہیلو ینگ مین! کیسے ہو؟“

زور آور نے ہاتھ تھاما، شوخی سے بولا۔ ”آپ اپنا ہاتھ بھی دیتی ہیں تو دستانے میں چھپا کر...... چلیں! اسی پر گزارا کر لیتے ہیں۔ سنائیں! کدھر جا رہی ہیں؟“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھے اور قدرے جھک گیا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ یوں، جیسے میرا ہونا یا نہ ہونا اُس کے نزدیک بالکل بے معانی ہو۔

میڈم بولی۔ ”ایک شادی میں شرکت کی غرض سے شجاع آباد جا رہی ہوں۔“

وہ زیرِ لب ہنسا۔ ”آپ جیسی عظیم ہستی کے پاس اتنا وقت کہاں کہ ایسا فضول فنکشن اٹینڈ کرتی پھریں۔ میرے لائق کوئی حکم ہو تو صادر کیجیے۔ بندہ حاضر ہے۔“

میڈم ہنسی۔ ”نہیں زور آور! تم بہت اچھے ہو۔ آئی لو یو...... رہی بات تمہارے لائق کسی کام کی، تو یقین مانو کہ جب بھی مجھے تم سے کوئی کام پڑا، میں رائی بھر تکلف نہیں برتوں گی کیونکہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔“

زور آور نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میڈم! آپ نے کہا تھا کہ استاد موبی کا قاتل آپ تک پہنچا تو آپ اسے میرے حوالے کر دیں گی کیونکہ آپ کو بھی موبی اتنا ہی پیارا تھا جتنا مجھے...... پھر آپ نے مجھے اور موبی کی روح کو دھوکا کیوں دیا؟ اس کے قاتل کو اپنے پہلو میں کیوں جگہ دی؟“

بے چینی کی ایک لہر میرے تن بدن میں پھر گئی۔ میڈم سنجیدہ ہو گئی، بولی۔ ”زور آور! میں نے کل جھوٹ بولا تھا نہ آج بولتی ہوں۔ شہر یار موبی کا قاتل نہیں ہے۔ اس کے قاتل کا معاون بھی نہیں ہے۔“

”خالد اس کا لنگوٹیا یار ہے میڈم!“ زور آور کے لہجے میں غیر معمولی کاٹ پنہاں تھی۔

”دوست ہونا بڑی بات نہیں ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمہارے دوست کے قتل میں شریک نہیں تھا۔ تم نے خود بتایا تھا کہ موبی خالد کا خون کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اسما نامی لڑکی پر دل و جان سے فریفتہ تھا اور کسی شخص کو رقیب کے طور پر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ خالد نے اچانک ہی موبی پر وار کر دیا اور موبی زندگی کی بازی ہار گیا۔ یار! جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس کا وار چل جاتا ہے، وہی الیگزینڈر قرار پاتا ہے۔ تم اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ شہر یار نے موبی پر فائر نہیں کیا تھا اور خالد کے ساتھ اس کی موجودگی محض اتفاق تھی۔ دوبارہ یہ خالد سے کبھی نہیں ملا اور نہ ہی جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کریمنل نہیں ہے۔ تبھی تمہارے خوف سے کہیں روپوش ہے۔ جب دکھائی دیا، میں یقیناً تمہیں انفارم کروں گی۔“ میڈم نے قدرے سخت اور بااعتماد انداز میں کہا۔

”یہ کئی بار میرے ہاتھوں مرنے سے بچ گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اگلی مرتبہ جب میں اس کے سر پر پہنچوں تو اسے پھر زندہ چھوڑ دوں۔ اسے بھی خالد کے ساتھ ہی کہیں روپوش کر دیں تو بہتر ہے۔“ زور آور کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

میں کچھ کہنے چلا تھا کہ میڈم نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا اور زور آور سے مخاطب ہوئی۔ ”دھمکی دے رہے ہو؟“

”نہیں...... اپنے اندر جلتی ہوئی آگ کی شدت سے آگاہ کر رہا ہوں۔“

”اس آگ کو اپنی طاقت بناؤ۔ کمزوری بناؤ گے تو کہیں کے نہیں رہو گے۔“ میڈم کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ”شہر یار کی اس حیثیت کو مدِنظر رکھو کہ یہ میرا دوست ہے۔“

زور آور نے معنی خیز انداز میں ایک زہریلی مسکراہٹ اُچھالی اور بولا۔ ”میڈم! اس ڈکے کی طرف میرے بڑے حساب نکلتے ہیں۔ خیر...... آپ کی موجودگی میں آپ کے شاہ زور پر ہاتھ ڈالنے کو دل نہیں مانتا۔ دل آپ کا دیدار مانگتا تھا، وہ مل گیا، اب چلتا ہوں۔“

میڈم بڑی فرحت سے مسکرائی، بولی۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”میں بھی ایک دوست کی شادی میں شرکت کی غرض سے شجاع آباد جا رہا ہوں۔“

”چوٹ نہ کرو، سیدھی طرح بتاؤ۔“

”شجاع آباد سے آگے ایک بستی ہے سمن...... وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ رفاقت بھٹی۔ وہ کسی مصیبت میں ہے اور اس نے مجھے فون کر کے اپنے ہاں بلایا ہے۔ اس کی مدد کے ارادے سے اس کے ڈیرے پر جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا، پھر سینے پر دل کے مقام پر ہاتھ رکھا اور شوخ انداز میں بولا۔ ”گڈ بائے میڈم شکیلہ! سی یو اَگین، وین اِٹ ول جمپ ٹو یو......“

اس نے عاشقانہ انداز میں میڈم کا دستانے میں چھپا ہوا ہاتھ تھاما، لبوں اور آنکھوں سے لگایا اور ہاتھ لہراتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے عقب نما میں دیکھا۔ زاویے کی تبدیلی کی وجہ سے اس کی گاڑی کی فرنٹ اسکرین کے پار دکھائی دے رہا تھا۔ زور آور اکیلا ہی اپنے دوست رفاقت بھٹی کی اعانت کی غرض سے بستی سمن کی طرف جا رہا تھا۔

میں نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! رفاقت بھٹی وہی ہے جس نے کیپٹن اپلٹ نگینہ سے نکاح پڑھوایا ہے۔ نوروز بھٹی کا بیٹا......“

”اوہ یس...... مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔“ میڈم کے ہونٹ سکڑ گئے۔ ”اس کا مطلب ہے کہ رفاقت بھٹی ہمارے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ زور آور کا دوست عام خصوصیات کا مالک نہیں ہو سکتا۔“

”میرا خیال ہے کہ زور آور اور رفاقت بھٹی نگینہ کو تلاش کرتے ہوئے ہم تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ ہم نے اپنے پیچھے کوئی کلیو نہیں چھوڑا۔“

”بشرطیکہ یہ لوگ ایل ایچ وی مس عالیہ تک نہ پہنچ

جائیں۔'' میں نے اپنے اندیشے کا مبہم اظہار کیا۔

اس نے کندھے اُچکائے اور بے پروائی سے بولی۔ ''جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ فی الحال ہمیں اپنی توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ زور آور کو آگے نکلنے دو۔''

میں نے گاڑی کی رفتار کم کردی۔ زور آور ہارن بجاتا ہوا آگے نکل گیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی شجاع آباد کی طرف عازم سفر تھیں۔ شجاع آباد شہر کے مضافات میں پہنچ کر میں نے سوالیہ نظروں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ''زور آور شہر میں سے گزر کر سمن کی طرف جائے گا جبکہ ہم اسی راستے پر جائیں گے، جس راستے پر پہلے گئے تھے۔ مین روڈ چھوڑتے ہی رفتار بڑھا لینا۔''

اس نے مجھے سمجھایا کہ زور آور شہر کے بیچ سے گزر کر سمن جانے والی سڑک پر جائے گا۔ ہم بھی اُسی سڑک پر شہر میں داخل ہوئے بغیر سپر بند، نہر اور سڑکوں کے اتصال پر جا چڑھیں گے۔ چونکہ زور آور کے راستے میں شہر کا بے پناہ ہجوم حائل تھا، اس لیے ہم اس سے کہیں پہلے سمن والی سڑک پر پہنچ کر پوئٹے والی سڑک پر اُتر جائیں گے۔ رفتار تیز رکھنے کی وجہ سے ہمارے ٹکراؤ کے چانس مزید کم ہوجائیں گے۔

میں نے میڈم کی ہدایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مین روڈ سے اُترتے ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

بیٹ خیر پور اور پوئٹا جانے والی سڑک پر اترنے تک ہمیں زور آور کی گاڑی دکھائی نہیں دی اور یوں ہم اس کی نظروں میں آئے بغیر تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اسپتال کے پاس سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر ہماری نظریں چار دیواری کے اوپر سے رہائشی کالونی پر جمی رہیں۔ شکر ہوا کہ مس عالیہ یا اس کا شوہر ہمیں دکھائی نہیں دیا۔

''میڈم! کیا آپ نخی محمد کے کام کا جائزہ لینا چاہیں گی؟''

''نہیں...... پیرو ماچھی کے ڈیرے پر چلو۔ مبادا کہ وہ جھوک لوری سے واپس آ گیا ہو اور دل پر ہاتھ رکھ کر اپنی اجڑی ہوئی دنیا ملاحظہ کر رہا ہو۔''

اس کا لہجہ بڑا طنزیہ تھا۔ پختہ سڑک ختم ہوگئی اور ناہموار زگ زیگ راستہ شروع ہوگیا۔ دریائی فضا میں رچی ہوئی مخصوص مہک نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ میں نے پوچھا۔ ''میڈم! آپ نے سوچا تو ہوگا کہ آپ کے کمزور پہلو پر ہاتھ ڈالنے والا کون ہوسکتا ہے؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر قدرے متردد انداز میں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ سردار حیدر خان اور اس کا دستِ راست استاد بہلو متحرک ہیں۔ خان اپنی بیٹی کو بازیاب کرانے کے چکر میں انگاروں پر لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ اس نے زندگی بھر اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی، یہاں ناک کٹنے کا معاملہ درپیش ہے۔''

''پیرو ماچھی کے پیچھے یہاں آنے سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا کہ ہم ڈائریکٹ ایکشن کرتے ہوئے سردار حیدر خان پر حملہ کرتے۔''

''کہاں؟'' وہ کڑی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس نے اماں اور سیمو کو کہاں چھپا رکھا ہے، یہ کیسے علم ہوگا؟''

مجھے تھوڑی شرمندگی ہوئی۔ ''سوری میڈم! میں نے رائے پیش کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''پیرو ماچھی جانتا ہے کہ اُس نے دونوں کو کس کے کہنے پر اغوا کیا اور انہیں کہاں پہنچایا۔ یقیناً وہ اب تک وہاں موجود نہیں ہوں گے، جہاں پیرو ماچھی انہیں چھوڑ آیا ہوگا مگر وہاں سے ہمیں کلیو مل سکتا ہے۔'' میڈم بولی۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حرامزدگی سردار حیدر خان کے بجائے کسی اور نے کی ہو اور ہم حیدر خان پر اپنا وقت ضائع کرتے رہیں۔''

''آپ اگر اغوا کار کا مطالبہ سن لیتیں تو یقیناً واضح ہو جاتا کہ ہمارا دشمن کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں اپنی کمزوری اس پر عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب مخمصے میں پڑ گیا ہے۔ میرے بے پروا رویے کے باعث پیدا ہونے والی نئی صورتِ حال پر غور کر رہا ہوگا، الجھ رہا ہوگا اور اسے پینترا بدلنے میں کچھ دیر لگے گی۔ ایسے میں کوئی غلطی کر بیٹھے گا۔''

میڈم کے لہجے میں غیر معمولی اعتماد اور خنکی سمٹی ہوئی تھی۔ دریا کی چمکتی ہوئی لکیر دکھائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اُس ڈھنڈ پر پہنچ گئے جس کے کنارے پر رات کو میڈم کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''میڈم! زخم کی حالت کیسی ہے؟''

''کون سے زخم کی؟'' میڈم چونکی پھر مسکرا کر بولی۔ ''اچھا...... وہ ڈنڈے کا زخم...... کم بخت نے زور کا وار کیا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔ چھیڑنے سے دکھتا ہے، ویسے نہیں۔''

میں نے ڈھنڈ کے پاس ریتیلی جگہ پر گاڑی روک دی۔ میڈم گنگنائی۔ ''لے آئی پھر کہاں پر، قسمت ہمیں کہاں سے...... یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے......''

اس کی نظریں اُس ننھے سے ٹیلے پر جمی ہوئی تھیں جہاں اسے بے ہوش کرنے کے بعد چت لٹا کر مراد بخش اس پر چڑھ بیٹھا تھا۔ دھوپ میں ٹوٹا ہوا سنہرا ہیئر ربن چمک رہا تھا۔ میں نے گاڑی سے اُتر کر ڈگی کھولی۔ وہاں ایک کمبل، پانی کی دو تین بوتلیں اور ایک بیگ پڑا تھا۔ میڈم نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''گنیں کمبل کے نیچے پڑی ہوں گی۔''

میں نے کمبل کھینچا۔ نیچے پڑی ہوئی دونوں گنیں اور پستول نکالے۔ میگزینیں چیک کرکے چڑھائیں اور اضافی راؤنڈ اُٹھا کر میڈم کے پاس آ گیا۔ میڈم نے اپنے لیے ایک گن اور پستول لے لیا۔ پستول روایتی جسامت کے تھے۔ اسلحہ بہ اہتمام سنبھالنے کے بعد میں نے پیرو ماچھی کے ڈیرے کا رُخ کیا۔

وہاں پہنچ کر ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈیرے کا منظر جوں کا توں تھا۔ تین قد آور کتے مراد بخش کی لاش کے قریب صحن میں اداس اور پریشان حال بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بھونکتے ہوئے دور چلے گئے۔ یہ کتے پہلے دکھائی نہیں دیے تھے۔ شاید پولیس کی اندھا دھند فائرنگ سے خوفزدہ ہو کر جنگل کی طرف بھاگ گئے تھے۔ کتوں کو بارود کی بو ناگوار گزرتی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے مراد بخش کی لاش کو منہ تک نہیں لگایا تھا اور حد تو یہ تھی کہ مراد بخش کی آنکھ کے ڈیلے اور چھچھڑوں کو بھی نہیں کھایا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''میڈم! کتا گوشت خور جانور ہے۔ گوشت سامنے پڑا ہے مگر کتوں نے اسے اپنی سرشت کے برعکس سونگھا تک نہیں...... ہے نا عجیب بات!''

میڈم نے مراد بخش کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پالتو کتے اپنے مالک کا ماس کیسے کھا سکتے ہیں شہر یار! مراد بخش انہیں آج تک کھلاتا پلاتا آیا تھا، کیسے اس کے ہاتھ پیر ان کی خوراک بن جاتے......''

میں نے دیکھا کہ صحن کے پار بلند قامت درخت کے نیچے کھڑے تینوں کتے ہماری جانب منہ کیے کھڑے تھے۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے ان کی فطری بے چینی اور اضطراب عیاں تھا۔

ڈیرے کے سرسری جائزے سے صاف عیاں تھا کہ یہاں کسی نے میرے بعد قدم نہیں رکھا تھا۔ اگر پیرو ماچھی نے اس علاقے کو اپنی کمین گاہ بنایا تھا تو بلاوجہ نہیں بنایا تھا۔ کئی گھنٹے گزرنے کے بعد بھی پیرو ماچھی کے ڈیرے پر ہونے والے قتل اور پولیس ریڈ کی خبر انسانوں کے جنگل میں چنگاری کی طرح نہیں پھوٹی تھی۔ کسی نے ادھر آنے کی زحمت نہیں کی تھی حالانکہ فائرنگ کی آواز اطراف میں کافی دور تک سنی گئی ہوگی۔ یقیناً پیرو ماچھی کی دہشت نے کسی کو ادھر نہیں آنے دیا تھا۔ سردار حیدر خان نے دریائے سندھ کے بیلے کو اپنی بدمعاشیوں کی آبیاری کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ چناب کے بیٹ پر اَن گنت شاہ زوروں کا قبضہ تھا۔ دریاؤں میں پانی کم ہونے کی وجہ سے بیلے کا علاقہ خاصا سمٹ گیا تھا مگر اپنی خوں ریزی سمیت ابھی تک موجود تھا۔ ان جنگلی اور دریائی علاقوں میں قانون کی عملی طور پر مداخلت بہت کمزور تھی۔ یہاں وہی کچھ ہوتا تھا جو جانوروں کی دنیا میں روا ہوتا ہے۔ طاقت کا استعمال اور فتح بہ زورِ جنگ وجدل!

میڈم فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''ہمیں یہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ طے ہے کہ پیرو ماچھی یہاں نہیں آیا۔ وہ ابھی تک جھوک لوری میں اپنے دوست کے پاس مقیم ہے۔ اسے اپنے گروہ پر بیتنے والے خونیں واقعات کی خبر نہیں ہوئی۔''

''میڈم! یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے پتا چل گیا ہو اور وہ روپوش ہوگیا ہو۔'' میں نے عندیہ دیا۔

وہ بولی۔ ''ہاں...... چلو...... دریا پار کرتے ہیں۔''

اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ مراد بخش کی لاش پر ڈالی اور پلٹ کر گاڑی کی طرف چل دی۔ میں نے قدم ملائے۔ کتے ہم پر غرائے، نیچی آواز میں بھونکے مگر انہوں نے ہم پر لپکنے کی زحمت نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر دریا پر موجود تھے۔ میڈم نے مجھے اس طرف چلنے کا حکم دیا جس طرف سے پانی آ رہا تھا۔

دریا کے عمومی کٹاؤ نے سطح زمین کو غیر معمولی طور پر ناہموار کر رکھا تھا۔ کہیں اچانک دس بارہ فٹ اونچی ریتیلی زمین کا تخت بچھ جاتا تو کہیں قدِ آدم گڑھا اچانک نمودار ہو جاتا۔ بیل، ریہڑیوں اور ٹریکٹروں کی آمد و رفت کے باعث زگ زیگ انداز میں دو متوازی لکیروں پر مشتمل راستہ دور تک جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ میڈم نے مجھے خبردار کیا تھا کہ ان لکیروں سے ہٹنے کی صورت میں گاڑی کچی جگہ پر پھنس جائے گی۔ چونکہ دریا کی چھوڑی ہوئی جگہ پر چکنی مٹی کی تہ جمی نظر آ رہی تھی جس کے نیچے موٹی ریت والی زمین تھی، اس لیے ایسی جگہوں پر گاڑی کا اچانک پھنس جانا بعید از امکان نہیں تھا۔ کوئی ڈیڑھ فرلانگ کا سفر طے کرنے کے بعد ایک دوراہا دکھائی دیا۔ میڈم بولی۔ ''یہاں سے بائیں ہاتھ ٹرن لو۔''

میں نے گاڑی موڑی۔ ہمارا رُخ رواں دریا کی طرف ہوگیا۔ دو تین منٹ بعد ہم ایک چبوترا نما جگہ پر پہنچ کر

رُک گئے۔ ہمارے عین سامنے کوئی ڈیڑھ سوفٹ چوڑے پاٹ والا دریا بہہ رہا تھا۔ موسم سرما کی وجہ سے پانی گدلا نہیں تھا بلکہ اس کی رنگت سبزی مائل تھی۔ ہم نیچے اُترے اور پیدل چلتے ہوئے کنارے تک چلے گئے۔ میڈم نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنایا اور چڑھتے رُخ دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ رہا بیڑا...... ہم اس بیڑے کے ذریعے اپنی گاڑی کو دریا کے پار لے جا سکتے ہیں۔ بیڑے والے کو آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کرو۔“

میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں بیڑے کو دیکھ لیا۔ زیادہ فاصلے کی وجہ سے بیڑے کی جسامت عام کشتی کے برابر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنایا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت بروئے کار لاتے ہوئے آواز دی۔ ”اوئے!“

یکے بعد دیگرے میں نے کئی آوازیں دیں مگر بیڑے پر کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بیڑے کا ملاح بیڑے کو لانبہ کر کے کہیں چلا گیا تھا۔

میڈم بولی۔ ”تم اُس طرف جاؤ، بیڑے کے قریب ترین مقام پر کھڑے ہو کر اپنا لاؤڈ اسپیکر چلاؤ۔“

میں چڑھتے رُخ پیدل چل پڑا، کیونکہ گاڑی کو ادھر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ چند قدم چلا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جو میں نے گزشتہ شب میں ڈھنڈ پر دیکھا تھا جب میں جھنگی میں سے اسلحہ اُٹھانے کے لیے گیا تھا۔ مراد بخش نے میری عدم موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈنڈے کے زوردار وار سے میڈم کو زمین پر بچھا دیا تھا۔ میں پلٹ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”میڈم! گاڑی کو کوئی خطرہ نہیں، آپ میرے ساتھ آ جائیں۔“

میڈم نے کچھ سوچا پھر ہنس پڑی۔ بولی۔ ”اردگرد کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم جاؤ۔“

میں رکا رہا۔ وہ بولی۔ ”جاؤ ناں!“

میں نے کہا۔ ”پلیز میڈم! آپ میرے ساتھ آ جائیں۔ دیکھیں، دریا کی فضا کتنی جاندار ہے۔“

”میں دریا کی فضا میں سانسیں لے رہی ہوں۔“ وہ بولی مگر اس نے میری بات مان لی۔ قریب آئی اور اپنا ہاتھ تھماتے ہوئے بولی۔ ”میں مراد بخش پر قابو پا سکتی تھی اگر میں تن آسان نہ ہو جاتی۔“

”میرا کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں نے آپ کی فائٹنگ دیکھ رکھی ہے...... بلکہ بھگت رکھی ہے۔ آپ بہت مضبوط ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ حادثہ کسی بھی لمحے رونما ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں گیلی زمین پر چلتے ہوئے بیڑے کے عین مقابل مقام کی طرف جا رہے تھے۔ میڈم بولی۔ ”مجھے تمہارے ساتھ اس تنہائی میں چلنا بڑا اچھا لگ رہا ہے۔“

”یہ میری خوش بختی ہے۔“ میں نے مختصراً اپنی قلبی کیفیت آشکار کی۔

”ہوں.... کیا تم اپنی منگیتر کو کسی ایسی رومانوی جگہ پر لے کر گئے ہو؟“

میں چونکا۔ وہ بڑے رسان سے چٹکی لیتی تھی۔

”نہیں میڈم! دریا نور پور سے خاصے فاصلے پر بہتا ہے۔“

”میں نے دریا کی بات نہیں کی، رومانوی جگہ کی بات کی ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”ویسے تو نور پور بذاتِ خود رومانوی فضا والا گاؤں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن غزالہ کو بالخصوص میں کسی بھی جگہ لے کر نہیں گیا۔“

”کبھی موقع ملا تو لے جاؤ گے؟“

”میرا نہیں خیال کہ میں اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے قابل کبھی ہو پاؤں گا۔“ میں نے سپاٹ انداز اختیار کیا۔ ”میرا سفر مجھے روز بہ روز میرے آبائی گاؤں اور غزالہ سے دور لے جا رہا ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ میں لوٹ کر نور پور نہیں جاؤں گا۔“

”تم چاہو تو اُسے اپنے پاس بلا سکتے ہو۔“

”ہاں! مگر وہ اپنا گاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو گی۔“

”کیوں؟ وہاں ایسا کیا رکھا ہے جسے وہ دیکھتے رہنا چاہتی ہے؟“ وہ رُک کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے نظریں چُرا لیں۔ کہا۔ ”شاید ایسا کچھ بھی نہیں ہے مگر ہم دیہاتی لوگ بڑے روایت پسند ہوتے ہیں۔ اپنی روایات اور اقدار سے ہٹنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہتا۔“

”کیا تم غزالہ کی اقدار کا حصہ نہیں ہو؟“ میڈم کے لہجے میں کاٹ تھی۔ ”یا عشق کی روایات میں کوئی تیسرا کردار حائل ہے؟“

”جی نہیں میڈم!“ میں نے جلدی سے کہا۔

”عورت کے لیے اپنے من چاہے منگیتر سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی۔“

میں نے لاجواب ہو کر کہا۔ ”مگر شاید میرا اور غزالہ کا ملن قسمت میں نہیں لکھا۔“

”قسمت؟“ وہ ٹھٹک کر بولی۔ ”واٹ ڈو یو مین؟ کیا تم

...پیدا کردہ فاصلوں کو قسمت سے موسوم کرنے لگے ہو؟“

”میڈم! انسانوں کی زندگی کے فیصلے اوپر ہوتے ...نیچے صرف بساط بچھی ہے جس پر ہم مہروں کی طرح ...حرکت کرتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے، مگر نہیں......“ اس کی آنکھیں جلنے بجھنے ...لیں۔ ”شہر یار! انسان کو اپنی حماقتوں پر قسمت کی ترپال ...نہیں ڈالنی چاہیے۔ ہم وہی فصل کاٹیں گے، جو ہم بوئیں ...گے۔ اگر میں اور تم یہاں، اس وقت، اس حالت میں موجود ...ہیں تو یہ ہمارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم جس ...میں اُڑ رہے ہو، وہاں تمہاری منگیتر، غزالہ، ہرگز فٹ ...نہیں ہوتی۔“

میں نے سر جھکا لیا۔ اس کی باتوں کا جواب میرے پاس ...نہیں تھا۔ وہ بولی۔ ”تمہاری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ تم بے ...وفائی کا ارتکاب کرنے پر مائل ہو۔ کیا میں نے غلط کہا ہے؟“

میں نے جلدی سے اس کی تصحیح کرنا چاہی۔ ”نہیں ...میڈم! آپ نے یہ رائے قائم کرنے میں جلد بازی کا ...مظاہرہ کیا ہے۔ جب سے میری بہن پر قیامت ٹوٹی، تب ...سے اَب تک میں نے غزالہ یا کسی بھی شخص کے بارے میں ...نہیں سوچا۔ جب وہ مل جائے، تب میں اپنی زندگی کے ...بارے میں کچھ سوچ پاؤں گا۔“

میڈم نے قدم بڑھائے۔ سر جھٹکا اور بولی۔ ”شاید تم ...ٹھیک کہہ رہے ہو۔ محبت حالات کے تابع نہیں ہوتی۔ عشق ...کج راستوں پر عافیت کے گوشے نہیں تلاشتا۔ پروین کا ...غم اپنی جگہ، غزالہ کی یاد کا تناؤ اپنی جگہ...... تم شاید سوچوں ...سے فرار حاصل کرنے کے لیے یہ اسٹوپا اپنے سامنے کھڑا ...کرتے ہو۔“

میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ”شاید ایسا ہی ہو۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میری وجہ سے ڈبل مائنڈڈ ہو ...گئے ہو؟“

”جی!“ میں چونکا۔ ”نہیں میڈم! میں آپ کو اس ...نظر میں دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟ کیا میں عورت نہیں ہوں؟“ اس کی آواز ...میں تلخی کا ہلکا سا تاثر موجود تھا۔

”آپ کیا ہیں؟ یہ میرا دل جانتا ہے۔ زبان تک وہ ...احساسات رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں! یہ ضرور کہوں گا ...آسمان اور زمین کا قسمت نے کہیں ملن نہیں لکھا، کہیں جوڑ ...نہیں بنتا۔“

”یعنی تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟“

ایک ہی بات

حنیف فدا سے۔ ”تمہارے دادا نے میرے ابا سے میری شکایت کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔ میں ضد پہ آیا تو بڈھے کو ناک سے چنے چبواؤں گا۔“

فدا۔ ”تم اسے ناک کے بجائے منہ سے چنے چبواؤ تو ایک ہی بات ہو گی۔“

حنیف۔ ”کیا مطلب؟“

فدا۔ ”مطلب یہ کہ دادا جی کے دانت نہیں ہیں۔“

مرسلہ: بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ سچ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔ جھوٹ بولنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”سچ کہو...... دلیر اور بہادر انسان کے لبوں پر جھوٹ نہایت بدصورت لگتا ہے۔“

میں رُک گیا۔ اس کا ہاتھ میری گرفت میں تھا، تبھی اسے بھی رُکنا پڑا۔ میں بولا۔ ”میڈم! کوئی اور بات کریں۔“

”میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔“ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

میں گڑبڑا گیا۔ سچ کیا تھا؟ کیا بتاتا، کہ میں نے ابھی تک خود بھی اپنی حیثیت اور مقام کا تعین نہیں کیا تھا۔ جھجک کر کہا۔ ”میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔“

”وقت ضائع نہ کرو، سیدھی بات کرو۔“ وہ گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گئی۔ میں بھی دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا، دونوں بانہیں پوری وسعت میں فضا میں لہرائیں اور بولی۔ ”قدرت کے حسن کو دیکھو۔ کتنی خوبصورتی رچی ہے۔ یہ ریت کتنی پیاری ہے، یہ پانی، وہ درخت، وہ جھاڑیاں...... ہر چیز میں ندرت ہے۔ جانتے ہو، کیوں؟...... میں بتاتی ہوں۔ اس زمین تک بناوٹ اور انسانی توڑ پھوڑ کا عمل نہیں پہنچا۔ اس زمین کے ان گنت گوشے کنوارے ہیں۔ درخت ان چھوئے ہیں، پانی میلا

نہیں ہے...... ہاں! جب ان کی اصلیت داغ دار ہو جائے گی اور اس زمین پر جھوٹ کی فصل بوئی جانے لگے گی، اس کا حسن ماند پڑ جائے گا۔ ہے ناں؟"

اس کی آواز مخصوص ترنم کے بہاؤ پر لرزاں تھی اور آنکھوں میں زندگی کروٹیں لیتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی زندگی میں دکھ یا تکلف نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ وہ بس وہی کچھ تھی، جو دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "میڈم! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں۔ تم میرے سوال کا دوٹوک جواب دو، کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟...... ہاں یا نہیں؟"

میں نے سر جھکا لیا، کہا۔ "میڈم! اگر میں کہوں کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتا تو پھر میری ذات زیرِ عتاب آ جائے گی۔ آپ نے مجھے اپنی نظرِ التفات اور توجہ کا عادی کر دیا ہے۔ جب نظر انداز کیا جاؤں گا تو بہت تکلیف محسوس کروں گا۔ اس لیے میں اپنے منہ سے کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتا۔"

وہ بڑی توجہ سے مجھے سننے لگی۔ میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا اور بات بڑھائی۔ "آپ کیا ہیں؟ یہ میرا دل جانتا ہے۔ آپ سے بڑھ کر دنیا کا کوئی حسین وجود میری نظر میں نہیں ہے۔ آپ یکتا ہیں۔ منفرد ہیں۔ ہزاروں کیا، لاکھوں آپ کی دید کو ترستے ہیں اور میرا بخت مجھے آپ کے قرب کی لازوال گھڑیاں بخشتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں تو یہ عجیب اور مضحکہ خیز صورتِ حال ہوگی۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا...... میں آپ کے قابل ہی کہاں ہوں کہ اتنی بڑی بات اپنے چھوٹے منہ سے نکال کر خود کو بے وقعت کر لوں۔ نہیں میڈم! آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھیں تو میرے لیے بہتر ہے۔"

"تم نے مجھے چکر دینا سیکھ لیا ہے۔" اس کے چہرے پر تناؤ ہویدا ہو گیا۔ "میں پوچھتی ہوں، کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں...... ہاں یا نہ میں جواب دو۔"

میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑیں، اپنی زیر و زبر ہوتی دنیا کا ایک لحاتی جائزہ لیا اور سود و زیاں کا شمار ذہن سے محو کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم! اگر آپ بضد ہیں تو میں لب کشائی کرتا ہوں۔ نہیں جانتا کہ مجھے اپنے ان لفظوں کی کیا قیمت چکانا پڑے گی۔ مگر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آئی لو یو...... مجھے علم ہے کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ آپ کے وصال کی خواہش طفلانہ ہوگی اور آپ کو چھو کر میلا کرنے کا شوق میرا جرم ہوگا، مگر میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ کے قرب کی خواہش میرے دل میں جاگزیں رہتی ہے اور جب آپ میرے ساتھ ہوتی ہیں، تب میری سوچ کی دنیا میں کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا۔"

اس کی آنکھیں جل اُٹھیں۔ ہونٹ نیم وا ہو گئے۔ گال تمتمانے لگے۔ بولی۔ "کیا واقعی؟"

اس کا ردِعمل دیکھ کر میری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار خطرناک حد تک مہمیز ہو گئی۔ میں دلیر ہو گیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اپنے تمام تر جذبات کو آواز میں گوندھ کر اس کے سامنے پیش کر دیا۔

"میڈم! میں نے جھوٹ نہیں کہا۔ سچ کہتا ہوں کہ آپ نے کبھی نظر انداز کیا تو ٹوٹ پھوٹ جاؤں گا۔ شاید زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ اور مزید کہنا چاہوں گا کہ مجھے اپنی کم مائیگی کا پورا احساس ہے۔ میں کبھی آپ کے لیے دردِ سر نہیں بنوں گا۔ آپ مجھے اپنی ذات سے دور مت کیجیے گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یک ٹک میری آنکھوں میں جھانکتی رہی اور میرے الفاظ کی سچائی کو پرکھتی رہی۔ پھر مطمئن ہو کر گھٹنوں کے بل آگے بڑھی اور مجھے سوچنے کا موقع دیے بغیر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اُسے سہار نہ سکا اور کمر کے بل ریتیلی زمین پر گر گیا۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ مجھ پر لد گئی اور چہکنے لگی۔ "میں تمہیں اپنے آپ سے دور نہیں کروں گی کیونکہ تمہاری موجودگی مجھے تقویت دیتی ہے۔ تمہاری محبت مجھے تحفظ کا احساس دیتی ہے۔ تم میرے باڈی گارڈ نہیں ہو، تم میرے نوکر نہیں ہو، تم میرے دوست ہو!"

وہ رات میں کئی مرتبہ میرے حواس کے ساتھ ساتھ میرے بدن پر سوار ہوئی تھی مگر تب میری قلبی کیفیت یہ نہیں تھی۔ میرا دل اتنی تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اَب تب میں کسی وقت پسلیوں کا جنگلا توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ میں نے اس کے نرم و گداز کوٹ میں چھپے ہوئے وجود کو اپنی بانہوں کے شکنجے میں کس لیا۔ اپنی خوش نصیبی پر دل بلیوں اچھلا...... ایسے میں غزالہ کی پرچھائیں سطحِ آب پر پاؤں پاؤں چلتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ میں چونکا۔ دیکھا، چشمِ تصور نے بڑا ابھرپور عکس کھینچا تھا۔ وہ قریب آ کر بولی۔ "شہرے! کیا یہی تمہاری محبت تھی جو ایک شہزادی نے اپنی مٹھی میں جکڑ کر ہوا میں اچھال دی ہے؟"

میں نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے اور دل ہی دل میں اسے جواب دیا۔ "ہاں میری جان! میں ہار گیا، تمہاری محبت ہار گئی اور ایک شہزادی مجھے فتح کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ آئی ایم ویری سوری!"

وہ لب بستہ چند قدموں کے فاصلے پر آ کر رُک گئی اور یاس بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد ایک آہ بھر کر پلٹ گئی۔ کچھ کہا، نہ سنا...... شاید باقی کچھ نہیں رہا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق میڈم میری دہکائی ہوئی آگ کی حدت سے گھبرا گئی، میرے نیچے سے اپنے دونوں ہاتھ نکال کر اچھل کر کھڑی ہوئی اور بولی۔ "رومانٹک پیریڈ ختم، مشن کی طرف پیش رفت شروع...... کم آن! اپنا لاؤڈ اسپیکر آن کرو اور بیڑے والے کو آواز دو۔"

اس کے لحاتی لمس نے میرے جسم میں بے عنوان شکست و ریخت برپا کر دی تھی۔ یوں لگا جیسے میں نے اُٹھنے کی کوشش میں اپنے بدن کی تمام تر توانائیوں کو صرف کر دیا تھا۔ کئی ثانیوں تک اپنے حواس بحال کرتا رہا پھر ہاتھوں کا بھونپو بنا کر پوری قوت سے چیخ اُٹھا۔ "اوئے...... کوئی ہے......"

بیڑے میں نصب شدہ ننھے سے خیمے سے کوئی نکلا اور جواباً چلایا۔ میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور ہاتھ لہرا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں گاڑی کو دریا کے پار لے جانے کے لیے اس کے بیڑے کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھ گیا۔ چند منٹوں بعد وہ بیڑے سے اُتر کر خشکی کی طرف بڑھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بیڑے کی لانچ کھولنے جا رہا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ کچھ ہی دیر بعد اس نے بیڑے کا انجن جو غالباً چوبیس ہارس پاور پیٹر انجن پر مشتمل تھا، اسٹارٹ کر دیا اور فضا 'پٹ پٹ' کی مخصوص آواز سے گونج اُٹھی۔

کوئی پانچ سات منٹ کے بعد بیڑا اس اُبھرے ہوئے کنارے پر آن لگا جس پر ہماری لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ تب تک ہم بھی اپنی گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ بیڑے کا سیلر انتہائی کالے اور چمکدار بدن والا توانا شخص تھا جس نے مقامی لہجے میں کہا۔ "آپ کون ہیں اور دریا کے پار کس کے پاس جانا چاہتے ہیں؟"

میں نے بتایا۔ "ہم روہیلا توالی جانا چاہتے ہیں۔"

"کس کے پاس؟"

"انور خان وشتی کے ہاں......" میڈم نے جلدی سے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھے اس سوال کا جواب دینے میں لاعلمی کے سبب تامل تھا۔

"پانچ سو روپے لگیں گے کیونکہ یہ بڑی گاڑی ہے۔" اس نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے دریا پار کرنے کی فیس بتائی۔

میڈم بولی۔ "ٹھیک ہے۔ بیڑا لانچ کرو۔"

"گاڑی پیچھے ہٹا کر پتن پر لے آؤ۔" اس نے پانی میں اُترتے ہوئے کہا اور بڑی چابکدستی اور مہارت سے بیڑے کے دونوں رسے خشکی پر پھینک دیے۔ تب میں نے دیکھا کہ لینڈ کروزر کے دونوں طرف کچھ فاصلے پر دو بڑے سے چوبی کلے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں رسوں کو ان کھونٹوں پر اس طریقے سے باندھا کہ بیڑا ایک انچ بھی اِدھر اُدھر حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے آج تک گاڑی کو بیڑے پر نہیں چڑھایا تھا اور نہ اس عمل کو تماشائی بن کر دیکھا تھا۔ میرے تذبذب کو دیکھ کر میڈم جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی کو دس پندرہ فٹ پیچھے لے گئی۔

میں یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بیڑے کا سیاہ فام سیلر بیڑے کے عین وسط میں کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر لیے۔ اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔ "بی بی! ایں ہتھ تے...... اُڈے...... اِڈے...... ہا...... ہا...... ایں سیدھے تے گھدی آ......"

میڈم اس کے ہاتھوں کے اشاروں اور زبانی جاری کردہ ہدایات کے مطابق گاڑی کو آہستہ آہستہ کنارے تک لے آئی پھر سیاہ فام سیلر کی طرف سے اوکے رپورٹ ملتے ہی اس نے بیڑے پر گاڑی کے اگلے ٹائر گرا دیے۔ بیڑے کو ایک جھٹکا لگا اور وہ خطرناک انداز میں اوپر نیچے ہونے لگا جس سے گاڑی بھی ہچکولے کھانے لگی۔ میں دم سادھے اس خطرناک کام کو دیکھ رہا تھا۔

چند لمحوں میں گاڑی کے پچھلے ٹائر بھی زمین کو چھوڑ کر بیڑے کے چوڑے تختے پر گر گئے۔ اس مرتبہ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک انداز میں بیڑا اوپر نیچے ہوا مگر خیر گزری کہ چند ہچکولوں کے بعد اس کی حرکت تھم گئی اور بھاری بھر کم گاڑی بخیر و عافیت بیڑے کے وسط میں جا کھڑی ہوئی۔ میڈم بیڑے سے نکلی اور مجھے بیڑے میں اترنے کا حکم صادر کرتے ہوئے بولی۔ "واٹ اے رومانس ڈارلنگ...... میں نے پہلی مرتبہ بیڑے پر گاڑی چڑھائی ہے۔ ہائے! کیا ایڈونچر ہے یہ!"

مجھے اس کے اعتماد پر حیرت ہوئی۔ آہستگی سے بیڑے میں اُترا۔ سیاہ فام ہنسا، بولا۔ "بے شک چھلانگ لگا دیتے،"

بیڑا ڈوبنے والا نہیں ہے تمہارے وزن سے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ میری احتیاط فضول تھی کیونکہ میری نظروں کے سامنے منوں وزنی گاڑی بیڑے پر اُتری تھی۔ وہ تب نہیں ڈوبا تھا تو میرا وزن کیا معانی رکھتا تھا۔ میڈم گاڑی سے چند قدم ہٹ کر بیڑے کے کنارے پر نصب چوڑے چوبی تختے پر کھڑی تھی جبکہ سیاہ فام ملاح بیڑے میں پڑے ہوئے موٹے رسے کی مدد سے گاڑی کو بیڑے کے آہنی کنڈوں کے ساتھ باندھ رہا تھا۔ میں میڈم کے پاس آن کھڑا ہوا۔ ہچکولے لیتے ہوئے بیڑے پر کھڑا ہونا بذات خود بڑا ایڈونچر تھا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! تھوڑا پیچھے ہٹ جائیں۔ یہ نہ ہو کہ مزے لیتے لیتے پانی میں غوطے کھانے لگیں۔ پانی بہت ٹھنڈا ہے۔''

وہ پانی کی طرف جھکی اور چاہا کہ اپنے ہاتھ پانی میں ڈالے مگر اپنے دستانوں کو دیکھ کر رُک گئی۔ عجیب ہی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے میڈم؟''

''دیکھ رہی ہوں کہ انسان کے سینے سے بھاری سل ہٹ جائے تو اس کا چہرہ کیسا نظر آتا ہے۔''

میں اس کے الفاظ میں چھپی ہوئی معنویت کو سمجھ کر جھینپ گیا اور بولا۔ ''میں نے آپ کے مجبور کرنے پر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔''

چند منٹوں میں ہی سیاہ فام ملاح حفاظتی اقدامات سے فارغ ہو کر بیڑے کے انجن سے نبرد آزما ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ بیڑے کے عین وسط میں دو چوڑے متوازی تختے نصب تھے جن پر لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ تختے اسی مقصد کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ جونہی انجن اسٹارٹ ہوا، میڈم گاڑی سے بندھے ہوئے موٹے رسے کو پکڑ کر دوسرے تختے پر چلی گئی اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ میں بھی چکر کاٹ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

''شہریار! اتنا بڑا بیڑا مین میڈ (انسان ساختہ) ہے۔ دیکھو...... انسان کتنا طاقتور ہے۔ لکڑیوں کو جوڑ کر پانی کے سینے پر رکھتا ہے اور پھسلتا جاتا ہے۔'' میڈم کے لہجے میں کسی ان پڑھ بیڑا ساز کاریگر کے لیے ستائش پنہاں تھی۔ ''یہ ایک ناخواندہ مستری کی انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔ ہے سیلر! تم نے یہ کشتہ کب بنوایا تھا؟''

اس نے پیٹر کی ٹس کھینچ کر فکس کرتے ہوئے کہا۔ ''بی بی جی! ایں کو چھیوّاں سال ویندا پئے۔''

(بی بی جی! اس کا چھٹا سال گزر رہا ہے۔)

میڈم نے حیرت سے مجھے دیکھا، بولی۔ ''چھ سال، بڑا عرصہ ہے۔ ہے ناں؟''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ہم دونوں گاڑی سے کچھ فاصلے پر تختے پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے جب کوئی لیور کھینچ کر سیلر نے کشتہ رواں کر دیا۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ میڈم مجھ سے ٹکرائی۔ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ''شہریار! ہوا کتنی خوش گوار ہے۔ یاد ہے، رات کو بدن کے آر پار ہوتی محسوس ہوتی تھی۔''

مجھے گزشتہ رات کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ میں نے کہا۔ ''جی میڈم! آپ کو بخار کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہوئی ہوگی۔''

''ہاں یار! میں کوشش کے باوجود اپنی کپکپاہٹ پر قابو نہیں پا رہی تھی۔''

بیڑا اپنی مخصوص چال سے پار والے پتن کی طرف رواں دواں تھا۔ پیٹر انجن کی پھٹی پھٹی آواز فضا میں گونج رہی تھی جبکہ سیاہ فام سیلر پیٹر کے قریب نصب چھوٹے سے چوبی بنچ پر بیٹھا اپنے کام میں مگن تھا۔ آدھا سفر طے ہو چکا تھا۔ آدھا باقی تھا جب اچانک ایک تیز، قدرے باریک مگر نہایت سرد آواز ہمارے عقب میں گونجی۔ ''اوئے! تساں کون لوک ہوے؟''

(اوئے! تم کون لوگ ہو؟)

ہم دونوں یکبارگی مڑے۔ ہمارے عین عقب میں گاڑی کے سامنے تختے پر پاؤں جمائے کھڑا گٹھے ہوئے توانا جسم والا شخص ہاتھ میں سیمی آٹومیٹک گن تھامے کھڑا تھا۔ اس کی شعلے اگلتی آنکھوں اور گن کی نال ہماری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے کن انکھیوں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ میڈم کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر میری دھڑکن تیز ہو گئی۔

میرے کانوں میں گن بردار کی چیختی ہوئی آواز پڑی۔ ''ہک ڈوجے کوں وَل ڈیکھ گھناہے! پہلے اپنے ایں پیو کو جواب ڈیوو، نئیں تاں رَت نال رنگ چھڑیساں...... منٹ ماردے اپنے ہتھ سر تیں رکھو!''

(ایک دوسرے کو بعد میں دیکھ لینا۔ پہلے اپنے اس باپ کو جواب دو۔ نہیں تو میں خون میں نہلا دوں گا۔ جلدی کرو اور اپنے ہاتھ سر پر رکھ لو)

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ



اسیرِ ابلیس

مریم کے خان

اسیری محبت کی ہو یا نفرت کی، دنیا سے قطع تعلق کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تنہائی اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتی۔ وحشت یوں چہار سو رقص کرتی ہے کہ اپنا ہی عکس خوفزدہ کر دیتا ہے۔ اس آسیب زدہ بستی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا... جہاں ایک نادیدہ خوف رگوں میں لہو سرد کر رہا تھا مگر... جینے کی امنگ پھر بھی زندہ تھی۔

بے خبری کے عالم میں موت کے سائے سائے چلنے والوں کا قصہ

ایلس برٹن اپنے گھر ویسٹ ورجینیا چارلسٹن سے بعجلت روانہ ہوئی کیونکہ اسے آج نہ صرف دفتر میں بہت سے کام نمٹانے تھے بلکہ اس کے بعد اسے اپنی کولیگ رانا کے ساتھ کولمبس جانا تھا جو پڑوسی ریاست اوہائیو کا دارالحکومت تھا۔ یہ چارلسٹن سے کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر شمال مغرب میں تھا۔ ایلس ایک معروف اخبار کے چارلسٹن کے دفتر میں کام کرتی تھی اور اس کا شعبہ میگزین تھا۔ بنیادی طور پر وہ صحافی تھی اس لیے میگزین کا کام اسے کسی قدر بور لگتا تھا لیکن اس

میں کبھی کبھی کوئی اچھی اسٹوری ہاتھ لگ جاتی تھی اور آج وہ ایک اچھی اسٹوری کی تلاش میں کولمبس جارہی تھی۔ چار بجے وہ رائنا کے ساتھ دفتر سے نکلی۔ رائنا بھی میگزین سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا شعبہ آثاریات تھا۔ ایلس اسے گڑے مردے اکھاڑنے والی کہتی تھی۔ ہائی وے پر اکیلے طویل ڈرائیو کرنا مشکل تھا، اس لیے ایلس اصرار کرکے رائنا کو ساتھ لے آئی تھی اور شکر گزار تھی کہ اس کی وجہ سے ایلس کا سفر اچھا گزرا۔ وہ ساڑھے چھ بجے کولمبس کے مضافات میں واقع اس خوب صورت مکان کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ایلس نے رائنا کو بتایا۔

''یہاں انکل ہیری برٹن رہتے ہیں۔''

''تم نے بتایا تھا کہ ان کا بیٹا ارجنٹائن میں کہیں غائب ہوگیا تھا؟''

ایلس نے سرہلایا۔ ''یہ ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔''

''پولیس کی کیا رپورٹ ہے؟''

''یہ سب انکل ہیری بتائیں گے۔'' ایلس نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ انکل ہیری کو ان کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ ان کے استقبال کے لیے باہر آگئے تھے۔ ایلس رشتے میں ان کی کزن کی بیٹی تھی۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور پھر رائنا سے ہاتھ ملایا۔ ایلس نے تعارف کا رسمی فرض ادا کیا کیونکہ دونوں ایک دوسرے کا نام ضرور جانتے تھے۔ انکل ہیری انہیں براہ راست کچن میں لے آئے۔ اکتوبر کے آغاز میں موسم بہت سرد ہوگیا تھا اور ایسے میں گرم کافی اچھی لگی تھی۔ اس کے بعد انکل ہیری ڈنر کی تیاری میں لگ گئے۔ ایلس کو اچھا نہیں لگا تھا کہ وہ ان پر اس طرح سے بوجھ ڈالے اس لیے وہ ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ کھانے کے بعد رائنا نے برتن دھوئے اور کچن صاف کیا۔ پھر وہ سب لاؤنج میں آگئے جہاں دیواروں پر برٹن خاندان کے اکثر افراد کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایلس اور رائنا تصویریں دیکھنے لگیں۔ ان میں سب سے زیادہ تصویریں انکل ہیری کے گم شدہ اکلوتے بیٹے گلیور برٹن کی تھیں۔ وہ تقریباً تیس برس کا خوب صورت اور صحت مند نوجوان تھا۔ ایک تصویر میں وہ اپنا ہاتھ نمایاں کیے ہوئے تھا جس پر اس نے ڈریگن ٹیٹو بنوایا تھا۔ وہ انکل ہیری کے اسٹاک بزنس کی دیکھ بھال کرتا تھا لیکن اس کا اصل شوق انوکھے مقامات کی سیاحت تھی۔ انکل ہیری اپنے اور ان کے لیے کافی بنا کر لے آئے تھے۔ ایلس نے اپنی نوٹ بک کھولی تو انکل ہیری سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایلس نے کہا۔

''انکل، آپ شروع سے سب بتائیں۔''

''درحقیقت مجھے بھی زیادہ علم نہیں ہے۔ دو مہینے پہلے گیلی نے بتایا کہ ارجنٹائن کے جنوب میں کہیں ایک برٹش سیٹل منٹ ہے۔ کوئی وادی ہے جس کی ساری آبادی انگریز نسل کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ وہ آج سے کوئی تین سو سال پہلے وہاں جاکر آباد ہوئے تھے اور آج بھی تین سو سال پرانے طور طریقوں سے زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے صرف نئی ایجادات کو قبول کیا ہے ورنہ ان کا رہن سہن، لباس اور دوسری چیزیں تین سو سال پرانے انداز کی ہیں۔''

''حیرت انگیز۔'' رائنا بولی۔ ''گلیور کو اس بارے میں کہاں سے پتا چلا؟''

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے شاید اس کے کسی نیٹ فرینڈ نے ذکر کیا تھا۔ گیلی نے کچھ اور عجیب باتیں بھی بتائی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی کہ اس وادی میں شیطان کا معبد ہے اور وہاں آج بھی شیطان کی عبادت کی جاتی ہے اور شیطان کے نام پر انسانوں کو قربان کیا جاتا ہے۔''

''خوفناک۔'' رائنا نے جھرجھری لی۔ ''آج کے دور میں بھی ایسی جہالت موجود ہے۔''

''تم ایک پسماندہ ملک کے دور دراز حصے کی بات کر رہی ہو۔'' انکل ہیری سنجیدگی سے بولے۔ ''گیلی کے غائب ہونے کے بعد میں نے اس بارے میں کچھ تحقیق کی تو یہ بات سامنے آئی کہ امریکا اور یورپ کے متمدن خطوں میں بھی شیطان کی عبادت کی جاتی ہے اور پورے امریکا میں ایسے دو سو معبد ہیں جہاں شیطان کی عبادت کی جاتی ہے۔''

''ناقابلِ یقین۔'' رائنا بولی۔ ''کیا آپ مجھے اس بارے میں کچھ معلومات دیں گے۔''

ایلس نے رائنا کو گھورا۔ ''لیکن پہلے ہم گیلی کے بارے میں سن لیں تو بہتر ہوگا۔''

''چھ ہفتے پہلے گیلی کچھ دوستوں کے ساتھ ارجنٹائن روانہ ہوا۔ انہوں نے وہاں کچھ اور علاقوں کی سیر بھی کی تھی مگر اس کے دوستوں نے اس وادی کی طرف جانے سے انکار کردیا اس لیے گیلی اکیلا ہی روانہ ہوگیا۔ اس کی آخری کال اسی وادی کے پاس ایک قصبے سے آئی تھی جہاں گیلی ایک موٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس سے اگلے دن وہ وادی کی طرف گیا اور پھر اس کی واپسی نہیں ہوسکی۔''

''مقامی پولیس اس بارے میں کیا کہتی ہے؟''

''پولیس کی رپورٹ کے مطابق وادی کے لوگوں نے کسی بھی اجنبی کی آمد سے انکار کیا تھا۔ گیلی جس کرائے کی کار

میں وہاں گیا تھا وہ وادی سے کوئی بیس میل دور سڑک کے کنارے خالی ملی۔ اس میں گیلی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ یہ رپورٹ مجھے امریکی سفارت خانے کے توسط سے ملی ہے۔ پولیس نے اسے معمول کی گم شدگی کا کیس قرار دیا۔ ارجنٹائن میں ہر سال دو سو غیر ملکی سیاح غائب ہوجاتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کے پیچھے مقامی جرائم پیشہ لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے جو سیاحوں کو لوٹ کر قتل کردیتے ہیں اور ان کی لاش غائب کر دیتے ہیں تاکہ ان کے جرم کا کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔''

''آپ کے خیال میں گیلی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے؟''

انکل ہیری کے چہرے پر کربناک تاثر آیا۔ گلیور ان کا اکلوتا بیٹا تھا لیکن انہوں نے جلد خود پر قابو پالیا۔ ''نہیں، میرا خیال ہے گیلی کی گم شدگی میں اس وادی اور وہاں پائے جانے والے شیطان کے معبد کا کوئی عمل دخل ہے۔ جہاں شیطان موجود ہو وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''آپ شیطان پر یقین رکھتے ہیں؟'' رائنا نے پوچھا۔

''ہاں کیونکہ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں۔'' انکل ہیری نے جواب دیا۔ ''میں نے امریکی محکمہ خارجہ کو درخواست دی ہے کہ اس معاملے کی پھر سے تحقیق کی جائے۔''

''اس کا شاید ہی کوئی فائدہ ہو۔'' ایلس بولی۔ ''سفارت خانہ پھر ارجنٹائن کی حکومت سے کہے گا اور وہ اپنی پولیس سے کہے گی۔ بات وہیں آجائے گی۔''

انکل ہیری مایوس نظر آنے لگے۔ ''یعنی کچھ نہیں ہو سکتا؟''

''نہیں، ہو تو سکتا ہے۔'' ایلس نے کہا۔ ''اگر میں وہاں جاکر دیکھوں، انویسٹی گیشن میرا شعبہ ہے لیکن اس کے لیے اخبار انتظامیہ سے اجازت لینی پڑے گی۔''

رائنا نے لقمہ دیا۔ ''اور وہ شاید ہی ملے کیونکہ مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں اور انتظامیہ ہر ڈالر بچانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں اخراجات برداشت کرنے کا ذمہ لیتا ہوں۔'' انکل ہیری نے کہا۔

''تب ممکن ہے اجازت مل جائے۔'' رائنا نے سر ہلایا۔

''میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔'' ایلس نے جواب دیا۔ وہ کوئی اقرار کرنے سے پہلے اپنے میگزین انچارج سے بات کرلینا چاہتی تھی۔ اس رات وہ انکل ہیری کے خوب صورت مکان میں ٹھہرے۔ سونے سے پہلے اس نے رائنا سے بات کی تو اس نے بھی اس معاملے کو اخبار کے نقطۂ نظر سے دلچسپ قرار دیا۔

اگلے روز وہ براہ راست دفتر پہنچے اور ایلس نے اپنے میگزین انچارج سے بات کی۔ اس نے جواب دیا۔ ''معاملہ دلچسپ لگ رہا ہے۔ لیکن فی الحال اخبار کی مالی حالت کسی مہم جوئی کی اجازت نہیں دیتی۔''

''اگر میں یہ کام اپنے خرچ پر کروں اور بعد میں جب اخبار اسٹوری شائع کرے تو مجھے اخراجات اور معاوضہ ادا کردے..... تب تو اجازت مل سکتی ہے؟''

''ہاں تب اجازت مل سکتی ہے بشرطیکہ اخراجات ایک حد میں رہیں۔''

میگزین انچارج نے اوپر والوں سے اجازت چاہی اور اس شرط پر اجازت مل گئی کہ مجموعی اخراجات پچاس ہزار ڈالرز سے تجاوز نہ کریں۔ ایلس نے انکل ہیری سے بات کی اور انہوں نے اخراجات کی ذمے داری قبول کرلی۔ اگلے دن اخراجات کے پچاس ہزار ڈالرز ایلس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوچکے تھے اور اس نے ارجنٹائن روانگی کی تیاری شروع کردی۔

☆☆☆

بیونس آئرس کے ائرپورٹ پر وہ تینوں اترے اور کہیں رکے بغیر کرائے کی کار لے کر منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایلس اور رائنا کے ساتھ تیسرا فرد میگزین کا فوٹو گرافر میٹ سائن تھا۔ وہ دونوں بھی فوٹو گرافی جانتی تھیں اور ان کے پاس جدید ترین اور مختصر ڈیجیٹل کیمرے تھے جو بہت ہائی ریزلیوشن تصاویر بنانے کے ساتھ ساتھ ویڈیو بھی بنا سکتے تھے لیکن پھر بھی انہیں ایک پیشہ ور فوٹو گرافر کی ضرورت تھی جو بہترین تصاویر لے سکے اور میٹ اس کام کا ماہر تھا۔ وہ تقریباً تیس برس کا خوش شکل لیکن سلجھے ذہن کا آدمی تھا جو اپنی ساتھی خواتین کو صرف عورت نہیں سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایلس اور رائنا سمیت دفتر کی تمام خواتین کے اس سے بہت اچھے تعلقات تھے۔

ان کی منزل بیونس آئرس سے کوئی چھ سو میل جنوب مغرب میں نیوکوئن نامی چھوٹے سے شہر سے کوئی پچاس میل آگے تھی۔ نقشے کے مطابق یہ نہایت دشوار گزار پہاڑی علاقہ تھا۔ یہ جگہ چلی کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہاں ہموار زمین بہت کم تھی اس لیے آبادی بھی بہت کم تھی۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ ایک رات نیوکوئن میں قیام کرکے وہ اگلے دن اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں

گے۔ راستے میں وہ باری باری ڈرائیو کرتے رہے اور رات سے پہلے نیو کوئن پہنچ گئے تھے۔ شہر چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا اور یہاں بھی اسپینش تہذیب کی چھاپ تھی۔ ارجنٹائن کے لوگ اسپینی نژاد یورپی لوگوں اور مقامی قدیم باشندوں کی ملی جلی نسل ہیں۔ اس لیے یہاں خالص انگریز نسل کے افراد کی ایک پوری کالونی حیرت انگیز تھی۔ جنوب کی طرف اور سطح سمندر سے کوئی چار ہزار فٹ بلند ہونے کی وجہ سے نیو کوئن خاصا سرد تھا حالانکہ ان دنوں یہاں گرمی کا موسم تھا۔ ایک گائڈ بک کے مطابق دسمبر اور جنوری گرم ترین مہینے ہوتے ہیں اور اس وقت بھی درجۂ حرارت شاذ ہی بیس ڈگری سینٹی گریڈ سے اوپر جاتا ہے۔ انہیں ایک مناسب ہوٹل میں تین مناسب قسم کے کمرے مل گئے تھے جہاں انہوں نے سکون سے رات گزاری۔ اگلی صبح وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی روانہ ہوگئے تھے، انہوں نے طے کیا تھا کہ ناشتا اس آخری قصبے میں کریں گے جو اس وادی سے پہلے آتا تھا اور وہاں انہیں کچھ معلومات بھی مل جاتیں۔

وہ ایک گھنٹے بعد اس قصبے میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی اسپینش آباد تھے۔ وہ روایتی گرم جوشی سے پیش آئے لیکن جب ایلس نے کیفے میں موجود مختلف لوگوں سے وادی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے چپ سادھ لی یا جان چھڑانے کے لیے مختصر جواب دیے تھے۔ ایلس نے محسوس کیا کہ لوگ خوفزدہ تھے۔ البتہ ایک شخص نے انہیں وادی کی طرف جانے والا راستہ سمجھا دیا تھا کیونکہ نقشے اور گائڈ میں اس وادی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ مقامی لوگ اس جگہ کو ڈیول ٹاؤن کہتے تھے یعنی شیطان کا شہر۔ وہ لوگ اس طرف جانے سے گریز کرتے تھے اور اگر ڈیول ٹاؤن کا کوئی فرد ان کے قصبے میں آئے تو اس سے گھلنے ملنے سے گریز کرتے تھے بہرحال انہوں نے تسلیم کیا کہ ڈیول ٹاؤن کا معاشی تعلق ان کے قصبے سے تھا اور وہاں کے لوگ یہیں آکر خرید و فروخت کرتے تھے۔

وہ روانہ ہوئے تو بلند سورج بہت تیز چمک رہا تھا اور یہاں زیادہ تر چٹانیں تھیں جو تپ رہی تھیں۔ موسم گرم تھا مگر کچھ دیر بعد وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں گھنا جنگل اور ٹھنڈک تھی۔ یہاں جابجا چشمے بہہ رہے تھے اور بلندی سے آبشاریں گر رہی تھیں۔ یہیں سے ہائی وے سے نکلنے والی ایک سڑک ڈیول ٹاؤن کی طرف جارہی تھی۔ اس سڑک پر کوئی بورڈ نہیں تھا لیکن راستہ سمجھانے والے نے دوسری نشانیاں سمجھا دی تھیں، میٹ ان کو دیکھتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا۔ پیچھے کے خشک علاقے کو دیکھتے ہوئے یہاں کی ہریالی اور ٹھنڈک حیرت انگیز لگ رہی تھی۔ پہاڑوں کے درمیان یہ جگہ کسی ہموار میدان کا حصہ لگ رہی تھی۔ رائنا نے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے ہم انگلینڈ کے کسی علاقے میں سفر کر رہے ہیں۔“

”ہاں بالکل ویسی ہی ہریالی ہے۔“ میٹ نے تائید کی۔

”شاید اسی لیے ان لوگوں نے آباد ہونے کے لیے یہ جگہ منتخب کی۔“ ایلس باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ اس بل کھاتی سڑک پر سفر کرتے ہوئے اس قصبے تک پہنچ گئے۔ داخلی راستے کی آرچ پر قصبے کا نام دی ٹاؤن لکھا تھا۔ یعنی قصبے کا کوئی نام نہیں تھا اور نہ ہی کوئی استقبالیہ بورڈ تھا۔ میٹ نے خبردار کیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے یہاں اجنبیوں کو خوش آمدید نہیں کہا جاتا۔“

انہوں نے کار قصبے کے آغاز میں ہی سڑک پر چھوڑ دی اور اتر کر پیدل چل پڑے۔ حیرت انگیز طور پر بالکل سترھویں صدی کے کسی انگریز قصبے کا سا ماحول تھا۔ لکڑی سے بنے ہوئے الگ الگ مکانات اور باڑھ لگا کر بنائے ہوئے صحن جن میں سوکھنے کے لیے کپڑے لٹکے تھے۔ عورتوں اور مردوں نے پرانے انداز کا لباس پہن رکھا تھا۔ عورتوں نے سر پر مخصوص گول کنٹوپ بھی لیا ہوا تھا۔ ان کے پیروں میں چمڑے کے ہاتھ سے بنے بھدے جوتے تھے۔ عورتیں تنکوں سے بنی ٹوکریوں میں سامان لے کر گھروں کو جارہی تھیں۔ وہاں جدید زندگی کی اشیا بہت کم نظر آرہی تھیں۔ پورے قصبے میں چند ایک گاڑیاں تھیں اور وہ بھی بہت پرانے انداز کی۔ البتہ وہاں بجلی کی سہولت نظر آرہی تھی۔ دکانیں نہیں تھیں اور نہ ہی کوئی ورکشاپ یا کمرشل جگہ نظر آئی۔ قصبے کی طرف آتے ہوئے انہوں نے بہت خوب صورت فارمز دیکھے تھے۔ اس کا مطلب تھا یہاں بسنے والے کاشت کار تھے۔ شاید جانور بھی پالتے ہوں۔

وہ تینوں جہاں سے گزرتے مقامی مرد و عورتیں رک کر یا کام چھوڑ کر انہیں گھورنے لگتے تھے۔ مگر وہ ان نظروں سے بے پروا چلتے رہے۔ ایک احاطے میں انہیں بہت سارے خنزیر پھرتے دکھائی دیے اور ذرا پیچھے ایک شیڈ تلے ان کا ایک ساتھی رسی سے بندھا ہوا معلق تھا۔ چمڑے کا ایپرن پہنے ایک شخص نے خنزیر کے پیٹ میں چھرا مارا۔ اس نے بے ہنگم سی آواز نکالی اور تڑپنے لگا۔ آدمی فوارے کی طرح اڑتے خون اور خنزیر کے تڑپنے کی پروا کیے بغیر چھرے سے اس کا پیٹ چاک کرنے میں لگ گیا۔ ایلس

اور رائنا نے منہ پھیر لیا تھا۔ ان سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا۔ رائنا نے جھرجھری لی۔ ”یہ لوگ واقعی تین سو سال پرانے انداز میں زندگی گزار رہے ہیں۔“

میٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”شاید تم نے اپنے سلاٹر ہاؤس نہیں دیکھے ہیں، وہاں بھی جانور اسی طرح کاٹے جاتے ہیں۔“

قصبہ بہت بڑا نہیں تھا۔ اس میں مشکل سے دو سو گھر تھے اور آبادی شاید ہزار کے آس پاس تھی۔ مگر باہر نظر آنے والے لوگ بہت کم تھے۔ روایتی طور پر قصبے کے آخری حصے میں ایک چرچ تھا اس پر لگی صلیب اور بیل ٹاور دور سے نظر آرہا تھا۔ ایلس نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا یہی شیطان کا معبد ہے؟“

”نہیں یہ عام چرچ ہے۔“ رائنا بولی۔ ”ہم اسے اندر سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میٹ نے چرچ کے داخلی دروازے کے اوپر لگی مصلوب شبیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ شبیہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ ایک عام چرچ ہے۔“

”تب شیطان کا معبد...“ رائنا بولی۔

”وہ صرف ایک کہانی ہے۔“ میٹ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”ایلس کے انکل ہیری نے بھی صرف سنا ہے۔“

پہلی بار سامنے سے ایک شخص نمودار ہوا، وہ سائیکل پر جا رہا تھا۔ ایلس نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور گلیور کی تصویر دکھائی۔ ”یہ میرا کزن ہے یہاں آیا تھا اور یہیں غائب ہوگیا۔“

آدمی کچھ دیر بے تاثر نظروں سے انہیں دیکھتا رہا پھر اس نے دوبارہ پیڈل مارنے شروع کر دیے اور آگے بڑھ گیا۔ میٹ بولا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں لوگوں کے اسی رویے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

ایلس نے مایوسی سے کہا۔ ”یہ تعاون کرنے والے نہیں لگ رہے ہیں، ابھی تک کوئی ہمارے پاس بھی نہیں پھٹکا ہے۔“

”میرا خیال ہے ہمیں ان سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔“ میٹ نے کہا۔ ”ہمیں براہ راست مقامی پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے کیا کیا ہے؟“

”سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اس طرح کیوں رہ رہے ہیں؟“ ایلس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ کوئی خاص فرقہ ہے؟“

اس سوال نے میٹ اور رائنا کو چونکا دیا تھا۔ واقعی، اکیسویں صدی میں اس طرح کی زندگی گزارنے کا کوئی جواز

نہیں بنتا تھا سوائے اس کے کہ وہ کسی مخصوص مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں جو جدید زندگی کا مخالف ہو۔ امریکا اور دنیا کے دوسرے خطوں میں ایسے گروپ موجود ہیں جو آج بھی قدیم انداز میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر جدید زندگی سے کٹ کر پرانے طرز زندگی کی طرف گئے ہیں کیونکہ جدید طرز زندگی انہیں ذہنی سکون دینے میں ناکام رہی تھی۔ اس کے برعکس یہ لوگ تین سو سال سے اسی طرح زندگی گزار رہے تھے اور یہ خاصے پراسرار بھی تھے۔ ان کا رویہ کھل کر وضاحت کر رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بیرونی مداخلت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے لیے وہ مروجہ اخلاق کا مظاہرہ بھی نہیں کر رہے تھے۔ انہیں ہر چہرے پر درشت اور اجنبی تاثر دکھائی دیا تھا۔ بعض لوگوں کے انداز میں بھی نفرت تھی۔ غیر محسوس طور پر وہ سب ایک ہی پیغام دے رہے تھے کہ وہ تینوں فوراً یہاں سے چلے جائیں۔

"مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔" رائنا نے سرگوشی کی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ساتھ ہیں اور غیر ملکی ہیں، یہ ہمارے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کر سکتے۔" ایلس نے کہا۔

"گلیور بھی غیر ملکی تھا۔" میٹ نے یاد دلایا۔

"ہاں، لیکن وہ اکیلا تھا اور ضروری نہیں ہے اس کی گم شدگی میں یہاں کے لوگوں کا ہاتھ ہو۔"

"ویسے میں سوچ رہا ہوں ہمیں آتے ہوئے کوئی ہتھیار لیتے آنا چاہیے تھا۔" میٹ بولا۔

"شاید مقامی قانون غیر ملکیوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔" ایلس بولی۔ وہ چلتے ہوئے قصبے کے آخری حصے تک آگئے تھے۔ یہاں سے دوبارہ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو آگے گھنے جنگل تک چلا جاتا۔ اسی لائن کے آخری حصے میں چرچ تھا۔ قبرستان کے ساتھ باڑھ لگی تھی اور اس پر پھولدار بیلیں چڑھی تھیں۔ انہیں وہاں ایک بچی دکھائی دی جو پھول چن رہی تھی اس نے بھی قدیم طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایلس اس کی طرف بڑھی۔ بچی نے قدموں کی آہٹ محسوس کر کے رخ پھیرا۔ وہ تقریباً بارہ تیرہ سال کی لڑکی تھی۔ ایلس نے مسکرا کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہائی... میں ایلس ہوں۔"

بچی مسکرائی۔ "ہائی، میں جیڈ ہوں۔" وہ خالص انگریز لہجے میں بولی۔

"یہ میرے ساتھی میٹ اور رائنا ہیں۔" ایلس نے تعارف کرایا۔ ان دونوں نے بھی ہائی کہا اور بچی نے جواب دیا۔ ایلس نے گلیور کی تصویر نکال کر بچی کو دکھائی۔

"جیڈ، تم نے اس آدمی کو یہاں دیکھا تھا۔ یہ ایک مہینے پہلے یہاں آیا تھا؟"

لیکن اس سے پہلے کہ جیڈ کوئی جواب دیتی اچانک ایک طرف جھاڑیوں سے وہی قسائی نمودار ہوا جو زندہ خنزیر پر اپنا چھرا آزما رہا تھا، اس وقت بھی اس کے ہاتھ پر خون لگا ہوا تھا اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "جیڈ ادھر آؤ۔"

"بے بی، بتاؤ تم نے اسے دیکھا ہے؟"

جیڈ کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات تھے جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ ایلس کی بات کا جواب دے یا قسائی کے حکم کی تعمیل کرے۔ اسے کھڑے دیکھ کر وہ غصے سے چلایا۔ "جیڈ! تم نے سنا نہیں، فوراً یہاں آؤ۔"

جیڈ نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور آدمی کی طرف چل پڑی۔ آدمی نے اس کا بازو پکڑ کر آہستہ سے کچھ کہا اور پھر اسے جھاڑیوں کی طرف دھکیل دیا جہاں سے وہ خود آیا تھا۔ جیڈ جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ قسائی چند لمحے تک انہیں خونخوار نظروں سے دیکھتا رہا پھر ذرا آگے آیا۔

"تم لوگ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

میٹ آگے بڑھا۔ "آرام سے مسٹر، ہم سیاح ہیں۔"

قسائی نے میٹ کی بات مکمل ہونے سے پہلے اپنا بڑا سا چھرا نکال لیا۔ میٹ بے ساختہ پیچھے ہٹا اور دفاعی انداز میں بولا۔ "اوکے... اوکے ہم جا رہے ہیں۔"

"تم ہمیں دھمکا رہے ہو۔" ایلس نے برہمی سے کہا۔ "ہم مقامی پولیس کو رپورٹ کریں گے۔"

میٹ نے اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ "اس کے منہ مت لگو، چلو یہاں سے۔"

رائنا پہلے ہی خوفزدہ تھی اس لیے وہ فوری وہاں سے چل پڑے۔ ایلس نے کہا۔ "ہم قصبے سے گزرنے کے بجائے کھیتوں سے کیوں نہ چلیں۔ اس طرح ہم مزید اس جگہ کو دیکھ سکیں گے اور ممکن ہے کوئی بات کرنے والا معقول انسان مل جائے۔"

رائنا اور میٹ نے اس کی تجویز مان لی اور وہ درختوں کے ساتھ ساتھ کھیتوں کے کنارے چلنے لگے۔ اچانک رائنا نے جنگل کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کیا ہے؟"

میٹ اور ایلس نے اس طرف دیکھا۔ پہلے انہیں کچھ خاص نظر نہیں آیا لیکن جب انہوں نے جنگل کے اوپر غور کیا

تو انہیں ایسا لگا جیسے جنگل میں آگ لگ گئی ہے اور اس سے دھواں اٹھ رہا ہو۔ لیکن یہ دھواں منتشر ہونے یا ہوا کے ساتھ اڑنے کے بجائے ایک جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ایلس اور میٹ حیران ہوئے تھے پھر میٹ نے اپنے اعلیٰ قسم کے کیمرے کا زوم لینس استعمال کر کے اس چیز کو دیکھا۔ "یہ دھواں نہیں ہے بلکہ دھند جیسی کوئی چیز ہے۔"

ایلس نے اس سے کیمرا لے کر دیکھا۔ واقعی وہ چیز دھواں نہیں بلکہ دھند لگ رہی تھی اور عجیب بات تھی کہ وہ مرغولوں یا گول شکل میں نہیں تھی بلکہ اس میں بے ترتیب سی نوکیں سی نکلی ہوئی تھیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ ایک ہی جگہ رکی ہوئی تھی حالانکہ یہاں اچھی خاصی تیز ہوا چل رہی تھی اور بلندی پر اس کی رفتار مزید تیز ہونی چاہیے تھی۔ انہوں نے اس کی تصویریں لیں۔ ابھی وہ تصویریں لے ہی رہے تھے کہ اچانک رائنا کے منہ سے ڈری ہوئی آواز نکلی۔ "مارے گئے... وہ پھر آگیا ہے۔"

انہوں نے مڑ کر دیکھا، چرچ والی سمت سے وہی قسائی مزید دو جوان آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا، اس کے ہاتھ میں چھرا تھا جبکہ اس کے ساتھیوں کے ہاتھ میں گندم صاف کرنے والا کانٹا اور لکڑی کا گول ڈنڈا تھا، ان کے تیور بے حد جارحانہ تھے۔ قسائی نے نزدیک آ کر دانت پیس کر کہا۔ "میں نے کیا کہا تھا... یہاں سے چلے جاؤ۔"

"ہم جا رہے تھے۔" ایلس آگے آ کر بولی۔ "لیکن پھر ہماری نظر اس پر پڑی۔" اس نے دھند نما چیز کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کیا ہے؟"

جواب میں قسائی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے دھکا دیا اور بے حد خراب لہجے میں بولا۔ "میں نے کیا کہا ہے، یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

میٹ کو غصہ آگیا۔ "تمہارا دماغ درست ہے۔"

میٹ ذرا آگے آیا تو قسائی نے پھرتی سے چھرا اس کی گردن پر رکھ دیا۔ اسی لمحے ایلس کی نظر چرچ کی طرف کھڑے تین راہبوں پر گئی انہوں نے ہڈ والے چوغے پہن رکھے تھے۔ اور ہاتھ باندھ کر ساکت کھڑے تھے پھر ان میں سے درمیان والے نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "یہاں سے چلے جاؤ اس سے پہلے کہ شیطان تمہاری روحوں پر قابض ہو جائے۔"

رائنا نے خوفزدہ ہو کر میٹ کو پیچھے کھینچا جو غصے سے قسائی کو گھور رہا تھا۔ ایلس نے بھی میٹ کا دوسرا ہاتھ تھام لیا اور قسائی سے بولی۔ "آپے میں رہو، ہم اب پولیس سے رابطہ کریں گے۔ یہاں میرا کزن غائب ہوا ہے اور مجھے شبہ ہے وہ اسی قصبے میں غائب ہوا ہے۔"

"تمہیں جو کرنا ہے کر لو لیکن یہاں سے جاؤ۔" قسائی بولا اور اس کے ساتھیوں نے یوں ہتھیار سنبھال لیے جیسے اس کا اشارہ پاتے ہی ان پر حملہ کر دیں گے۔ ان تینوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ یہاں سے نکل جائیں۔ وہ تیز قدموں سے کار تک آئے۔ ان کے موڈ آف تھے۔ جیسے ہی وہ قصبے سے نکلے رائنا نے کہا۔ "شکر ہے ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ ہمیں قتل کر دیں گے۔"

"اتنا آسان نہیں ہے۔" ایلس نے برہمی نے کہا۔ "اب ہم مقامی پولیس اور حکام کی مدد حاصل کریں گے۔"

"میرا نہیں خیال کہ اس سے کوئی فرق پڑے گا۔ پولیس بھی ان لوگوں کا ساتھ دے گی کیونکہ یہ مقامی ہیں اور ہم غیر ملکی ہیں۔" میٹ نے تلخی سے کہا۔ "پھر یہ عام قصبہ نہیں ہے، یہاں ایک مخصوص کمیونٹی آباد ہے اور ممکن ہے مقامی حکام نے انہیں یہ حق دے رکھا ہو کہ وہ اپنے علاقے میں کسی کو داخل نہ ہونے دیں خاص طور سے جب وہ غیر ملکی ہو۔"

دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان یہ وادی میدان کی طرح دور تک پھیلی ہوئی تھی اور خاص طور سے قصبہ بالکل ہموار جگہ تھا لیکن آس پاس کے جنگل بھی پہاڑوں پر نہیں تھے۔ پہاڑ یہاں سے بہت دور تھے۔ جنگل کے درمیان جا بجا دلدلی زمین تھی اسی لیے سڑک سیدھی جانے کے بجائے خاصی گھوم پھر کر وادی کے باہر سے گزرنے والی ہائی وے تک جا رہی تھی۔ وہ ہائی وے کے پاس پہنچے تھے کہ اچانک ایلس نے میٹ سے کہا۔ "کار روکو۔"

میٹ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیوں؟"

"میں نے کہا نا کار روکو۔" ایلس سنجیدگی سے بولی۔ "ہم اس طرح واپس نہیں جائیں گے۔"

میٹ نے کار سڑک کے کنارے روک لی اور ایلس کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "تم نے ان لوگوں کا رویہ دیکھ لیا ہے، وہ تشدد پر اتر آئے تھے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"ہم مقابلہ نہیں کریں گے۔" ایلس کار سے اتر آئی۔ "لیکن ہم جاننے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

میٹ اور رائنا بھی نیچے اتر آئے۔ "ہم کیسے جان سکتے ہیں؟"

"وہاں تک جا کر۔" ایلس نے فاصلے پر نظر آنے والی دھند نما چیز کی طرف اشارہ کیا۔ "اس جگہ یہی ایک چیز

ہے جو سمجھ میں نہ آنے والی ہے اور عین ممکن ہے گلیور کی گم شدگی کا تعلق اسی جگہ سے ہو۔"

رائنا جو پہلے خوفزدہ تھی لیکن جب ایلس نے دھند والی جگہ کی بات کی تو اس کے اندر کی رپورٹر جاگ اٹھی اور اس نے ایلس کی تائید کی۔ "ہاں، ہمیں جاننے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔"

میٹ اس حق میں نہیں تھا لیکن دو کے مقابلے میں وہ ایک تھا۔ اگر رائنا یوٹرن نہ لیتی تو وہ ایلس کی بات نہ مانتا لیکن اب وہ مجبور تھا۔ "ٹھیک ہے، لیکن یاد رہے ہمیں تصادم سے بچنا ہے اور ایسی کسی صورت میں فوری فرار کی راہ اختیار کریں گے۔"

"منظور ہے۔" ایلس بولی۔ انہوں نے کار سے اپنے بیگ نکال کر اپنے شانوں پر ڈال لیے، میٹ نے کار لاک کر دی اور وہ جنگل میں چلنے لگے۔ میٹ نے کیمرے کے لینس سے دھند کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یہ کوئی تین سے چار کلومیٹر دور ہے۔"

"ہمیں آدھا گھنٹا لگے گا وہاں تک جانے میں۔"

جنگل ہموار تھا اور اس کی زمین پر برسوں سے گرنے والے سوکھے پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہاں نہ تو کوئی آتا تھا اور نہ ہی اس زمین کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں ایسے راستے بھی نہیں تھے جو زمین پر مسلسل پیدل چلنے سے بنتے ہیں۔ وہ بہت مشکل سے چل رہے تھے۔ رائنا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے یہاں کوئی نہیں آتا ہے۔"

"بہت مشکل راستہ ہے۔" میٹ نے کہا۔

مگر دو کلومیٹر بعد زمین کسی قدر ڈھلان والی ہو گئی اور یہاں زمین سخت تھی اس لیے انہیں چلنے میں آسانی ہو گئی۔ میٹ نے کھلی جگہ سے دیکھا دھند نما چیز کچھ ہی دور تھی۔ مزید دس منٹ چلنے کے بعد وہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دھند کسی باقاعدہ حد کی طرح ایک جگہ سے شروع ہو رہی تھی اور یہاں بھی وہ ساکت تھی۔ انہیں خوف محسوس ہوا تھا۔ رائنا نے کہا۔ "میں نے آج تک اس طرح کی دھند نہیں دیکھی۔"

"میں نے بھی۔" ایلس بولی۔ "لیکن ممکن ہے یہاں اسی قسم کی دھند ہوتی ہو۔"

میٹ، ایلس سے متفق نہیں تھا، اس کے خیال میں یہ دھند مافوق الفطرت تھی، ایلس نے کہا۔ "تمہارے خیال میں یہ بنائی گئی ہے، قدرتی نہیں ہے؟"

"نہیں، لیکن میں اسے فطری چیز ماننے کو تیار نہیں ہوں۔"

دھند میں درخت اور پودے کچھ دور تک صاف دکھائی دے رہے تھے لیکن اس کے بعد حدِ نگاہ ختم ہو گئی تھی تقریباً دس گز کے بعد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میٹ نے ایلس کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے اس میں داخل ہونا عقل مندی نہیں ہوگی۔"

"مجھے یقین ہے اس جگہ جو بھی پراسراریت ہے وہ اسی دھند سے تعلق رکھتی ہے۔" ایلس نے یقین سے کہا۔ "اس میں داخل ہوئے بغیر ہم اصل بات نہیں جان سکتے۔"

میٹ منع کرنے لگا اور ایلس اصرار کر رہی تھی۔ ان دونوں نے توجہ ہی نہیں دی کہ رائنا کسی قدر آگے ہو کر دھند میں داخل ہوئی اور پھر وہ آگے بڑھتی چلی گئی، جب تک وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہوتے وہ دھند میں غائب ہو چکی تھی۔ ایلس نے چونک کر دیکھا۔ "رائنا کہاں گئی؟"

"میرا خیال ہے وہ دھند میں داخل ہوئی تھی۔" میٹ نے پریشانی سے کہا۔ "اس وقت میں نے دھیان نہیں دیا کہ شاید وہ مزید آگے نہیں جائے گی۔"

"اسے آگے نہیں جانا چاہیے تھا۔" ایلس بھی پریشان ہو گئی۔ "ہمیں مل کر قدم اٹھانا چاہیے تھا۔"

میٹ نے رائنا کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ ایلس نے اس کا ہاتھ دبایا۔ "بلند آواز سے مت بولو، ممکن ہے گاؤں والے اس جگہ کی نگرانی کرتے ہوں۔"

"تب ہم کیا کریں، اسے کیسے تلاش کریں؟" میٹ بولا۔ "کیا ہمیں دھند میں جانا چاہیے؟"

"ہم دونوں کو نہیں۔" ایلس نے سوچ کر کہا۔ "میں جاتی ہوں اور تم باہر رہو اگر میں بھی واپس نہ آؤں تو تم واپس جاؤ گے اور پولیس کی مدد لے کر آؤ گے۔"

میٹ نے سر ہلایا تو ایلس نے اپنا بیگ اتار کر اس کے حوالے کر دیا اور خود دھند کی حد کی طرف بڑھی۔ کسی قدر ہچکچاہٹ اور خوف کے ساتھ وہ اس میں داخل ہو گئی۔ اس نے ایک بار مڑ کر میٹ کی طرف دیکھا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ ایلس آگے بڑھنے لگی، دوسری بار اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے عقب میں بھی سوائے دھند کے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا میٹ بھی اب اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایلس کا ابتدائی خوف کم ہو گیا تھا اور وہ متجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ یہاں بہت زیادہ سناٹا تھا۔ اسے خیال آیا کہ دھند کے پاس جنگل میں بھی سناٹا طاری تھا۔ اب ایلس کو خیال آ رہا تھا کہ یہاں کسی پرندے یا جانور کے بولنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ جبکہ اس سے پہلے جنگل میں جانور اور پرندے بول رہے تھے۔ مگر یہاں سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے جا رہی تھی دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اب پانچ گز سے آگے کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایلس کا اندازہ تھا کہ وہ خاصی آگے آ چکی تھی۔ اس نے دبی آواز میں رائنا کو پکارنا شروع کر دیا۔ مگر رائنا کی طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ اچانک اسے لگا سامنے کوئی شخص موجود ہے۔

☆☆☆

میٹ مضطرب تھا، رائنا کے دھند میں جانے کے بعد ایلس کا اکیلے جانا اس کے لیے شرم کا باعث تھا کہ وہ مرد ہو کر بھی ان سے پیچھے تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ رائنا کو دھند میں گئے ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا جبکہ ایلس کو گئے ہوئے بھی بیس منٹ ہو گئے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی اگلے دس منٹ میں باہر نہیں آیا تو وہ خود اندر جا کر انہیں تلاش کرے گا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، ایک منٹ سے بھی پہلے رائنا اس سے کوئی بیس پچیس گز بائیں جانب دھند سے برآمد ہوئی اور یوں گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے نہ جانے کتنی مشقت کر کے آئی ہو۔ میٹ اس کی طرف لپکا۔ "رائنا تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

رائنا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں، میٹ نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔ "رائنا میری بات کا جواب دو۔"

اس بار رائنا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ "کیا ہوا؟... ایلس کہاں ہے؟"

"تم دھند میں چلی گئی تھیں ایلس تمہاری تلاش میں گئی تھی، کیا وہ تمہیں نہیں ملی؟"

رائنا تھکی ہوئی نظر آنے لگی۔ "میں نے اسے نہیں دیکھا، لیکن وہاں کچھ اور ہے۔"

"کیا ہے؟"

"وہاں شیطان ہے۔" رائنا نے سرسراتے لہجے میں کہا تھا۔ میٹ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

☆☆☆

ایلس نے بہ مشکل اپنی چیخ روکی تھی۔ یہ مجسمہ تھا، سیاہ اور کریہہ پتھر سے بنا ہوا۔ پتھر کا نچلا حصہ گول اور چوڑا تھا اور اصل مجسمہ کمر سے شروع ہو رہا تھا۔ اس کا پیٹ اور سینہ نمایاں تھا۔ چوڑے بازو جن کے آگے کلائیاں تھیں اور جانور جیسے پنجے تھے۔ سب سے ہیبت ناک مجسمے کا چہرہ تھا، ماتھے سے اوپر نکلتے ہوئے مڑے اور نوکیلے کان تھے۔ اندر دھنسی ہوئی تاریک آنکھیں، آگے کو نکلی ہوئی تھوتھنی اور اس کے نیچے درندوں جیسے نوکیلے دانت تھے۔ ایلس سحر زدہ سے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے سامنے شیطان کا مجسمہ ہے۔ ہاں، یہ شیطان کا روایتی مجسمہ تھا جو بالعموم یورپ میں شیطان کے طور پر بنایا جاتا رہا ہے۔ وہ بالکل سیدھا ایلس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو اس پراسرار جگہ یہ موجود ہے۔" ایلس نے سوچا اور پاکٹ سے ڈیجیٹل کیمرا نکالا۔ مجسمے کا چہرہ فوکس کر کے اس نے اس کی چند تصویریں لیں اور پھر زاویہ بدلتے ہوئے کھینچی ہوئی تصویروں کا نتیجہ دیکھتے ہوئے وہ مجسمے کے دائیں طرف آئی اور اس نے دوبارہ تصویر لینے کے لیے کیمرا اوپر کیا تو دہل کر رہ گئی۔ کچھ دیر پہلے شیطان کا سر سامنے دیکھ رہا تھا اور اب اس نے زاویہ بدلا تو شیطان کا سر گھوم کر اپنے شانے کے اوپر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایلس کا سر گھوم کر رہ گیا۔ یہ کیا اسرار تھا؟ پتھر کے بنے مجسمے کا سر کیونکر گھوم گیا۔ اچانک پتھر چٹخنے جیسی آواز آئی اور شیطان کے الٹے پنجے نما ہاتھ میں حرکت پیدا ہوئی جس میں کوئی چیز دبی تھی اور ایلس نے دیکھا اس چیز نے ہلنا شروع کر دیا۔ وہ ایک انسانی دل تھا جو شیطان کے ہاتھ میں دھڑک رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجسمے کی آنکھوں سے اور منہ سے خون بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ ایلس دہشت زدہ سی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستہ قدموں سے پیچھے ہٹی پھر پلٹ کر بھاگی، مگر کچھ دیر میں اسے احساس ہوا کہ وہ راستہ کھو بیٹھی ہے، چاروں طرف دھند تھی۔

اچانک اسے کسی کی سرگوشی سنائی دی۔ آواز انجانی اور زبان نامانوس تھی لیکن اسے لگا جیسے کوئی اسے اپنے ساتھ لے جانے کو کہہ رہا ہے۔ سرگوشی میں بیک وقت التجا بھی تھی اور حکم بھی۔ ایلس تیزی سے بھاگنے لگی۔ وہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی جہاں شیطان کا پراسرار مجسمہ تھا اور جہاں کوئی ذہن میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ یہ جگہ یقیناً شیطان کا مرکز تھی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی، اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ سرگوشیاں مسلسل اس کا پیچھا کر رہی تھیں اور دھند میں بھاگتے بھاگتے اچانک اس نے خود کو دھند سے باہر پایا۔ وہ جنگل میں کھڑی تھی اور اس کا سینہ دھونکنی کی طرح حرکت کر رہا تھا۔ ایک طرف سے میٹ اور رائنا دوڑتے ہوئے آئے۔ میٹ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "ایلس، تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

ایلس نے بہ مشکل سر ہلایا پھر رائنا کی طرف دیکھا جو

پہلے ہی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ رائنا نے آہستہ سے کہا۔ ”تم نے بھی اسے دیکھ لیا؟“

ایلس سمجھ گئی، اس نے سر ہلایا۔ میٹ حیران تھا کیونکہ رائنا نے اسے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم دونوں کس بارے میں بات کر رہی ہو؟“

”یہاں دھند کے اندر وسط میں ایک مجسمہ ہے۔“ ایلس نے بتایا۔ ”ممکنہ طور پر شیطان کا مجسمہ۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ میٹ نے بے یقینی سے کہا۔

”یہ حقیقت ہے۔“ رائنا بولی۔ ”میں نے خود اس مجسمے کو دیکھا ہے اور میں جس طرف جاتی مجسمہ کا سر بھی اسی طرف گھوم جاتا تھا، وہ مسلسل مجھے دیکھ رہا تھا۔“

ایلس سوچ رہی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے انکل ہیری کی بات درست ہے، یہاں شیطان کا معبد بھی ہوگا۔“

”لیکن اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ میٹ نے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ ہم کسی ایسی مشکل میں پڑ جائیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملے۔“

ان دونوں نے میٹ سے اتفاق کیا اور وہ واپسی کے لیے چل پڑے۔ رائنا سست ہو رہی تھی۔ وہ ذرا پیچھے چل رہی تھی، ایلس نے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”نہیں، میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“ رائنا گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔

”جلدی کرو۔“ میٹ نے پکار کر کہا۔ وہ دونوں تیز قدموں سے اس کے پاس پہنچیں اور پھر وہ تینوں ٹھٹک گئے۔ کچھ فاصلے پر وہی بچی جیڈ کھڑی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے گاؤں سے یہاں تک کیسے آئی لیکن ایسا لگ رہا تھا وہ ان کی منتظر تھی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا جیسے اپنے پیچھے آنے کو کہہ رہی ہو اور آگے چل پڑی۔ ایلس تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ میٹ نے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اچھا خیال نہیں ہے، ہمیں یہاں رکے بغیر روانہ ہو جانا چاہیے۔“

جیڈ نے رک کر دوبارہ اشارہ کیا تو ایلس نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے قدم بڑھائے تو مجبوراً میٹ اور رائنا بھی اس کے پیچھے آئے۔ میٹ نے ایک کوشش پھر کی۔ ”ایلس، یہ کوئی جال بھی ہو سکتا ہے۔“

”شاید، لیکن ہم یہاں حقیقت جاننے آئے ہیں۔“ ایلس نے کہا اور جیڈ کے پیچھے جانے لگی۔ انہیں محسوس ہوا کہ بچی انہیں اس سمت میں لے جا رہی ہے جس طرف گاؤں واقع ہے لیکن گاؤں یہاں سے ابھی بہت دور تھا۔

”اگر یہ گاؤں تک لے گئی تو وہاں کے جاہل لوگ اس بار ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ میٹ نے فکرمندی سے کہا۔

”فکر مت کرو اگر اس نے ہمیں گاؤں میں لے جانے کی کوشش کی تو ہم وہیں سے واپس آ جائیں گے۔“

ایلس کی بات پر میٹ مسکرایا۔ ”بشرطیکہ ہمیں واپس آنے دیا گیا۔“

لیکن جیڈ انہیں گاؤں کے بجائے جنگل میں واقع ایک چھوٹی سی پہاڑی تک لائی۔ ڈھلان کے سب سے نچلے حصے میں لکڑی کا ایک بڑا اور مضبوط دروازہ تھا جسے لکڑی کی بلی لگا کر بند کیا گیا تھا۔ وہ تینوں متجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیڈ نے زور لگا کر بلی ہٹائی اور دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ کچھ ہموار جگہ کے بعد سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ اندر داخل ہونے سے پہلے انہوں نے اپنی ٹارچیں نکال لیں۔ میٹ آگے تھا اور وہ دونوں پیچھے تھیں۔ جیڈ سب سے پیچھے تھی، اس نے دروازہ کھینچ کر اندر سے بند کر لیا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ یہ جگہ یقیناً اس پہاڑی کو اندر سے کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ یہاں دیواروں پر جابجا صلیبیں لگی تھیں۔ جہاں سیڑھیاں اتریں وہاں دو دروازے دکھائی دے رہے تھے ایک سامنے تھا اور دوسرا بائیں طرف تھا۔ یہ بھی لکڑی سے بنے مضبوط دروازے تھے اور انہیں بھی پرانے انداز میں بلیاں لگا کر بند کیا جاتا تھا۔ میٹ نے سامنے والے دروازے کو کھولا۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس میں عقب میں بڑا سا اسٹیج بنا ہوا تھا اور اسٹیج کے عین سامنے پتھر کی بڑی سی سل تھی جس پر ایک آدمی آرام سے لیٹ سکتا تھا۔

”قربان گاہ۔“ رائنا کے منہ سے نکلا۔ میٹ نے چونک کر دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”یہ قربان گاہ ہے، یہاں انسانوں کی قربانی دی جاتی ہوگی۔“

”میرے خدا کیا یہی شیطان کا معبد ہے۔“ ایلس کے منہ سے نکلا۔

یہ جگہ بے حد ویران اور ہیبت ناک لگ رہی تھی۔ ایک طرف دیوار پر فولادی خود جیسی چیزیں ترتیب وار ٹنگی ہوئی تھیں۔ یہ کسی بھی انسان کے چہرے کو مکمل طور پر ڈھانپ سکتی تھیں۔ مگر وہاں نہ تو شیطان کا مجسمہ تھا اور نہ کوئی ایسی چیز تھی جس سے پتا چلتا کہ یہی شیطان کا معبد ہے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لکڑی سے بنے کوئی نصف درجن تابوت رکھے

تھے۔ میٹ نے انہیں چیک کیا، وہ تمام خالی تھے۔ تب انہیں یہاں رکھنے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ ایلس نے پتھر کی سل کا معائنہ کیا لیکن وہ بھی صاف ستھری تھی۔ اگر اس پر انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی تو سل پر خون کے نشانات ہونے چاہیے تھے۔ رائنا ٹارچ کی روشنی میں معائنہ کرتی ہوئی ہال سے نکلی اور اس نے دوسرے دروازے کی بلی ہٹائی۔ جیڈ وہیں کھڑی تھی۔ رائنا نے دروازہ کھولا اور چونک گئی۔

”میٹ، ایلس...... یہاں آؤ۔“

وہ دونوں اس کے پاس پہنچے اور وہ بھی دنگ رہ گئے کیونکہ اس بڑے کمرے میں کوئی دو درجن تابوت مختلف جگہوں پر رکھے تھے اور وہ تابوت یقیناً خالی نہیں تھے کیونکہ ان سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ وہ تینوں اندر آئے۔ رائنا بولی تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ”کیا ان میں لاشیں ہیں؟“

”شاید۔“ میٹ نے کہا اور ایک تابوت کھولنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے پاس موجود بند ہو جانے والا چاقو نکالا اور اسے تابوت کے تختے میں پھنسا کر زور لگایا تو چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ تختہ اٹھ گیا۔ اس نے تختہ الگ کیا تو وہ تینوں ہی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ تابوت میں بہت پرانی اور بالکل سوکھ جانے والی لاش پڑی ہوئی تھی اور یہ کسی عورت کی لاش تھی کیونکہ اس نے مقامی طرز کا زنانہ لباس پہن رکھا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ عورت کے چہرے پر وہی فولادی خود چڑھا ہوا تھا۔ خود نے اس کا پورا سر ڈھانپ لیا تھا اور صرف اس کی آنکھوں والی جگہ سوراخ تھے۔ رائنا نے اچانک گھوم کر قے کر دی۔ اس سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا۔ میٹ نے تختہ واپس رکھ دیا۔ وہ دوسرے تابوت کی طرف بڑھا۔ اس نے دوسرا تابوت کھولا۔ اس میں کسی نوجوان مرد کی لاش تھی اور یہ زیادہ پرانی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر بھی فولادی خود چڑھا ہوا تھا۔ اچانک ایلس کی توجہ ایک چیز نے کھینچ لی۔ لاش کے ہاتھ پر جانا پہچانا ٹیٹو ڈریگن بنا ہوا تھا۔ ایلس نے سسکی لی۔

”میرے خدا! یہ گلیور کی لاش ہے۔“

”اس کا مطلب ہے شیطان کے معبد والی بات درست ہے، یہاں لوگوں کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔“ میٹ نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”جیڈ کہاں ہے؟“ ایلس نے دروازے کی طرف دیکھا اسی لمحے ایسی آواز آئی جیسے کوئی لکڑی گری ہو۔ وہ تینوں باہر کی طرف لپکے لیکن اس جگہ سے باہر جانے والا دروازہ بند ہو گیا تھا اور رخنوں سے لگی ہوئی بلی صاف نظر آ رہی تھی۔ ”دھوکا۔“ ایلس نے بے ساختہ کہا۔

”میں پہلے ہی کہہ رہا تھا یہ ٹریپ ہے۔“ میٹ نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے چاقو رخنے سے باہر نکال کر بلی اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ دو ناکام کوششوں کے بعد اس نے بالآخر بلی اٹھا دی اور وہ باہر نکل آئے۔ مگر جیسے ہی انہوں نے جنگل کی طرف قدم بڑھایا، انہیں سامنے سے کم سے کم نصف درجن افراد آتے دکھائی دیے۔ وہ بائیں طرف بھاگے۔ آنے والوں نے انہیں دیکھ لیا تھا اور وہ شور کرتے ان کے پیچھے بھاگے۔ میٹ، رائنا اور ایلس جھاڑیوں میں گھس گئے۔ وہ پوری قوت سے بھاگ رہے تھے، انہیں معلوم تھا، پکڑے گئے تو موت ان کا مقدر بن جائے گی۔ ان کی عافیت فرار میں تھی۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہے تھے۔ بھاگنے سے رائنا کی حالت پھر خراب ہونے لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی اور ایک جگہ پر ٹھہر گئی۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”اب... مجھ سے... نہیں چلا... جا رہا ہے۔“

لیکن ایلس اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک مویشی گھر کے سامنے جا نکلے۔ یہ دو منزلہ مویشی گھر تھا جس میں نیچے مویشی رکھے جاتے ہیں اور اوپر چارہ ذخیرہ کیا جاتا ہے، وہ اس میں گھس گئے لیکن یہ جگہ ویران تھی شاید اب اسے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ میٹ کھڑکیوں سے باہر جھانکنے لگا۔ مگر فی الحال پیچھا کرنے والے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ رائنا رو رہی تھی۔ ”ہم مارے جائیں گے... یہ شیطان کے پجاری ہیں۔“

”ہم اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔“ ایلس نے عزم سے کہا۔ ”ہم اپنی جان بچانے کی پوری کوشش کریں گے اور اس شیطانی ٹولے کو دنیا کے سامنے بے نقاب کریں گے۔“

اچانک باہر شور اٹھا، ان کا تعاقب کرنے والے آ پہنچے تھے۔ وہ تینوں تیزی سے اوپری منزل پر آئے کیونکہ سامنے سے نکلنے کا راستہ نہیں تھا۔ پچھلا حصہ اونچی گھاس اور جھاڑیوں سے پر تھا۔ میٹ نے نیچے چھلانگ لگائی اور رائنا سے کہا۔ ”تم نیچے آؤ۔“

”میں نہیں آ سکتی۔“ وہ روتے ہوئے بولی لیکن ایلس نے اسے حوصلہ دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے اترنے میں مدد دی، آخری مرحلے میں میٹ نے اسے کمر سے پکڑ کر نیچے اتار لیا تھا۔ اس نے ایلس کو اشارہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ ایلس نیچے کودتی، عقب سے آنے والے شخص نے

اسے جکڑ کر کھڑکی سے پیچھے کھینچ لیا۔ میٹ اس کی مدد کے لیے سامنے والے حصے کی طرف بھاگا تھا کہ اس کے سامنے سے دو افراد نمودار ہوئے۔ یہ قسائی اور اس کا ایک ساتھی تھا۔ قسائی کے ہاتھ میں زمانۂ قدیم کا تیر مارنے والا شوٹر تھا۔ میٹ پلٹ کر بھاگا۔ قسائی نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے رائنا کا نشانہ لیا، وہ بھاگی لیکن تیر کہیں تیز رفتاری سے آکر اس کی پنڈلی میں اتر گیا۔ وہ چیخ مار کر نیچے گری اور بلند آواز سے رونے لگی۔ میٹ اس کے پاس رکا تھا کہ اسے تین آدمیوں نے گھیر لیا اور ذرا سی دیر میں اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے جا چکے تھے۔ دو آدمی تڑپتی مچلتی ایلس کو بھی پکڑ کر نیچے لے آئے تھے اور اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ میٹ انہیں گالیاں دے رہا تھا اس لیے ایک آدمی نے مشتعل ہو کر اس کے سر پر لکڑی ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ باندھنے کے بعد انہیں کھڑا کیا گیا اور میٹ کو دو افراد نے دائیں بائیں سے تھام لیا اور اسے کھینچ کر لے جانے لگے۔

"تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟" رائنا بولی۔

"ہم امریکی شہری ہیں۔" ایلس نے کہا۔ "ہم صحافی بھی ہیں اور تمہیں جواب دینا پڑے گا۔"

مگر انہیں لے جانے والے خاموش تھے اور کسی نے انہیں جواب دینے یا چپ کرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ذرا دیر میں وہ پہاڑی کے سامنے تھے۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور انہیں اندر لے جایا گیا۔ انہیں قربان گاہ والے ہال میں لے جایا گیا تھا۔ یہاں وہی تین چوغہ پوش راہب تھے جو انہیں چرچ کے پاس نظر آئے تھے اور انہوں نے ان تینوں کو یہاں سے جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ اسٹیج پر ساکت کھڑے تھے۔ ایلس کا سر گھومنے لگا تھا اور اسے وہی عجیب سی سرگوشیاں اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک راہب نے پاس آکر ان تینوں کا معائنہ کیا، خاص طور سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ میٹ کی آنکھیں بے ہوشی کے عالم میں کھول کر دیکھی گئی تھیں۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "مرد کو باہر لے جاؤ۔"

دو افراد خاموشی سے میٹ کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ اب وہاں ایلس اور رائنا ہراساں کھڑی تھیں۔ دو تنومند افراد نے عقب سے ان کے بازو پکڑ کر انہیں بے بس کر رکھا تھا۔ راہب واپس اپنی جگہ چلا گیا اور اس نے ایک آدمی کو سر سے اشارہ کیا۔ وہ آگے آیا اور اس نے پہلے رائنا کے کپڑے پھاڑنا شروع کیے۔ وہ چلانے اور رونے لگی تھی۔ ایلس التجا کر رہی تھی کہ وہ ایسا نہ کریں لیکن آدمی نے کوئی توجہ نہ دی

ایک منٹ میں رائنا کے جسم سے تمام لباس اتار کر ایک طرف پھینک دیا پھر وہ ایلس کی طرف آیا اور اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ ذرا دیر میں وہ دونوں خود کو اپنے ہاتھوں سے چھپا کر رو رہی تھیں۔ عقب میں موجود افراد نے ان کے بازو چھوڑ دیے تھے۔ پھر راہب کے اشارے پر دو چوغہ پوش آگے آئے، انہوں نے مقامی طرز کے نسوانی لباس اٹھا رکھے تھے جو انہوں نے گلے والے حصے سے ایلس اور رائنا کے سروں سے گزارے اور انہوں نے جلدی سے بازو خود پہن لیے۔ لباس پہن کر انہیں سکون ملا تھا ورنہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ اب ان کے ساتھ برا سلوک ہو گا، ان کی نسوانیت کی توہین کی جائے گی۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" ایلس نے پوچھا۔

جواب میں راہب کے اشارے پر اسے ایک فولادی پنجرے میں دھکیل دیا گیا۔ پھر چار چوغہ پوشوں نے رائنا کو پکڑا اور اسے اٹھا کر قربان گاہ والے پتھر پر لٹا دیا۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی لیکن اس کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں دبا کر اسے بے بس کر دیا تھا۔ پھر ایک شخص نے دیوار پر ٹنگا ایک خود اتار کر راہب کو دیا اور وہ آگے آیا۔ اس نے خود لے کر بلند کیا اور بولا۔ "اے ہم سب کے مالک... اس کی روح کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دے۔"

یہ کہہ کر اس نے خود کے دو حصے کیے اس کا ایک حصہ رائنا کے سر کے نیچے رکھا اور دوسرا حصہ چہرے پر رکھ دیا۔ رائنا پوری قوت سے چلا رہی تھی لیکن خود رکھتے ہی اس کی آواز بند ہو گئی۔ پھر راہب کے دونوں ساتھیوں نے پھرتی سے خود کے دونوں حصوں کو ملانے والی جگہوں پر پیچ کسنے شروع کیے۔ خود چہرے سے ذرا چھوٹا تھا اس لیے جیسے جیسے پیچ کسے جا رہے تھے، رائنا کا سانس رک رہا تھا اور وہ مچل رہی تھی لیکن جیسے ہی پیچ مکمل کس گئے اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا اور پھر وہ ساکت ہو گئی۔ ایلس پنجرے میں سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ رائنا کے ساکت ہوتے ہی اس نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا، اس پر پنجرے کے پاس کھڑے چوغہ پوش نے غرا کر اس کی طرف دیکھا تو ایلس سہم گئی کیونکہ اس کے سامنے وہی شیطانی چہرہ تھا جو اس نے دھند میں مجسمے پر دیکھا تھا۔ یہ چوغہ پوش سب سے الگ تھلگ کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایلس کے ذہن میں پھر وہی پراسرار آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ دو افراد ایک خالی تابوت لے کر آئے اور رائنا کے مردہ جسم کو اس میں گرا کر

انہوں نے کیلوں کی مدد سے تابوت بند کر دیا اور پھر اسے اٹھا کر دوسرے ہال کی طرف لے گئے۔ راہب نے اب ایلس کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا اور دو افراد اسے پنجرے سے نکالنے کے لیے آگے بڑھے۔

☆☆☆

میٹ کو اس وقت ہلکا سا ہوش آگیا تھا جب اسے معبد سے باہر نکال کر لایا جا رہا تھا۔ لانے والوں نے اسے ایک درخت تلے گھاس پر ڈال دیا اور ایک آدمی کو اس کی نگرانی پر لگا کر چلے گئے۔ میٹ نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا، اس آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ چوکسی سے اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اگر میٹ اٹھ کر اس پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو بہ آسانی اسے گولی مار سکتا تھا۔ میٹ پہلو کے بل گرا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے، وہ غیر محسوس انداز میں ہاتھوں پر رسی کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ایلس اور رائنا کہاں تھیں لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا ہو گا۔ یہ لوگ شیطان کے پجاری تھے۔ کچھ دیر کی کوشش سے اس کے ہاتھ کی رسی ڈھیلی پڑنے لگی اور دوسری طرف اس کا نگران بھی سست پڑنے لگا تھا، اب وہ پہلے جیسا چوکس نظر نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر میٹ نے ہاتھوں کی رسی ڈھیلی کر کے ہاتھ آزاد کرا لیے۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے زمین ٹٹولی اور ایک بڑا پتھر بھی اسے مل گیا۔ اس نے پتھر ہاتھ میں دبایا اور موقعے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ معبد سے کچھ ہی دور تھے۔ اچانک ہی کسی عورت کے چلانے کی ہلکی سی آواز آئی۔ نگران نے چونک کر معبد کی طرف دیکھا اور میٹ کو موقع مل گیا، اس نے زمین سے اٹھتے ہوئے پتھر والا ہاتھ گھمایا اور نگران بے خبری میں مار کھا گیا۔ پتھر پوری قوت سے اس کے سر پر لگا۔ وہ کراہ کر جھکا تو میٹ نے پے در پے کئی ضربیں لگائیں اور نگران بے ہوش ہو گیا۔ میٹ نے اس کے ہاتھ سے پستول نکالا اور معبد کی طرف بڑھا۔ اسے لڑکیوں کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی۔ چیخنے کی آواز ان میں سے کسی ایک کی تھی۔ اس نے اندر جھانکا تو اسے سیڑھیوں پر کوئی نظر نہیں آیا تھا لیکن جب وہ اتر کر نیچے پہنچا تو قربان گاہ والے ہال سے کچھ افراد باہر آتے دکھائی دیے، وہ لپک کر ایک آڑ میں ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ تین افراد ایک تابوت لے کر تابوت والے کمرے میں گئے اور تابوت رکھ کر دوبارہ قربان گاہ والے ہال میں چلے گئے۔ میٹ سرک کر دروازے تک پہنچا

اور اس نے اندر جھانکا۔ اسے ایلس ایک پنجرے میں دکھائی دی اور دو افراد پنجرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ایلس کو پنجرے سے نکالا اور کھینچ کر... قربان گاہ کی طرف لے جانے لگے۔ جیسے ہی وہ دروازے کے قریب آئے، میٹ نے اچانک اندر داخل ہو کر ایلس کو پکڑے ایک شخص کے سر پر پستول کا دستہ مارا اور پھر ایک ہوائی فائر کیا۔

"خبردار کوئی آگے نہ آئے۔"

سب ٹھٹک گئے تھے۔ میٹ نے ایلس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور باہر آتے ہوئے دروازہ کھینچ کر باہر سے بلی گرا دی۔ جب تک اندر والے دروازے تک آتے وہ بند ہو چکا تھا، وہ اب دروازے پر لاتیں مار رہے تھے اور میٹ کو گالیاں دے رہے تھے۔ میٹ اور ایلس بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ شام ہو چکی تھی اور کچھ دیر میں رات کی تاریکی چھا جاتی۔ ایلس نے روتے ہوئے رائنا کے بارے میں بتایا۔ "ان درندوں نے اسے بے دردی سے مار دیا۔"

"میں نے دیکھا ہے لیکن ابھی ہمیں اپنی جان بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ ہم یہاں سے نکل کر ہی ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے ہماری گاڑی یہ لوگ اس جگہ سے ہٹا چکے ہوں گے۔" ایلس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کے لیے گاؤں سے کوئی گاڑی حاصل کرنی ہو گی۔"

"ہاں گاؤں نزدیک ہے۔" میٹ بولا۔ "دوسرا یہ ہمیں جنگل میں تلاش کریں گے، ان کو خیال بھی نہیں آئے گا کہ ہم گاؤں کی طرف گئے ہیں۔"

وہ دونوں جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ پستول حاصل کرنے کے بعد میٹ کو اعتماد ہو گیا تھا کہ اب کوئی آسانی سے ان پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ ایلس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ بار بار پیٹ پر ہاتھ رکھ رہی تھی، ایک جگہ اس نے رک کر الٹی کی اور ہانپتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے؟"

"یہ حالات کا اثر ہے۔" میٹ نے اسے تسلی دی۔ "ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بالآخر وہ گاؤں کے نزدیک ایک جگہ نکلے۔ چھوٹے سے میدان کے بعد ایک خوب صورت مکان کے احاطے میں ایک فورڈ منی ٹرک کھڑا تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی تاریکی چھا گئی تھی اور مکان کے احاطے میں لگی روشنیاں جل رہی تھیں۔ گاڑی دیکھ کر میٹ کی جان میں جان آئی اور وہ

تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ایلس اس کے پیچھے تھی۔ اچانک وہ ٹھٹک گئی، اسے لگا جیسے کوئی اسے آواز دے رہا ہے۔ ”ایلس... تم کہاں ہو... میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔“

میٹ نے منی ٹرک کے اندر جھانکا اور آہستہ سے بولا۔ ”لعنت ہو، اس میں چابیاں نہیں ہیں ایلس۔“

لیکن ایلس اس سے دور ساکت کھڑی تھی۔ میٹ پلٹ کر اس کی طرف آیا اور اسے بتایا کہ اسے چابیاں لینے کے لیے اندر جانا ہوگا۔ ایلس خوف زدہ تھی، اس نے میٹ کا بازو تھام لیا۔ ”میں بھی چلوں گی، مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے چلو لیکن آواز مت نکالنا۔“

وہ دونوں دبے قدموں برآمدے میں آئے۔ میٹ نے دروازہ کھولا تو اسے گیلری کے آخری سرے پر ایک عورت کچن میں مصروف نظر آئی۔ وہ دونوں اندر آئے۔ میٹ نے ایلس کو گیلری میں رکنے کا اشارہ کیا اور خود خاموشی سے کچن میں آیا۔ عورت دھلے برتن ایک کپڑے سے خشک کر کے رکھ رہی تھی، اس نے میٹ کی موجودگی محسوس کی اور اس کی طرف مڑی تو اس کے ہاتھ سے ایک پلیٹ چھوٹ کر نیچے گری اور ٹوٹ گئی۔ میٹ نے پستول اس کی طرف سیدھا کر دیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر آہستہ سے بولا۔ ”مجھے تمہارے ٹرک کی چابی چاہیے۔“

”ماما۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔ دروازے کے پاس ایک دس گیارہ سال کا لڑکا کھڑا تھا۔ میٹ نے لپک کر بچے کو قابو میں کر لیا۔ عورت نے بے ساختہ چیخ ماری تو اندر سے ایک مرد بھی نمودار ہوا تھا۔ میٹ نے پستول اس کی طرف سیدھا کر لیا اور دانت پیس کر بولا۔

”میں کسی کو مارنا نہیں چاہتا لیکن ایسا موقع آیا تو میں ہچکچاؤں گا نہیں، مجھے صرف ٹرک کی چابی چاہیے۔“

”اس کی چابی نہیں مل رہی ہے۔“ مرد نے دونوں ہاتھ اوپر کر کے کہا۔ ”آج صبح سے نہیں مل رہی ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ میٹ غرایا۔ ”اندر چلو۔“

پانچ منٹ کے اندر پہلے عورت نے مرد کو کرسی پر بٹھا کر رسی سے باندھ دیا اور پھر میٹ نے کرسی کی پشت سے دوسری کرسی ملا کر عورت کو بھی باندھ دیا۔ اب انہیں کوئی آزاد کراتا تو وہ آزاد ہوتے ورنہ خود سے کسی صورت آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ کام کر کے اس نے پستول پھر مرد کی طرف سیدھا کیا۔ ”میں آخری بار پوچھ رہا ہوں ٹرک کی چابی کہاں ہے اگر وہ نہ ملی تو سب سے پہلے تمہیں گولی مار دوں گا۔“

مرد کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور عورت دبی آواز میں رونے لگی۔ اسی لمحے ایلس اندر آئی، وہ اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔ عورت اسے دیکھ کر چونکی اور پھر اس نے ہذیانی انداز میں مرد کو بتایا۔ ”میرے خدا، یہ معبد میں لے جائی جانے والی عورت یہاں آگئی ہے۔“

مرد نے چونک کر مڑ کر دیکھا اور ایلس کے مخصوص لباس سے شاید وہ پہچان گیا تھا، اس نے گھگیا کر میٹ سے کہا۔ ”میں چابی دے رہا ہوں خدا کے لیے اسے لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔“

”تم لوگ خدا کو مانتے ہو جو اس کا نام لے رہے ہو؟“ میٹ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تم شیطان کے پجاری ہو۔“

”یہ غلط ہے۔“ مرد بولا۔ ”چابی کچن میں اوون کے ساتھ بنی دراز میں ہے، دوسری دراز میں دیکھنا۔“

ایلس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس کے اندر گونجنے والی آواز باقاعدہ شور کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ پھر اس نے دیکھا، بچے کا چہرہ اچانک بگڑ کر شیطان جیسا ہو گیا تھا اور وہ اپنے دانت کچکچا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر بندھے مرد اور عورت کی صورتیں بھی بدل گئی تھیں اور وہ گندے جانور سے مل رہی تھیں۔ ایلس سہم کر پیچھے ہٹی۔ عقب میں دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور وہ اس میں چلی گئی۔ اب اسے ان لوگوں کی صورتیں نہیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن اندر گونجنے والی آوازیں بہ دستور شور کر رہی تھیں۔ اچانک کمرا یوں لرزنے لگا جیسے وہاں زلزلہ آ رہا ہو۔ چیزیں ہل رہی تھیں اور فرش اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

میٹ، ایلس کی کیفیت سے بے خبر بچے کو لے کر کچن میں آیا اس نے بتائی ہوئی جگہ سے چابیوں کا گچھا نکالا اور بچے کو بھی پکڑ کر اوون کے فولادی پائپ سے باندھ دیا۔ بچے نے مزاحمت کی۔ ”چھوڑ دو مجھے۔“

لیکن میٹ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، اسے معلوم تھا اگر شیطان کے پجاریوں کو اس کے فرار کا علم ہو گیا تو وہ اس کا پیچھا کریں گے۔ قصبے میں اور گاڑیاں بھی تھیں اس لیے ضروری تھا کہ ان کے فرار کا علم اتنی دیر بعد ہو کہ وہ اس جگہ سے نکل سکیں۔ بچے کو باندھ کر وہ واپس آیا تو میاں بیوی خوفزدہ سے دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے ایسے شور کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے وہاں طوفان آیا ہو۔ ”ایلس کہاں ہے؟“

”وہ اندر ہے۔“ عورت بولی۔ ”خدا کے لیے ہمیں

کھول دو۔“

میٹ کو دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر مرد چلایا۔ ”دروازہ مت کھولنا، وہ ہم سب کو مار دے گی۔“

مگر اتنی دیر میں میٹ دروازہ کھول چکا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر جاری شور تھم گیا تھا۔ لیکن کمرے کی ہر چیز تباہ ہو گئی تھی یا اپنی جگہ سے دور پڑی تھی۔ میٹ اندر آیا۔ یہاں تاریکی تھی شاید بلب فیوز ہو گیا تھا۔ وہ کھڑکی تک آیا کہ اچانک عقب سے دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے کمرے سے چیخوں اور شور کی آواز آنے لگی۔ میٹ خوفزدہ ہو گیا تھا، آوازیں ان میاں بیوی کی تھیں جنہیں وہ باندھ کر آیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو اب وہاں خاموشی تھی۔ پھر کچن کی جانب سے بچے کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ ان آوازوں میں نمایاں ایک غراہٹ بھی تھی جس سے بھرپور درندگی جھلک رہی تھی۔ وہ لاؤنج میں آیا تو بڑا خوفناک منظر تھا۔ میاں بیوی کرسیوں کی قید کے ساتھ زندگی کی قید سے بھی آزادی حاصل کر چکے تھے۔ وہ اپنے خون میں نہائے ہوئے دور پڑے ہوئے تھے۔ بچہ گرتا پڑتا گیلری میں نمودار ہوا لیکن فوراً ہی کسی نے اسے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا اور اس کی آخری چیخ بہت بھیانک تھی، اس کے بعد وہاں سناٹا چھا گیا۔

میٹ کا پستول والا ہاتھ کانپ رہا تھا اور اس کے ذہن میں کچھ سوالات گردش کر رہے تھے۔ اول ایلس کہاں گئی اور دوسرے یہاں کون قتل و غارت گری کر رہا تھا۔ دونوں سوالوں کا جواب ملا ہوا تھا لیکن میٹ کا ذہن اسے تسلیم نہیں کر رہا تھا، اس نے ایلس کو آواز دی۔ ”ایلس تم کہاں ہو؟“

جواب میں نشست گاہ کی طرف سے ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ وہ محتاط قدموں سے اس طرف بڑھا، اس نے نشست گاہ کے دروازے پر بچے کی لاش دیکھ لی تھی۔ مگر نشست گاہ میں کوئی نہیں تھا۔ پورے مکان کی روشنیاں بند ہو چکی تھیں۔ البتہ باہر احاطے میں روشنیاں جل رہی تھیں جن کا عکس اندر تک آ رہا تھا۔ میٹ کو اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا کسی نے اسے دھکا دیا اور وہ اڑتا ہوا فرش پر جا گرا۔ فوراً ایک بھاری وجود اس پر آ گرا اور اسے بے بس کر دیا۔ میٹ نے پلٹ کر دیکھا، ایک بھیانک چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ ایلس تھی لیکن اس کے پورے چہرے پر نیلگوں لائنیں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں میں جیسے آگ دہک رہی تھی اور کھلے منہ سے غراہٹوں کے ساتھ بے پناہ بدبو آ رہی تھی۔

گدھا

کسی انگریز نے خواجہ حسن نظامی سے پوچھا۔ ”تمام انگریزوں کی رنگت ایک جیسی ہے لیکن ہندوستانیوں کی مختلف، اس کی وجہ کیا ہے؟“

خواجہ حسن نظامی نے جواب دیا۔ ”تمام گھوڑوں کی رنگت ایک جیسی نہیں ہوتی لیکن تمام گدھوں کی رنگت ایک جیسی ہوتی ہے۔“

”میٹ۔“ وہ ڈراؤنی آواز میں بولی۔ ”میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی لیکن مجھے پیار کرو۔“

”مجھے چھوڑ دو۔“ میٹ چلایا تو ایلس کا چہرہ مزید بگڑ گیا تھا۔

”لگتا ہے تمہیں بھی فنا کرنا پڑے گا۔“

اسی لمحے نشست گاہ کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور تین راہبوں کے ساتھ چار دوسرے افراد بھی اندر آ گئے۔ بڑے راہب نے صلیب آگے کرتے ہوئے چلا کر کہا۔ ”چھوڑ دو اسے۔“

ایلس اچھل کر پیچھے گئی اور چاروں ہاتھوں پیروں سے آتشدان سے چپک گئی۔ میٹ تیزی سے سرک کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ تینوں راہب اور ان کے چار ساتھی نیم دائرے میں پھیل کر ایلس کو گھیر رہے تھے۔ وہ کسی درندے کی طرح غرا رہی تھی۔ راہب نے بلند آواز سے کہا۔ ”میں خدا کے نام پر تمہیں حکم دیتا ہوں اسے چھوڑ دو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“

ایلس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا، اس نے غراتے ہوئے کہا۔ ”میرے سامنے یہ نام مت لو۔“

راہبوں کے چاروں ساتھی جن میں قسائی بھی تھا عجیب ساخت کے چاقوؤں سے مسلح تھے۔ ان کا دستی حصہ صلیب سے مشابہ تھا۔ اچانک ان میں سے ایک ایلس کی طرف لپکا، اس نے ایلس کو چاقو مارنے کی کوشش کی لیکن ایلس نے اس کو نزدیک آنے کا موقع دیے بغیر اپنا ہاتھ گھمایا اور اس نے ہاتھوں میں موجود لمبے ناخنوں سے آدمی کا منہ نوچ لیا تھا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے گرا، اس کی کم سے کم ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی کیونکہ اس سے خون بہہ رہا تھا۔ ایلس نے غرا کر کہا۔ ”اب کوئی مجھے دوبارہ قید نہیں کر سکتا۔“

"میں خدا کے نام پر حکم دیتا ہوں اس عورت کے جسم سے چلے جاؤ۔"

"اسے پکڑلو۔" قسائی نے چیخ کر کہا۔

"نہیں۔" راہب چلایا لیکن اس سے پہلے ہی قسائی کے دونوں ساتھی حرکت میں آ گئے تھے۔ راہب انہیں ایلس کے پاس جانے سے روک رہا تھا جیسے ہی وہ اس کے پاس پہنچے ایلس نے پتا نہیں کیا، کیا کہ وہ اچھل کر دور جا پڑے تھے، ان میں سے ایک مر چکا تھا کیونکہ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا اور دوسرا بے ہوش تھا۔

"کوئی مجھ پر قابو نہیں پا سکتا۔" ایلس نے تن کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں سب سے طاقتور ہوں۔"

"غلط...... تم خدا سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتے۔" راہب نے بارعب لہجے میں کہا اور جیب سے ایک بوتل نکال کر ایلس پر پانی چھڑکا تو وہ یوں بلبلائی جیسے اس پر تیزاب پھینک دیا گیا ہو۔ راہب مسلسل مخصوص کلمات ادا کرتے ہوئے ایلس پر پانی پھینک رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ آگے بھی بڑھ رہا تھا۔ ایلس نے اپنی پشت اس کی طرف کر لی تھی اور اب نارمل آواز میں چلا رہی تھی۔ بے ساختہ میٹ نے کہا۔

"رک جاؤ، چھوڑ دو اسے۔"

راہب نے رک کر میٹ کی طرف دیکھا اس وقت وہ ایلس کے بالکل پاس تھا اور ایلس نے اچانک گھومتے ہوئے آتش دان کی لوہے کی سلاخ راہب کے سینے میں اتار دی اور پھر لات مار کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔ قسائی نے راہب کو سنبھالا جو آخری دموں پر لگ رہا تھا کیونکہ سلاخ دل والی جگہ لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ میٹ اور دوسرے پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ایلس جو چند لمحے پہلے قابل رحم انداز میں بلبلا رہی تھی اب پھر سینہ تانے کھڑی تھی۔ اس نے غرا کر کہا۔ "میں تم سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ گاؤں کے ایک ایک فرد کو مار ڈالوں گا تم سے اپنی صدیوں کی قید کا انتقام لوں گا۔"

قسائی نوجوان سرخ چہرے کے ساتھ اس کی بات سن رہا تھا، وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو ایلس اس کی طرف لپکی لیکن جیسے ہی وہ پاس آئی قسائی نے راہب کی بوتل سے پانی اس پر پھینکا۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہوئی تو قسائی نے اپنی پتلون کے ساتھ لٹکا تلوار نما چھرا نکال کر ایلس کے سینے میں اتار دیا۔ اس نے ایلس کو اتنی قوت سے زمین پر گرایا کہ چھرا فرش میں اتر گیا اور اب وہ پھنس گئی تھی۔ راہب کے دو ساتھی لپکے اور انہوں نے اپنے چاقو ایلس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں سیدھے کر کے ان میں اتار دیے۔ چاقو ہاتھ سے گزر کر فرش میں اتر گئے۔ یوں ایلس بالکل بے بس ہو گئی تھی۔ مگر اس حالت میں بھی وہ اس طرح مچل رہی تھی کہ صاف لگ رہا تھا کہ اگر قسائی اور راہبوں نے اپنا دباؤ ہٹا دیا تو وہ آزاد ہو جائے گی۔ قسائی نے چلا کر کہا۔

"خود کہاں ہے؟"

ایک راہب نے اپنے چوغے سے وہی فولادی خود نکالا جو رائنا کو بھی پہنایا گیا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ بیک وقت ایلس کے ہاتھ میں گڑا چاقو دبا کر یہ خود اسے نہیں پہنا سکتا تھا۔ لیکن اس نے کوشش ضرور کی۔ ایلس اپنا سر مسلسل دائیں بائیں کر رہی تھی، وہ راہب کو موقع نہیں دے رہی تھی کہ وہ اسے خود پہنائے۔ میٹ ایک طرف بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ایلس کے منہ سے خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ اچانک میٹ آگے آیا اور اس نے راہب سے خود لے کر اسے کھولا پھر اس نے زبردستی ایلس کا سر اٹھا کر خود کا ایک حصہ نیچے رکھا اور دوسرا حصہ اس کے منہ پر رکھنے ہی والا تھا کہ اچانک ایلس کا چہرہ نارمل اور پہلے کی طرح ہو گیا اس نے التجا کرتی آواز میں کہا۔ "پلیز، یہ مجھے مت پہناؤ۔"

میٹ رک گیا قسائی چلایا۔ "رکو مت، یہ دھوکا دے رہا ہے۔"

"پلیز۔" ایلس نے پھر التجا کی۔

"خدا کے نام پر کہو تو میں چھوڑ دیتا ہوں۔" میٹ نے جواب دیا تو لمحے کے اندر ایلس کا چہرہ بگڑ کر ویسا ہی ہو گیا تھا۔

"کبھی نہیں۔" وہ غرائی، اگلے ہی لمحے میٹ نے فولادی خود کا نچلا حصہ اس کے سر کے نیچے رکھا اور اس کی بھرپور مزاحمت کے باوجود دوسرا حصہ اس کے چہرے پر رکھ کر اسے فٹ کرنے لگا۔ راہب نے اسے اسکرو دیے اور ایک اسکرو ڈرائیور پکڑا دیا۔ میٹ اپنی کوشش میں کامیاب رہا اور اس نے ایلس کی نقاب سے جھانکتی انگارہ آنکھوں کو نظر انداز کر کے اسکرو کسنے کا کام جاری رکھا۔ جیسے جیسے اسکرو کس رہے تھے اس کی غراہٹیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی بجھ رہی تھیں۔ اس کا جسم پھڑک رہا تھا لیکن بالآخر وہ بھی ساکت ہو گیا۔

☆☆☆

قسائی کا نام رچرڈ تھا۔ وہ اور میٹ گھر سے باہر نکل آئے تھے۔ رچرڈ کے ساتھی اندر موجود لاشیں اٹھا رہے تھے اور ایلس کی لاش اسی مخصوص ساخت کے تابوت میں ڈال کر

سب سے پہلے معبد کی طرف لے جائی گئی تھی۔ میٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم لوگ کون ہو اور یہ سب کیا ہے؟“

”ہم خدا کے خادم ہیں۔“ رچرڈ نے جواب دیا۔ ”ہمیں ذمے داری سونپی گئی ہے کہ اس شیطان کو قید میں رکھیں۔ پہلے ہم انگلینڈ میں تھے لیکن جب وہاں شیطان کے پجاری طاقتور ہو گئے تو ہم اسے یہاں لے آئے۔“

”شیطان کے پجاری؟“ میٹ نے تعجب سے کہا۔

”ہاں، شیطان کے پجاری۔ میں نام نہیں لوں گا لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ سترھویں صدی میں کون سی خفیہ تحریک تھی جس نے انگلینڈ اور اس کے ساتھ پورے یورپ پر قبضہ کر لیا۔ وہ خود کو کچھ بھی کہیں لیکن اصل میں وہ شیطان کے پجاری ہیں اور یہاں شیطان کا اصل روپ تم خود دیکھ چکے ہو۔“

”پھر تم لوگ شیطان کے مجسمے کو لے کر یہاں چلے آئے؟“

”ہاں، ہم ایسی جگہ چاہتے تھے جہاں اس تحریک کی رسائی نہ ہو اس لیے ہم اس دور دراز خطے میں چلے آئے اور یہاں سب سے چھپ کر رہ رہے ہیں۔“

”چھپنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے، جب لوگوں کو پتا چلتا ہے کہ ارجنٹائن میں ایک انگریز نسل کے افراد پر مشتمل قصبہ ہے جہاں لوگ سترھویں صدی جیسی زندگی گزار رہے ہیں تو بہت سے تجسس کی وجہ سے چلے آتے ہیں۔ تم لوگ اب مقامی ماحول میں ڈھل جاؤ اور اپنی قدامت بھی چھوڑ دو۔ سچی بات ہے کہ تم لوگوں کے بارے میں کچھ ایسا تاثر ہے کہ تم شیطان کے پجاری ہو اور یہاں شیطان کا کوئی معبد ہے جہاں انسانوں کی قربانی دی جاتی ہے۔“

”اب اصل بات تم جان چکے ہو۔“ رچرڈ پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”میں بھی اسی بات کا قائل ہوں لیکن اصل فیصلہ ہمارے بڑوں کو کرنا ہے۔“

”وہ دھند کیسی ہے؟“

وہ دھند اس کا حصار ہے، یہ خود سے باہر نہیں نکل سکتا لیکن اگر کوئی انسان اس دھند میں داخل ہو جائے تو یہ اس کے جسم پر قبضہ کر لیتا ہے۔“

”اسی وجہ سے تم دھند میں داخل ہونے والے کسی انسان کو زندہ نہیں چھوڑتے ہو۔“

میٹ کے اس سوال کا رچرڈ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس لیے اس نے دوسرا سوال کیا۔ ”تم لوگ تابوت جمع کیوں کرتے ہو، دفناتے کیوں نہیں ہو؟“

”ہم اس وقت تک تابوت اس ہال میں رکھتے ہیں جب تک مرنے والے کا جسم بالکل خشک نہ ہو جائے۔ دفن کرنے کی صورت میں خطرہ ہوتا ہے کہ شیطان کسی طریقے سے اسے باہر نہ نکال لے۔ وہ مرنے والے کے جسم کو بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اس لیے جب تابوت میں پنجر رہ جاتا ہے تب ہم اسے جلا کر اس کی راکھ دفناتے ہیں۔“

”ان تین صدیوں میں کتنے لوگ مارے گئے ہیں؟“

”سچی بات ہے صحیح تعداد ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم ہے۔“ رچرڈ نے جواب دیا۔ ”لیکن شاید درجنوں ہوں گے۔“

میٹ نے جھرجھری لی۔ ”اتنے انسان... آسان کام نہیں ہے کہ شیطان کے اس مجسمے کو فنا کر دیا جائے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے وہ اسی مجسمے میں تو قید ہے۔ اگر مجسمہ تباہ کر دیا تو وہ آزاد ہو جائے گا۔“

میٹ کے لیے یہ سب ناقابلِ یقین تھا۔ اگر وہ خود اس تجربے سے نہ گزر چکا ہوتا تو کبھی ان باتوں پر یقین نہ کرتا۔ ”تم لوگ کب تک یہ کام کرتے رہو گے؟“

”جب تک ہم میں سے ایک فرد بھی زندہ ہے۔“ رچرڈ نے یقین سے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ میں تمہیں نزدیکی قصبے تک چھوڑ دوں گا جہاں تم پیدل جاؤ گے اور پولیس کو رپورٹ کراؤ گے کہ چند جرائم پیشہ نظر آنے والے افراد نے حملہ کر کے تمہاری عورتوں کو اغوا کر لیا ہے۔ تمہاری گاڑی ایک جگہ کھڑی کر دی ہے، میں تمہیں وہ جگہ بھی دکھاؤں گا۔“

رچرڈ نے اسے وہ جگہ دکھائی جہاں کرائے کی کار چھوڑ دی گئی تھی اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا خراب کر دیا گیا تھا۔ اسٹیج پوری طرح تیار تھا، اب میٹ کو باقی کام کرنا تھا۔ رچرڈ نے اسے قصبے سے کچھ دور اتارا۔ ”دوست، مجھے امید ہے تم وہی کہو گے جو طے ہو چکا ہے۔“

میٹ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم فکر مت کرو، اب یہ تمہارا نہیں میرا راز بھی ہے۔“

رچرڈ گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ میٹ نے گہری سانس لی۔ ایک لمحے کو اس کی نظروں میں رائنا اور ایلس کی صورتیں گھوم گئی تھیں۔ لیکن اس نے فوراً ہی انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے جو وعدہ کیا تھا اسے ہر صورت اسے نبھانا تھا۔ اس نے خود سے کہا۔ ”میٹ، اب یہ تمہارا بھی راز ہے۔ تمہیں اس کی حفاظت کرنی ہوگی۔“

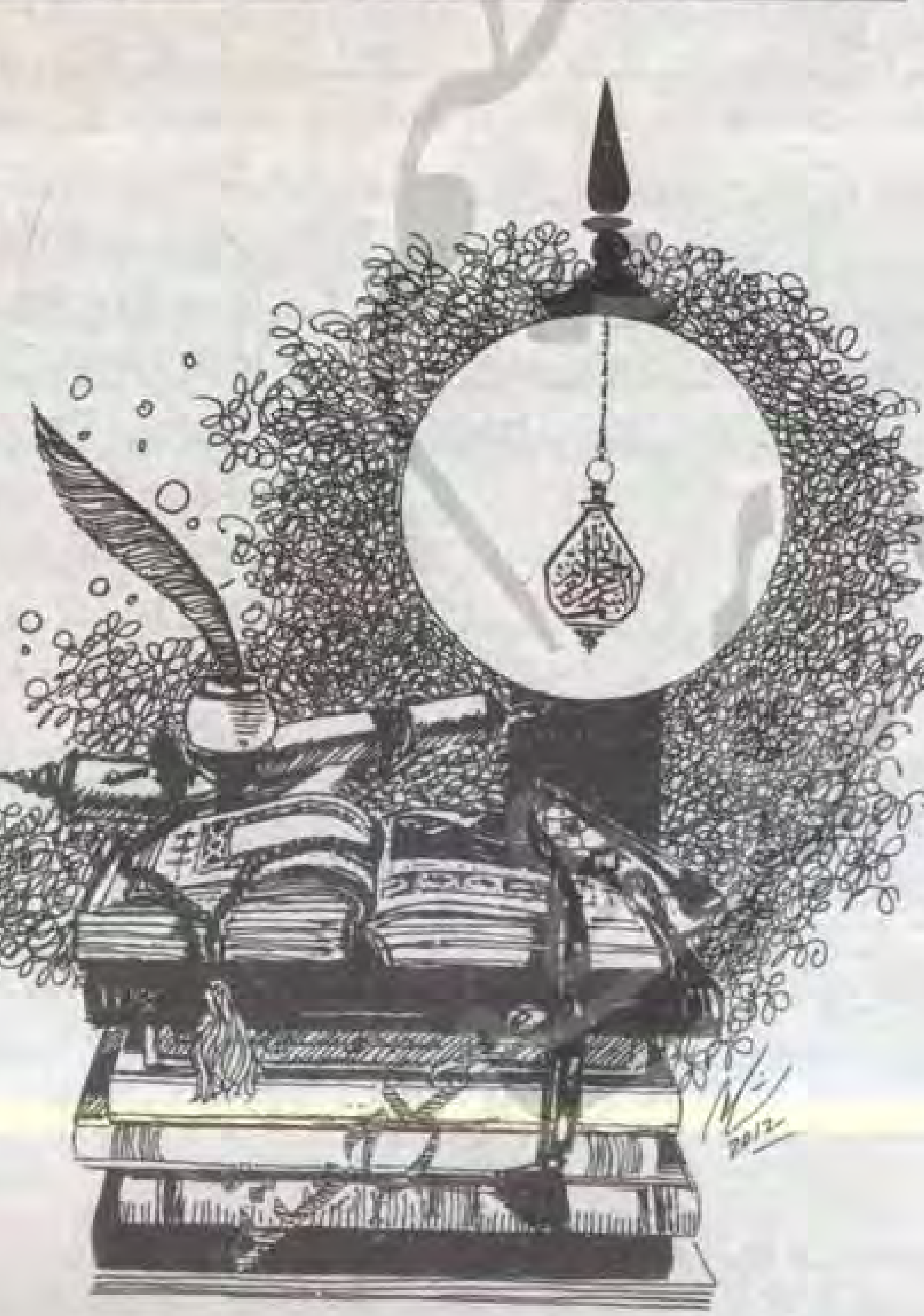
وہ تھکے قدموں سے قصبے کی طرف چل پڑا۔

شمعِ صوفیاں

ضیا تسنیم بلگرامی

رشد وہدایت کا سلسلہ کہنے میں جتنا آسان ... اتنا ہی اس کے میزان پر پورا اترنا مشکل... مگر اللہ جنہیں اس کام کے لیے منتخب کرتا ہے انہیں ویسا ہی حوصلہ اور عزم عطا کرتا ہے... ایسے رستے ان کے قدموں تلے بچھا دیتا ہے وہ ہر آزمائش پر پورا اترتے چلے جائیں... یوں وہ علم ومعرفت کہ ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہر امتحان ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

دشوار گزار راہوں پر استقامت کے پیکر...... ایک ولی کا قصہ



چشت کے سات سالہ بچے مودود کی ابھی عمر ہی کیا تھا۔ جب لوگوں نے یہ سنا کہ مودود نے قرآن پاک حفظ کر لیا ہے تو اکثر کو اس خبر کی صداقت پر یقین نہیں آیا۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سات سال کا بچہ قرآن پاک کے تیسوں پارے تجوید کے ساتھ حفظ کر لے۔ یہ لوگ اپنی اپنی چوپالوں میں دوست احباب کے ساتھ بیٹھ جاتے اور مودود کا ذکر لے بیٹھتے۔

بہار کا موسم تھا، موسلا دھار بارش نے ہر شے کو دھو ڈالا تھا، ہرے بھرے درخت کچھ زیادہ سرسبز دکھائی دینے لگے تھے۔ آس پاس کی پہاڑی چٹانیں اور راہوں میں پڑے ہوئے پتھر دھل دھلا کر نکھر گئے تھے۔ بارش کا پانی جب اوپر سے بہہ کر نیچے آیا تو اس نے دریا کی شکل... اختیار کرلی۔ اس کے بہاؤ میں اس بلا کی تندی اور سرکشی تھی کہ اس نے چشت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اِدھر کا آدمی اُدھر نہ جا سکتا تھا اور اُدھر کا آدمی اِدھر نہ آسکتا تھا۔ دونوں طرف سیکڑوں تماشائی پانی کی سرکشی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سامنے کی چوپال میں چند بے فکرے مودود کے حفظ قرآن پر بحث مباحثہ کر رہے تھے۔ ان میں ایک بڑے میاں بھی تھے۔ انہیں مودود کے کارنامے پر ذرا بھی تعجب نہیں تھا۔

وہ کہہ رہے تھے۔ ”آخر تم لوگوں کو اس پر تعجب کیوں ہے؟“

ایک نوجوان نے قہقہہ لگایا، کہنے لگا۔ ”اجی قبلہ! آپ کی کیا عمر ہوگی؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”میری عمر...... میری عمر یہی کوئی پینسٹھ، سرسٹھ رہی ہوگی۔“

نوجوان نے پوچھا۔ ”آپ قرآن پاک کو کتنے دنوں میں حفظ کر سکتے ہیں؟“

بڑے میاں چکرا گئے، گھبرا کے جواب دیا۔ ”اب میں اس لائق کہاں رہا کہ قرآن پاک کو حفظ کرلوں، مجھے تو لوگوں کے نام تک نہیں یاد رہتے۔“

چوپال میں موجود لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جب آپ اتنی پختہ عمر میں داخل ہو جانے کے بعد بھی حفظ قرآن کی ہمت نہیں رکھتے تب پھر اس سات سالہ بچے نے قرآن پاک کو اپنے سینے میں کس طرح محفوظ کرلیا؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”بھائی! تم لوگ میری بات سمجھتے کیوں نہیں، مودود کا خاندان ولیوں کا خاندان ہے۔ اس کا باپ ولی، دادا ولی، مودود سے جو کچھ بھی ظاہر ہو جائے کم ہے۔“

اتنے میں کسی کی سامنے نظر پڑی تو مودود کو گزرتے دیکھا۔ سب چوپال سے نکل کھڑے ہوئے اور مودود کو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ دوسری طرف تماشائی جو پانی کے بہاؤ سے لطف اندوز ہو رہے تھے آپس میں شرط لگا رہے تھے۔

کسی نے مودود سے پوچھا۔ ”کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے قرآن پاک حفظ کرلیا ہے؟“

مودود نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے قرآن حفظ کرلیا ہے۔“

اچانک مودود کے کان میں آواز آئی، کوئی تماشائی کہہ رہا تھا۔ ”اجی جناب! اس پانی کو کوئی بھی عبور نہیں کر سکتا۔ ایک تو اس کا چوڑا پاٹ، دوسرے اس کا پرزور بہاؤ۔ گھوڑے اور اونٹ تک اس کے زور کے آگے نہیں ٹھہر سکتے۔“

ایک گرانڈیل پانی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”اگر میں اسے عبور کرلوں تو؟“

کئی آدمی ایک ساتھ بولے۔ ”ہم سب تمہارے مرید ہو جائیں گے۔“

یہ دیو جیسا آدمی پانی میں داخل ہوا اور ابھی چند ہی قدم چلا ہوگا کہ پانی کے زور نے اسے لڑکھڑا دیا۔ وہ کئی بار آگے پیچھے ہلا اور آخر ڈر کے باہر نکل آیا، شرمندہ ہو کر بولا۔ ”میں نہیں جا سکتا اس پانی میں خطرناک بہاؤ ہے۔“

لوگوں کی اُمید کے خلاف سات سالہ بچہ آگے بڑھا اور تماشائیوں سے کہا۔ ”میں اس طرف چلا جاؤں گا۔“

تماشائیوں نے آنکھیں پھاڑ کے مودود کی طرف دیکھا اور بولے۔ ”صاحبزادے! تم اپنے گھر جاؤ۔ اگر بہہ گئے تو تمہارے بزرگ ہماری جان لے لیں گے۔“

مودود پانی کے کنارے پہنچ گئے۔ بولے۔ ”تم ڈرو مت۔ میں سامان اٹھائے بغیر اُدھر جا سکتا ہوں اور اسی طرح کسی نقصان کے بغیر واپس بھی آسکتا ہوں۔“

تماشائیوں میں سے ایک بزرگ بولے۔ ”مودود تم پانی میں مت جانا۔ مجھے معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔“

لیکن مودود نے ان کی پروا کیے بغیر کہا۔ ”بہرحال میں تم سب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ پانی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“ یہ کہتے ہوئے مودود پانی میں اتر گئے۔ بعض کا اس کا انجام سوچ کر چیخیں نکل گئیں۔ بعض مبہوت اور پریشان ہو کے، خوفناک انجام کو تصور میں دیکھنے لگے۔ ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ چند بزرگوں نے آگے بڑھ کر مودود کو پکڑ لینا چاہا لیکن وہ ہاتھ نہیں آئے۔ مودود تیزی سے پانی کے بہاؤ میں داخل ہو گئے اور دھارے کو کاٹ کر دوسری طرف بڑھنے لگے۔ تماشائی دیکھ رہے تھے کہ مودود بڑے اطمینان سے پانی پر یوں چل رہے تھے جس طرح ہوا میں بعض اوقات پرندے اپنے پروں کو سمیٹ کر تیرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ مودود پانی سے نہ نکل سکے تو ان کے والدین کو کیا

جواب دیا جائے گا لیکن تماشائیوں نے یہ حیرت انگیز تماشا بھی دیکھ لیا کہ مودود پانی کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر خشکی پر کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر لوگوں کو اشارے سے بتایا کہ میں پانی عبور کر چکا ہوں اور اسی راہ سے واپس بھی آرہا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد آپ پانی میں دوبارہ اتر پڑے اور جس طرح گئے تھے اسی طرح واپس بھی آنے لگے۔

یہ جیسے ہی پانی سے نکلے، لوگوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انہیں حیرت تھی کہ مودود کی کوئی چیز بھیگی نہیں تھی۔ چوپال میں لوگ بحث و مباحثے میں الجھے رہ گئے تھے۔ ان میں سے بڑے میاں نے اپنے ساتھیوں کو شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم لوگ کیا کہو گے؟ مودود کے قرآن پاک حفظ کرنے پر یقین نہ کرنے والو، بتاؤ تم اس حیرت انگیز واقعے پر تبصرہ کرو گے؟“

نوجوان نے جواب دیا۔ ”اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ ہم انسان کیا کہہ سکتے ہیں۔“ لوگوں نے مودود کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور اصرار کر رہے تھے کہ انہیں مرید کرلیا جائے۔

☆☆☆

اس واقعے کے دو سال بعد، چشت خشک سالی کا شکار ہو گیا۔ لوگوں پر غربت چھا گئی، اناج کی کمی اور گرانی نے لوگوں کا سامان بکوا ڈالا۔ بھوک نے غریبوں سے شرم و حیا چھین لی، گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگ کھانے کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ امرا کے دروں پر صدائیں لگتیں۔ جس کا اگر جواب ملتا تو نفی میں، ورنہ ایک چپ ہزار بلائیں ٹال دیتی۔

مودود اپنے مکتب سے نکلے تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان میں چند کہنے لگے۔ ”میاں صاحبزادے! دو سال پہلے تم نے لمبا چوڑا دریا اس طرح عبور کرلیا تھا کہ تمہارے جوتے اور کپڑے بالکل خشک رہے تھے۔“

نو سالہ مودود نے دریافت کیا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”ہم بھوکے ہیں، ہمیں کچھ کھلاؤ، اللہ کے برگزیدہ بندے۔“

مودود نے پوچھا۔ ”کیا کھاؤ گے؟“

لوگوں نے جواب دیا۔ ”جو کچھ تم کھلا دو گے، کھا لیں گے۔“

مودود نے اپنا ہاتھ آستین میں ڈال دیا اور لمحوں میں باہر نکال کر کچھ زمین پر پھینک دیا۔ چاروں طرف مٹھائیاں ہی مٹھائیاں بکھر گئیں۔ آپ نے لوگوں کو حکم دیا۔ ”تم لوگ کھڑے میری صورت کیا تک رہے ہو، مٹھائیاں اٹھا اٹھا کر کھانا شروع کر دو۔ یہ سب تمہارے لیے ہے۔“

لوگ بے تحاشا مٹھائیوں پر ٹوٹ پڑے اور چن چن کر کھانے لگے۔

مودود نے جب یہ دیکھا کہ ہجوم بڑھتا ہی جا رہا ہے اور لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر مٹھائی سمیٹنے میں مشغول ہیں تو آپ نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ اندر کی طرف ڈال کر باہر جو نکالا تو مٹھائی غائب ہو گئی۔ لوگوں سے کہا۔ ”میرے نادان دوستو!“ آپ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”کہیں میں دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں؟“

بہت سے آدمیوں نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر مودود کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔

یہ خبر مودود کے والد کو بھی پہنچ گئی۔ باپ نے بیٹے کو فوراً ہی بلوایا۔ جب یہ اپنے والد کے پاس پہنچے تو انہوں نے مودود کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ پہلے سوال کیا۔ ”مودود میں نے عوام الناس میں تیری کرامتوں کے بڑے چرچے سنے ہیں، کیا وہ صحیح ہیں؟“

مودود نے جواب دیا۔ ”جی ہاں وہ خبریں صحیح ہیں۔ کیوں، کوئی خاص بات؟“

باپ نے ناگواری سے کہا۔ ”مودود! تو ابھی بچہ ہے اور تجھے کچھ نہیں پتا کہ تجھے کیا کرنا چاہیے اور کن چیزوں کو طلب کرنا چاہیے اور کن سے پرہیز واجب ہے؟“

مودود انتہائی سعادت مندی سے باپ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور باپ کی نصیحتیں سننے لگے۔

باپ کی زبان تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”بیٹے مودود! کیا میں نے تمہیں یہ نہیں بتا دیا تھا کہ ہمارے خاندان میں کرامتوں کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا، ہمیں محنت مشقت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کرامتوں کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔ ضرور ہونا چاہیے لیکن برسرعام نہیں ہونا چاہیے۔“

مودود نے شرمسار لہجے میں کہا۔ ”آئندہ میں اس سے گریز کروں گا۔“

باپ نے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ تم کرامتیں نہ دکھاؤ بلکہ میں کثرت سے منع کرتا ہوں کیونکہ اگر تمہیں اس کا چسکا پڑ گیا تو پھر

دن رات اسی میں الجھے رہو گے اور میں قیامت کے دن شرمندگی اٹھاؤں گا۔"

مودود نے وعدہ کیا۔ "باواجان! میں وعدہ کرتا ہوں آیندہ اس کا خیال رکھوں گا۔"

کچھ عرصے بعد شکاریوں کی ایک جماعت کے ساتھ شکار کھیلنے تشریف لے گئے۔ راستے میں ایک سرائے ملی، مودود اپنی جماعت سے الگ ہوکر چپ چاپ سرائے کے اندر چلے گئے اور عبادت کرنے لگے۔ آپ کے ساتھیوں نے آپ کی کمی کو اس وقت محسوس نہ کیا اور شکار میں مشغول ہوگئے لیکن بھاگ دوڑ میں تھک گئے اور سب ایک جگہ جمع ہوئے تو اپنے درمیان مودود کو نہ پاکر بہت فکرمند ہوگئے۔ آرام کرنا بھول گئے، مودود کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ کافی دیر بعد یہ لوگ سرائے میں داخل ہوئے تو وہاں مودود کو اس حال میں دیکھا کہ یہ خود کو عبادت میں لگائے ہوئے تھے اور ان کے چاروں طرف سبز لباس میں ملبوس لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ یہ سبز پوش مختلف مصروفیتوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ تو زمین پر سر رکھے سجدے میں پڑے تھے اور کچھ اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔

شکاری ساتھیوں نے کہا۔ "حضرت! ہم سب تو آپ کو اپنی جماعت میں نہ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے اور آپ یہاں تشریف فرما ہیں، خوب۔"

مودود نے اشارے سے پوچھا۔ "کوئی خاص بات؟"

ایک شخص نے کہا۔ "ہم سب نے جو کچھ شکار میں حاصل کیا ہے آپ کو پیش کر دیتے ہیں، آپ جیسا حکم دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔"

آپ نے پوچھا۔ "کچھ زندہ جانور بھی ہیں؟"

لوگوں نے جواب دیا۔ "ہاں چند زندہ جانور بھی ہیں۔"

آپ نے کہا۔ "ان کا دودھ پیش کرو۔"

لوگوں نے کہا۔ "لیکن وہ دودھ دینے کے لائق نہیں ہیں۔"

آپ نے بااصرار کہا۔ "جیسا میں کہہ رہا ہوں کرو، وہ دودھ کیوں نہیں دیں گے؟"

لوگوں نے آپ کے حکم پر ان جانوروں کو دوہنا شروع کر دیا اور حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ جانور... دودھ دے رہے تھے۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور یہ سب بیعت کی خاطر آپ کے گرد جمع ہوگئے، بولے۔ "آج تو ہم مرید ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔"

آپ نے ان سب کو مرید کر لیا۔ بعد میں ان سبز پوشوں کی بابت پوچھا۔ "حضرت! یہ کون لوگ ہیں؟"

آپ نے مسکرا کر کہا۔ "تم لوگ انہیں نہیں پہچانتے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "اگر پہچانتے تو آپ سے سوال کیوں کرتے۔"

آپ نے کہا۔ "یہ اجنہ ہیں، جن۔ یہ سب مجھ سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔"

لیکن اس سوال کے جواب کے بعد جب ان لوگوں نے سبز پوشوں کو پھر دیکھنے کی کوشش کی تو وہ سارے ہی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

آپ نے پندرہ سال کی عمر میں منہاج العارفین نامی نادر روزگار کتاب تصنیف فرمائی۔

ابھی آپ چوبیسویں سال میں داخل ہی ہوئے تھے کہ والد کی حالت بگڑنے لگی۔ ان کی صحت جواب دیتی جارہی تھی۔ ایک دن انہوں نے مودود کو اپنے روبرو طلب کیا اور بولے۔ "مودود! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت میں نے تمہیں کیوں طلب کیا ہے؟"

آپ نے لاعلمی کا اظہار کیا، بولے۔ "حضور خود ہی ارشاد فرما دیں میں کیا عرض کروں۔"

باپ نے کراہتے ہوئے کہا۔ "بیٹے مودود! میری زندگی کا آفتاب غروب ہونے کو ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنا خرقہ، فقر و خلافت تمہارے حوالے کر دوں۔"

مودود نے پوچھا۔ "کیا آپ کو یہ یقین ہے کہ میں اس کا اہل ہوں؟"

باپ نے پیار بھری نظروں سے مودود کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ "اگر میں تمہیں اس کا اہل نہ سمجھتا تو یہ سب تمہیں ہرگز نہ دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ہم میں تم جیسا ایک بھی نہیں ہے اس لیے تم حیل و حجت مت کرو اور جو کچھ مجھ سے لینا ہے، لے لو۔"

مودود چپ ہوگئے۔ ان کے والد نے انہیں کمبل کا خرقہ پہنا دیا اور کہا۔ "بیٹے مودود! یہ خرقہ رسول اللہ اور حضرت علی مرتضیٰ کا ہے اور یہ اسی شخص کو زیب دیتا ہے جو صاحب ریاضت ہو۔"

اس کے بعد باپ نے انہیں وہ وظائف بتائے جو نسل در نسل چلے آرہے تھے۔ ان وظائف کے ورد نے مودود کی باطنی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا، جو اب تک نہ دیکھا تھا، وہ سامنے آگیا۔ جو آپ کی صحبت میں بیٹھتا وہ یکسر بدل جاتا۔

کچھ عرصے بعد باپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کا شہرہ پھیلنے لگا۔ ارادت مندوں میں اضافہ ہونے لگا۔ آپ کی خدمت میں حاضریاں دینے والے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ مودود سلام کرنے میں سب سے سبقت لے جایا کرتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے، اپنے پرائے، لونڈی غلام میں کوئی فرق نہ کیا جاتا۔ یہی حال تعظیم بجالانے کا تھا۔ آپ ہر ایک کی تعظیم میں کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

ایک دن چند مریدوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "حضرت! آپ کو جو مرتبہ ملا ہے اس سے ایک زمانہ واقف ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اپنی تعظیم کروانے کے بجائے، دوسروں کی تعظیم بجالاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ سلام کرنے میں بھی دوسروں کے مقابلے میں پہل کرتے ہیں اور یہ دو ایسے عمل ہیں کہ ان میں آپ کو پہل نہیں کرنا چاہیے۔"

آپ نے پوچھا۔ "میرے اس عمل میں برائی کیا ہے؟"

ایک مرید نے جواب دیا۔ "استغفراللہ، استغفراللہ۔ ہم ناچیز برائی کا تو اپنے دل میں خیال تک نہیں لاسکتے، ہاں یہ ضرور سوچتے ہیں کہ جب آپ آنے والے کے مرتبے اور مقام کی تخصیص کا خیال کیے بغیر تعظیم بجالاتے ہیں اور سلام میں پہل کر گزرتے ہیں تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ آنے والا غالباً مرتبہ و مقام میں آپ سے نمایاں ہے۔"

مودود مسکرانے لگے، فرمایا۔ "میرے سادہ لوح دوستو! ہماری حس اور ادراک کا ہر فیصلہ درست نہیں ہوتا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں کوئی بڑا انسان ہوں اور نہ ہی میں دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہوں۔ میں اپنے اعمال اور اشغال سے رسول ﷺ کی متابعت ضرور کرتا ہوں۔ ہمارے رسول ﷺ سلام کرنے میں ہمیشہ سبقت لے جایا کرتے تھے، وہی میں بھی کرتا ہوں اس کے علاوہ جب ہمارے رسول ﷺ شب معراج اللہ تعالیٰ کے قریب پہنچے تو خدائے عزوجل نے انہیں پہلے ہی سلام کر لیا تھا یعنی فرمایا تھا۔ السلام علیک ایہا النبی ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ تو کیا اس سے اللہ تعالیٰ کے مرتبے میں فرق آگیا؟ جب رسول ﷺ سلام میں پہل فرمایا کرتے تھے تو اس سے نعوذ باللہ، کیا خود رسول ﷺ کے مرتبے میں کوئی کمی آجایا کرتی تھی؟"

مریدوں کو سانپ سونگھ گیا۔ خاموش ہوگئے اور ان کے دلوں میں مودود کے لیے بے پایاں عقیدت اور محبت پیدا ہوگئی۔

☆☆☆

ایک دن مرید گھبرائے ہوئے آپ کے پاس آئے اور عرض کیا۔ "حضور والا! ایک خطرہ جام سے چل کر ہرات تک پہنچ چکا ہے اور وہ بہت جلد چشت میں داخل ہونے والا ہے۔ اگر آپ نے اس پر کوئی توجہ نہ فرمائی تو اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "کیسا خطرہ، کہاں کا خطرہ، جو کچھ تمہیں معلوم ہے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟"

ایک مرید نے عرض کیا۔ "حضور والا! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی سجادہ نشینی کی خبر سن کر شیخ الاسلام حضرت شیخ احمد جام زندہ فیل، جام سے چشت کے لیے چل چکے ہیں اور ان دنوں ہرات میں مقیم ہیں۔ ان کا ارادہ ہے کہ چشت میں داخل ہو کر آپ کو ولایت سے ہٹا دیں اور اس پر خود فائز ہو جائیں حالانکہ ایک دنیا جانتی ہے کہ جو ولایت آپ کو ملی ہے اس کے آپ نہ صرف مستحق تھے بلکہ یہ آپ کا موروثی حق بھی تھا۔"

مودود نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں، فرمایا۔ "تمہارے اندیشے غلط اور بے بنیاد ہیں، شیخ الاسلام میری تقویت کو آرہے ہیں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

یہ مرید اپنا سا منہ لے کر چلے گئے لیکن چند دنوں بعد پھر حاضر ہوئے اور پہلے سے زیادہ گھبرا کر عرض کیا۔ "حضور! شیخ الاسلام بالکل قریب آچکے ہیں۔ ان کے مقابلے کا انتظام کیجیے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ شیخ الاسلام ایک غنیم ہیں جو اپنے ارادت مندوں اور مریدوں کی فوج لیے آپ کے چشت اور ولایت پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے یہ وقت بھی خوش فہمی اور تساہل میں گزار دیا تو آپ کی ولایت کا اللہ مالک ہے۔"

آپ نے ان مریدوں کو حکم دیا۔ "شیخ الاسلام واقعی چشت کے قریب آچکے ہیں، ہم ان کے چشت میں داخلے سے پہلے ہی مل لینا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کریں گے کہ شیخ الاسلام چاہتے کیا ہیں؟"

چند مریدوں نے عرض کیا۔ ”حضرت کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے، بہتر یہی ہے کہ آپ ان کے مقابلے میں اپنے جاں نثار مریدوں کو روانہ فرما دیں اور اگر آپ واقعی وہاں جانا ہی چاہتے ہیں تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ آپ اپنے ساتھ مریدوں کی بڑی تعداد لے چلیں تاکہ اگر وہاں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو آپ اس کا مقابلہ بھی کر سکیں۔“

مودود نے اپنے چار ہزار مریدوں اور صوفیوں پر مشتمل جمعیت کو ساتھ لیا اور شیخ الاسلام کی پیشوائی کو چل پڑے۔ دوسری طرف یہی منافق شیخ الاسلام کی خدمت میں بھی پہنچ گئے اور ان سے کہا۔ ”حضور والا! کچھ پتا ہے کہ مودود آپ کی نسبت کیا گمان رکھتے ہیں؟“

شیخ الاسلام نے دریافت کیا۔ ”کیا گمان رکھتے ہیں؟“

منافقوں نے جواب دیا۔ ”وہ کہتے تو یہی ہیں کہ وہ اپنے مریدوں اور صوفیوں کے ساتھ آپ کے استقبال کو آرہے ہیں لیکن بات یہ نہیں ہے۔ ان کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔“

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ ”ان کے کیا ارادے ہیں؟“

منافقوں نے جواب دیا۔ ”جناب والا! مودود کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام آخر چاہتے کیا ہیں، کیا وہ میری ولایت پر قابض ہونا چاہتے ہیں؟ اگر ان کے یہ ارادے ہیں تو ان کا مقابلہ کیا جائے گا۔“

شیخ الاسلام نے انہیں جھڑک دیا بولے۔ ”ایسی کوئی بات نہیں، تم لوگ منافق ہو اور ہم دونوں کو آپس میں لڑا دینا چاہتے ہو۔“

منافقوں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ”ہمیں کیا ہے، ہم نے جو کچھ حضور کو بتایا ہے نیک نیتی سے بتایا ہے اگر حضور کی سمجھ میں ہماری بات نہیں آتی تو نہ آئے، ہم واپس جاتے ہیں۔“

یہی لوگ مودود کی خدمت میں پہنچ گئے، بولے۔ ”حضرت! ہم لوگ سیدھے شیخ الاسلام کے پاس سے چلے آرہے ہیں، ان کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے۔“

مودود نے دریافت کیا۔ ”ان کے کیا ارادے ہیں؟ اور تمہارے خیال میں وہ کیا چاہتے ہیں؟“

منافقوں نے جواب دیا۔ ”شیخ الاسلام خود تو نہیں ان کے بعض مرید یہ بتا رہے تھے کہ اب دیکھنا ہے خواجہ مودود کس طرح اپنی ولایت پر فائز رہتے ہیں۔ آخر وہ شیخ الاسلام شیخ احمد کے مقابلے میں ہیں کیا۔“

مودود نے انکساری سے جواب دیا۔ ”اگر شیخ الاسلام کا میری بابت واقعی یہ خیال ہے تو میں بھی یہی کہوں گا کہ میں ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔“

منافقوں نے کہا۔ ”حضرت! اس پسپائی سے کام نہیں چلے گا، آپ کو ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔“

مودود نے بیزاری سے کہا۔ ”تم لوگ چپ رہو، جیسا مناسب سمجھوں گا کروں گا۔“

دونوں بزرگ اپنے اپنے ساتھیوں اور مریدوں کے ساتھ ماران اور سافلان کے درمیان پہنچ گئے۔ یہاں ان دونوں کے درمیان دریائے ٹونک حائل تھا۔ یہ دونوں اپنے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ شیخ الاسلام نے بآواز بلند مودود کو مخاطب کیا۔ ”ابن ابو یوسف! ہم ایک طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک آگئے ہیں۔ اگر تم کہو تو میں دریا عبور کر کے تمہارے پاس آجاؤں یا تم خود آنا پسند کرو گے؟“

شیخ الاسلام کو منافقوں نے ورغلایا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ہماری بات سمجھتے کیوں نہیں، خواجہ مودود کے ساتھ چار ہزار آدمیوں کی موجودگی کیا خطرے کی علامت نہیں ہے؟“

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ ”تم لوگ بکواس بند کرو، ہمیں معلوم ہے کہ خواجہ مودود کیا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ چار ہزار مریدوں کی موجودگی کسی خطرے کا باعث نہیں بن سکتی۔“

دوسری طرف خواجہ مودود نے جواب دیا۔ ”حضرت آپ اتنی طویل مسافت طے کر کے اس ناچیز کی خاطر تشریف لے آئے ہیں اس لیے اب یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آپ کو مزید زحمت دی جائے۔“

ادھر بھی منافق موجود تھے، انہوں نے خواجہ مودود کو ورغلایا۔ ”حضرت آپ کیا غضب فرما رہے ہیں، ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھایئے گا۔ آپ شیخ الاسلام کو طلب فرمایئے خود ادھر ہرگز نہ جایئے ورنہ آپ سمجھ لیجیے کہ آپ کی ہر چیز خطرے میں ہے۔ ولایت، مرتبہ، اعزاز اور احترام، شیخ الاسلام آپ کا سب کچھ چھین لیں گے۔“

خواجہ مودود نے انہیں ڈانٹا، بولے۔ ”تم لوگ اپنی بکواس بند کرو، اللہ تعالیٰ انہیں سخت ناپسند کرتا ہے جو دو دلوں میں نفرت اور

نفاق کا بیج بوتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک وہ پسندیدہ ہیں جو دو دلوں میں محبت اور اتفاق پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔“

دوسری طرف شیخ الاسلام کی آواز آئی۔ ”تب پھر دیر مت کرو اور ہمارے پاس چلے آؤ۔“

خواجہ مودود نے جواب دیا۔ ”حضرت! ناچیز آرہا ہے۔ انتظار فرمائیں۔“ اس کے بعد آپ نے مریدوں سے کہا۔ ”میں شیخ الاسلام کے پاس جا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر خواجہ مودود پانی میں اتر گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا کے اس پار پہنچ گئے۔ شیخ الاسلام آپ کے استقبال کو آگے بڑھے۔ ان کے ساتھ ہی ان کے مرید بھی خواجہ مودود کے قریب پہنچ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ ضرور پیش آئے گا لیکن شیخ الاسلام نے اپنے مریدوں کو مخاطب کیا۔ ”تم لوگ خواجہ مودود سے دور رہو کیونکہ اب تک منافقوں نے جو کچھ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے وہ سب غلط ہے، خواجہ مودود کاملانِ روزگار میں سے ہیں۔“ خواجہ مودود نے فرطِ محبت میں شیخ الاسلام کو سینے سے لگا لیا۔

خواجہ مودود کے مرید دوسرے لوگ مختلف ذریعوں اور طریقوں سے دریا عبور کر رہے تھے۔ شیخ الاسلام نے مسکرا کر کہا۔ ”منافق کہتے تھے کہ تم ہم سے جنگ کرنے آرہے ہو اور مریدوں کی یہ کثیر تعداد تمہاری سپاہ ہے۔“

خواجہ مودود نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ”اور یہی منافق مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کر رہے تھے کہ آپ میری ولایت پر قبضہ کرنے کی غرض سے تشریف لا رہے ہیں۔“

دونوں بزرگ کچھ دیر منافقوں کی شرارت پر گفتگو کرتے رہے۔ آخر خواجہ مودود نے کہا۔ ”آپ ہمارے مہمان ہیں اس لیے غریب خانے پر تشریف لے چلیں۔“

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ ”ہم تو تم سے ملاقات کرنے آئے تھے سو ملاقات ہوگئی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ خواجہ مودود نے کہا۔ ”آپ اس ناچیز کے غریب خانے پر ضرور تشریف لے چلیں وہیں ہمارے خواجگان کی زیارت بھی کر لیجیے گا۔“

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ ”نہ بابا ہمارے آنے کا مقصد تم سے ملاقات کرنا تھا جو بہت اچھی طرح پورا ہو چکا ہے اب رہا تمہارے خواجگان کی زیارت کرنے کا مسئلہ تو وہ ہمیں یہیں سے حاصل ہو رہی ہے کیونکہ اولیا اللہ کی ارواح کا تصرف اور ان کی ولایت کا اثر ہر جگہ ہے میں جہاں سے چاہوں ان کی زیارت کر سکتا ہوں۔“

اس کے بعد شیخ الاسلام نے چشت کی طرف منہ کر کے فاتحہ پڑھی اور خواجہ مودود سے کہا۔ ”بابا مودود! تم میرے ساتھ چلو، ہم دونوں وہیں چل کر قیام کرتے ہیں۔“

خواجہ مودود نے کہا۔ ”کہاں؟“

شیخ الاسلام نے جواب دیا۔ ”جہاں ہم لے چلیں۔“

اس کے بعد یہ دونوں ایک طرف چل دیے۔ ان کے ساتھ ساتھ دونوں کے مرید اور ساتھی بھی چل رہے تھے۔ راستے میں شیخ الاسلام کے ایک معتقد خواجہ علی حکیم کا گھر پڑتا تھا۔ شیخ الاسلام ان کے گھر ٹھہر گئے۔ یہاں دونوں بزرگ سماع میں مشغول ہوگئے۔ اس چھوٹے سے گھر میں دونوں بزرگوں کے مرید تو نہیں ٹھہر سکتے تھے اس لیے شیخ الاسلام کے خادم نے حاضر ہو کر دریافت کیا۔ ”حضور والا! ہم پڑاؤ کہاں ڈالیں؟“

آپ نے معنی خیز جواب دیا۔ ”ابھی ٹھہرو، مہم درپیش ہے۔“ پھر رات ہوگئی اور دونوں بزرگ پھر سماع میں مشغول ہوگئے۔ رات کی تاریکی میں کئی سائے آہستہ آہستہ مجلس سماع کی طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیغ و خنجر تھے۔ انہوں نے اپنے چہروں کو رومالوں میں چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے مجلس میں گھستے ہی شیخ الاسلام پر اپنے ہتھیاروں سے حملہ کر دینا چاہا لیکن خواجہ مودود تڑپ کر ان کے درمیان آگئے اور غصے میں فرمایا۔ ”ناہنجار! یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا تمہیں شرم نہیں آتی؟“

حملہ آوروں نے خواجہ مودود کی طرف دیکھا تو ان کے ہوش ہی باقی نہ رہے اور وہ بے دم ہو کر ڈھیر ہوگئے۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی دونوں بزرگ پھر سماع میں مشغول ہوگئے اور یہ منافق یہیں بے ہوش پڑے رہے۔ مجلس سماع کے خاتمے پر شیخ الاسلام نے ان منافقوں کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔ ”مودود یہ کیا معاملہ ہے، یہ کون لوگ ہیں؟“

خواجہ مودود نے جواب دیا۔ ”حضرت! یہ وہی منافق ہیں جو ہم دونوں کو آپس میں لڑا دینا چاہتے تھے لیکن جب اپنے مقصد میں ناکام رہے تو دھوکے سے آپ کو قتل کروانے کا منصوبہ بنا ڈالا اور میں نے انہیں عین حملے کے دوران بے ہوش کر کے گرا دیا۔“

شیخ الاسلام نے رنج اور افسوس سے انہیں دیکھا اور فرمایا۔ "بابا مودود! ان لوگوں نے جو کچھ کیا، اس کی سزا بھگتی، اب انہیں معاف کردو۔"

خواجہ مودود نے جواب دیا۔ "بابا شیخ الاسلام! اب بدبختوں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ آپ کے خلاف تھا اس لیے میں معاف کرنے والا کون؟ جب تک آپ معاف نہیں کریں گے میں کس طرح معاف کرسکتا ہوں۔"

شیخ الاسلام نے ان کے چہروں کو دیکھا وہ سیاہ ہو رہے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ انہیں ان بدبختوں کے حال پر بڑا رحم آیا، بولے۔ "میں ان کا قصور معاف کرتا ہوں، اب تم بھی معاف کردو۔"

خواجہ مودود نے کہا۔ "جب آپ نے معاف کردیا تو میں بھی معاف کرتا ہوں۔"

ابھی یہ جملہ پوری طرح ادا بھی نہیں ہوا تھا کہ سارے منافق ہوش میں آگئے اور ان کے چہرے پہلے جیسے ہوگئے، ان کے منہ سے بہتے ہوئے جھاگ بند ہوگئے۔ منافق ہوش میں آتے ہی دونوں بزرگوں کے قدموں میں گر گئے اور دیر تک اپنی غلطیوں اور شرارتوں کی معافی مانگتے رہے۔

اس کے بعد شیخ الاسلام نے خواجہ مودود سے کہا۔ "بابا مودود! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، وہ یہ کہ علم کے بغیر درویشی بے معنی چیز ہے۔ تم علم معرفت میں جتنا کمال چاہو حاصل کرلو لیکن یاد رکھو کہ علم ظاہری کے بغیر کام نہیں چلتا۔ درویش کے لیے ضروری ہے کہ وہ ظاہری اور باطنی دونوں ہی علوم حاصل کرے اس سے درویش کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کا ظاہر اور باطن یکساں ہوجاتا ہے۔"

خواجہ مودود نے عقیدت مندی سے سر جھکا دیا اور عرض کیا۔ "حضور والا کی نصیحت میں نے گرہ سے باندھ لی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ میں کتنی جلدی علم ظاہر حاصل کرتا ہوں۔"

شیخ الاسلام جام واپس چلے گئے اور خواجہ مودود نے چشت کا رخ کیا۔

☆☆☆

آپ اسی سال بلخ روانہ ہوگئے۔ وہاں کے عوام و خواص نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور انہیں نہایت عزت و احترام سے شہر کے اندر لے گئے۔ شہر کے امرا، مشائخ اور اکابران کی خدمت گزاری میں لگ گئے۔ اس قدر و منزلت نے شہر کے علما میں حسد پیدا کردیا۔ انہوں نے شہر والوں کو ورغلانا شروع کردیا۔

چند عالموں نے خواجہ مودود کے عقیدت مندوں سے پوچھا۔ "آخر تم لوگوں نے اس شخص میں کیا خوبی دیکھی ہے جو دن رات اسی کے قصیدے پڑھتے رہتے ہو؟"

عقیدت مندوں نے جواب دیا۔ "ہمیں ان جیسی عظیم ہستی دوسری نظر نہیں آتی اور ان کی ذات میں کچھ ایسی دلکشی پائی جاتی ہے جس کا لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن اس کا اثر محسوس ضرور کیا جاسکتا ہے۔"

عالموں نے ہنس کر کہا۔ "تم لوگ بہت بھولے ہو ہم سیدھی سی بات یہ جانتے ہیں کہ یہ شخص بہت چالاک ہے اور تم جیسے بھولے بھالے لوگوں کو ورغلانے آگیا ہے۔"

لوگوں نے غصے میں کہا۔ "آپ لوگ حضرت خواجہ کی شان میں گستاخی نہ کریں ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔"

عالموں نے کہا۔ "اچھا ایک بات کا جواب دو۔"

لوگوں نے کہا۔ "پوچھو۔"

علما نے کہا۔ "کسی شخص کا جب تک امتحان نہ لیا جائے، اس وقت تک اسے کامل کس طرح سمجھ لیا جائے ہم چاہتے ہیں کہ اس شخص سے اس کے کمال کی نشانیاں کرامات کی شکل میں طلب کریں، اگر یہ شخص اس امتحان میں پورا اتر جائے تو خیر ورنہ اسے شہر بدر کروا دیا جائے۔" سادہ لوح عوام نے علما کے اس منصوبے کو مان لیا۔

جمعے کے دن بلخ کی جامع مسجد میں بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ ان میں خاص و عام شہریوں کے علاوہ تقریباً چار سو علما اور مفتیان بلخ بھی موجود تھے۔ خواجہ مودود بھی جمعے کی نماز پڑھنے تشریف لائے۔

جب آپ نماز پڑھ چکے تو مخالفین کی جماعت آپ کے آس پاس جمع ہوگئی اور مختلف علوم و فنون پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ آپ نے ان سوالوں کے تشفی بخش جوابات دیے۔ جب یہ لوگ عاجز آگئے تو آخر میں سوال کیا۔ "حضرت! بس ایک آخری سوال۔ آپ جانتے ہیں کہ سماع کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے اور ابھی ابھی سوال و جواب سے آپ کی علمی فضیلت اچھی طرح ثابت ہوچکی ہے پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسی عالم و فاضل شخصیت سماع جیسے غیر شرعی اور غیر اسلامی فعل کو کیوں پسند کرتی ہے اور اس

میں خود کو مشغول رکھتی ہے؟"

خواجہ مودود نے پوچھا۔ "ابراہیم بن ادھم سے تو تم لوگ خوب اچھی طرح واقف ہو؟"

ان لوگوں نے جواب دیا۔ "خوب اچھی طرح لیکن ان کا اس جگہ کیا ذکر ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ان کا میں ذکر کیوں کررہا ہوں، اس کا جواب بعد میں دوں گا پہلے تم مجھے یہ جواب دو کہ تم ابراہیم بن ادھم کو جانتے ہو یا نہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ابراہیم بن ادھم کو کون نہیں جانتا وہ بلخ کے حکمراں تھے اور انہوں نے درویشی کی خاطر تاج و تخت کو لات ماردی۔"

آپ نے کہا۔ "وہ بھی سماع سے بڑی رغبت رکھتے تھے اور پھر ہمارے وہ پیر، جن کا دور تک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے اور جو علوم ظاہری و باطنی میں عدیم المثال کمال رکھتے تھے اور جن سے خلاف شرع کوئی فعل سرزد نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے سماع کو بدعت یا حرام نہیں قرار دیا اور ہمیشہ اس کے پابند رہے۔ پھر ہم، جو انہی کے مرید اور عقیدت مند ہیں اور ان کی پیروی کو فرض سمجھتے ہیں کس طرح سماع سے باز آجائیں؟"

علما نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ "تمہارا ابراہیم بن ادھم سے کیا مقابلہ۔ وہ کاملین روزگار اور مجتہدین عصر میں سے تھے۔ کیا تم نے یہ سنا کہ جب وہ سماع سنتے تھے تو ان پر بعض اوقات ایسی کیفیت طاری ہوجایا کرتی تھی کہ وہ حالت وجد میں کئی کئی ہاتھ زمین کے سہارے کے بغیر ہوا میں معلق ہوجاتے تھے اور اسی معلق حالت میں وہ پرواز کرنے لگتے تھے۔ کیا ان کے بعد کسی نے بھی یہ کیفیت طاری کرکے دکھائی ہے؟ کیا تم جو ان کے اتباع کا دعویٰ کرتے ہو ایسا کرسکتے ہو؟"

خواجہ مودود نے انکساری سے جواب دیا۔ "میں ان کی متابعت کا دعویٰ تو خیر کیا کروں گا بلکہ یہ سمجھ لو کہ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں ابراہیم بن ادھم کا ادنیٰ سا عقیدت مند ہوں اور اسی عقیدت مندی نے مجھ میں وہ وصف پیدا کردیا ہے کہ میں انہی کی طرح ہوا میں معلق ہوکر پرواز کرنے لگوں۔"

اس کے بعد آپ اچانک زمین سے بلند ہوئے اور کسی سہارے کے بغیر ہوا میں رک گئے پھر ہوا میں ہی شمال سے جنوب میں پرواز کی، لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ دیر بعد آپ زمین پر واپس آگئے۔ لوگوں پر سکتے نے موت جیسی کیفیت طاری کردی تھی۔ اس مسجد میں تقریباً دس ہزار آدمی موجود تھے۔ یہ سارے ہی آپ کے مرید ہوگئے لیکن دس ہزار کے علاوہ چند ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یہ طے کرچکے تھے کہ خواجہ مودود کی بہرحال مخالفت کی جائے گی، وہ کیسا ہی کمال دیں، کیسی ہی کرامت پیش کردیں، وہ ان کی ہر حال میں مخالفت کریں گے۔

ان مخالفین میں سے چند نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ "اس قسم کے شعبدے تو کافر جوگی بھی دکھا دیا کرتے ہیں۔ ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ جو کچھ تم نے دکھایا وہ رحمانی ہے یا شیطانی؟"

ان لوگوں نے کہا۔ "ذرا ہمارے ساتھ مسجد کے باہر تک آؤ۔" آپ خاموشی سے ان کے ساتھ ہولیے۔ مسجد کے باہر ایک چٹان سی پڑی ہوئی تھی۔ آپ کے حاسد مخالفوں نے کہا۔ "جناب! یہ ایک پتھر ہے جسے پچاس ساٹھ آدمی مل کر بھی نہیں اٹھا سکتے اگر تم اسے اٹھا دو اور اس سے اپنی صداقت اور سچائی کی گواہی دلوا دو تو ہم سب تم پر ایمان لے آئیں گے۔"

آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھا کے عرض کیا۔ "الہ العالمین! یہ لوگ اسی طرح مجھ ناچیز سے کرامتیں مانگ رہے ہیں جس طرح تیرے نبیوں سے ان کی قومیں معجزات طلب کرتی ہیں، میری عزت و آبرو تیرے ہی ہاتھ ہے۔"

اس کے بعد آپ نے اس پتھر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ہلایا۔ جو نہیں ہلا پھر ہلایا، پھر نہیں ہلا۔ آخر آپ نے بسم اللہ کہہ کر اس پتھر کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ ان لوگوں کے منہ سے داد و تحسین کے کلمات نکل گئے۔ آپ اس پتھر سے ذرا دور جا کھڑے ہوئے اور اسے حکم دیا۔ "میں تجھ سے اپنی صداقت کی گواہی چاہتا ہوں۔"

پتھر اسی طرح لڑھکا جس طرح کوئی جاندار شے لڑھکا کرتی ہے۔ یہ لڑھک کر ان سب کے قریب پہنچا تو انہوں نے ادھر ادھر ہٹ کر اپنی جانیں بچائیں، آپ نے پوچھا۔ "تم لوگ بھاگ کیوں رہے ہو؟"

"واہ جناب واہ! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم سب اس کے نیچے دب کر اپنی جانیں دے دیں؟"

"نہیں، ہم یہ نہیں چاہتے لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ آپ لوگ بھی سیدھے سچے مسلمان بن جائیں۔"

لوگوں نے کہا۔ "ہم سب مطمئن اب بھی نہیں ہیں اور اس وقت تک ہم کس طرح مطمئن ہوسکتے ہیں جب تک کہ یہ پتھر

تمہاری گواہی نہ دے دے۔"

اس کے بعد آپ نے پتھر سے کہا۔ "اے پتھر! یہ لوگ میری بزرگی اور عظمت کا لوہا نہیں مانتے۔ تو ان پر آج کسی طرح بھی یہ ثابت کردے کہ میں شیطانی طاقت نہیں رکھتا۔"

پتھر ایک بار پھر ہوا میں معلق ہوا اور کسی انسانی آواز نے کہا۔ "تم لوگ خواجہ مودود سے کرامتیں چاہتے ہو؟ حالانکہ خواجہ مودود وہ ذات ہے جس کی بزرگی اور عظمت کے چرند، پرند گیت گاتے ہیں۔ لوگو! خواجہ مودود ولی اللہ ہیں اور ان کے قول و فعل میں شرعی مطابقت ہوتی ہے۔"

آپ کے حاسد اور مخالف خوف زدہ اور شرمندہ ہو کر قدموں میں گر گئے اور معافی کے طلب گار ہوئے۔ آپ نے انہیں معاف کردیا۔

اس کے بعد آپ نے بلخ کو چھوڑا اور بخارا روانہ ہوگئے۔ راستے میں پھر دریا ملا، ملاح کشتیوں کے ذریعے لوگوں کو پار اتار رہے تھے۔ خواجہ مودود کے ساتھ مریدوں اور صوفیوں کی کثرت تھی اس لیے ملاحوں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آپ دیر تک اس انتظار میں کھڑے رہے کہ ملاح ان پر توجہ دیں تو ان سے پار اترنے کی اجرت معلوم کی جائے لیکن ملاح دوسرے مسافروں میں الجھے رہے۔ آپ نے ایک ملاح سے کہا۔ "بابا! کچھ ہم پر بھی توجہ دو، ہم بھی اس پار جانا چاہتے ہیں۔"

ملاح نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "یہاں تو سبھی اس پار جانے کے لیے جمع ہوئے ہیں، خاموش کھڑے رہو ہم خود تمہیں بلالیں گے فکر مت کرو۔"

آپ کو ملاح کی بات بری لگی۔ آپ نے اپنے مریدوں اور صوفیوں کو مخاطب کیا۔ "دوستو! ہم کشتیوں کا کہاں تک انتظار کریں گے۔ اللہ کا نام لے کر ہم اپنا گھوڑا دریا میں ڈالتے ہیں تم بھی ہماری پیروی کرو اور ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ، اللہ نے چاہا تو ہمارے جانور ہی کشتی کا کام کریں گے اور ہم خیریت کے ساتھ اس پار پہنچ جائیں گے۔"

ملاحوں نے ان کی یہ بات سنی تو ہنسنے لگے۔ ایک نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرکے کہا۔ "بھائیو! سنا کچھ۔ یہ صاحب اپنے جانوروں کو کشتی بنانے کا حکم دے رہے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ دریا کا دھارا کتنے زوروں پر ہے۔ یہ حضرت خود بھی ڈوبیں گے اور اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی غرق کروا دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا، اس کے ساتھ ہی دوسرے ملاح اور مسافر بھی ہنس دیے۔

آپ نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا، آپ کے پیچھے پیچھے مریدوں اور صوفیوں نے بھی اپنے گھوڑے پانی میں اتار دیے۔ گھوڑے پانی میں کچھ اس طرح تیر رہے تھے گویا ان کے پیروں میں چپو باندھ دیے گئے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سب دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ کسی ایک کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ تھوڑی دیر پہلے جو ملاح ان کی ہنسی اڑا رہے تھے اب وہ حیرت زدہ اور شرمندہ ہو کر خود کو اس قابل نہ سمجھ رہے تھے کہ آپ کے پاس جا کر معافی مانگتے اور اپنی شرمندگی کا اظہار کرتے۔ جس ملاح نے آپ کی ہنسی اڑائی تھی اور قہقہہ مار کر ہنس دیا تھا۔ کشتی کو کھیتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچا اور کشتی سے پھاند کر ساحل پر اترا اور آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ آپ کی رحم دلی یہاں بھی عود آئی اور آپ نے اسے معاف کردیا۔

☆☆☆

آپ نے بخارا شیخ الشائخ نجم الدین عمر سے فقہ کی تکمیل کی۔ ان کے ہم سبق شاگردوں میں ایک شخص انسانوں سے مختلف تھا۔ آپ کی اس سے گہری دوستی ہوگئی۔ اس گہری دوستی کے باوجود آپ نے یہ محسوس کیا کہ وہ آپ کو اپنا گھر نہیں دکھانا چاہتا۔

ایک دن آپ خود ہی اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ جگہ بخارا کے نواح میں تھی اور دور تک کھنڈرات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آپ نے ان کھنڈرات میں داخل ہو کر اپنے ہم سبق کو آواز دی تو ایک بل سے ایک خوب صورت سانپ نکلا اور لوٹ پوٹ کر انسانی روپ میں تبدیل ہوگیا۔ آپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تمہیں بہت پہلے پہچان لیا تھا لیکن تم اپنے دوست سے بھی پردہ رکھنا چاہتے تھے اور یہ بات دوستی کے منافی ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں بھی اس بات سے واقف تھا کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے اس لیے خاموش رہا ورنہ کب کا بتا چکا ہوتا۔"

آپ نے پوچھا۔ "تم جنوں کے بادشاہ ہو نا؟"

اس نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

آپ نے فرمایا۔ "دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے دوست سے کچھ چھپایا نہ جائے۔ ہم جو کچھ ہیں، ہم جانتے ہو اور تم جو کچھ ہو ہمیں معلوم ہو چکا ہے اب اس شناسائی کا ہمیشہ اظہار کس طرح ہوتا رہے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اپنی قوم کے لوگوں کو یہ حکم دیے دیتا ہوں کہ وہ کبھی بھی آپ کی نسل کے کسی شخص کو نہ ستائیں اور آپ بھی مطمئن ہو جائیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اس وقت تک عمل ہوتا رہے گا جب تک اس زمین پر ہم دونوں کی نسلیں موجود ہیں۔"

بخارا میں بھی آپ کا بہتوں سے مباحثہ ہوا اور آپ نے اپنے ہر مقابل مخالف کو پُرزور دلائل اور براہین سے لاجواب اور خاموش کردیا۔

آپ تحصیلِ علوم کے بعد اپنے وطن چشت واپس آگئے اور لوگوں کو رشد و ہدایت فرمانے لگے۔ آپ کی مجلسوں میں لوگوں کا ہجوم رہتا اور وہ اس طرح خاموشی سے آپ کے مواعظ سنتے کہ گمان گزرتا، گویا وہاں خواجہ مودود کے علاوہ کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ ایک دن اس مجلس میں ایک اجنبی نوجوان داخل ہوا۔ اس نے درویشی کا خرقہ پہن رکھا تھا اور سجادہ بغل میں تھا۔ وہ آتے ہی ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ دورانِ وعظ آپ کی نظر اس نوجوان پر پڑ گئی۔ آپ نے وعظ بند کیا اور فرمایا۔ "تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟"

یہ نوجوان اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے قریب چلا گیا، بولا۔ "بہت دنوں سے ایک سوال میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے۔ کیا آپ اس کا جواب عنایت فرمائیں گے؟"

آپ نے کہا۔ "پوچھو، کیا سوال ہے؟"

نوجوان نے کہا۔ "رسول مقبول ﷺ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟"

آپ نے نوجوان کے سراپا کا جائزہ لیا اور جواب دیا۔ "نوجوان! اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنا زنار توڑ دو اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آؤ، مومن بن جاؤ۔"

نوجوان نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ نعوذ باللہ زنار اور میرے پاس، آپ مجھے اتنے بہت سارے حاضرین میں ذلیل و رسوا کیوں کر رہے ہیں؟"

آپ نے ایک خادم کو اشارہ کیا۔ "تم ادھر آؤ میرے قریب۔"

یہ خادم آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے حکم دیا۔ "اس نوجوان کا خرقہ اتار دو۔"

خادم نے حکم کی تکمیل کی اور نوجوان کا خرقہ اتار دیا۔ خرقے کے دور ہوتے ہی اندر سے زنار نکل آیا۔ نوجوان شرم سے پانی پانی ہوگیا اور زار و قطار رونے لگا۔

آپ نے فرمایا۔ "روتے کیوں ہو؟ زنار توڑ دو اور مسلمان ہو جاؤ۔"

نوجوان نے اسی وقت زنار توڑ دیا اور آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ وہ اسی وقت مسلمان ہوگیا اور خجالت سے کہا۔ "آج میں مومن کی فراست کا قائل ہوگیا۔ اس حدیث کی اس سے بہتر تشریح اور توضیح نہیں ہو سکتی۔"

☆☆☆

آپ کو سماع کا اتنا شوق تھا کہ اس کا بڑا اہتمام فرماتے اور اس محفل سماع میں اس وقت کے بڑے بڑے لوگ شریک ہوتے، طرح طرح کے کھانے پکے اور آنے والوں کو کھلائے جاتے۔ مجلس سماع کا آغاز اور اختتام تلاوت کلام پاک سے ہوتا۔ سماع کے دوران خواجہ مودود کی عجیب حالت ہو جاتی کبھی یہ روتے روتے بے حال ہو جاتے، کبھی متبسم ہو جاتے اور کبھی آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ کبھی کیف و مستی کی یہ حالت ہو جاتی کہ منہ سے کف جاری ہو جاتا۔

ایک بار اسی طرح محفل سماع گرم تھی کہ حاضرین محفل نے دیکھا کہ خواجہ مودود ان کی نظروں سے ایک دم اوجھل ہو گئے۔ آپ کافی دیر تک محفل سے غائب رہے اور پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ جس جگہ سے غائب ہوئے تھے آہستہ آہستہ بتدریج اسی جگہ پر دوبارہ نمودار ہو گئے۔

ایک معتقد سماع کے اختتام پر آپ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "حضرت! یہ سماع کے دوران آپ غائب کہاں ہو گئے تھے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "عزیز من! تمہیں یہ راز نہیں معلوم کہ صاحب سماع محبو کا نورانی لباس زیب تن کر لیتا ہے اور سب سے بیگانہ ہو کر محبوب کے ساتھ یگانہ ہو جاتا ہے۔ محبوب حقیقی اسے اپنا لباس پہنا کر اپنے ہی جیسا بنا لیتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ وہ تم لوگوں کو کس طرح نظر آسکتا ہے؟"

معتقد نے پوچھا۔ ”آخر ہم سب بھی تو محفل سماع میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تم لوگ سماع میں موجود تو ضرور ہوتے ہو لیکن سماع کی لذت اور اس کے معنی سے نا آشنا اور ناواقف ہونے کی وجہ سے تم اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے اور نہ تم پر وہ کیفیت طاری ہوسکتی ہے جس کا میں نے ذکر کیا۔“

معتقد نے سوال کیا۔ ”اچھا پھر ہمیں سماع کی بابت تفصیل سے کچھ بتایئے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”افسوس کہ ہم سماع کی بابت تفصیل سے کچھ بھی نہیں بتاسکتے کیونکہ ہم اس کا شمہ بھر حال بھی بیان کردیں تو لوگ ہمیں دار پر کھینچ دیں گے اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں اور پیروں نے سماع کے راز کو پوشیدہ رکھا ہے۔ ان حالات میں ہم اس راز کو کس طرح کھول سکتے ہیں۔“

آپ ستانوے سال کے ہوچکے تھے۔ آپ کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اس علالت کے دوران آپ کی یہ حالت ہوگئی کہ آپ بار بار دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایسا لگتا جیسے آپ کو کسی کا انتظار ہے۔ اس وقت شیخ ابی احمد آپ کے قریب ہی موجود تھے اور آپ اپنی اولاد میں انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ شیخ ابی احمد نے اپنے والد کی بے چینی محسوس کرلی، دریافت کیا۔ ”بابا جان! خیرت تو ہے، آپ کو کس کا انتظار ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! ہم جس شخص کے منتظر ہیں تم اسے، بہت جلد اس حجرے میں دیکھ لوگے۔“

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سفید لباس میں ملبوس ایک بزرگ حجرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے حجرے میں داخل ہوتے ہی خواجہ مودود کو سلام کیا اور سامنے ہی کھڑے ہوگئے۔

شیخ ابی احمد نے ان بزرگ سے دریافت کیا۔ ”جناب کہاں سے تشریف لائے ہیں اور وجہ تشریف آوری کیا ہے بیان فرمائیں تاکہ اس پر عمل کیا جائے یا اسے پورا کیا جائے۔“ ان بزرگ نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ برابر خواجہ مودود کو دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد بزرگ خواجہ مودود کی طرف بڑھے اور اپنی بغل سے ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال کر ان کی آنکھوں کے سامنے کردیا۔ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ خواجہ مودود نے اسے پڑھا اور پڑھ کر آنکھوں سے لگالیا۔ ابی احمد آگے بڑھے کہ دیکھیں اس پر کیا لکھا ہے لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بزرگ اب وہاں موجود نہیں تھے اور والد کے ہاتھ والا ریشمی کپڑے کا ٹکڑا بھی موجود نہیں تھا، خواجہ مودود آنکھیں بند کیے یوں پڑے تھے گویا گہری نیند سو رہے ہوں۔ شیخ ابی احمد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، انہوں نے والد کو آواز دی۔ ”بابا جان! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

لیکن بابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت وہ اپنے مالک حقیقی سے مل چکے تھے۔ شیخ ابی احمد کی دونوں آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لوگ جمع ہونے لگے۔

ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں آپ کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ کے لیے آپ کی نعش مبارک باہر لائی گئی۔ ابھی نماز جنازہ پڑھی بھی نہ گئی تھی کہ ایک خوف ناک آواز نے لوگوں کو خوف زدہ کردیا اور وہ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ ان کے ہٹتے ہی، خواجہ مودود کے ہم سبق جنوں کے بادشاہ نے اپنی قوم کے ساتھ نماز جنازہ پڑھائی۔ جب یہ نماز پڑھ چکے تب عوام نے نماز جنازہ پڑھی۔ عوام کے بعد اکابر علما، مشائخ، صوفیا اور مریدوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے جنازہ اٹھانا چاہا تو ایک بار پھر ہیبت ناک آواز سنائی دی لوگ خوف زدہ ہو کر پھر ہٹ گئے۔ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے ہی جنازہ خود بخود ہوا میں اٹھ گیا اور قبر کے اوپر پہنچ کر رک گیا اور لوگوں نے آپ کو سپرد خاک کیا۔

آپ کی تاریخ وصال، آں حجت الاولیا بودہ، سے نکلتی ہے۔

آپ کے خلفا اور مریدوں کی تعداد بے شمار تھی۔ آپ کو تاریخ تصوف میں شرف الاسلام والمسلمین، شمع صوفیاں اور چراغ چشتیاں کہا گیا ہے۔

آج آپ کو گزرے ہوئے تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال ہوچکے ہیں لیکن آپ کا نام آج بھی اسی طرح روشن اور زندہ ہے جس طرح آپ کی موجودگی میں تھا اور 235ھ میں پیدا ہونے والا یہ نامور صوفی 527ھ میں جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے پیچھے اپنے عقیدت مندوں اور نسبت رکھنے والوں کو اتنی بڑی تعداد چھوڑ گیا کہ آج بھی ہمیں یہ نام اور اس کا فیضان دور دور پھیلا دکھائی دے رہا ہے۔

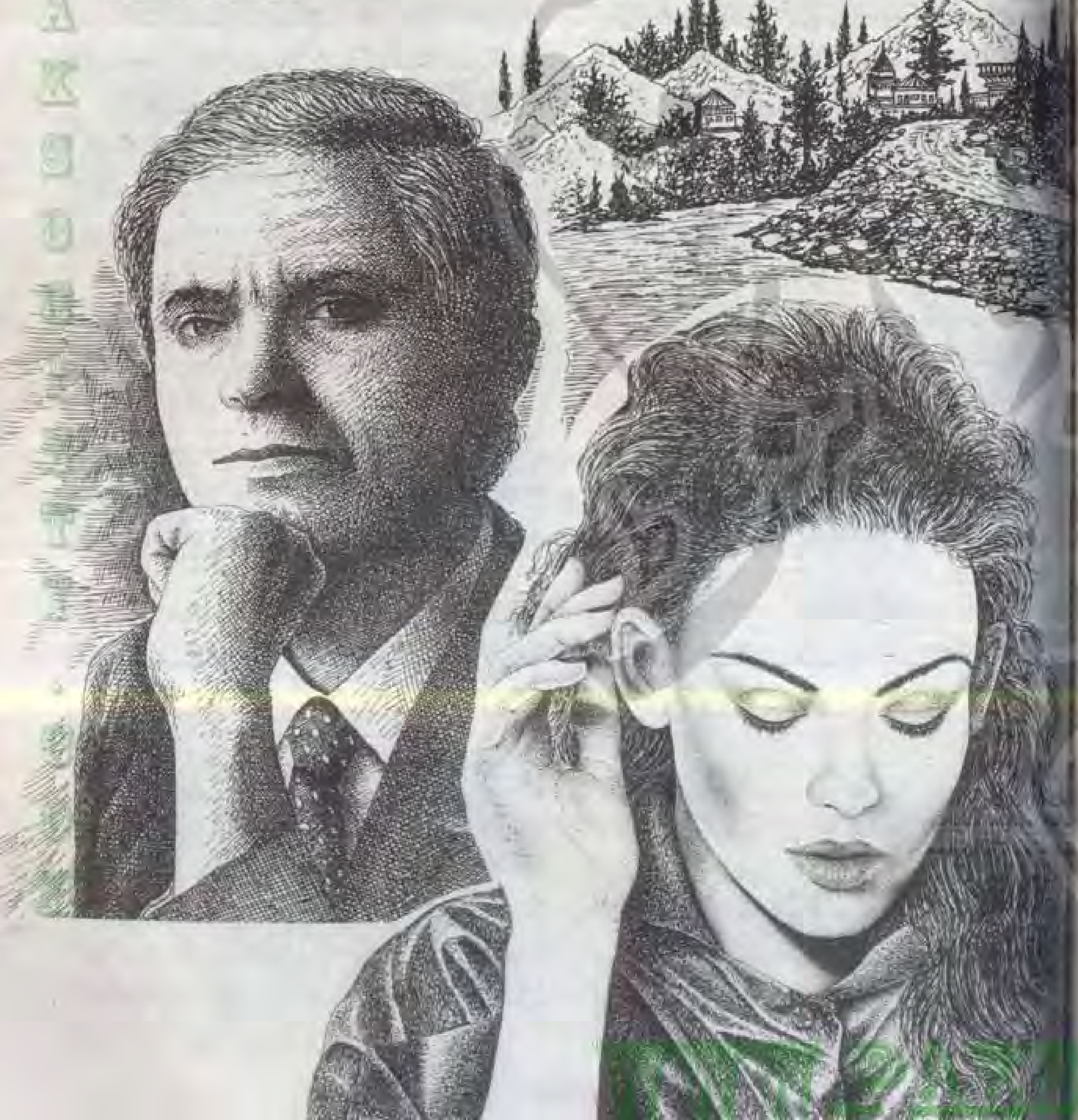
ماخذات: تذکرۂ خواجگان چشت، ابن شیخ عبدالرحیم۔ خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ سکینۃ الاولیا، دارا شکوہ۔ اخبار الاخیار، عبدالحق محدث دہلوی۔ اخبار الصالحین، نواب معشوق جنگ بہادر۔ انوار اصفیا، شیخ غلام علی اینڈ سنز

ایک دوشیزہ کی معصومیت اور جان لیوا فراست کا ماجرا

کبھی کبھی انسان حماقت میں بھی بڑے بڑے دانشمندانہ فیصلے کرڈالتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی لمحے کی قید میں کچھ ایسا ہی قدم اٹھا بیٹھی تھی مگر اسے خبر نہ تھی کہ وہ کسی کی جان اور ارمان سے کھیل گئی ہے۔

دانش مند

صفدر صدیقی



اس کی عمر تینتیس سال تھی۔ دبلا پتلا مگر موزوں و متناسب جسم، سیاہ بال بحیثیت مجموعی اسے بدصورت نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس قسم کی عورتوں میں شامل تھی جن کی طرف مرد کم ہی متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اس چھوٹے سے تنگ کمرے کے دروازے پر جسے میں اپنا آفس کہا کرتا تھا ہچکچائی۔ اس کی آنکھیں میرا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

”مسٹر میلیک؟“ آخر اس نے پوچھا۔

"میں ہی ہوں۔" میں نے کرسی سے قدرے اٹھتے ہوئے جواب دیا اور دیکھا کہ اس کے بائیں ہاتھ میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی۔

"بیٹھ جاؤ مس......" میں نے میز کی دوسری جانب پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کرسٹی...... ایلس کرسٹی!" اس نے بتایا اور یہ جواب گویا مزید اس بات کی تصدیق تھی کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس انداز میں کہ کمر بالکل سیدھی تھی اور دونوں پیر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اس نے بہت سادہ سا نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا ایک ہینڈ بیگ بھی تھا جو کافی پرانا معلوم ہوتا تھا۔ میں اسے اطمینان دلانے کے لیے مسکرانے لگا۔

"میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں مس کرسٹی؟" میں نے سوال کیا اس کے انداز میں ابھی تک تذبذب تھا۔

"میں نے تمہارا اشتہار ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھا تھا۔" ایلس نے کہا۔ "تم لوگوں کے بارے میں تحقیقات کرتے ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہاری فیس کیا ہے؟"

"ایک سو ڈالر یومیہ اور اخراجات علیحدہ۔" یہ میرا عام معاوضہ تھا اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اسے اس سے کچھ کم بتاتا لیکن میں نے افسوس کیا کہ یہ معاوضہ شاید میری نوارد موکلہ کے لیے زیادہ ہو پھر اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی جو میری دلچسپی کو ابھار رہی تھی اس لیے میں نے جواب دیا۔

"اس کا انحصار مختلف باتوں پر ہوتا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس سلسلے میں آئی ہو؟" وہ نظریں بچا کر میز کے ایک کونے کو گھورنے لگی۔

"میں...... میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کن الفاظ میں بتاؤں۔"

"الفاظ کی فکر مت کرو مس کرسٹی! بس بالکل ابتدا سے کہنا شروع کردو۔" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر رک گئی اور اپنا ہینڈ بیگ کھول کر ایک تہ کیا ہوا اخبار نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک چار صفحات کا اخبار تھا جس میں مردوں اور عورتوں کی تصویروں کے ساتھ ذاتی حالات و کوائف بھی دیے گئے تھے۔ خط کتابت کے لیے بکس نمبر بھی تحریر تھا۔ اخبار کا نام "کیوپڈ کیورپر"

"تم ایسے افراد کے بارے میں کیا خیال کرو گے جو ...... اس جیسے اخبار کے خریدار ہیں؟" ایلس کرسٹی نے پوچھا۔

اس طرح کے تنہا لوگوں کو کیا کہا جاسکتا ہے۔ اعصابی مریض؟ سنسنی خیزی کے متلاشی؟ موقع پرست یا ایسی کوئی بھی دوسری اصطلاح لیکن ان میں سے کوئی بھی اصطلاح مجھے اس خاتون پر فٹ ہوتی محسوس نہیں ہورہی تھی۔

"میں نے کبھی اس معاملے پر غور نہیں کیا۔" میں نے براہِ راست جواب سے بچنے کے لیے کہا۔

"لیکن میں نے غور کیا ہے۔" ایلس بولی۔ "اور مجھے معلوم ہے کہ عام لوگ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں اور ممکن ہے ان کا خیال ٹھیک ہی ہو لیکن......" وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہوگئی۔ اب اس کی نظریں اپنے ہینڈ بیگ پر جمی ہوئی تھیں۔ "مسٹر میلیک!" وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔

"میری عمر اس وقت تینتیس سال ہے۔ جس سال میں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اسی سال میرے والد کار کے حادثے میں انتقال کرگئے۔ اسی حادثے میں میری ماں اپاہج ہوکر پہیوں والی کرسی پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی اور پھر اس وقت سے لے کر تقریباً پندرہ سال تک میں اپنی ماں کی کفالت کا واحد ذریعہ بنی رہی۔ میں مستقل ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرتی رہی۔ میں نے ...... میں نے اپنی زندگی ان کے لیے تج دی۔ یہ میں شکایت نہیں کررہی ہوں، میں نے اپنا فرض سمجھ کر ان کی خدمت کی تھی لیکن اس مجبوری کی وجہ سے میری اپنی سوشل زندگی نہیں بن سکی۔ میرا حلقۂ تعارف چند دوستوں تک محدود رہا۔ جب بھی کوئی فیصلہ کن وقت آیا تو میں نے اپنی ماں کی خدمت کو ترجیح دی اور پھر آٹھ ماہ گزرے کہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔"

میں اب کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا کہ ایلس میری خدمات کس سلسلے میں حاصل کرنے آئی تھی۔

"اور تب پھر اس کلب کی معرفت تمہاری ملاقات یا یوں کہنا چاہیے کہ خط کتابت ایک آدمی کے ساتھ ہوئی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" ایلس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک کیفے ٹیریا میں کسی شخص نے اس اخبار کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا تھا۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ اس میں دوسرے افراد کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شریف آدمی کا فوٹو اور اس کے کوائف بھی دیے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ دلچسپی محسوس ہوئی۔ میں کلب کی ممبر بن گئی اور پھر ہمارے درمیان خط کتابت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اس کا نام ہومر ایکومین ہے۔ کینساس میں ایک فارم

کا مالک ہے۔ اس کی بیوی کا انتقال ہوچکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں کینساس چلی آؤں اور اس سے شادی کرلوں۔ پرسوں رات اس نے پھر مجھے فون کیا تھا اور ایک مرتبہ پھر مجھ سے اپنی بات ماننے پر اصرار کرتا رہا۔"

اب صورتِ حال واضح ہوچکی تھی۔ ایلس مرد کی محبت کی بھوکی تھی اور اس خلا کو پُر کرنا چاہتی تھی جو اب تک اس کی زندگی میں موجود تھا لیکن فطری شرم اور حالات کی وجہ سے ایسے معاملات میں اس کی ناتجربہ کاری دامن گیر تھی اور یہی موقع تھا جب اسے میری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"لیکن تم کوئی فیصلہ نہیں کرپارہی ہو۔" میں نے کہا۔ "اور چاہتی ہو کہ اپنی رضامندی کا اظہار کرنے سے پہلے اس شخص کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرو اور اسی لیے میرے پاس آئی ہو کہ میں اس کے متعلق تحقیقات کرکے اپنے تاثرات پیش کروں۔"

"ہاں لیکن شاید تم مجھے بے وقوف خیال کررہے ہوگے۔" چونکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اس لیے میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کے برعکس میں بڑی خوشی سے اس معاملے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے مسٹر ہومر کے بارے میں کچھ اور تفصیلات بتاؤ۔" ایلس نے ایک گہری سانس لی اور اتنی دیر میں پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا اور پھر ہومر کے فارم کے متعلق بتانے لگی کہ وہ کہاں اور کس جگہ واقع ہے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ میری فیس کے بارے میں پوچھنا چاہا۔

"جب وقت آئے گا تو ہم اس بارے میں بھی بات کرلیں گے۔" میں نے کہا۔ "آج مشکل ہے تم جمعہ کی سہ پہر کو میرے پاس آؤ۔ اُمید ہے کہ اس وقت تک میں ہومر کے بارے میں ضروری تحقیقات کرلوں گا۔" اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر جانے لگی۔ دروازے تک پہنچ کر وہ ٹھٹکی۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"میں اب بھی مطمئن نہیں ہوں کہ آیا مجھے یہ قدم اٹھانا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔" اس نے کہا۔ "میرے خیال میں مجھے اس معاملے کو یہیں ختم کردینا چاہیے۔"

"تم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت مناسب ہے، اس لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے گھر جاؤ اب جمعہ کی سہ پہر کو ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تم دل ہی دل میں مجھ پر ہنس تو نہیں رہے ہو؟"

"بالکل نہیں اس کے برعکس میں تمہاری دانشمندی کا

معترف ہوں۔"

ایلس چلی گئی جہاں تک اس کے کیس کا تعلق تھا تو یہ ان کیسوں سے بہت مختلف تھا جو میں اب تک لیتا رہا تھا لیکن اس کے باوجود میری خواہش یہی تھی کہ میں اسے اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ مکمل کرنے کی کوشش کروں۔ ہومر کا فارم ٹوپیکا سے تقریباً چالیس میل مشرق میں ایک چھوٹے سے قصبے کے باہر واقع تھا۔ میں بذریعہ طیارہ ٹوپیکا پہنچا اور پھر وہاں سے ایک کار کرائے پر لے کر میں دوسرے دن دوپہر کے بعد اس قصبے میں پہنچ گیا۔ میں نے اپنی تحقیقات کے لیے کوئی خاص پلان نہیں سوچا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں قصبے کے مختلف لوگوں سے مل کر ہومر کے بارے میں معلوم کروں کہ وہ کس سیرت و کردار کا آدمی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر کسی نے پوچھا کہ میں ہومر کے بارے میں یہ سوالات کیوں کر رہا ہوں تو جواب دوں گا کہ میں ایک قرضہ دینے والی کمپنی کا نمائندہ ہوں۔ ہومر نے کمپنی سے قرضہ مانگا ہے اس لیے کمپنی نے مجھے ہومر کے بارے میں تحقیقات کرنے کی ہدایت کی ہے پھر دوسرے دن صبح کو میں خود ہومر سے ملنے جاؤں گا اور اسے ذاتی طور پر جانچنے اور پرکھنے کے لیے ضروری سوالات کروں گا۔ یہاں میرا عذر یہ ہوگا کہ میں ایک ایسی کمپنی کا نمائندہ ہوں جو زمینیں خریدتی ہے اور ہومر کے فارم میں دلچسپی رکھتی ہے۔

چنانچہ میں نے پہلے مختلف لوگوں سے ہومر کے بارے میں سوالات کیے۔ پتا چلا کہ ہر شخص اسے اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ایک شریف اور باعزت آدمی ہے۔ اپنی بیوی کی موت کا اسے گہرا صدمہ ہوا تھا اس صدمے کے زیرِ اثر اس نے کچھ مدت تک شراب پینا شروع کردی تھی مگر پھر کچھ دن کے بعد خود بخود سنبھل گیا اور پھر پہلے جیسا شریف، متین، سنجیدہ اور ایمان دار آدمی بن گیا، جو بلاشبہ ایک قابلِ تعریف بات تھی۔ جن لوگوں سے میں نے ہومر کے بارے میں سوالات کیے تھے ان میں ہوٹل کا کلرک بھی شامل تھا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح میں اس خیال سے اس کے پاس پہنچا کہ ہومر کے فارم جانے کے لیے اس سے راستے کے بارے میں معلومات حاصل کرلوں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خود بھی میرے آنے کا منتظر تھا۔

"مجھے افسوس ہے جناب۔" وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

"کیسا افسوس؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کل رات مسٹر ہومر کا انتقال ہوگیا۔" کلرک نے بتایا۔ "اس کی کار سڑک کے کنارے ایک درخت سے ٹکرا گئی اور اسٹیئرنگ وہیل نے اس کے سینے کی پسلیاں توڑ دیں۔" میں جیسے سکتے میں رہ گیا۔ جو پہلا خیال ذہن میں آیا وہ یہی تھا کہ یہ خبر سن کر پتا نہیں ایلس کے دل پر کیا گزرے گی۔ کلرک نے مجھے کچھ اور باتیں بھی بتائیں۔ اس کے بیان کے مطابق ہومر شام کے وقت قصبے میں آیا ایک مشہور بار میں داخل ہوا اور خوب شراب پینے لگا۔ وہ بے حد اداس، پژمردہ اور مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس کے دوستوں نے اسے شراب پینے سے باز رکھنا چاہا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب وہ بار سے رخصت ہوا تو نشے سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ اس نے شراب پینا چھوڑ دی تھی؟" میں نے کلرک سے کہا۔

"میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہومر عادی شراب نوش نہیں تھا لیکن کل اس کی بیوی کی برسی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس موقعے پر ایک مرتبہ پھر اسے اپنی بیوی کی یاد نے ستایا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے غم کو فراموش کرنے کے لیے شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہوگیا۔" یہ بات قطعی ممکن تھی۔ مزید یہ کہ اپنی بیوی کی یاد تازہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہومر نے اپنے اور ایلس کرسٹی کے تعلقات کو ایک دوسری ہی نظر سے دیکھا ہو، ممکن ہے اسے یہ بات اپنی مرحوم بیوی سے بے وفائی پر مبنی محسوس ہوئی ہو اور غم کے علاوہ اپنی اس شرمندگی کو مٹانے کے لیے اس نے شراب پینا شروع کردی ہو۔ بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میں یہ خبر ایلس کرسٹی کو کس طرح سنا سکوں گا۔ معلوم نہیں اس پر اس اطلاع کا کیا ردِعمل ظاہر ہو۔

قصبے سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے شیرف سے ملنا بھی ضروری سمجھا کہ اس کے ذریعے اس خبر کی مزید تصدیق کرلوں۔ میں ہومر ہی کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی ملاقات کر چکا تھا۔ شیرف نے اس خبر کی تصدیق کی۔ اس کے خیالات بھی کم و بیش ہوٹل کے کلرک سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔

☆☆☆

جیسا کہ طے ہو چکا تھا کہ ایلس جمعے کی سہ پہر کو میرے دفتر آئی۔ آج اس نے دوسرا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا طرزِ عمل بھی پہلے روز کے مقابلے میں کچھ زیادہ پُراعتماد تھا لیکن میں ابھی تک فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ میں اسے ہومر کے مرنے کی منحوس خبر کن الفاظ میں سناؤں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

"اس سے پہلے کہ تم مجھے کچھ بتاؤں مسٹر میلیک۔" وہ آتے ہی بولی۔ "میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ایسی بات ہے جو تمہیں بتانا ضروری ہے۔"

"اوہ۔"

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں کینساس نہیں جاؤں گی اور یہ کہ تم نے خواہ کچھ بھی معلوم کیا ہو میرا ہومر اکیومین سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں حیران بیٹھا ایلس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

"لیکن میرا خیال تھا کہ......" میں نے کہنا چاہا مگر ایلس نے میری بات کاٹ دی۔

"میں جانتی ہوں کہ میں نے اس روز کہا تھا۔" وہ بولی۔ "لیکن پھر اسی دن تمہارے دفتر سے واپس جانے کے بعد میں نے دوبارہ اس معاملے پر غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی کر رہی ہوں اور یہ کہ میرا ہومر سے خط و کتابت کرنا بھی حماقت اور ناتجربہ کاری کے سوا کچھ نہیں تھا۔"

اور میں سوچ رہا تھا کہ زندگی کے تینتیس سال تنہا گزار دینے کے بعد اب وہ اتنی کم حوصلہ ہوگئی ہے کہ میری رپورٹ ہومر کے حق میں ہونے کے باوجود اس سے شادی کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتی تھی لیکن دوسری طرف ایلس کے انکار نے ہومر کی موت کا ایک اور پہلو اجاگر کردیا تھا۔

"اور تم نے ہومر کو بھی اپنے اس فیصلے سے مطلع کردیا تھا، کیوں؟" میں نے پوچھا۔ ایلس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ وجہ اگرچہ کچھ اور رہی تھی لیکن وہ وجہ ایلس کو نہیں بتا سکتا تھا۔

"تم نے ابھی جو کچھ کہا اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ ممکن ہے تم نے ہومر کو بھی اپنا فیصلہ سنا دیا ہو۔"

"ہاں میں نے اسے بدھ کی رات کو فون کیا تھا۔" ایلس نے اعتراف کیا۔ "میں نے اس سے کہا کہ میں اب تک اسکول کی کسی کم عقل لڑکی کی طرح عمل کرتی رہی ہوں۔ مجھے اسے خط لکھنا ہی شروع نہیں کرنا چاہیے تھا اور پھر اُمید ظاہر کی کہ وہ میرے انکار کی وجہ کو سمجھنے کی کوشش کرے گا اور یہ کہ آئندہ نہ میں اسے کوئی خط لکھوں گی نہ فون کروں گی۔"

"پھر کیا وہ تمہارے انکار کی وجہ سمجھ گیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں پہلے تو وہ سمجھا کہ میں اسے ستانے اور چڑانے کے لیے ایسا کر رہی ہوں پھر اس نے میری منت و خوشامد کرنا شروع کردی لیکن آخرکار جب اسے یقین ہوگیا کہ میں سنجیدہ ہوں اور اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کروں گی تو پھر اس نے اچانک ہی ریسیور رکھ کر سلسلہ منقطع کردیا۔" ظاہر ہے وہ بدنصیب اس کے علاوہ اور کیا کرتا۔ ایلس کے دفعتاً انکار نے اسے مایوس اور دل شکستہ کردیا اور یہی مایوسی اسے قصبے کے بار میں لے گئی۔ ایلس غور سے میری صورت دیکھ رہی تھی۔

"اور اب تمہاری فیس کا معاملہ بھی طے ہو جائے تو اچھا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں نے ایک گہری سانس لی مجھے کچھ نہ کچھ رقم تو بتانا ہی تھی چنانچہ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "پچاس ڈالر دے دو، کافی ہوں گے۔"

"صرف پچاس ڈالر؟" ایلس نے تعجب ظاہر کیا۔ "یہ کم تو نہیں ہیں؟"

"نہیں، بالکل مناسب ہیں۔" ایلس نے اپنے ہینڈ بیگ سے نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیے اور میرا شکریہ ادا کیا۔

"اگرچہ اس کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ آخر تم نے ہومر کے بارے میں کیا معلوم کیا، وہ کیسا آدمی تھا؟" مجھے اسی سوال کی توقع تھی۔ اس وقت تک میں فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ مجھے ایلس کو کیا بتانا چاہیے لیکن موجودہ صورتِ حال میں میرے منہ سے آپ ہی آپ نکل گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارا فیصلہ بہت دانش مندانہ تھا۔ جو معلومات میں نے حاصل کی ہیں ان کی روشنی میں ہومر کوئی اچھا شوہر ثابت نہیں ہوتا۔ اسے قمار بازی کی عادت ہے اور اپنے فارم پر صرف اس وقت کام کرتا ہے جب اسے کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے پھر یہ کہ اس کی طبیعت میں کچھ ہرجائی پن بھی ہے۔ عورتوں کے معاملے میں خاصا بدنام ہے۔" ایلس نے ایک گہری سانس لی اس طرح جیسے میری رپورٹ نے اس کے شبہات کی تائید کردی ہو۔

"اس کا مطلب ہے جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔" اس نے کہا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور جس جواب کی اسے توقع تھی وہی جواب دیا۔

"ہاں تم نے درست کہا، جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔"





دوسرا اور آخری حصہ

آشوبِ وفا

محی الدین نواب

دنیائے ادب کا نامور قلم کار شیکسپیئر، اس کا شہرہ آفاق ڈراما "مرچنٹ آف وینس"، ڈرامے کا یہودی سود خود شائیلاک اور اس کا اپنے قرض دار انطونیو کے جسم سے زندہ گوشت کا ایک پاؤنڈ کاٹ لینے کا وحشیانہ مطالبہ کون نہیں جانتا۔ شیکسپیئر جو کچھ لکھتا تھا، بہت سوچ سمجھ کر لکھتا تھا۔ اس نے یہ رمز پالیا تھا کہ یہودی قوم چمڑی جائے، دمڑی نہ جائے کہ گندے اصول کی پیروکار ہے۔ اپنے اسی ادراک کے تحت اس نے شائیلاک کا کردار تخلیق کرکے صیہونیوں کو آئینہ دکھادیا۔ عام آدمی سے پیشواؤں تک ان میں سب ہی زرپرست ہیں... عصائے موسیٰ اور زروجواہر سے اثاث بھرے ہوئے تابوت یہودا کی بازیابی کا جذباتی نعرہ دے کر انہوں نے کروڑوں کا ایک عالمی فنڈ قائم کیا اور اپنی قوم کو سمجھایا کہ ہیکل سلیمانی کے بارہ سورما جب ظاہر ہوکر وہ تابوت منظرِ عام پر لائیں گے تو اس کی برکت سے کرہ ارض پر یہودیوں کو بے مثال عروج حاصل ہوجائے گا اور وہ سب قوموں پر حکمرانی کریں گے... سادہ لوح یہودی دل کھول کر اس سازشی فنڈ میں عطیات دیتے ہیں... ایک طرف صیہونی تقدس کے پیرہن میں چھپے شیطانی وجود پوری آلِ موسیٰ کو ورغلا رہے تھے تو دوسری طرف حریت کے لیے برسرپیکار آزادی کے متوالے تھے... زرگزیدہ ربیوں کے نزدیک وہ حریت پسند باغی تھے جنہیں سفاکی سے کچل دینا ان کا حق تھا... موہوم روایتوں اور حرص وہوس کے غبار میں سازشوں کی جنگ نے ان کو دشمن کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کردیا... سورماؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے وہ اتنے گر گئے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو چارہ بنا کر سورماؤں کو خریدنا شروع کردیا... حریت پسندوں نے اپنی منصوبہ بندی سے ان سب کی ہوس زر کو خوب ہوا دی، وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح خون کی ہولی کھیلنے لگے، طاقت اور بربریت ان طاغوتی پیشواؤں اور رہنماؤں کا سہارا تھی۔

تحیر، تجسس، سنسنی اور چشم کشا حقیقتوں کے جال میں بنی ایک انوکھی داستان

وہ آگ اور پانی تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا۔ جلالت ربیوں کے ساتھ دوسری گاڑی کی طرف گیا۔ بنجامن پیشوا کے ساتھ ایک کار کی پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ ان سب کے ہاتھوں میں شمعیں روشن تھیں۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے گئے تاکہ شمعیں بجھ نہ پائیں۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کی گاڑیاں بھی ان کے آگے پیچھے چل پڑیں۔

وہ سب خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ معاملات بہت سنگین تھے۔ ایک کی محبوبہ زخمی ہوئی تھی۔ دوسرے کی ماری گئی۔ پیشوا ربی اور انٹیلی جنس والے اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔

ایک گھنٹے بعد وہ تمام گاڑیاں ہیکل کے صدر دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ مسلح سپاہی ہیکل کے چاروں طرف پہرا دینے کے لیے چلے گئے۔ جلالت اسرار ان کا قیدی تھا۔ وہ اسے ہیکل کے کسی دروازے سے فرار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔

جلالت اسرار، بنجامن اور ربیوں کے ہاتھوں میں شمعیں روشن تھیں۔ پیشوا ان دونوں سورماؤں کے درمیان چل رہا تھا تاکہ وہ پھر لڑ نہ پڑیں۔ تمام ربی ان کے پیچھے تھے۔ وہ سب بیک زبان دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے ہیکل میں داخل ہو گئے۔ وہاں انہیں آدھی رات تک عبادت کرنی تھی۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو ان کی عبادت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ افسران جلالت پر نظر رکھنے کے لیے ہیکل کے اندر آ گئے تھے۔ پیشوائے اعظم اپنے دینی طریقۂ کار کے مطابق دو سورماؤں سے عبادت کرا رہا تھا اور عبادت کے دوران میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

ہیکل کی وسیع و عریض چار دیواری میں وہ جگہ بدل بدل کر عبادت کر رہے تھے۔ اس کے دور افتادہ حصے میں کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ پیشوا نے جلالت اور بنجامن سے کہا کہ وہ دو الگ الگ کمروں میں جائیں اور آدھے گھنٹے تک عبادت کرنے کے بعد باہر آ جائیں۔

اس کی ہدایت کے مطابق ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جلالت اسے طیش دلانے کے لیے طنزیہ انداز میں مسکرایا پھر حیران ہوا۔ اس بار بنجامن عادت کے مطابق غصے میں نہیں آیا۔ وہ ٹھنڈے دماغ سے جلالت کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ کم بخت کیا کرنے والا ہے؟

وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ایک ایک کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ جلالت نے مسکرا کر کہا۔ ''میں سورما ہوں۔ کبھی کسی سورما کو جانی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

بنجامن نے کہا۔ ''اور میں بھی سورما ہوں، کسی سورما سے ڈرتا نہیں ہوں۔ کسی پر بھروسا بھی نہیں کرتا۔''

پیشوا نے کہا۔ ''بہتر ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے سے نہ بولو۔ عبادت میں مصروف رہو۔''

جلالت بہ دستور مسکراتا ہوا دروازہ کھول کر کمرے میں گیا۔ پھر وہ دروازہ بند ہو گیا۔ پیشوا اور ربیوں نے بنجامن کو دیکھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر گیا پھر وہ دروازہ بھی اندر سے بند ہو گیا۔

تمام ربی بلند آواز میں دعائیہ کلمات پڑھنے لگے۔ موم بتیاں پگھل رہی تھیں۔ وہ دوسری موم بتیاں جلانے لگے۔ ہیکل کے اس حصے میں بجلی سے حاصل ہونے والی روشنیاں بجھا دی گئی تھیں۔ چند موم بتیوں کی روشنی ناکافی تھی۔ دعائیہ کلمات کی گونجتی ہوئی آواز میں وہاں کا ماحول بڑا پُراسرار لگ رہا تھا۔

صرف دس منٹ کے اندر ہی محسوس ہوا، جیسے ہلکا سا زلزلہ آیا ہے۔ عبادت کرنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہرا دینے والے کھڑے ہوئے تھے۔ زلزلے سے زمین کو لرزنا چاہیے تھا لیکن ایک ذرا سی بھی لرزش نہیں ہوئی۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز محسوس ہوئی تھی۔

ان سب نے دونوں ہاتھ فرش پر رکھے، پھر جھک کر فرش سے کان لگائے۔ بہت ہی دھیمی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ انٹیلی جنس اور پولیس کے افسران ایک دوسرے سے پوچھنے لگے یہ کیسی آواز ہے؟

فوری طور پر سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ تمام رہنماؤں نے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھا۔ بہ ظاہر وہ بھی حیران اور پریشان ہوئے۔ ایک منٹ کے بعد وہی لرزش پھر محسوس ہوئی۔

وہ سب سجدے میں چلے گئے۔ فرش سے کان لگا کر سننے لگے۔ ایسے ہی وقت لرزش ختم ہو گئی۔ نہ زلزلہ آیا تھا، نہ وہ لرزش سمجھ میں آئی تھی۔

بنجامن کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شمعدان تھی۔ اس نے حیرانی سے کہا۔ ''ابھی میرے قدموں تلے فرش لرز رہا تھا۔ زلزلہ تو نہیں تھا لیکن ایک لہر سی محسوس ہوئی تھی۔''

انٹیلی جنس کے ایک افسر نے چیخ کر کہا۔ ''میں دعوے سے کہتا ہوں، یہاں فرش کے نیچے کہیں تہ خانہ ہے۔ ابھی

وہاں کی زمین سرکنے کے بعد پھر اپنی جگہ واپس آئی ہے۔''

اس بات پر سب ہی کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ بنجامن نے چونک کر دوسرے کمرے کے دروازے کو دیکھا پھر کہا۔ ''کیا سولومن نے یہ محسوس نہیں کیا ہے؟ وہ باہر کیوں نہیں آ رہا ہے؟''

اس بات نے سب کو سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ باہر کیوں نہیں آ رہا ہے؟ ایک پولیس افسر نے تیزی سے چلتے ہوئے وہاں آ کر دروازے پر دستک دی۔ پھر انتظار کیا۔ سب ہی دروازے کو تک رہے تھے۔

پیشوا نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ ''یہ دستک کا جواب کیوں نہیں دے رہا ہے؟''

وہ سب جانتا تھا مگر انجان بن رہا تھا۔ اس نے دروازے پر آ کر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''سولومن! ہم پریشان ہیں۔ جواب دو یا دروازہ کھول کر باہر آؤ۔''

جواباً خاموشی رہی۔ بنجامن نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''محترم پیشوائے اعظم! یہ آپ کو بھی نظر انداز کر رہا ہے۔ چپ کیوں ہے؟ کیا مر گیا ہے؟''

اس نے آ کر دروازے پر زور کی لات ماری دروازہ لرز گیا لیکن اندر والا نہ لرز رہا تھا، نہ بول رہا تھا۔

پھر تو پولیس والے بھی آ کر دروازہ پیٹنے لگے۔ کہنے لگے کہ اسے اندر کچھ ہو گیا ہے۔ وہ بولنے کے قابل نہیں ہے۔ دروازہ توڑ دو۔

دروازہ ایک تھا۔ توڑنے والے زیادہ تھے۔ وہ ٹوٹ گیا۔ انہوں نے اندر آ کر دیکھا، سولومن نہیں تھا۔ اس کمرے میں ایک باتھ روم تھا۔ وہ سب وہاں آئے۔ وہ صاف ستھرا ٹوائلٹ کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی نہیں آیا ہے۔

بنجامن نے چیخ کر پوچھا۔ ''وہ کہاں غائب ہو گیا ہے؟''

انٹیلی جنس کے اور پولیس کے افسران کہنے لگے کہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس کمرے میں گیا تھا۔ باہر جانے کے لیے اور کوئی دوسرا دروازہ یا کھڑکی نہیں ہے۔ روشندان بہت چھوٹا ہے اور وہاں لوہے کی جالی لگی ہے۔ وہاں سے ایک بچہ بھی نہیں گزر سکے گا۔ پھر وہ یہاں سے کہاں جا سکتا ہے؟

بنجامن نے کہا۔ ''اس نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ ہیکل میں آنے کے بعد ایک ذہنی جھٹکا پہنچائے گا اور وہ پہنچا رہا ہے۔ یہاں ضرور کوئی تہ خانہ ہے۔ یہاں کا فرش کھود کر اسے اس کی قبر سے نکالو۔''

افسران اسی وقت فون کے ذریعے ماہرین سے کہنے لگے کہ وہ فوراً جدید آلات کے ساتھ وہاں آ جائیں۔ اگر تہ خانے کا سراغ نہ ملا تو وہاں کے فرش کو گہرائی تک کھودا جائے گا۔

بنجامن نے ان سے ذرا دور جا کر سیلینا کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بے چینی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ ''کہاں رہ گئے تھے؟ کب سے فون کو تک رہی ہوں کہ تم اب بولو گے، تب بولو گے۔''

وہ بولا۔ ''میری جان! میں تمہاری بے چینی کو سمجھ رہا ہوں۔ مگر کیا کروں؟ وہ دشمن سورما میرے ساتھ تھا۔ اچانک غائب ہو کر میرے لیے چیلنج بن گیا ہے۔''

وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔ ''کیا وہ ہیکل سے فرار ہو کر ابھی میرے پاس آئے گا؟''

''وہ یہی کرے گا۔ فوراً اپنے ڈیڈی کو فون کرو۔ اپنے اطراف مسلح گارڈز کی تعداد بڑھاؤ۔ میں ابھی تمہاری حفاظت کے لیے آ رہا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''تم آ جاؤ گے تو مجھے کسی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ پھر بھی میں ڈیڈی کو خطرے سے آگاہ کر رہی ہوں۔''

وہ فون بند کر کے پیشوا کے پاس آ کر بولا۔ ''مجھے سیلینا کی فکر ہے۔ سولومن اچانک غائب ہو کر سوزانہ کا انتقام لینے میری محبوبہ کے پاس جائے گا، میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس کی حفاظت کے لیے وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔''

وہ پیشوا سے اجازت لے کر تیزی سے چلتا ہوا، ہیکل سے باہر جانے لگا۔ پیشوا نے دل ہی دل میں کہا۔ ''جاؤ ہمارا کام تو ہو چکا ہے۔ کوئی سولومن یہودا کے سائے تک بھی پہنچ نہیں پائے گا۔''

ماہرین آ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''ہم اس کمرے اور باتھ روم کو اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ کہیں خفیہ دروازہ نہیں ہے اور فرش کے نیچے کھوکھلی زمین نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو اوپر سے آلات کے ذریعے ٹھونک بجا کر معلوم کر لیا جاتا۔''

ایک افسر نے پیشوا سے پوچھا۔ ''کیا ہیکل کے سورما جادو جانتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''نہ وہ جادو جانتے ہیں، نہ ان پر کسی جادو کا اثر ہوتا ہے۔ سولومن بھی کسی طرح کا پُراسرار عمل نہیں جانتا۔''

''پھر وہ غائب کیسے ہو گیا؟''

ایسے ہی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ پیشوا نے نام اور نمبر پڑھے۔ پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو مسٹر انتھونی! مجھے توقع تھی کہ آپ کال کریں گے۔''

انتھونی نے کہا۔ ”ابھی میری بیٹی نے بتایا ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ درندہ فرار ہوگیا ہے اور آپ نے اسے ہیکل سے غائب کیا ہے۔“

پیشوا نے کہا۔ ”یہاں قانون کے محافظ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ان سب کے سامنے مجھے بھی دھوکا دے کر حیرت انگیز طور پر غائب ہوا ہے۔ یہاں فرش کی کھدائی شروع ہونے والی ہے۔ جلد ہی معلوم ہوگا کہ یہاں تہ خانہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو یہ راز صرف سولومن جانتا تھا۔ کیونکہ وہ یہیں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ دادا نے نہ جانے یہاں کے کتنے راز اسے بتائے ہوں گے۔“

”اور وہ راز اس نے آپ کو نہیں بتائے۔ ایک سورما ہوکر اپنے پیشوا کو دھوکا دیتا رہا؟ میں یہ بات کبھی نہیں مانوں گا۔ آپ دونوں کی ملی بھگت سے اسے آزادی مل گئی ہے۔ اب میں اسے قیدی بنا کر اس کی نگرانی نہیں کرا سکوں گا۔ اپنی بیٹی کی بربادی کا انتقام نہیں لے سکوں گا۔“

”آپ بولتے رہیں۔ بولنے میں کیا جاتا ہے؟ ہم سچے اور دیندار رہنما ہیں۔ ہم پر آنچ نہیں آئے گی۔“

”میں جانتا ہوں۔ آپ کا دماغ خوب چلتا ہے۔ اگر آپ پیشوا نہ ہوتے تو ایک کامیاب شاطر سیاستدان ہوتے۔ آپ انتہائی مکارانہ صلاحیت سے نائٹ ٹیمپلرز فنڈ پر اپنی گرفت مضبوط کر رہے ہیں۔“

نائٹ ٹیمپلرز فنڈ ایک ایسا فنڈ ہے‘ جس میں اربوں ڈالرز موجود ہیں۔ ان اربوں ڈالرز کا تعلق بارہ سورماؤں سے ہے۔ کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے اربوں ڈالرز کے سازشی کھیل کا ذکر کرنا لازمی ہوگیا ہے۔ اس کھیل کے ساتھ ہی یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ بارہ سورماؤں کا ڈراما کیوں پلے کیا جارہا ہے؟

یہودی پوری دنیا کو اپنی کتاب کے ذریعے یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہیکل کے بارہ سورما ضرور آئیں گے۔ مسلمان اپنی دینی کتابوں کے حوالے سے مانتے ہیں کہ قیامت سے پہلے دجال اس دنیا میں آئے گا اور شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لیے یہودی قوم کو استعمال کرے گا۔

صیہونی کتابوں میں ہیکل کے بارہ سورماؤں کا کہیں مختصر سا ذکر ہے۔ یہودی پیشوا اور ربی اسے بڑھا چڑھا کر ڈرامائی انداز میں پیش کر رہے تھے۔ یہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ بارہ سورما تابوت یہودا لائیں گے تو ان مقدس تبرکات کے ذریعے یہودی پوری دنیا کے حکمران بن جائیں گے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ تمام دنیا کے اہم کاروبار پر یہودی تاجر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ ارب پتی‘ کھرب پتی تاجر بڑی بے چینی سے بارہ سورماؤں کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا تھا کہ بارہ سورما انہیں سپر پاور بنانے کا سامان لائیں گے تو وہ ان سورماؤں کو مالا مال کردیں گے۔

ان سورماؤں کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا تھا۔ ان کے لیے نائٹ ٹیمپلرز کمیٹی بنائی گئی تھی۔ پیشوائے اعظم‘ ربی‘ اسرائیلی حکمران، آرمی کے اعلیٰ افسران‘ انتھونی فورڈ جیسے اعلیٰ عہدیدار اور تمام ارب پتی‘ کھرب پتی یہودی تاجر اس کمیٹی کے اعلیٰ ارکان تھے۔

یہ اندازہ کیا جارہا تھا کہ انہوں نے سورماؤں کے نام سے بینک میں جو فنڈ قائم کیا ہے‘ اس فنڈ کی رقم اربوں ڈالرز تک پہنچ گئی ہوگی۔

جہاں حد سے زیادہ دولت ہوتی ہے۔ وہاں سازشیں ضرور ہوتی ہیں۔ نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کا ایک ایک اعلیٰ رکن اس کوشش میں تھا کہ اربوں ڈالرز اس کے حصے میں آجائیں۔ پتا نہیں بارہ سورما کب آئیں گے؟

آئیں گے بھی یا نہیں؟

ان کا آسرا نہ کیا جائے۔ اربوں ڈالرز کے بینک اکاؤنٹس پر اپنے پنجے گاڑ دیئے جائیں۔ انتھونی فورڈ اور مزید پانچ اعلیٰ عہدیدار اس فنڈ پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے اسرائیلی حکمرانوں کو معاشی اور مالی مشکلات میں مبتلا رکھتے تھے اور اسرائیلی آرمی کے لیے فلسطینیوں سے جنگ لڑتے رہنے کے حالات پیدا کرتے رہتے تھے۔

انتھونی فورڈ اور اس کی ٹیم کا یہ منصوبہ تھا کہ بارہ سورماؤں کے آنے اور یکجا ہونے تک پیشوائے اعظم اور ربیوں کے اختیارات کم سے کم کرکے انہیں کمزور بنادیں۔ اگر بارہ سورما ان سے بدظن رہیں گے اور انتھونی فورڈ کی ٹیم کو سپورٹ کرتے رہیں گے تو وہ تمام دینی رہنما نائٹ ٹیمپلرز فنڈ سے ایک تنکا بھی حاصل نہیں کرسکیں گے۔

اس مقصد کے لیے انتھونی فورڈ نے بنجامن کو اپنی بیٹی کے ذریعے تابعدار بنا لیا تھا۔ آئندہ بھی آنے والے سورماؤں کو اپنی دولت سے اور حسین ترین عورتوں کی رشوت سے زیرِ اثر لانے کا ارادہ تھا۔

بہرحال ہیکل کے بارہ سورماؤں کی حقیقت یہ تھی کہ وہ تابوت یہودا اور مقدس تبرکات لائیں یا نہ لائیں‘ ان کے ذریعے اربوں ڈالرز حاصل ہونے والے تھے اور اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے لازمی تھا کہ دو آگئے ہیں‘ دس اور آہی جائیں گے۔

جب کہانی کی گرہیں کھل رہی ہیں اور وضاحت ہو رہی ہے تو یہ بھی واضح ہوجائے کہ ان کی کتابوں کے مطابق سورماؤں کا وجود ہے بھی یا نہیں۔

دیگر مذاہب کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کا صندوق یعنی تابوت یہودا یروشلم لایا گیا تو اس کے بارہ سورما محافظ تھے۔ وہ تابوت کہاں گم ہوگیا یا اسے کہاں چھپا دیا گیا؟ یہ صرف وہ سورما ہی بتا سکتے تھے۔

اب یہ خیال قائم کیا گیا ہے کہ ڈھائی ہزار سال پہلے جو بارہ سورما تھے‘ وہ نسل در نسل چلے آرہے تھے۔ ان کی پہچان یہ تھی کہ ان کے نام کے ساتھ لفظ یہودا ضرور ہوتا تھا اور دائیں بازو پر ستارے کے مانند ایک پیدائشی نشان ہوتا تھا اور وہ قدیم عبرانی زبان جانتے تھے۔

یہ بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ ان سورماؤں کی اولاد قدیم عبرانی زبان سیکھتی پڑھتی آئی ہوگی۔ وہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق اپنے ناموں کے آخر میں لفظ یہودا کا اضافہ کرتے ہوں گے لیکن....

یہ بات ہضم ہونے والی نہیں تھی کہ بارہ سورماؤں کی تمام اولاد کے بازو پر ایک جیسا پیدائشی نشان ہوگا۔

اور یہ نشان موجودہ دور کے سورما کہلانے والے جلالت اسرار اور بنجامن یہودا کے دائیں بازو پر تھا۔ تیسرے کم سن سورما ایان کے بازو پر بھی ویسا ہی نشان تھا۔

پلاسٹک سرجری کے ماہرین بیان دے چکے تھے کہ وہ نشانات سرجری کے مرہونِ منت نہیں تھے۔ یعنی بناوٹی نہیں تھے پیدائشی ہی لگتے تھے۔

پیدائشی ہونے اور پیدائشی لگنے میں فرق ہے۔ اب یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ وہ نشانات پیدائشی نہیں تھے البتہ لگتے تھے۔ ڈھائی ہزار سال پہلے بارہ سورماؤں نے اپنی مخصوص شناخت کے لیے آپس میں یہ طے کیا ہوگا کہ جب بھی کسی کے گھر بیٹا پیدا ہو تو پیدائش کے ایک ماہ کے اندر ہی اس کے دائیں بازو پر ستارے کے مانند نشان گودوایا جائے۔

قدیم زمانے میں سوئی اور تیل کے ذریعے بدن پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اس کے لیے جدید آلات ایجاد ہوچکے ہیں۔ چونکہ نوزائیدہ بچے کے بازو پر وہ نشان گودوایا جاتا تھا اس لیے وہ بچے کی کچی جلد کے ساتھ جذب ہوکر رفتہ رفتہ یوں لگتا تھا کہ پیدائشی نشان ہے۔ کسی حکمت سے‘ کسی آلے سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بچپن کے گودوائے ہوئے نشانات ہیں۔ کچی عمر کے نشانات جوان ہوتے ہوتے صحت مند جلد کا ایک قدرتی حصہ بن جاتے تھے۔

جلالت اسرار کی پیدائش سے پہلے اس کے باپ کو قتل کردیا گیا تھا۔ قتل سے پہلے اس نے اپنی شریکِ حیات کو یعنی جلالت کی ماں کو تاکید کی تھی۔ ”بیٹا پیدا ہو تو ٹھیک ایسا ہی نشان جو میرے بازو پر ہے‘ بیٹے کے دائیں بازو پر ضرور گودوانا اور اس کی پیدائش کے ایک ماہ کے اندر ہی میری ہدایت پر عمل کرنا۔“

اس نشان کا فوٹو بڑے سائز میں موجود تھا۔ جلالت کی والدہ نے اپنے مقتول شوہر کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور جلالت نے باپ دادا کے زمانے سے چلی آنے والی روایت کے مطابق اپنے بیٹے ایان کے بازو پر وہی نشان گودوایا تھا۔

جلالت‘ ایان اور بنجامن یہودا کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ باقی سورما بھی اپنے باپ دادا کی اس روایت کو ہزاروں برسوں سے قائم رکھتے آرہے ہوں گے۔ وہ سب اس دنیا کے مختلف ملکوں میں کہیں ہوں گے۔ جس طرح جلالت اور بنجامن اسرائیل میں سورماؤں کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے‘ اسی طرح باقی دس سورما بھی آئیں گے۔

یہ طے تھا کہ جب تک بارہ سورما نہیں آئیں گے‘ تب تک فنڈ کے وہ اربوں ڈالرز منجمد رہیں گے۔ جو کھرب پتی تاجران اس فنڈ میں رقم جمع کرتے آرہے تھے‘ وہ تابوت یہودا کو اور بارہ سورماؤں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر اس فنڈ سے ایک تنکا بھی نکالنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

سب ہی کو دولت حاصل کرنے کی جلدی تھی۔ زندگی کا کیا بھروسا ابھی ہے‘ ابھی نہیں... آنکھ بند ہوتے ہی زمین کھا جائے گی اور زندہ رہنے والے فنڈ کی رقم کھاتے رہیں گے۔

لہٰذا تمام سازشی ذہن رکھنے والے یہی چاہتے تھے کہ وہ تمام دولت اپنی زندگی میں حاصل ہوجائے۔ امریکا، افریقا اور یورپ کے تمام ملکوں میں پیشوا تھے۔ وہ سب اسرائیلی پیشوا کو اپنا پیشوائے اعظم مانتے تھے۔ ان کی اپنی ایک مذہبی تنظیم تھی۔ تمام یہودی تاجر یہودیت کو پھیلانے کے لیے عالمی یہودی فنڈ میں اچھی خاصی رقمیں دیتے رہتے تھے اور وہ تمام تاجر نادان نہیں تھے۔ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مذہبی رہنما بھی انسان ہوتے ہیں‘ وہ بھی بے ایمان ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے انتھونی فورڈ جیسے پانچ معروف اور تجربہ کار بینکرز کو فنڈ کی رقم کا نگراں بنایا تھا۔ جلالت اسرار نے ہیکل سے اچانک ہی غائب ہوکر ان تمام

بینکرز کو چونکا دیا تھا۔ انتھونی کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ جلالت یوں روپوش ہوتے ہی اس کی بیٹی کو ہلاک کرنے کی ضرور کوشش کرے گا۔

جبکہ ان پانچ بینکرز کو پورا یقین تھا کہ پیشوائے اعظم نے جلالت کو کسی چور راستے سے کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دیا ہے۔ پیشوا' ربی' پولیس اور انٹیلی جنس والے وہاں ہیکل میں موجود تھے۔ وہ جس کمرے میں جا کر غائب ہوا تھا' اس کمرے کے فرش کی کھدائی ہو رہی تھی۔ انتھونی فورڈ فون پر پیشوا سے بولا۔ ''میں ابھی آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''میرا ایک سورما اچانک غائب ہو گیا ہے۔ تمام سورما میرے لیے بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ جب تک سولومن کا سراغ نہیں ملے گا' تب تک میں کسی دوست یا دشمن سے ملاقات نہیں کروں گا۔''

''پلیز۔ اس طرح فون پر باتیں نہ بنائیں۔ ہم ایک دوسرے کی اندرونی چالبازیوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے' مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد آپ کو کوئی فائدہ پہنچے۔ ابھی نہ سہی' کل دن میں کہیں ملاقات کریں۔''

''اچھی بات ہے۔ میں بتاؤں گا کہ کل ہماری ملاقات کہاں ہو سکتی ہے؟''

''کل رات تک آپ وعدہ کریں کہ سولومن یہودا میری بیٹی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''وہ یہاں سے گم ہو گیا ہے۔ میں کیسے وعدہ کر سکتا ہوں کہ وہ سیلینا کے خلاف کچھ نہیں کرے گا؟ تم تو جونیئر امریکا ہو۔ بڑے وسیع ذرائع و اختیارات کے مالک ہو اور ایک سورما سے خوفزدہ ہو؟ جاؤ' اپنی بیٹی کی حفاظت کرو۔ کل فون کروں گا۔''

پیشوا نے فون بند کر دیا۔ اس کمرے میں آ کر دیکھنے لگا۔ وہاں ایک ہیوی مشین کے ذریعے فرش کو کھودا جا رہا تھا۔ یہ راز کھلنے والا تھا کہ وہ کمرے کے کس حصے سے کس طرح فرار ہوا ہے؟

☆☆☆

جلالت اسرار نے کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا تھا پھر اس شمع کی روشنی میں دیکھا۔ وہاں اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے کا کوئی سامان نہیں تھا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ ایک چھوٹا سا قالین عبادت کے لیے بچھا ہوا تھا۔ وہ کمرا اس کے لیے غیر ضروری تھا۔ وہ شمعدان اٹھائے سیدھا کموڈ کے پاس آیا۔ وہ نمائشی کموڈ تھا۔ اسے رفع حاجت کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس نے شمعدان کو فرش پر رکھا۔ پھر کموڈ کو دو اطراف سے تھام کر اسے دائیں طرف گھمایا۔

وہ ایک جھٹکا کھا کر ذرا گھومتا پھر رک جاتا تھا۔ وہ پھر اسے گھماتا تھا' وہ پھر جھٹکا کھانے کے بعد ذرا گھوم کر رک جاتا تھا۔ اس متواتر عمل کے نتیجے میں جب وہ ایک دائرے میں پوری طرح گھوم گیا تو ایک ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔

اس آواز کو کمرے کے باہر سب ہی نے محسوس کیا تھا۔ باتھ روم سے ابھرنے والی آواز باہر تک نہیں پہنچی۔ صرف اتنا ہوا کہ فرش ہولے سے لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں سب لوگ فرش سے کان لگا کر سننے کی کوشش کرنے لگے۔

باتھ روم کے اندر گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی جلالت سنبھل گیا۔ کموڈ کے چاروں طرف چار فٹ کے رقبے میں فرش دھنسنے لگا۔ اس نے شمعدان کو اٹھا لیا۔ کموڈ کے ساتھ لگا بیٹھا رہا۔ فرش کے خلا میں نیچے کی طرف جانے لگا۔

چند لمحوں بعد ہی وہ لفٹ نما حصہ تہ خانے کے فرش پر پہنچ کر رک گیا۔ وہاں دو ربی اپنے مخصوص لبادے میں نظر آئے۔ وہ اپنے مذہبی روپ کے خلاف ہاتھوں میں گن اٹھائے ہوئے تھے۔

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ وہ شمعدان لیے ان کے قریب آ گیا۔ اسی وقت وہ لفٹ ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ پھر اوپر جا کر اپنی جگہ ٹھہر گئی۔ باتھ روم کے فرش پر کہیں خلا نہیں رہا۔ وہ پہلے کی طرح مکمل ہو گیا۔

ایک گن مین ربی نے ہاتھ اٹھا کر ریموٹ کنٹرولر کے ذریعے اس لفٹ کو لاک کر دیا۔ اب اوپر باتھ روم میں کوئی بھی آ کر اس مقفل کموڈ کو گھمانا چاہتا تو کبھی نہ گھومتا اور یہی ہوا تھا۔ ماہرین نے آ کر اس کموڈ کا معائنہ کیا۔ اسے صاف ستھرا دیکھ کر' اس کے اندر ہاتھ ڈال کر اچھی طرح ہلا کر دیکھا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

گن مین ربیوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ان کے پیچھے چلنے لگا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے تعارف حاصل نہیں کیا تھا۔ جلالت نے بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ان گونگے بن کر رہنے والوں کے ساتھ ایک سرنگ سے گزر رہا تھا۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک چلتے رہے۔ سرنگ کے آخری حصے میں ایک زینہ اوپر کی طرف گیا تھا۔ وہ تینوں اس پر چڑھتے ہوئے ایک دیوار کے پاس آئے۔ ایک ربی نے ریموٹ کنٹرولر کو آپریٹ کیا تو دیوار کا ایک چھوٹا سا حصہ ایک طرف سرک گیا۔ وہ اس چور دروازے سے گزر کر ایک کمرے میں آ گئے۔ ان کے پیچھے دیوار پھر برابر ہو گئی۔

یہودیوں کی ایک نچلے طبقے کی آبادی میں وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ باہر ایک کھٹارا سی گاڑی ان کی منتظر تھی۔ وہ اس میں بیٹھ کر اس علاقے سے باہر آئے۔ وہ اب بھی ایک دوسرے سے نہیں بول رہے تھے۔ بولنا یوں ضروری نہیں تھا کہ پیشوا نے پہلے ہی اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔

ایک صاف ستھرے علاقے میں پہنچ کر کھٹارا رک گئی۔ قریب ایک نئی چمچماتی ہوئی کار تھی۔ وہ اس میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں سے آگے جانے لگے۔ وہ کار ایک بنگلے کے احاطے میں آ کر رک گئی۔

ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے جلالت کا استقبال کیا۔ وہ اس کے ساتھ اندر آ کر بولا۔ ''پیشوائے اعظم نے بتایا تھا کہ ایک خوبصورت سی خاتون میری میزبان ہوں گی اور وہ یہیں آ کر مجھ سے ملاقات کریں گی۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''کبھی جوانی میں خوبصورت تھی۔ یہ جوانی بڑی بے ایمان ہوتی ہے۔ بڑی جلدی ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔''

وہ ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آؤ بیٹھو.....''

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم خود کو بوڑھی کیوں سمجھ رہی ہو؟ میرا اندازہ ہے' جوانی نے ابھی پوری طرح ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔''

''جو دیکھتا ہے' یہی کہتا ہے کہ ابھی تو میں جوان ہوں لیکن میں خوش فہمی میں مبتلا رہنے والی عورت نہیں ہوں۔''

پھر وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ''آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے انتظار میں بھوکی ہوں۔ کھانا لگا رہی ہوں۔''

وہ کھانے کے بعد خاتون کے ساتھ اس کی خوابگاہ میں آیا تھا۔ وہاں ایک بڑی سی الماری دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ خاتون نے کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد الماری کے ایک پٹ کو کھولا۔ وہاں ملبوسات ہینگرز سے لٹکے ہوئے تھے۔

اس نے ملبوسات کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''الماری کا یہ پچھلا حصہ چور دروازہ ہے۔ اس دروازے کو نہ کوئی سمجھ سکے گا' نہ کھول سکے گا۔''

اس نے الماری کے دوسرے پٹ کو کھول کر کہا۔ ''یہ دیکھو! اس حصے میں نقدی اور زیورات رکھنے کے لیے یہ سیف ہے اور یہ سیف نمبروں کی مخصوص ترتیب سے کھلتا ہے۔''

اس نے خفیہ نمبروں کی ترتیب سے اسے کھولا۔ وہاں اسرائیلی کرنسی کے علاوہ ڈالرز کی گڈیاں' زیورات اور دستاویزات رکھی ہوئی تھیں۔

جلالت نے پوچھا۔ ''وہ چور دروازہ کیسے کھلے گا؟''

وہ سیف کو بند کرنے کے بعد بولی۔ ''میں ان نمبروں کی ترتیب بدل رہی ہوں۔ دیکھو!''

اس نے نمبر تبدیل کیے۔ اس کے ساتھ ہی الماری کے دوسرے حصے میں چور دروازہ کھل گیا۔ وہ الماری میں

داخل ہو کر اس دروازے سے گزرتے ہوئے بولی۔ ''آجاؤ۔۔۔''

وہ اس کے پیچھے اس دروازے سے گزر کر ایسی جگہ پہنچا جہاں فرش نہیں تھا، ایک زینہ نیچے کی طرف گیا تھا۔ وہ بولی۔ ''میں ابھی باہر والوں سے نمٹ کر آؤں گی۔ تم یہاں آرام کرو۔''

وہ چلی گئی۔ جلالت وہیں ایک کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر مارتھا کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ کھدائی کرتے ہوئے واش روم کے کموڈ تک پہنچ گئے تھے۔ تہ خانے تک جانے کا راستہ مل گیا۔ مسلح جاسوس اور سپاہیوں نے نیچے آکر دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ آگے سرنگ تھی۔ انہوں نے للکارا کہ وہاں جو لوگ چھپے ہوئے ہیں' ہتھیار پھینک کر سامنے آجائیں۔ وہاں کوئی ہوتا تو سامنے آتا۔ آخر وہ حوصلہ کر کے سرنگ میں داخل ہوئے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اس کے آخری سرے تک پہنچے۔ پھر ایک زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر آئے تو سامنے دیوار تھی۔ آگے راستہ نہیں تھا۔

جلالت کو اپنے ساتھ لے جانے والوں نے ریموٹ کنٹرولر کے ذریعہ راستہ بنایا تھا۔ انہیں عقل نے سمجھایا کہ اس دیوار کو توڑنے کے بعد ہی آگے راستہ ملے گا۔ وہاں بھی مزدوروں کو بلانا پڑا۔ جاسوس اور تمام افسران حیران تھے' جھنجلا رہے تھے کہ سولومن یہودا کتنی زبردست پلاننگ پر عمل کرتا ہوا فرار ہوا ہے۔ دیوار توڑنے کے بعد انہوں نے خود کو ایک چھوٹے سے مکان میں دیکھا۔ معلوم ہوا' وہ نچلے طبقے کی ایک بستی میں ہیں۔

وہاں کچھ لوگوں نے بتایا کہ اس مکان کے سامنے ایک کھٹارا کار آئی تھی۔ اس میں تین افراد بیٹھ کر کہیں گئے ہیں۔ جاسوس اور افسران فون کے ذریعے مسلسل رابطے میں تھے۔ تمام چھوٹے بڑے علاقوں کے متعلقہ محکموں کو رپورٹ دے رہے تھے۔ یوں تمام پولیس فورس' انٹیلی جنس اور موساد والے حرکت میں آگئے تھے۔ وہ کھٹارا کار ایک شاہراہ پر ملی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جلالت چھپنے کے لیے وہاں سے کس سمت گیا ہے؟ وہ جارحانہ انداز میں اسے ڈھونڈ نکالنے کے لیے تمام عمارتوں اور رہائشی مکانوں میں جبراً گھسنے لگے۔

اس رات یہودیوں اور مسلمانوں کے رہائشی علاقوں میں جیسے قیامت آگئی تھی۔ جبراً تلاشی کے باعث سب ہی کی نیندیں حرام کر دی گئی تھیں۔ میزبان خاتون کا دعویٰ تھا کہ وہ موساد میں ایک سینئر آفیسر ہے۔ نہ کوئی اس پر شبہ کرے گا' نہ اس کے گھر کی تلاشی لی جائے گی۔ اس کا یہ دعویٰ باطل ہو گیا تھا۔ موساد کا ایک افسر سپاہیوں کے ساتھ وہاں آگیا تھا۔ اس نے خاتون سے کہا۔ ''سوری مارتھا! ہمیں تم پر شبہ نہیں ہے۔ لیکن وہ سورما کہلانے والا خطرناک ہے۔ وہ تمہیں گن پوائنٹ پر رکھ کر یہاں چھپنے کی جگہ بنا سکتا ہے۔''

مارتھا نے انہیں گھر میں آنے کی اجازت دی۔ نہ دیتی تب بھی وہ زبردستی گھس آتے۔ انہوں نے تمام کمروں' غسل خانوں اور اسٹور روم وغیرہ کو اچھی طرح دیکھا۔ تمام الماریوں کو بھی باہر سے اور اندر سے ٹٹولا۔ پھر مطمئن ہو کر چلے گئے۔

جلالت ایک چور دروازے کے پیچھے محفوظ تھا۔ مارتھا کا انتظار کرنے کے لیے بیڈ پر آکر لیٹ گیا تھا۔ اسے باہر کے حالات کا اندازہ تھا کہ انتھونی فورڈ' اسرائیلی حکام اور آرمی کے افسران اس کے فرار ہونے پر کس بری طرح جھنجلا رہے ہوں گے۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی پارٹی کے رہنماؤں کو خبر مل گئی کہ ہیکل کا یہودی سورما بننے والا فرار ہو گیا ہے۔ پارٹی کے حلقے میں پہلے تو یہ یقین ہونے لگا تھا کہ جلالت واقعی دین اسلام سے پھر گیا ہے۔ یہودی بن کر دولت کما رہا ہے اور عیاشی کر رہا ہے۔

پھر اسرائیلی شہروں میں روپوش رہنے والے مجاہدین نے یقین دلایا کہ جلالت کا ان سے خفیہ رابطہ ہے۔ وہ بے شک ایک سچا جانباز مسلمان ہے۔ اس کے بعد ٹی وی پر سیلینا کے مخالفانہ بیان نے اس بات کو اچھالا کہ سولومن یہودا بہروپیا ہے۔ وہ اب بھی مسلمان ہے اور ہیکل کا یہودی سورما بن کر دھوکا دے رہا ہے۔

عمر محمود جیسے جانباز رہنما، ورقہ اور ایان سب ہی پریشان ہو کر سوچ رہے تھے کہ ان کا شہزور شیر دل جلالت فرار ہو کر کہاں چھپا ہو گا؟ اگر اس ملک سے فرار ہونے کا موقع نہیں ملے گا تو اسرائیلی کتے اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ پھر زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ورقہ نے عمر محمود سے کہا۔ ''ان یہودی درندوں نے میرے پیچھے کتے لگا دیے تھے۔ میں تو کسی طرح بچ کر یہاں آگئی۔ جلالت کا کیا ہو گا؟ انہوں نے اس کی کوئی اُترن کتوں کے سامنے ڈالی ہو گی۔ وہ سُونگھتے ہی اس کی کسی خفیہ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں گے۔''

جلالت نادان نہیں تھا۔ اس نے ورقہ کے حوالے سے ان کتوں کو یاد رکھا تھا۔ اس نے اپنی اُترن جلا ڈالی تھی۔ باقی دھلے ہوئے کپڑے اسی بنگلے میں چھوڑ دیے تھے۔ وہاں ایسی کوئی بھی چیز نہیں چھوڑی تھی جس کے ذریعے کتے اس کی مہک پا لیتے۔

عبدالباری نے کہا۔ ''وہاں روپوش رہنے والے مجاہدین بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اگر وہ نظر آئے گا تو اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دیں گے۔ کسی نہ کسی طرح اسے سرحد پار کرا دیں گے۔''

غالی نے کہا۔ ''ہم دعائیں مانگتے رہیں گے کہ جلالت سلامتی کے ساتھ سرحد پار کر لے۔ جب وہ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے ہاتھ نہیں آئے گا تو یہ کہا جائے گا کہ وہ غزہ پہنچ گیا ہے۔ ہم نے اسے پناہ دی ہے۔''

عبدالباری نے کہا۔ ''یہ دشمن کسی جواز کے بغیر بے سبب حملے کرتے رہتے ہیں۔ اب تو جلالت کی بازیابی کے بہانے انہیں عداوت کا خوب موقع ملے گا۔''

عمر نے کہا۔ ''ہم تو بدترین دشمنی سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ دیکھیں گے' کل تک کیا ہوتا ہے؟''

دشمنوں کی نیندیں بھی اڑ گئی تھیں۔ انتھونی فورڈ کو اپنی بیٹی کی فکر تھی۔ اس اسپتال کے اندر اور باہر مسلح گارڈز کی تعداد بڑھا دی گئی تھی۔ پھر بنجامن یہودا اس کی بیٹی کے پاس آگیا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر گھونسا مارتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ سولومن وہاں آئے گا تو زندہ واپس نہیں جائے گا۔

بنجامن نے اسپتال کے کمرے میں آتے ہی سیلینا پر جھک کر اسے چوم لیا۔ وہ اٹھ کر اس کے گلے نہیں لگ سکتی تھی۔ دشمن کی چلائی ہوئی گولی نے پسلی کی ایک ہڈی توڑ دی تھی۔ وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''تم آگئے ہو۔ اب مجھے دشمن کا ڈر نہیں ہے۔ مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے؟''

وہ بولا۔ ''جب تک دشمن گرفتار نہیں ہو گا' میں تمہیں کسی گارڈ کے بھروسے پر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''ہائے! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ میں تم پر قربان ہوتی رہوں گی۔ اس دشمن سے نہیں ڈروں گی۔''

سیلینا نے اپنے باپ کے منصوبے کے مطابق بنجامن کو اپنا دیوانہ عاشق بنا لیا تھا۔ وہ آئندہ انتھونی فورڈ اور اس کے ساتھی بینکرز کے زیر اثر رہنے والا تھا۔

دوسری طرف پیشوا بھی بازی ہارنے والا کھلاڑی نہیں تھا۔ جیسی چالیں چل رہا تھا' وہ چالیں پوری طرح ان پانچ بینکرز کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ دو سورماؤں کو آپس میں لڑنے سے منع کرتا تھا اور ایسے حالات بھی پیدا کرتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دشمنی کرتے رہیں۔

اس جنگ میں اس کی پوزیشن اس طرح مضبوط ہو سکتی تھی کہ سیلینا مر جائے۔ اس کی موت کے بعد جلالت یعنی سولومن پر مسلمان ہونے کا الزام رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا اور سیلینا کی موت سے دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ بنجامن حسن و شباب کے شکنجے سے نکل جاتا۔ پیشوائے اعظم نے یہ تمام پلاننگ ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے پالتو غنڈوں اور قاتلوں سے سیلینا پر فائرنگ کروائی تھی جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ گئی تھی۔ مگر سیلینا زندہ تھی۔ انتھونی فورڈ کا جال مضبوط تھا۔ اس جال کو ہمیشہ کے لیے توڑ ڈالنا بہت ضروری تھا۔

اس وقت پیشوا ربیوں کے ساتھ ہیکل میں تھا۔ انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران اس بات پر حیران تھے کہ پیشوائے اعظم سمیت تمام رہنماؤں کو اس چور راستے کا علم نہیں تھا اور ایک بہروپیا مسلمان وہ راستہ جانتا تھا۔ آخر وہ کیسے جانتا تھا؟ پیشوا نے کہا۔ ''اوّل تو وہ بہروپیا نہیں ہے یا مسلمان نہیں ہے۔ ایک سچا ہیکل کا یہودی سورما ہے۔ آپ حضرات اس کی لائف ہسٹری پڑھیں۔ تب یقین ہو گا کہ ہماری ایک کتاب ہیکل کے سورما کے مطابق وہ ہیکل میں پیدا ہوا تھا۔ وہاں کے درودیوار سے' چھت سے اور فرش سے اس کا روحانی تعلق ہے۔ وہ ہیکل کے ایسے راز جانتا ہے جنہیں ہم جیسے رہنما بھی نہیں جانتے۔''

''اگر وہ سچا تھا تو فرار کیوں ہوا؟''

''سورما آزاد رہتے ہیں۔ آپ لوگوں نے اسے قیدی بنانے کی غلطی کی' وہ چلا گیا۔ میں ایک پیشوا کی زبان سے اور یقین سے کہتا ہوں' وہ واپس آئے گا اور باقی گیارہ سورماؤں کے ساتھ یہاں تابوت یہودا لائے گا۔''

دوسرے ربیوں نے کہا۔ ''ہمیں اس کے جانے کا افسوس نہیں ہے کیونکہ وہ واپس آنے والا ہے۔''

وہ سب پیشوا کے ساتھ اپنی گاڑیوں کی طرف جانے لگے۔ انٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا۔ ''ہم حقائق کے سامنے روحانیت کو اہمیت نہیں دیتے۔ جو آپ کے لیے روحانی شخص ہے' وہ ہماری نظروں میں ایک مفرور مجرم ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں۔ جب تک وہ گرفتار نہیں ہو گا' ہمارے آدمی آپ لوگوں کی بھی نگرانی کرتے رہیں گے۔''

پیشوا نے جواب نہیں دیا۔ ربیوں کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔ وہ سب دو گاڑیوں میں تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے عقب نما آئینوں میں دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے

تھے کہ واقعی ان کی نگرانی کی جارہی ہے۔
پیشوا کی رہائش گاہ کے سامنے گاڑیاں رکیں۔ وہاں موساد کا ایک افسر سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پلیز۔ مائنڈ نہ کریں۔ ہر گھر کی تلاشی لی جارہی ہے۔ سولومن یہاں آکر چھپ سکتا ہے۔“
پیشوا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”آئیں اور اپنی تسلی کرلیں۔“
انہوں نے اندر آکر مکان کے ایک ایک حصے کی تلاشی لی۔ دوسرے کئی سپاہی ربیوں کے گھروں کی تلاشی لے رہے تھے۔ بہرحال انہیں ناکام ہونا تھا۔ وہ مایوس ہوکر چلے گئے۔ پیشوا نے ان کے جانے کے بعد دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کیا۔ پھر ایک صوفے پر بیٹھ کر اپنے فون کی سم بدلنے لگا۔ اسے جلالت کی فکر تھی۔ اس نے میسج کے ذریعے مارتھا سے پوچھا۔ ”میری امانت محفوظ ہے؟“
وہ جواباً میسج کے ذریعے بولی۔ ”محفوظ ہے۔“
”میں کل کسی وقت آؤں گا۔ آنے سے پہلے انفارم کروں گا۔ ویٹس آل...“
اس نے سیلینا اور انتھونی فورڈ کو تصوراتی آنکھ سے دیکھا۔ پھر میسج لکھنے لگا۔ وہ تینوں اسپتال کے کمرے میں تھے۔ انہیں خبر ملی تھی کہ وہ چور راستہ مل گیا ہے جہاں سے سولومن فرار ہوا ہے۔ سیلینا نے کہا۔ ”تھینکس گاڈ! اب وہ پکڑا جائے گا۔“
رات کے تین بج رہے تھے۔ انہیں سوجانا چاہیے تھا لیکن سولومن انہیں جاگنے پر مجبور کررہا تھا۔ ایسے وقت سیلینا کے فون پر میسج ٹون سنائی دی۔ اس نے سرہانے سے فون اٹھا کر اسے آپریٹ کیا۔ ننھی سی اسکرین پر تحریر ابھری۔ ”ہائے! میری جان! زندہ ہو؟ میرے خلاف جھوٹ بولنے اور جھوٹے الزامات لگانے کا نتیجہ دیکھ لیا؟ ابھی اور دیکھو گی۔“
وہ چیخ پڑی۔ ”یہ سولومن ہے۔ دیکھو! یہ کیا بول رہا ہے؟“
بنجامن نے فون لے کر وہ تحریر پڑھی۔ انتھونی نے بھی اسے پڑھا۔ پھر حیرانی سے کہا۔ ”کیا اسے گرفتاری کا خوف نہیں ہے؟ یہ کہیں اطمینان سے ہے۔ اسے آزادی سے موقع مل رہا ہے تب ہی سیلینا کو چیلنج کررہا ہے۔“
اس کی بات ختم ہوتے ہی پھر میسج ٹون سنائی دی۔ سیلینا نے کہا۔ ”مجھے دو۔ میں پڑھوں گی۔“
پہلے بنجامن نے پڑھا۔ اسکرین پر لکھا تھا۔ ”میں نے تم پر گولی چلائی۔ صرف زخمی کیا تاکہ میرے لیے زندہ رہو۔ تمہارا بدن صرف میرے لیے ہے۔ میں بنجامن کو حاصل کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔“
بنجامن نے غصے سے کہا۔ ”یو ڈرٹی ڈاگ! میں تمہیں اپنی سیلینا تک کبھی پہنچنے نہیں دوں گا۔“
باپ بیٹی نے فون لے کر وہ تحریر پڑھی۔ انتھونی نے کہا۔ ”اس سے کہو‘ میسج نہ دے‘ فون پر بات کرے۔“
بنجامن غصے سے تلملا رہا تھا۔
انتھونی نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ ”طیش میں نہ آؤ۔ ہمیں فون پر باتوں ہی باتوں میں اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ کہاں ہوگا؟“
سیلینا نے فون لے کر نمبر پنچ کیے۔ پھر اس کا اسپیکر آن کردیا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ پھر وہ آواز بند ہوگئی۔ سیلینا نے دوسری بار کال کی۔ دوسری بار بھی کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔ بنجامن نے کہا۔ ”وہ مکار بولنا نہیں چاہتا۔ یہ نہیں چاہتا کہ جہاں چھپا ہوا ہے‘ وہاں کا سراغ ہمیں ملے۔“
پھر میسج ٹون سنائی دی۔ انہوں نے تحریر پڑھی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”میں ایک حادثے میں زخمی ہوگیا ہوں۔ زبان بھی زخمی ہے۔ فی الحال بولنے کے قابل نہیں ہوں۔“
وہ بولی۔ ”یہ تو خوشخبری ہے۔ وہ بری طرح زخمی ہے۔ بول نہیں پارہا ہے۔ خدا کرے‘ مرجائے۔“
پھر میسج آیا۔ ”تم بھی زخمی پڑی ہو۔ پتا نہیں‘ تمہاری ٹوٹی ہوئی پسلی جڑنے میں کتنے دن لگیں گے؟ تب تک بنجامن کے ساتھ نہ سوسکو گی‘ نہ اس کے ارمان پورے ہوں گے۔ تب تک میں تمہیں اس سے جدا کردوں گا۔ یہ کبھی نہ بھولنا کہ تم صرف میرے لیے ہو۔ بس سوجاؤ۔“
بنجامن پھر اسے گالیاں دینے لگا۔

☆☆☆

جلالت تھکا ہوا تھا۔ بیڈ پر لیٹنے کے بعد سوگیا تھا۔ ویسے نیند اسے غافل نہیں بناتی تھی۔ وہ بچپن ہی سے سوتے جاگتے وقت محتاط رہنے کا عادی تھا۔ اس وقت بھی ہلکی سی آہٹ پر آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تہ خانے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ میزبان خاتون مارتھا زینے سے اتر کر اس کے پاس آئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا وقت ہوا ہے؟“
اس نے کہا۔ ”دو بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ ویری سوری میں جلد ہی نہ آسکی۔ تم نے درست کہا تھا‘ موساد والے اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کرتے ہیں۔ مجھ جیسی سینئر آفیسر کے گھر میں آسکتے ہیں اور وہ اچانک آگئے تھے۔“
وہ بولا۔ ”تھینکس گاڈ! میں یہاں آگیا تھا۔“
”میں مانتی ہوں۔ جو ہم سوچ نہیں سکتے‘ وہ ہوجاتا ہے۔ وہ اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد مطمئن ہوکر گئے ہیں۔ ان کا شبہ دور ہوگیا ہے۔ شاید پھر کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔“
وہ اوپر رہائش گاہ میں آگئے۔ دوسرے دن دھوپ نکلنے کے بعد تک سوتے رہے۔ مارتھا نے فون کی کالنگ ٹون سن کر آنکھیں کھولیں۔ پیشوائے اعظم ہارپر ہیمر اسمتھ کا نام ننھی سی اسکرین پر نظر آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ وہ دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ”دروازہ کھولو۔“
وہ اٹھ کر سیدھی الماری کی طرف آئی۔ اس کے ایک پٹ پر آئینہ تھا۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھ کر جلدی جلدی لباس درست کیا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے زلفوں کو سنوارا پھر الماری کو کھولا۔ اس کے میکانزم کو آپریٹ کیا تو پیشوا الماری کے پچھلے حصے سے باہر آگیا۔
وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ ”پورے دو ماہ بعد آئے ہو۔ کیا مجھ سے دل بھر گیا ہے؟“
وہ بڑے ہی جذباتی انداز میں اس کی گردن‘ اس کے چہرے کو چومتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے درمیان صرف دل کا معاملہ نہیں ہے۔ نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کا حصول بھی ہے۔ ہم کبھی ایک دوسرے سے بیزار نہیں ہوں گے۔“
انہوں نے الماری کو پہلے کی طرح لاک کردیا۔ بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مارتھا جوانی میں جتنی حسین اور پُرکشش تھی‘ اتنی ہی ذہین اور چالباز بھی تھی۔ پندرہ برس کی عمر سے ہی اسکاٹ لینڈ یارڈ میں تعلیم و تربیت حاصل کرتی رہی تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں رابرٹ ایڈن نامی ایک شخص سے شادی کی۔ پھر بیوہ ہوئی تو اس کی زندگی میں ہارپر ہیمر اسمتھ آیا۔ ان دنوں وہ پیشوا نہیں تھا۔ ایک بہت بڑے ادارے میں مذہبی تعلیمات حاصل کرتے ہوئے ربی کے درجے تک پہنچ رہا تھا۔ مارتھا اس کی مردانہ وجاہت اور شخصیت پر مرمٹی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم دیندار ہو اور میں دنیا دار ہوں۔ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ کیا میری خاطر اپنے مذہب کو چھوڑ کر دنیا داری کی طرف آؤ گے؟“
وہ بولا۔ ”میں مستقبل کا ارب پتی ہوں۔ اربوں ڈالرز کا مالک بننے سے پہلے ایک یا ایک سے زیادہ بیٹوں کا باپ بننا چاہتا ہوں۔ میری دولت سے میرے جانشین استفادہ کریں گے۔“
مارتھا نے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاس کہیں سے دولت آنے والی ہے؟“
”ہاں۔ وہ دولت تمہارے تعاون سے حاصل کروں گا۔ تم نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں رہ کر جرائم کی پوری ہسٹری معلوم کی ہے۔ یہ مجھ سے زیادہ جانتی ہو کہ بینکاری کے معاملات میں کیسی ہیرا پھیری ہوتی ہے؟“
اس نے بتایا کہ دنیا کے تمام امیر کبیر یہودیوں نے نائٹ ٹیمپلرز فنڈ قائم کیا تھا۔ اس فنڈ میں آئندہ اربوں کھربوں ڈالرز جمع ہوتے رہیں گے۔ اس رقم پر اپنی گرفت رکھنے کے لیے وہ تمام یہودی پیشواؤں کا پیشوائے اعظم بننے کے سلسلے میں محنت اور مکاری کے تمام حربے آزماتا رہے گا۔
ان دنوں انتھونی فورڈ جوان تھا۔ اس کا باپ ایک شاطر بینکر تھا۔ وہ اپنے باپ سے تربیت حاصل کرنے کے بعد نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کی تمام رقم ہتھیا لینا چاہتا تھا۔ وہ بینکرز موساد والوں سے خفیہ رابطہ رکھتے تھے۔
اتفاق سے ان ہی دنوں موساد کے چند سینئر افسران نے اسکاٹ لینڈ یارڈ میں مارتھا کی ذہانت اور حسن کارکردگی کا ریکارڈ دیکھا تھا اور اسے ملازمت کی آفر دی تھی۔ وہ آفر قبول کرکے ایک جونیئر آفیسر کے طور پر اسرائیل آگئی تھی۔
ہارپر ہیمر اسمتھ نے کہا۔ ”تم میرے لیے دو اہم کام انجام دے سکتی ہو۔ ایک تو یہ کہ ریکارڈ روم سے ان بینکرز کی مصروفیات اور کمزوریاں معلوم کرتی رہو گی‘ جن کا تعلق نائٹ ٹیمپلرز فنڈ سے ہے۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ میرے لیے کم از کم ایک بیٹا پیدا کرو گی۔ ہم دونوں کا بیٹا اربوں ڈالرز کا وارث ہوگا۔“
ایک بیٹا پیدا کرنے سے مارتھا کو توقع سے زیادہ دولت ملنے والی تھی۔ وہ راضی ہوگئی۔ ہارپر نے کہا۔ ”ہم میاں بیوی بن کر رہیں گے۔ لیکن میں دنیا والوں کے سامنے ایک مجرد پیشوا بن کر رہوں گا۔ یہ ظاہر کروں گا کہ نہ میں نے شادی کی ہے‘ نہ کوئی اولاد ہے۔ اگر ہوتی تو اس کے لیے مجھے دولت کی ہوس ہوتی۔ چونکہ ہوس نہیں ہے‘ اس لیے میں نے نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کی رقم میں خرد برد نہیں کی ہے۔“
مارتھا اس کی پلاننگ سمجھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”نہ میرا کوئی بینک اکاؤنٹ ہوگا‘ نہ میری کوئی جائیداد ہوگی۔ ربی اور پیشواؤں کو رہنے کے لیے جو مکانات دیے جاتے ہیں‘ ایسے ہی کسی مکان میں رہوں گا۔ مذہبی معاملات اور اخراجات کے فنڈ سے جو ہزاروں اور لاکھوں ڈالرز خرچ کروں گا‘ وہ تمہیں دیتا رہوں گا۔ تم ہمارے بیٹے کے نام

سے جائداد بناتی رہو گی۔"

مارتھا نے کہا۔ "تمہاری پلاننگ بہت ہی زبردست اور منافع بخش ہے۔ لیکن میں دنیا والوں سے کیا کہوں گی کہ کس کا بیٹا پیدا کیا ہے؟ جبکہ تم مجرد کہلاتے رہو گے۔"

وہ بولا۔ "ہم کسی ایسے شخص کو تلاش کریں گے' جو تمہارا نمائشی شوہر بن کر رہے۔ تنہائی میں تمہیں ہاتھ نہ لگائے۔ تم صرف میرے نطفے سے اولاد پیدا کرو گی۔"

یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ کسی کو نمائشی شوہر بنانے کا مطلب یہ تھا کہ اسے بھی رازدار بنایا جائے اور وہ اس اہم اور سنگین معاملے میں کسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

یہ مسئلہ اٹک گیا۔ کئی ماہ تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کیا جائے؟ پھر مارتھا کا سامنا ایسے شخص سے ہوا جو عورتوں سے کتراتا تھا۔ اس کی عمر اچھی خاصی تھی۔ اب تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کا نام جیمس وارنر تھا۔

مارتھا نے دو چار ملاقاتوں میں اس کے اندر سے بات نکالی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ عورتوں کے قابل نہیں ہے۔ بہ ظاہر وہ ایک صحت مند مکمل مرد تھا۔ نہ تو زنخوں کی طرح ہاتھ نچا کر باتیں کرتا تھا' نہ مٹک مٹک کر چلتا تھا۔

مارتھا نے کہا۔ "تم شادی نہیں کرتے۔ لوگ تمہارے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ کیا تمہیں اچھا لگتا ہے؟"

وہ بولا۔ "اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر کیا کروں؟ شادی کروں گا تو وہ مجھے دوسرے دن چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اس طرح اور زیادہ جگ ہنسائی ہوگی۔"

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرانی سے پوچھا۔ "کیا بول رہی ہو؟ میں ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ پھر شادی کس لیے کرو گی؟"

"میرا بوائے فرینڈ مجھ سے شادی نہیں کر رہا ہے۔ میں اس کے لیے پاگل ہوں۔ اس کے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ تم میرے لیے شوہر بن کر رہو گے تو کوئی مجھ سے نہیں پوچھے گا کہ بچے کہاں سے لا رہی ہوں؟"

"کیسی عجیب سی بات ہے۔ میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔ تم مجھے ایک قابل شوہر ثابت کرو گی۔ یہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بچوں کا باپ بن سکوں گا۔ تم بہت اچھی ہو۔ مارتھا! وہ بوائے فرینڈ تمہاری قدر کیوں نہیں کر رہا ہے؟"

"اس کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ اس کے متعلق اور کچھ نہ پوچھو۔ جس طرح میں تمہیں ایک مرد کہلانے کے لیے عزت دوں گی' اسی طرح اپنے بوائے فرینڈ کی بھی عزت رکھوں گی۔ تم دونوں کا کبھی سامنا نہیں ہوگا۔ تمہیں کبھی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کون ہے؟"

"ویل۔ میں اس کے متعلق پھر کوئی بات نہیں پوچھوں گا۔"

ان کے درمیان تمام معاملات طے ہو گئے۔ مارتھا نے اپنا وہ موجودہ مکان پچیس برس پہلے خریدا تھا۔ اس مکان کو فروخت کرنے والے نے مارتھا کو یہ راز بتایا کہ صدیوں پرانا یہ مکان تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں ایک جنگجو سپاہ سالار رہتا تھا۔ اس نے برے وقت میں دشمنوں سے بچ نکلنے کے لیے بڑی رازداری سے ایک تہ خانہ اور سرنگ بنوائی تھی۔

وہ تہ خانہ اور سرنگ اب مارتھا اور پیشوا کے کام آرہی تھی۔ اس نے جیمس وارنر کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے شادی کی۔ وہ ازدواجی رشتہ قائم کرنے کے قابل نہیں تھا اس لیے ایک الگ کمرے میں سوتا تھا۔ پیشوا ہارپر اکثر چور راستے سے خوابگاہ میں آتا تھا پھر صبح چلا جاتا تھا۔ ایک برس بعد مارتھا نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کے دونوں شوہر خوش ہو گئے۔ پیشوا ہارپر کا ایک وارث پیدا ہو گیا تھا۔ وہ آئندہ ٹائٹ ٹیمپلرز فنڈ کی رقم سے استفادہ کرنے والا تھا۔ دوسری طرف جیمس وارنر کی مردانگی کا بھرم رہ گیا تھا۔ وہ ایک بیٹے کا باپ کہلانے لگا تھا۔

بعض حالات میں عورتیں اسی طرح مردوں کے درمیان سینڈوچ بن کر بچے پیدا کرتی ہیں۔ بچے کسی کے ہوتے ہیں' نام کسی کا ہوتا ہے۔ کام نکالنے کی بات ہوتی ہے' وہ نکل جاتا ہے۔ ہارپر نے مارتھا سے کہا۔ "ایک سے اطمینان نہیں رہے گا۔ ایک اور بیٹا ہونا چاہیے۔ ہم دونوں کی سلامتی کی فکر کریں گے اور ان کی لمبی عمر کی دعائیں مانگتے رہیں گے۔"

وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ لہٰذا دوسرے کا انتظار کیا جانے لگا۔ دو برس بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ وہ پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ مزید دو برس بعد ایک بیٹا ہوا۔ وہ بھی دنیا میں آ کر چند سانسیں لے کر ختم ہو گیا۔ یوں پہلے بیٹے کی قدر اور اہمیت بڑھ گئی۔

وہ چھ برس کا ہوا تو اس کی پرورش اور رہائش کا انتظام لندن میں کیا گیا۔ پیشوا ہارپر بیٹے سے نہ کھل کر مل سکتا تھا' نہ بیٹا کہہ کر اسے سینے سے لگا سکتا تھا۔ بس یہ اطمینان تھا کہ اپنا خون ہے اور اربوں ڈالرز کی ہیرا پھیری اس بیٹے کو فائدہ

پہنچائے گی۔

اس کے ایک ماہ بعد جیمس وارنر اسپتال میں بیمار رہ کر چل بسا۔ اپنی مجرد زندگی میں مارتھا اور پیشوا ہارپر کے کام آ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے طے کر لیا کہ اب اولاد کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک ہی بیٹا کافی ہے۔

☆☆☆

شادی' بیوی اور بچوں کے بغیر یعنی کسی بھی عورت کے بغیر زندگی گزارنے والا پارسا' راہب پیشوا مارتھا کے بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ سب ہی جانتے تھے اور آنکھوں سے دیکھتے آرہے تھے کہ اس نے شادی نہیں کی۔ گھریلو ازدواجی زندگی نہیں گزاری۔ کبھی کسی عورت کے ساتھ چوری چھپے ناجائز تعلقات نہیں رکھے۔ شاطر وہی ہوتا ہے' جو ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے منصوبے کے مطابق زندگی گزارتا رہتا ہے۔

پیشوا ہارپر شبہات سے بالاتر تھا۔ بیٹا بائیس برس کا ہو چکا تھا۔ اس کا نام ہیمر ایڈن تھا۔ وہ لندن میں عیش و آرام سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مارتھا بیڈ پر لیٹی ہوئی ہارپر کو بتا رہی تھی کہ اس کی توقع کے خلاف موساد والے تلاشی لینے آ گئے تھے۔ اس وقت سولومن چور دروازے کے پیچھے تھا۔ ان کی نظروں میں نہیں آیا۔

ہارپر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سولومن ڈرامائی انداز میں فرار ہو کر تمام انٹیلی جنس اور موساد والوں کے لیے چیلنج بن گیا ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ وہ تلاشی لینے کے بعد تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر گئے ہیں۔ آئندہ ادھر نہیں آئیں گے۔"

وہ بیڈ سے اتر کر بولا۔ "سولومن یہاں کچھ روز تک بے خوف و خطر رہ سکتا ہے۔ یہ میرا بہت ہی وفادار سورما ہے۔ میں اسے ہمیشہ اپنی نظروں میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو! شاید وہ بھی بیدار ہو گیا ہے۔ ناشتا تیار کرو۔"

☆☆☆

لوگ سولومن یہودا کی حقیقت جاننے کے لیے اپنے گھروں میں' دکانوں میں' دفتروں میں' ملوں اور کارخانوں میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ پیشوائے اعظم نے شام ٹھیک چھ بجے اسکرین پر نمودار ہو کر انہیں مخاطب کیا۔

"اے خداوندِ یہودا! ہمارے بارہ سورماؤں کو تحفظ اور سلامتی دے۔

اے خداوند! تُو بڑی قوتوں والا ہے۔ تُو چاہے گا تو تمام سورما خود غرض اور لالچی دشمنوں کے شر سے محفوظ رہیں گے۔

ابھی صرف دو سورما آئے ہیں اور دونوں سے مختلف انداز میں دشمنی کی جا رہی ہے۔ بنجامن یہودا کو زلفوں کے جال میں الجھایا جا رہا ہے اور سولومن یہودا پر ایک مسلمان ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ یہ تو موٹی عقل سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ثبوت کے بغیر الزام قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ آپ سب نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے کہ ہیکل کے سورما سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ ایک طرف آپ کی کتاب یہ کہتی ہے' دوسری طرف ایک لڑکی آپ کے مذہب کو جھٹلاتی ہے۔ آپ فیصلہ کریں' کون سچی ہے؟ آپ کی کتاب یا وہ لڑکی...؟

اور وہ لڑکی جو کہتی ہے کہ سولومن یہودی نہیں ہے' وہ خود حقیقتاً یہودی نہیں ہے۔ یہ دنیا جانتی ہے کہ اس کا باپ انتھونی فورڈ صیہونی عیسائی ہے تو بیٹی بھی آدھی عیسائی' آدھی صیہونی یعنی آدھی تیتر' آدھی بٹیر ہے۔ ہم سے مذہبی دشمنی کر رہی ہے۔ ہماری قوم کو گمراہ کرنے کے لیے ہمارے یہودی سورما کو مسلمان ہونے کا الزام دے رہی ہے۔ اس پر یہ بھی جھوٹا الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ اس نے سیلینا پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ جبکہ حملے کے وقت سولومن ایک ایسے اجلاس میں موجود تھا'

پبلک پراپرٹی

پبلک لائبریری میں ایک خاتون لائبریرین نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ ان کی شہرت سے مرعوب ہو کر ایک صاحب جنہوں نے رکنیت کا نیا نیا کارڈ بنوایا تھا۔ سیدھے کاؤنٹر پر پہنچے اور دریافت کیا۔ "کیا اس کارڈ پر میں کوئی کتاب لے سکتا ہوں؟"

"جی ہاں۔" خاتون لائبریرین نے جواب دیا۔

"محترمہ کیا میں رسالے اپنے نام جاری کرا سکتا ہوں؟"

"جی ہاں! آپ یقیناً ایسا کر سکتے ہیں۔"

"کیا میں آپ کو کھانے پر مدعو کر سکتا ہوں؟"

خاتون نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کاؤنٹر پر جھک کر کہنے لگیں۔ "جناب، لائبریرین یہیں بیٹھ کر دیکھنے کے لیے ہے۔"

(مرسلہ: محمد علی خان دیوان، کراچی)

جہاں صرف ہم ہی نہیں' اسرائیلی اکابرین بھی موجود تھے۔ ایسی اعلیٰ اور معتبر شخصیات کی گواہی کے بعد یہ مان لینا چاہیے کہ سولومن کے خلاف منظم سازشیں ہو رہی ہیں۔

سورما آزاد رہنے کے عادی ہیں۔ لیکن ہمارے قانون کے محافظوں نے کسی ٹھوس الزام اور ثبوت کے بغیر سولومن کو اس کے مکان کی چار دیواری میں قید کر دیا تھا۔ قانون کے محافظوں کے اس غیر قانونی اقدام نے سولومن کو مایوس اور دلبرداشتہ کیا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہماری پولیس اور انٹیلی جنس کے کئی اعلیٰ عہدیدار زرخرید ہیں۔ وہ دشمنوں کے ایک اشارے پر سورما کو گولی مار سکتے ہیں۔ تب اس کے سامنے اپنی جان بچانے کا ایک ہی راستہ تھا کہ وہ قانون کے دشمن محافظوں کی گرفت سے دور چلا جائے اور وہ ان سب کے منہ پر جوتے مار کر جا چکا ہے۔"

وہ بڑی سخت باتیں کر رہا تھا لیکن پولیس اور انٹیلی جنس والے پیشوائے اعظم کو نہ بولنے سے روک سکتے تھے' نہ اس کے خلاف کسی طرح کی قانونی کارروائی کر سکتے تھے۔ سیلینا نے بھی جو رنگ جمایا تھا' وہ پھیکا پڑ رہا تھا۔

امریکا' برطانیہ' فرانس اور جرمنی کے یہودی پیشوا فون کے ذریعے پیشوائے اعظم سے کہہ رہے تھے۔ "ہم آپ کے اس پروگرام کے ذریعہ پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ سیلینا کا سختی سے محاسبہ کیا جائے۔ پولیس اور انٹیلی جنس کے رشوت خور افسران کو گرفتار کر کے انہیں سخت سزائیں دی جائیں۔ جب تک ایک ایک دشمن کا خاتمہ نہ ہو جائے' تب تک سولومن سے کہا جائے کہ وہ روپوش رہے۔ وہ ہمارے ملک میں آئے گا تو ہم اسے پناہ دیں گے۔"

پیشوا ہارپر کی ٹی وی مہم بڑی کامیاب رہی۔ اس کے ایک سوال نے یہودی قوم کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ وہ اپنی کتاب کو سچ مانیں یا ایک لڑکی کے بیان کو؟

ظاہر ہے' وہ اپنے مذہب پر کسی لڑکی کو ترجیح نہیں دے سکتے تھے۔

آخر میں پیشوا نے کہا۔ "ہمارا دوسرا سورما بنجامن یہودا بھی ہماری کتاب کے مطابق سچا اور دیانتدار ہے۔ لیکن عارضی طور پر سیلینا سے سحر زدہ ہو گیا ہے۔ میرے بچے بنجامن! تم خسارے میں ہو اور اپنی یہودی قوم کو خسارے میں ڈالنے والے ہو۔"

یہ آخری الفاظ بول کر وہ اسکرین سے آؤٹ ہو گیا۔ لیکن اس کی باتیں ناظرین کے دماغوں میں گونج رہی تھیں اور دشمنوں کے دماغوں کو سلگا رہی تھیں۔ سیلینا' انتھونی فورڈ اور بنجامن یہودا نے اسے اسکرین پر دیکھا' اس کی باتیں سنیں۔ بنجامن اپنے پیشوائے اعظم سے متاثر ہوا تھا۔ سیلینا ایسے وقت اس سے لگی ہوئی اپنی حرارت اسے پہنچا رہی تھی۔

سیلینا نے کہا۔ "ڈیڈ! وہ میرے خلاف ایسی باتیں کر رہا تھا کہ لوگ اثر لے رہے ہوں گے۔ میرے پچھلے تمام بیانات کو غلط کہہ رہے ہوں گے۔"

اس نے کن انکھیوں سے بنجامن کو دیکھا' وہ چپ تھا۔ سوچ میں گم تھا۔ انتھونی فورڈ نے کہا۔ "میری بیٹی تمہارے لیے جان کی قربانی دے رہی تھی۔ یہ تمہارے نصیب میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے مرتے مرتے بچ گئی۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "سوچ رہا ہوں' سیلینا کی قربانی رائگاں نہ جائے۔ ہماری قوم اس کے بارے میں غلط رائے قائم نہ کرے۔"

انتھونی نے کہا۔ "یہ اندیشہ ہے کہ یہودی قوم اپنے پیشوائے اعظم کو غلط نہیں کہے گی۔ میری بیٹی کا محاسبہ کرے گی۔ ایسے وقت تم کیا کرو گے؟"

"ابھی میرا ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔ اگر سیلینا کا محاسبہ کیا جائے گا تو مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ سیلینا کی خاطر مجھے سولومن سے سمجھوتا کرنا ہو گا۔ میں ابھی جا کر پیشوائے اعظم سے بات کروں گا۔ انہیں اس کے خلاف بولنے سے منع کروں گا۔"

"وہ تمہاری بات نہیں مانیں گے۔ سیلینا کو غلط ثابت کر کے ہی سولومن کے حق میں رائے عامہ ہموار کریں گے۔"

"میں نے کہا نا' میرا ذہن کام نہیں کر رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ تمہارہ کر اس سنگین مسئلے کا کوئی حل نکالوں گا۔"

اس نے سیلینا کو آغوش میں لے کر کہا۔ "مجھے اجازت دو۔ کل کسی وقت آؤں گا اور تمہارے لیے اچھی خبر لاؤں گا۔"

وہ باپ کے سامنے بیٹی کو بڑے ہی جذباتی انداز میں چوم کر چلا گیا۔ انتھونی نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے بنجامن کو توجہ سے دیکھا؟ کچھ محسوس کیا؟"

اس نے باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "میں قیافہ شناس ہوں۔ چہرہ دیکھ کر بدلتے ہوئے مزاج کو سمجھ لیتا ہوں۔ پیشوا کی باتوں نے اسے متاثر کیا ہے۔"

وہ قائل ہو کر بولی۔ "ہاں۔ وہ چپ چپ سا تھا۔ شاید یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ امریکا اور یورپ کے

تمام پیشواؤں کے مطالبات میرے خلاف ہیں اور میرا محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ تمہارے لیے پریشان ہو گا۔ اس کے باوجود اپنے رہنما سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا ہے۔ جب میں نے پیشوا کو غلط کہا تو اس کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی تھی۔"

"آپ محتاط رہیں۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کریں۔"

وہ بولا۔ "تم بھی محتاط رہو۔ اس میں تبدیلی نہ آنے دو۔ اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھو۔"

سیلینا نے شکست کھانے کے انداز میں سر جھکا لیا۔ پتا نہیں' ٹوٹی ہوئی پسلی کب جڑنے والی تھی؟ وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں تھی۔ اس پر گرفت مضبوط رکھنے والی سرتیں اسے دے نہیں سکتی تھی۔ مرد اگر دور سے بہل جاتے تو عورت کی ضرورت نہ ہوتی۔

اگلے' دوسرے دن سے جلالت کی مخالفت کرنے والے اعلیٰ حکام کو' آرمی کے اعلیٰ افسران کو' پولیس' انٹیلی جنس اور موساد والوں کو معلوم ہو رہا تھا کہ پیشوائے اعظم کی ہدایات سے بھرپور تقریر یہودی قوم کو متاثر کر رہی ہے۔ وہ سیلینا کی مخالفت میں اور سولومن کی حمایت میں بول رہے تھے۔

وہ ہیکل کے اس سورما کی یروشلم میں واپسی چاہتے تھے' ان کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ سیلینا پھر الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے عوام کے سامنے آئے۔ اس پر جھوٹ بولنے اور یہودی قوم کو گمراہ کرنے کا الزام ہے۔ اس الزام کو غلط ثابت کرے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اسے گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔

تیسرے دن سیلینا کو لوگوں نے ٹی وی اسکرین پر دیکھا۔ وہ اسپتال کے بیڈ پر پڑی تھی۔ رو رو کر کہہ رہی تھی۔ "میری سچائی کا ثبوت آپ سب کے سامنے ہے۔ مجھے سچ بولنے کے جرم میں قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔"

پیشوا ہارپر نے اسکرین پر آ کر کہا۔ "یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس وقت تم پر گولی چلائی گئی' اس وقت سولومن اسرائیلی اکابرین کے اور ہمارے سامنے موجود تھا۔ تمہارے کئی یار ہیں۔ انہوں نے رقابت میں تمہیں مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ تم یہ ثابت کرو کہ سولومن مسلمان ہے اور تمہارے جیسی گناہ گار لڑکی نے اسے فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ دیکھا تھا۔"

وہ بولی۔ "میں کیسے ثابت کر سکتی ہوں؟ میں نے اپنی آنکھوں سے جو دیکھا' وہ کہہ دیا۔"

"تم کسی ثبوت اور گواہ کے بغیر ہیکل کے ایک سچے یہودی سورما کے خلاف غلط کہو گی تو اسے درست تسلیم نہیں کیا جائے گا۔"

ٹی وی اسکرین پر پیشوا ہارپر' انتھونی فورڈ' سیلینا اور بنجامن کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔ بحث کے دوران ٹیلی فون کالز بھی آ رہی تھیں۔ کچھ کال کرنے والے پیشوا اور سولومن یہودا کے حمایتی تھے۔ کچھ مخالفت میں بول رہے تھے۔ ایسے وقت فون سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "معزز و محترم پیشوائے اعظم کو سلام!"

سب نے آواز کی طرف توجہ دی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ "اس وقت صرف آپ ہی نہیں' ہماری پوری قوم میری آواز سن رہی ہے۔ پلیز۔ تمام ناظرین پوری توجہ سے سنیں۔ میرا نام جوزف یہودا ہے۔ میں ہیکل کا تیسرا سورما ہوں۔"

یہ ایسی بات تھی کہ سب ہی چونک گئے۔ پیشوا ہارپر بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آشیرواد دینے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "خداوند یہودا تمہیں سلامتی دے۔ تم ہیکل کے سورما ہو۔ پوری یہودی قوم کے لیے معزز اور محترم ہو۔ ہمارے نجات دہندہ ہو۔ یہ پیشوائے اعظم تم سے کہتا ہے' فون کال نہ کرو۔ ابھی ہمارے روبرو آ جاؤ۔"

"مقدر میں ہماری آمد کا جو وقت لکھ دیا گیا ہے' ہم اسی کے مطابق آئیں گے۔ میں آپ کو اور اپنی یہودی قوم کو یہ خوشخبری سنا رہا ہوں کہ ہیکل کے مزید دو سورما میرے رابطے میں ہیں۔ ان کے نام جیکب یہودا اور داؤد یہودا ہیں۔"

یہ باتیں صرف پیشوا ہی نہیں' پوری قوم بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ پیشوا نے کہا۔ "یہ تو واقعی بہت بڑی خوشخبری ہے۔ تم تینوں کی آمد سے ہیکل کے سورماؤں کی تعداد پانچ ہو جائے گی۔"

بنجامن نے کہا۔ "میں دل کی گہرائیوں سے اپنے ساتھی سورماؤں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہمارے درمیان کوئی دیوار' کوئی فاصلہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم تینوں فی الحال یہاں نہیں آ سکتے تو مجھے اپنے پاس بلا سکتے ہو۔"

جوزف یہودا نے کہا۔ "ہم یکجا ہوں گے۔ دشمن پھر اپنا کھیل کھیلیں گے۔ جس طرح سولومن پر جھوٹے الزامات لگا کر اسے فرار ہونے اور روپوش ہونے پر مجبور کیا گیا ہے' اسی طرح ہمیں بھی منہ چھپانے پر مجبور کیا جائے گا۔"

بنجامن نے بیڈ پر پڑی ہوئی سیلینا کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "سولومن پر جھوٹا الزام نہیں ہے۔ سیلینا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ سولومن آج بھی اس کی جان لینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔"

’’بنجامن! تم سورما ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہیکل کے سورما کبھی کسی عورت سے دشمنی نہیں کرتے۔ ہم مرد ہیں اور مردوں کی دشمنی کا منہ توڑ جواب دیتے ہیں۔ میں بحث نہیں کروں گا‘ بس اتنا کہوں گا کہ عورت کے فریب سے نکل آؤ۔ ورنہ تم یروشلم میں تنہا رہو گے۔ سولومن کی باعزت واپسی نہیں ہوگی تو ہم کبھی ہیکل میں نہیں آئیں گے۔‘‘

اس کی باتوں سے پیشوائے اعظم کا پلڑا بھاری ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ’’جوزف یہودا! تم تینوں فی الحال نہیں آؤ گے۔ لیکن اپنے پیشوائے اعظم سے رابطہ تو رکھو گے؟‘‘

’’بے شک۔ ہمارے پاس آپ کا فون نمبر ہے۔ ہم رابطہ رکھیں گے اور آپ سے ہدایات حاصل کرتے رہیں گے۔‘‘

سیلینا اور انتھونی فورڈ کے دل ڈوب رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہودی قوم کو اچانک ہی تین سورماؤں کے وجود کی نوید ملے گی اور وہ پیشوائے اعظم اور سولومن کی حمایت میں بولیں گے۔ انتھونی نے کہا۔ ’’یہ واقعی بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اچانک ہی ہیکل کے تین سورما بیک وقت پیدا ہوگئے ہیں اور پیدا ہوتے ہی اپنی قوم سے پردہ کررہے ہیں۔ صرف فون کال کے ذریعے اپنے سورما ہونے کا یقین دلا رہے ہیں۔‘‘

جوزف یہودا نے کہا۔ ’’ہم وہاں نہیں آسکتے۔ تمہارے جیسے دشمن سولومن کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں‘ وہ ہمیں بھی جانی نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہم تمہیں اپنے پاس بلائیں گے تو تمہارے پیچھے دشمن بھی چلے آئیں گے۔ تم ابھی یہ تسلیم نہیں کرو گے کہ دشمنوں کی گود میں بیٹھے ہوئے ہو۔‘‘

’’میں ابھی تسلیم کروں گا۔ صرف ایک بار اپنے چہرے دکھا دو اور ہیکل کے سورما ہونے کے ٹھوس ثبوت پیش کردو۔‘‘

’’ہاں... اپنی قوم کو یقین دلانے کے لیے ہمیں ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ انتظار کرو۔ ہم اعلان کریں گے کہ جلد ہی ٹھوس ثبوت کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے قوم کے سامنے پیش ہوں گے۔ ڈیٹس آل...‘‘

اس روز سے یہودیوں کے ہر طبقے میں‘ ہر گھر میں یہ بحث ہونے لگی کہ نئے آنے والے تین سورماؤں کا وجود ہے تو وہ سیلینا اور انتھونی کے خلاف درست کہہ رہے ہیں۔

پیشوائے اعظم اور تمام ربیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ انہیں تو جیسے آسمانی مدد حاصل ہورہی تھی۔ ایک تو اچانک ہی تین سورما آگئے تھے پھر یہ کہ آتے ہی پیشوائے اعظم اور سولومن کی حمایت میں بول رہے تھے۔

ایک بینکر برنارڈ او کلے نے کہا۔ ’’ہم بھی ایسی چال چل سکتے ہیں۔ ہم بھی نقلی سورما پیدا کرکے پیشوا اور سولومن کے خلاف طرح طرح کی باتیں بنا سکتے ہیں۔ اس کے سورما سولومن کی حمایت کررہے ہیں۔ ہمارے سورما سیلینا کی سچائیاں بیان کریں گے۔‘‘

جے کے شیروِن نے کہا۔ ’’اچھا آئیڈیا ہے۔ وہ پیشوا جیسی چال چل رہا ہے‘ ویسی ہم بھی چلیں گے۔ اس کا حربہ اسی پر آزمائیں گے۔‘‘

انتھونی نے کہا۔ ’’مسٹر گورڈن! تمہارا یہ آئیڈیا دل کو لگ رہا ہے۔ اس طرح لوگ میری بیٹی کے متعلق غلط رائے قائم نہیں کریں گے اور نائٹ ٹیمپلرز فنڈ پر ہماری گرفت مضبوط رہے گی۔ ایک اور بینکر ایش ٹرومین نے کہا۔ ’’نقلی سورما پیش کرنے میں زیادہ دردسری نہیں ہوگی۔ سولومن اور بنجامن جیسے قدآور باڈی بلڈرز بہت مل جائیں گے۔ ہم قدیم عبرانی زبان جاننے والوں کو خرید کر ان کے بازوؤں پر سورماؤں کے خاص پیدائشی نشان بنوائیں گے۔ وہ ایک آدھ ہفتے کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد اصل سورما دکھائی دیں گے۔‘‘

وہ اس منصوبے کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ ان کے پاس دولت اور وسائل کی کمی نہیں تھی۔ وہ جلد ہی یہودی قوم کو مزید سورماؤں کی آمد کی خبر دے کر خوش کرسکتے تھے۔

ایک مہینا گزر گیا۔ دوسرا مہینا بھی گزرنے لگا۔ وہ تین نئے سورما پیشوائے اعظم سے فون پر باتیں کرتے تھے اور اس کے ذریعہ اپنی قوم تک یہ خبر پہنچاتے تھے کہ ابھی وہ اپنے اطراف سیکیورٹی کے انتظامات کو یقینی بنارہے ہیں۔ اخبارات‘ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ سولومن یہودا سے کہہ رہے ہیں کہ وہ ان کے پاس پناہ لینے کے لیے چلا آئے۔ وہ چاروں یکجا اور متحد ہوکر دشمنوں پر بھاری پڑیں گے۔

جلالت ان نئے اجنبی سورماؤں پر بھروسا نہیں کرسکتا تھا۔ فی الوقت جہاں تھا‘ وہاں دشمنوں کی پہنچ سے دور رہ کر بڑے آرام اور سکون سے اس گھر میں رہنا چاہتا تھا۔

پہلے ارادہ تھا‘ دو چار ہفتے گزار کر چلا جائے گا۔ پھر نئے سورماؤں کی آمد سے یہ شبہ ہورہا تھا کہ ایک نیا ڈراما شروع ہوگیا ہے۔ یہ ناٹک کون کھیل رہا ہے؟ کیوں کھیل رہا ہے؟ یہ معلوم ہونے تک اسے موجودہ پناہ گاہ میں ہی رہنا تھا۔

پیشوا ہارپر اپنی مصروفیات کے باعث کبھی کبھی وہاں آتا تھا۔ اس نے جلالت سے کہا۔ ’’وہ تینوں سورما ہمارے حمایتی ہیں۔ انہوں نے پوری قوم کے سامنے سیلینا کو جھوٹی اور چالباز کہا ہے۔ وہ بھی یروشلم میں تمہاری طرح اپنے لیے خطرات کو سمجھ رہے ہیں۔ یہاں نہ آکر تمہیں اپنے پاس بلا رہے ہیں۔‘‘

جلالت نے کہا۔ ’’اور جب میں پناہ لینے ان کے پاس جاؤں گا تو وہاں موساد کے شاطر جاسوس اور مسلح سپاہی ہوں گے۔ مجھے زنجیریں پہنا کر واپس یہاں لے آئیں گے۔‘‘

پیشوا نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ ’’ایسا ہوسکتا ہے۔ ہم کسی پر بھروسا نہیں کرسکتے۔‘‘

’’ان تینوں نے اچانک ہی خود کو ظاہر کیا ہے۔ وہ کون ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ ان کے بارے میں بہت ساری اہم معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔‘‘

مارتھا ان دنوں بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے کوئی اسپتال لے جانے والا اور علاج کرانے والا مرد نہیں تھا۔ پیشوا خود کو اس کے شوہر یا کسی رشتہ دار کی حیثیت سے ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تو یہی ظاہر کرتا آرہا تھا کہ نہ تو اس نے شادی کی ہے‘ نہ آگے پیچھے اس کا کوئی رشتہ دار ہے۔

جلالت وہاں روپوش تھا۔ اس گھر سے باہر جا نہیں سکتا تھا۔ تب مارتھا نے اسے یہ راز بتایا۔ ’’پیشوائے اعظم اور ان کے ربیوں نے ایک بہت بڑی لائبریری قائم کی ہے۔ وہاں ہزاروں کتب اور قدیم عبرانی زبان کے نسخے رکھے ہیں۔ جس کمرے میں وہ نسخے رکھے ہیں‘ وہاں صرف پیشوا اور ربی جاتے ہیں۔ سرکاری افسران خصوصی اجازت حاصل کرنے کے بعد وہاں جاسکتے ہیں۔‘‘

جلالت نے کہا۔ ’’میں سمجھ گیا۔ تہ خانے کی وہ سرنگ لائبریری کے اس خاص ممنوعہ کمرے میں پہنچاتی ہے۔‘‘

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ’’ہاں۔ اس کے آخری حصے میں ایک زینہ ہے۔ اس زینے کے اوپری حصے پر ایک ٹھوس دیوار ہے۔ آگے راستہ نہیں ہے۔‘‘

جلالت نے کہا۔ ’’ریموٹ کنٹرولر کے ذریعہ راستہ کھلے گا۔‘‘

وہ بولی۔ ’’ہاں۔ الماری کے سیف میں ریموٹ کنٹرولر رکھا ہوا ہے۔‘‘

اسی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ مارتھا کے ساتھ بینک میں کام کرنے والی ایک سہیلی نے فون پر کہا۔ ’’آج کا اخبار پڑھو۔ ہیکل کے تین اور سورماؤں کا سراغ مل رہا ہے۔‘‘

مارتھا نے پوچھا۔ ’’تین اور...؟ یعنی وہ جو داؤد یہودا‘ جوزف یہودا اور جیکب یہودا ظاہر ہورہے ہیں‘ ان کے علاوہ تین اور سورماؤں کا سراغ مل رہا ہے؟‘‘

’’اخبار میں کچھ ایسا ہی لکھا ہے۔‘‘

اس کی سہیلی نے کہا۔ ’’اس خبر میں ایک مادام نینسی نکاؤلی کا ذکر تھا۔ وہ خاتون ستارہ شناس اور قیافہ شناس مانی جاتی تھی۔ علم الاعداد اور تاش کے پتوں سے ماضی‘ حال اور مستقبل کی درست باتیں بتاتی تھی۔

اس نے پیشگوئی کی ہے کہ ماہِ رواں میں ہیکل کے مزید تین سورما نمودار ہوں گے۔ اس طرح سورماؤں کی کل تعداد آٹھ ہوجائے گی۔ یہودی قوم کا ستارہ عروج پر ہے۔ سالِ رواں کے آخر تک بارہ سورما ہیکل میں یکجا ہوں گے اور اپنی قوم کو تابوت یہودا پیش کریں گے۔‘‘

مارتھا نے کہا۔ ’’یہ تو واقعی ہمارے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تین اور سورما جو آنے والے ہیں‘ وہ بھی پیشوا ہارپر کے حمایتی ہوں گے۔‘‘

جلالت نے کہا۔ ’’معلوم نہیں یہ مادام نینسی نکاؤلی کون ہے؟ بعض نجومی اور عامل سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے چونکا دینے والی پیشگوئی کرتے ہیں۔‘‘

مارتھا نے کہا۔ ’’پیشوائے اعظم پیشگوئی کرنے والی مادام سے رابطہ کرکے ضرور اس کی حقیقت معلوم کرلیں گے۔‘‘

جلالت نے کہا۔ ’’مشکل تو یہ ہے کہ ہم ان سے فون پر رابطہ نہیں کرسکتے۔ ہماری کالز ریکارڈ کی جاسکتی ہیں۔ ورنہ یہ معلوم ہوجاتا کہ وہ مادام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے کیا کررہے ہیں؟ میں یہاں چار دیواری میں محدود ہوگیا ہوں۔ باہر کے بدلتے ہوئے حالات کا علم نہیں ہورہا۔‘‘

اُدھر مادام نینسی نکاؤلی کی پیشگوئی نے پانچوں بینکرز کے دل و دماغ میں بھی کھلبلی پیدا کردی تھی۔ وہ پانچوں جعلی سورما پیدا کرنے کے منصوبے پر عمل کررہے تھے۔ انہوں نے اپنی پلاننگ کے مطابق تین ایسے قدآور پہلوانوں کو خرید لیا تھا‘ جو کسی حد تک قدیم عبرانی زبان جانتے تھے اور آئندہ سورماؤں کا رول ادا کرسکتے تھے۔ ایسے ہی وقت مادام کی پیشگوئی نے انہیں چونکا دیا تھا۔

انہوں نے اخبار کے ذریعے مادام کا پتا ٹھکانا اور فون نمبر معلوم کیا۔ وہ چلی کے شہر سانتیاگو میں رہتی تھی۔ چلی برازیل اور پورے ساؤتھ امریکا میں اپنے پُراسرار علوم

کے باعث مشہور و معروف تھا۔

انتھونی نے فون کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے دو فون نمبرز تھے۔ دونوں مصروف رہتے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اس کے پی اے نے فون پر پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟ کیا اپنی کوئی پرابلم حل کرنے کے لیے مادام سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں۔ ہم آج ہی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پانچ بینکرز ہیں۔ ابھی تل ابیب میں ہیں۔ دس گھنٹوں میں سانتیاگو پہنچ کر مادام سے ملاقات کر سکیں گے۔''

''سوری۔ ایک ہفتے سے پہلے ملاقات کا وقت مقرر نہیں ہو سکے گا۔ وہ بہت مصروف ہیں۔''

انہوں نے اسرائیلی حکام سے کہا کہ وہ سفارتی سطح پر مادام نینسی سے کل تک ملاقات کا وقت مقرر کرائیں اور آج کسی بھی پہلی فلائٹ میں پانچ بینکرز کے لیے سیٹیں او کے کرا دیں۔ وہ پیشوائے اعظم سے پہلے مادام تک پہنچنا چاہتے تھے۔

پیشوا نے ملاقات کا شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا۔ چلی کے پیشوا اور ربیوں سے فون پر کہا۔ ''ابھی مادام نکاڈلی سے ملاقات کرو اور اس سے گفتگو کے دوران اپنا فون آن رکھو۔ ہم اپنے فون پر مادام کی باتیں سنتے رہیں گے۔''

چلی کا پیشوا اپنے ربیوں کے ساتھ مادام نکاڈلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اگرچہ وہ وقت مقرر کیے بغیر کسی سے نہیں ملتی تھی۔ مگر وہ مذہبی رہنما تھے۔ ان کی آمد کی خبر سنتے ہی اس نے خود دروازے پر آ کر ان کا استقبال کیا اور کہا۔ ''یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ایسے رہنما میرے دروازے پر آئے ہیں۔ تشریف رکھیں۔''

وہ سب آرام دہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ پیشوا نے اپنے فون پر پیشوا ہارپر کے نمبر پنچ کیے۔ اسے اطلاع دی کہ ہم مادام نکاڈلی سے گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ سماعت فرمائیں۔

پیشوا ہارپر نے فون کو کان سے لگائے رکھا۔ چلی کے پیشوا نے مادام سے کہا۔ ''تم نے ہیکل کے تین سورماؤں کے متعلق پیشگوئی کی ہے۔ ہمارے پیشوائے اعظم ہارپر ہیرامتھ نے ہمیں ہدایت کی ہے کہ ہم ابھی تم سے ملاقات کریں۔''

''میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ وقت مقرر کیے بغیر کسی سے نہیں ملتی لیکن آپ حضرات محترم ہیں۔ میری رہنمائی فرمانے آئے ہیں۔ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔''

وہ ایک بوڑھی خاتون تھی۔ گورے بدن پر سیاہ لبادہ پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی مالائیں تھیں۔ کانوں میں ویسے ہی موتیوں کے آویزے تھے۔ سر کے سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی' جیسے خنجر کی دھار چمک رہی ہو اور سیدھی دل میں اتر رہی ہو۔

اس کے چہرے سے اور آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بلا کی مکار اور خطرناک ہے۔ پیشوا نے کہا۔ ''تم اپنے علوم کے ذریعے تین سورماؤں کے متعلق معلومات رکھتی ہو۔ یہ یقین سے کہتی کہ وہ تینوں ماہِ رواں میں نمودار ہوں گے۔''

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ''بے شک۔ میرا علم سچا ہے۔ میں اپنے علم کی روشنی میں ان کے پاس پہنچ گئی ہوں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تینوں کے نام کیا ہیں اور وہ کہاں ہیں؟''

ایک ربی نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں؟''

''سوری۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے' جب تک وہ نہیں چاہیں گے' میں ان کی نشاندہی نہیں کروں گی۔''

پیشوا ہارپر نے فون کے ذریعے کہا۔ ''میں مادام کی باتیں سن رہا ہوں۔ فون اسے دو۔''

چلی کے پیشوا نے فون نکاڈلی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے لے کر کان سے لگا کر بولی۔ ''پیشوائے اعظم کو سلام! یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ آپ سے گفتگو کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''خداوند یہوواتم پر رحمتیں نازل کرے۔''

وہ بولی۔ ''اور وہ برکتیں بھی نازل کرے' جو آپ پر اور پانچ بینکروں پر نازل ہونے والی ہیں۔''

اس نے اشارتاً کہہ دیا کہ وہ سب نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کی کثیر رقم حاصل کرنے کے لیے جو خفیہ کھیل کھیل رہے ہیں' اسے وہ خوب جانتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے پیشوا ہارپر کو چپ سی لگ گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''اگر تم واقعی تین سورماؤں سے مل چکی ہو اور اگر وہ نقلی نہیں ہیں تو مجھ سے ملاقات کراؤ۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''آپ جہاں کہیں گے' جب کہیں گے' حاضر ہو جاؤں گی۔''

''یروشلم ہمارا روحانی مرکز ہے۔ آج ہی یہاں چلی آؤ۔''

''میں کل کسی فلائٹ سے آؤں گی۔''

''تینوں سورماؤں کے ساتھ آؤ۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا وہاں سورماؤں کی سلامتی کی کوئی ضمانت ہے؟ اگر ہے تو سولومن کو تحفظ حاصل کیوں نہ ہو سکا؟ وہ فرار ہونے اور روپوش رہنے پر مجبور کیوں ہو گیا؟''

"میں مانتا ہوں' موجودہ حالات سورماؤں کے موافق نہیں ہیں۔"

"اس لیے وہ میرے ساتھ نہیں آئیں گے۔"

"میں وہاں آسکتا ہوں' جہاں وہ حفاظت اور سلامتی سے ہیں۔ میں انہیں آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنے کے بعد معلوم کروں گا کہ تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں سوچوں گی کہ کس ملک میں آپ کو بلا کر ان کا دیدار کرانا چاہیے؟"

"ابھی سوچو۔ اس سلسلے میں دیر نہ کرو۔"

"دیر تو ہوگی۔ پانچ بینکرز بھی ان سے ملنے کے لیے بیتاب ہیں۔ میں آپ سے اور ان سے ملوں گی۔ دیکھوں گی' سمجھوں گی کہ دونوں میں سے کون مجھے برابر کا پارٹنر بنائے گا؟ ابھی ذرا صبر و تحمل سے کام لیں۔"

پیشوا ہارپر نے تڑپ کر کہا۔ "پلیز۔ ان پانچوں سے کوئی ڈیل نہ کرو۔ پہلے مجھ سے ملو۔ اپنی توقع کے مطابق فائدے میں رہو گی۔"

"میں آپ کا فون نمبر سیو کر رہی ہوں۔ بعد میں بات کروں گی۔"

اس نے رابطہ ختم کر کے اس کے نمبر اپنے فون میں سیو کیے۔ پھر چلی کے پیشوا کا فون واپس کرتے ہوئے کہا۔ "میں بہت مصروف ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔ میں اپنے اسٹڈی روم میں جا رہی ہوں۔"

وہ کوئی جواب سنے بغیر اسٹڈی روم کی طرف چلی گئی۔ اس کی پیشگوئی سے پیشوا اور ربیوں نے توہین محسوس کی۔ انہوں نے ناگواری سے اس دروازے کی طرف دیکھا' جہاں سے وہ گزر کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ وہاں سے اٹھ کر جانا چاہتے تھے۔ پھر رک گئے۔ اسی دروازے سے وہ ناشتے کی ٹرالی کے ساتھ آرہی تھی لیکن حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ اچانک ہی بڑھاپا ختم ہو گیا تھا۔ وہ جوان ہو گئی تھی۔

پیشوا نے حیرانی سے پوچھا۔ "مادام تم...؟ یہ تم ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "میں مادام نہیں ہوں۔ وہ میری ماما ہیں۔ میں ان کی بیٹی بونی نکاؤلی ہوں۔ آپ حضرات میری ماما کے رویے سے بدظن نہ ہوں۔ جب انہیں اپنی مصروفیات یاد آتی ہیں تو وہ ادب و آداب بھول کر محفل سے چلی جاتی ہیں۔"

وہ کھانے پینے کے لیے انہیں پلیٹیں پیش کرنے لگی۔ ایک ربی نے پوچھا۔ "کیا تم بھی اپنی ماں کی طرح قیافہ شناسی اور علم نجوم سیکھ رہی ہو؟"

"وہ تو بچپن سے سیکھتی آرہی ہوں۔ لیکن مجھے ریسلنگ سے دلچسپی ہے۔ اب تک چھ پہلوانوں کو رنگ سے باہر پھینک چکی ہوں۔"

انہوں نے اسے توجہ سے دیکھا۔ وہ تقریباً چھ فٹ اونچی باڈی بلڈر دکھائی دے رہی تھی۔ ایک ربی نے کہا۔ "ہاں۔ میں نے دیکھا ہے۔ عورتوں کے درمیان بھی ریسلنگ ہوتی ہے۔"

بونی نکاؤلی نے کہا۔ "میں عورتوں سے نہیں' مردوں سے لڑتی ہوں۔ پچھلی کے دو سورما مجھے زیر کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ میں ان پر حاوی تو نہ ہو سکی لیکن وہ بھی مجھے زیر نہ کر سکے۔"

پیشوا نے پوچھا۔ "وہ سورما کہاں ہیں؟"

"سوری۔ یہ میری ماما کا راز ہے۔ میں اس معاملے میں گونگی ہوں۔"

انہوں نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ چپ چاپ کھا پی کر وہاں سے چلے گئے۔ پی اے نے اسٹڈی روم میں آکر کہا۔ "مادام! وہ پانچوں بینکرز کئی بار فون کر چکے ہیں۔"

نکاؤلی نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ "بہت بے چین ہیں۔ اچھا ہے' تڑپتے رہیں۔ میری قدر و قیمت بڑھتی رہے گی۔"

پی اے نے کہا۔ "ابھی مسٹر انتھونی نے فون پر بتایا ہے' وہ پانچوں کل شام تک یہاں آرہے ہیں۔"

وہ بولی۔ "ان سے کہہ دو۔ یہاں نہ آئیں۔ میں کل رات تل ابیب پہنچ رہی ہوں۔ وہیں ملاقات ہوگی۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ بونی نے پوچھا۔ "ویل ماما! تم تل ابیب جا رہی ہو؟"

"ہم دونوں جا رہے ہیں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا کھیل شروع کر رہی ہیں؟"

"شروع ہو چکا ہے۔ وہاں تم اپنا کام دکھاؤ گی۔ یہاں جو سورما ہیں' وہ تمہیں زیر نہ کر سکے۔ ادھر تین سورما جوزف یہودا' جیکب یہودا اور داؤد یہودا کسی روز یروشلم پہنچیں گے۔ تم انہیں بھی بے وقوف بناؤ گی۔"

"وہ تو بناؤں گی۔ انہیں تمہارے زیرِ اثر لاؤں گی۔"

"فی الحال یروشلم میں بنجامن ہے۔ وہ سیلینا کا دیوانہ ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ اس کی دیوانگی چھومنتر کر دوں گی۔"

یہ کہہ کر بونی خلا میں تکنے لگی۔ تصور کی آنکھیں جلالت اسرار کو دیکھنے لگیں۔ ماں نے پوچھا۔ "سولومن کو سوچ رہی ہو؟"

"ہاں۔ سوچ رہی ہوں' نہ جانے کہاں جا کر چھپ گیا ہے؟ تمہارا علم کہتا ہے' میں اسے زیر نہیں کر سکوں گی۔ وہ میرے لیے چیلنج بن گیا ہے۔"

ماں نے کہا۔ "میں نے اس کے نام کے اعداد کا حساب کیا ہے۔ تاش کے پتے بھی یہی کہتے ہیں' تم اسے ٹریپ نہیں کر سکو گی۔"

"او ماما! مجھے غصہ نہ دلائیں۔ میں جھنجلا کر سوچتی ہوں' وہ ابھی سامنے آجائے' ابھی اس سے نمٹ لوں گی۔"

"غصہ کمزور بنا دیتا ہے۔ ابھی سولومن کو دماغ سے نکال دو۔ صرف ان سورماؤں کو اہمیت دو' جن سے سامنا ہونے والا ہے۔"

صرف بونی نکاؤلی کو ہی نہیں' پیشوا ہارپر اور پانچ بینکرز کو بھی آنے والے سورماؤں کا سامنا کرنا تھا اور انہیں اپنی اپنی طرف مائل کر کے اپنے اپنے زیرِ اثر لانا تھا۔ یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ تین سورما مادام کے ذریعے آئیں گے۔ وہ کہاں ہیں؟ ان کے نام کیا ہیں؟ ابھی یہ معلوم نہیں ہوا تھا۔

جوزف' جیکب اور داؤد یہودا کی طرف سے پیشوا ہارپر کو اطمینان تھا۔ وہ تینوں اس کے حامی اور فرمانبردار تھے۔ فون کے ذریعے اس سے رابطہ رکھتے تھے۔ فکر اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ مادام نکاؤلی ایک بہت بڑا گیم کھیلنے ان کے مقابلے پر آئی تھی۔ اس سے نمٹنے کے لیے پیشوا ہارپر اور انتھونی فورڈ اپنی اپنی جگہ الرٹ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

مارتھا پھر بیمار ہو گئی تھی۔ اسے اسپتال لے جانے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک ڈاکٹر وہاں آکر اس کا علاج کر رہا تھا۔ اُمید تھی کہ طبیعت سنبھل جائے گی لیکن اُمید نے اچانک ہی دم توڑ دیا۔ خلافِ توقع اس کی سانسیں پوری ہو گئیں۔

پیشوائے اعظم کو اطلاع دینی ضروری تھی۔ وہ زینے سے اتر کر تہ خانے میں آگیا۔ پھر سرنگ میں داخل ہو کر ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ اس کے آخری سرے پر مذہبی لائبریری کا وہ خاص کمرا تھا' جہاں ہزاروں سال پرانے تاریخی اور مذہبی نسخے رکھے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں صرف پیشوائے اعظم اور اس کے ربی جاتے تھے۔ کسی اور کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

اس وقت وہ اپنے معتمد خاص ربیوں کے ساتھ اس کمرے میں تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کوئی وہاں آ نہیں سکتا تھا۔ جلالت اس کمرے کی ایک دیوار کے پیچھے آگیا تھا۔ وہ سرنگ کا آخری حصہ تھا۔ ریموٹ کنٹرولر کے ذریعہ دیوار کا وہ حصہ ایک طرف سرک جاتا تھا۔ یوں کمرے میں داخل ہونے کا راستہ کھل جاتا تھا۔

اس نے جیب سے ریموٹ نکال کر ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھا۔ زیرو ون سیون کے نمبر پنچ کرتے ہی دروازہ کھلنے والا تھا۔ لیکن اس نے اسے آپریٹ نہیں کیا۔ ذرا رک کر دیوار سے کان لگا کر سننے لگا۔

پیشوا اور ربیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پیشوا ہارپر کہہ رہا تھا۔ "جلالت پوری طرح میری مٹھی میں ہے۔ جس طرح انتھونی نے اپنی بیٹی کے ذریعے بنجامن یہودا کو پھانس رکھا ہے' اسی طرح جلالت کو میں نے اپنی حکمت عملی سے اپنے شکنجے میں کس لیا ہے۔"

ایک ربی نے کہا۔ "آپ سولومن کو پہلی بار جلالت کہہ رہے ہیں۔"

"اس لیے کہ اس کے اندر کا بھید جانتا ہوں۔ ہم نے اسے یہودی بنایا ہے۔ لیکن وہ اب بھی مسلمان ہے۔ اپنے اندر کا بھید مجھ سے چھپاتا ہے۔ مگر میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ میں تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں۔"

جلالت کو حقیقت معلوم ہو رہی تھی کہ پیشوا اسے مسلمان سمجھ رہا ہے اور جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔ ایک ربی نے کہا۔ "آپ حقیقت جاننے کے باوجود اس پر بھروسا کر رہے ہیں۔ کیا وہ تابوت یہودا لانے تک آپ کا وفادار رہے گا؟"

"ضرور رہے گا۔ یہاں قدم قدم پر اس کے دشمن ہیں۔ اسے میرے ہی پاس پناہ ملتی رہے گی۔ میں ہی اسرائیلی حکام سے اور آرمی کے افسران سے اس کی حمایت میں لڑتا رہوں گا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد وہ ہوگا' جو ہمیں منظور ہے۔ جب تابوت یہودا ہمیں مل جائے گا اور اربوں ڈالرز میں سے بارہ سورما اپنا اپنا شیئر حاصل کریں گے۔ ان میں سے ایک ایک کو اوپر آسمان سے بھی پہنچایا جائے گا۔ جلالت کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔"

جلالت دیدے پھیلا کر خلا میں تکنے لگا۔ اس ایک بات سے بارہ سورماؤں کی حقیقت معلوم ہو گئی کہ وہ محض شطرنج کے مہرے ہیں۔ کھیلنے والے پیشوا' ربی اور پانچ

اپنی مرضی کے مطابق ان مہروں کو شطرنج کی بساط پر چل رہے ہیں اور ان شطرنج کے کھلاڑیوں میں مادام نینسی نکاؤلی کا اضافہ ہوگیا تھا۔

توقع کے خلاف ایسا انکشاف ہوا تھا کہ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر سوچتا رہ گیا۔ موجودہ معلومات کے مطابق اسے سوچنا اور سمجھنا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

عقل اسے روک رہی تھی۔ ورنہ وہ ابھی دیوار کے اس پار جا کر اس کی گردن مروڑ کر رکھ دیتا۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا رہا کہ اب تک انجان بن کر دھوکا کھاتا رہا تھا۔ اب جان بوجھ کر دھوکا کھانا چاہیے۔

اس نے موجودہ حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ریموٹ کنٹرولر کے بٹن پنچ کیے۔ دیوار کا ایک حصہ ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک طرف سرک گیا۔ پیشوا اور تمام ربی ایکدم سے اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

وہ سہم گئے تھے۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی اس چور دروازے کو کھول کر آسکتا ہے۔ پیشوا نے جلالت کو دیکھ کر اطمینان کی گہری سانس لی۔ جلالت نے اسے بتایا کہ مارتھا اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔ اس کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے پیشوا کو ابھی جانا ہوگا۔ وہ شوہر کی حیثیت سے نہیں ایک دینی پیشوا کی حیثیت سے وہاں جاسکتا تھا۔

وہ جلالت سے بولا۔ ''اب تم بھی وہاں نہیں رہ سکو گے۔ تمہیں عارضی پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔ فی الحال میرا مکان مناسب رہے گا۔''

ایک ربی اس لائبریری کے پچھلے دروازے کی طرف گاڑی لے آیا۔ ادھر نیم تاریکی تھی۔ جلالت پچھلے دروازے سے نکل کر گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ تقریباً دو ماہ بعد گھر کی چار دیواری سے نکل کر کھلی فضا میں سانسیں لے رہا تھا۔

پیشوا گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اپنی رہائش گاہ کے دروازے پر آگیا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب پولیس اور انٹیلی جنس والے دینی رہنماؤں کی خفیہ طور پر نگرانی نہیں کرتے تھے۔ انہیں اطمینان ہوگیا تھا کہ انہوں نے سولومن یہودا کو چھپا کر نہیں رکھا ہے۔

پیشوا نے مکان کے اندر آکر کہا۔ ''تمام کھڑکیاں اور دروازے اسی طرح بند رہنے دو۔ میں بیرونی دروازے کو باہر سے بند کر کے جاؤں گا۔ کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ اندر کوئی ہے۔''

جلالت نے کہا۔ ''تمام لائٹس بجھا کر تاریکی میں رہنا ہوگا۔''

''مجبوری ہے۔ آج کی رات اندھیرے میں گزارو۔ یہ میز پر پنسل ٹارچ رکھی ہے۔ اسے ضرورت کے وقت استعمال کرو۔ میں کل کسی وقت آؤں گا۔ آہ مارتھا...! وہ میری زندگی کی بہترین ساتھی تھی۔ بہت ہی وفادار اور محبت کرنے والی تھی۔''

وہ زیر لب بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوگیا۔ اس کے مقدر میں قیدی بن کر رہنا لکھا تھا۔ وہ پھر ایک چار دیواری میں، بلکہ کال کوٹھری میں قید ہوگیا۔

وہ ایک ایزی چیئر پر آکر بیٹھ گیا۔ ٹارچ بجھا کر تاریکی میں سوچنے لگا۔ ''کیا مجھے اسی طرح مفرور مجرم بن کر یا قیدی بن کر رہنا چاہیے؟''

اسے پیشوا کی باتیں یاد آئیں۔ اس کا اصلی روپ سامنے آگیا تھا۔ ابھی وہ بہت مجبور تھا۔ اگر پیشوا پر لعنت بھیج کر، زنجیریں توڑ کر جاتا تو کہاں جاتا؟ ہر سو دشمن ہی دشمن تھے۔ فلسطینی مجاہدین سے رابطہ ہوسکتا تھا۔ لیکن فون کال پکڑی جاسکتی تھی۔ مجاہدین جو روپوش اور محفوظ تھے، ان کی شامت آسکتی تھی۔ وہ ہر طرف سے بے بس ہوگیا تھا۔ عقل کہہ رہی تھی، فی الحال صبر کرے اور چھپ کر رہے۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ باہر ایک یا ایک سے زیادہ گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ٹارچ کی محدود روشنی میں دبے قدموں چلتا ہوا اسٹڈی روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ ایک میز پر چڑھ کر روشندان سے باہر دیکھنے لگا۔

مکان کے احاطے کے باہر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ آرمی کا ایک اعلیٰ افسر تین مسلح سپاہیوں کے ساتھ احاطے کے اندر آرہا تھا اور ایک سپاہی سے کہہ رہا تھا۔ ''یہاں اندر باہر تاریکی ہے۔ اگر کوئی پیشوائے اعظم کے ساتھ یہاں آیا تھا تو وہ دونوں ہی جاچکے ہیں۔''

اعلیٰ افسر نے دروازے پر آکر کال بیل کا بٹن دبایا۔ مکان کے اندر گھنٹی کا شور ابھر کر ڈوب گیا۔ اس نے کئی بار بٹن کو دبایا۔ کال بیل کی آواز پر دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ افسر کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہاں۔ بولو؟ کیا رپورٹ ہے؟''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''سر! موساد کے ریکارڈ روم کی ایک انچارج مارتھا مرگئی ہے۔ پیشوائے اعظم یہاں اس کی آخری رسومات ادا کرنے آئے ہیں۔''

افسر نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''پیشوا کسی اور معاملے میں مصروف ہے۔ یہاں دروازہ لاکڈ ہے۔ اندر تاریکی ہے۔''

پھر اس نے سپاہی سے کہا۔ ''تم نے پیشوا کو ایک قیم شحیم قد آور شخص کے ساتھ اس مکان کے اندر جاتے دیکھا تھا۔ پھر وہ شخص کہاں ہوگا؟ یقیناً اس مکان کے اندر تاریکی میں چھپا ہوگا۔''

''یس سر! ہمیں کسی طرح اندر جانا ہوگا۔''

جلالت میز سے اتر کر دبے قدموں چلتا ہوا مکان کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا پچھلے دروازے تک پہنچا۔ پھر اسے کھول کر باہر نکل گیا۔ اسی وقت ایک سپاہی پچھلے دروازے کی نگرانی کرنے آرہا تھا۔ جلالت نے اس پر چھلانگ لگائی پھر اس کے ساتھ زمین پر گرتے ہوئے اس کی گردن کو ایک بازو کے شکنجے میں جکڑ لیا۔

وہ سپاہی ہاتھی کے سامنے مینڈھے کی طرح تھا۔ اس کے مقابلے میں دم نہ مار سکا۔ گردن ایسے جکڑی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکال سکا۔ تھوڑی دیر تک پھڑ پھڑا کر نیم مردہ سا ہوگیا۔ جلالت نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے اس کی گردن توڑ دی۔

اس کی گن اور کارتوس کی پیٹی ہاتھ آگئی۔ وہ مکان کے ایک طرف سے چلتا ہوا سامنے والے حصے میں آیا۔ وہاں وہ افسر دو سپاہیوں کے ساتھ دروازے کے لاک کو توڑ کر اندر جانا چاہتا تھا۔ اس نے دیوار کی آڑ میں رہ کر ایک سپاہی کو گولی ماری۔ دوسرا سپاہی اور افسر اچھل کر بھاگنا اور کہیں چھپنا چاہتے تھے، جلالت نے انہیں للکارا۔ ''خبردار! اگر ذرا بھی حرکت کی تو دونوں مارے جاؤ گے۔''

وہ رک گئے۔ اس نے حکم دیا۔ ''اپنے ہتھیار پھینک دو۔ ذرا بھی چالاکی دکھاؤ گے تو گولی چل جائے گی۔''

سپاہی نے اپنی گن ایک طرف پھینک دی۔ اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''سولومن! تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ خود کو قانون کے حوالے کردو۔''

وہ بولا۔ ''باتیں نہ بناؤ۔ ہتھیار پھینک دو۔ کیا مرنا چاہتے ہو؟''

افسر نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر پھینک دیا۔ اس نے حکم دیا۔ ''چار قدم آگے جا کر اپنے ہاتھ اور گھٹنے زمین پر ٹیک دو۔ منہ سے کچھ نہ بولو۔ وقت ضائع نہ کرو۔''

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ خوفزدہ تھے۔ ابھی ایک سپاہی کو مرتے دیکھا تھا۔ دوسرے کے متعلق سمجھ گئے تھے کہ جلالت اسے بھی ہلاک کرنے کے بعد اس کی گن لے کر آیا ہے۔ جلالت نے ان کے ریوالور اور رائفل سے گولیاں نکال کر انہیں دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ خالی ہتھیار دکھاوے کے لیے اپنے پاس رکھو اور دونوں یہاں سے چل کر گاڑی کی اگلی سیٹوں پر بیٹھو۔ میں پچھلی سیٹ پر تم دونوں کو نشانے پر رکھوں گا۔''

وہ تینوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گئی۔ جلالت نے کہا۔ ''رفتار بڑھاؤ۔ سرحد کے قریب کچے راستے پر مڑ جاؤ۔ جدھر کہوں گا، ادھر چلتے رہو گے۔''

گاڑی کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ افسر نے کہا۔ ''تم بارڈر کراس کر کے لبنان جانا چاہتے ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے۔''

جلالت نے پیچھے سے ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''تم منع کرنے کے باوجود بول رہے ہو۔ اس کے بعد میں ہاتھ نہیں چلاؤں گا۔ گولی چلاؤں گا۔''

پھر اس نے ڈرائیو کرنے والے سپاہی سے کہا۔ ''اس کچے راستے پر شمال مشرق کی طرف چلو۔ ہم وہاں شامی سرحد کے ایک ویران پہاڑی علاقے سے گزریں گے۔ ادھر شامی بارڈر پر پولیس نہیں ہوگی۔''

تقریباً دو گھنٹے تک سفر جاری رہا۔ دو جگہ پولیس چوکی پر گاڑی کو روکا گیا۔ پھر آرمی کے اعلیٰ افسر کو دیکھ کر اسے سیلیوٹ کر کے آگے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ کچے راستے پر کہیں رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ جلالت پیچھے بیٹھا رہنمائی کر رہا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ آسمان ستاروں سے روشن تھا۔ زمین پر گہری تاریکی نہیں تھی۔ آگے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ملک شام کے ایک ویران سرحدی علاقے سے گزر رہے تھے۔ راستے کے ایک طرف اونچی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ اس کے حکم سے گاڑی رک گئی۔

وہ تینوں دروازے کھول کر باہر آئے۔ جلالت نے تڑاتڑ دو فائر کیے۔ وہ دونوں زمیں بوس ہوگئے۔ جلالت نے انہیں ٹھوکریں مار کر کھائی میں گرا دیا۔ وہ نہ رہے، ان کی لاشیں بھی نہ رہیں، نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

اس نے گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ وہاں سے آگے جانے لگا۔ کئی میل تک جانے کے بعد بہت دور روشنی دکھائی دی۔ وہ انسانی آبادی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاڑی کا رخ کھائی کی طرف کر کے اسے روک دیا۔ آگے ڈھلان تھی۔ اس نے گاڑی سے نکل کر اسے

دھکا دیتے ہوئے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے نیچے جاتی ہوئی' بڑے پتھروں سے ٹکراتی ہوئی گہری پستی میں پہنچی تو ایک دھماکا ہوا۔ آگ بھڑکی اور وہ شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔

وہ وہاں سے پلٹ کر آبادی کی طرف جانے لگا۔ اسرائیلی پولیس اور آرمی کو ان لاشوں کا سراغ ملنے والا نہیں تھا۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ سرحد پار کر کے یہودیوں کے شکنجے سے نکل چکا ہے۔

☆☆☆

جلالت دو ماہ تک بڑی خاموشی سے روپوش رہا تھا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والوں کو اور تمام دشمنوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ اسرائیل میں نہیں ہے۔ سرحد پار کسی دوسرے ملک میں چلا گیا ہے۔

ایک صبح پھر سے ہلچل پیدا ہوئی کہ وہ اسرائیل میں موجود ہے۔ آرمی کے ایک سپاہی نے پچھلی رات اسے پیشوا کے مکان میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد نہ تو وہ سپاہی نظر آیا' نہ سولومن یہودا اس مکان میں پایا گیا تھا۔

پیشوائے اعظم اور تمام دینی رہنماؤں نے آرمی افسر کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس اعلیٰ افسر کو اور چشم دید گواہ بننے والے سپاہی کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔ انہوں نے پیشوائے اعظم کی غیر موجودگی میں مکان کا تالا توڑ کر ایک معزز اور محترم دینی رہنما کی توہین کی ہے۔

اس اعلیٰ افسر کو اور اس سپاہی کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ ایک پڑوسی ملک میں ان کی لاش گم ہو گئی ہے۔ نہ وہ کبھی ملنے والے تھے' نہ یہ ثابت ہو سکتا تھا کہ جلالت اسرار کو پیشوائے اعظم کے مکان میں دیکھا گیا ہے۔

اس رات ایک فلائٹ سے مادام نکاؤلی تل ابیب پہنچی۔ بونی نکاؤلی بھی اس کے ساتھ تھی۔ پانچ بینکرز اس کے استقبال کے لیے ائرپورٹ آئے تھے۔

مادام نے کھانے کے دوران کہا۔ ''این ٹی ایف (نائٹ ٹیمپلرز فنڈ) کی رقم اربوں سے کھربوں ڈالرز تک پہنچنے والی ہے۔ یہ تو آپ جیسے بینکرز اچھی طرح جانتے ہوں گے۔''

انتھونی نے کہا۔ ''ہاں۔ رقم بڑھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی عداوتیں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔''

بونی نے مسکرا کر کہا۔ ''پہلے دو طلبگار تھے۔ پیشوائے اعظم اور آپ پانچوں بینکرز... اب تیسری طلبگار کا یعنی میری ماما کا اضافہ ہو گیا ہے۔''

مادام نے کہا۔ ''جس کی مٹھی میں زیادہ سے زیادہ سورما ہوں گے' وہ کھربوں ڈالرز میں سے زیادہ شیئر حاصل کرے گا۔''

برنارڈ اوکلے نے کہا۔ ''تم تو طلبگار بنتے ہی اپنے ساتھ تین سورما لے آئی ہو۔ کیا واقعی ان کا وجود ہے؟''

''بے شک ہے۔ جب تم لوگوں سے اور پیشوا سے معاملات طے ہوں گے' تب میں ان سورماؤں کو منظر عام پر لاؤں گی۔''

گورڈن نے کہا۔ ''پلیز۔ پیشوا سے کوئی معاملہ نہ کرو۔ این ٹی ایف کی رقم صرف ہمارے تمہارے لیے ہو گی۔ تیسرا حصے دار ہو گا تو ہمارا منافع تین حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔''

ایش ٹرومین نے کہا۔ ''ہم متحد ہو کر پیشوا کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔''

وہ بولی۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کے پاس صرف بنجامن یہودا ہے۔ جبکہ پیشوا کے پاس سولومن یہودا کے علاوہ تین نئے سورما جوزف' داؤد اور جیکب اس کے حمایتی ہیں۔ اس دینی اور روحانی رہنما سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔''

بونی نے کہا۔ عوام کے دماغوں پر ہمیشہ مذہب حاوی رہتا ہے۔ پیشوائے اعظم حاوی رہے گا۔''

جے کے شیرون نے کہا۔ ''سیاستدان مذہب کو ہمیشہ کھلونا بنا دیتے ہیں۔ ہمارے پاس دولت ہے' سیاسی قوت ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ ربیوں کو اور آنے والے سورماؤں کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیں گے۔ جو بکنے پر راضی نہیں ہو گا' اسے سولومن کی طرح بھاگنے اور چھپنے پر مجبور کر دیں گے۔''

لیکن اس طرح تو بارہ سورما کبھی یکجا نہیں ہوں گے۔ اپنی سلامتی کے لیے بھاگتے پھریں گے۔''

برنارڈ نے کہا۔ ''ہم نہ بکنے والوں کو بھگائیں گے۔ ہماری ایک خفیہ تنظیم ان دربدر ہونے والوں کو پناہ دے گی۔ ہم دہری چالیں چلتے ہوئے پیشوائے اعظم کو بالکل ہی زیرو بنا دیں گے۔''

''میں مانتی ہوں' میرا اور تمہارا اتحاد کسی تیسرے کو پنپنے نہیں دے گا۔'' مادام نے کہا۔ ''مجھے تمہاری دولت کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ تم سب دیکھو گے کہ میں اپنے پُراسرار علوم سے باقی آنے والے سورماؤں کو بھی اپنے زیرِ اثر لے آؤں گی۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟ ہمارا اتحاد کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟''

''میں تم پانچوں کو اور پیشوائے اعظم کو ناپتی اور تولتی رہوں گی۔ آنے والے سورما جس کے زیرِ اثر رہیں گے' اس سے اتحاد رکھوں گی۔''

''تم یہ کیوں نہیں سمجھ رہی ہو کہ ہمارے متحد ہوتے ہی پیشوا کمزور پڑ جائے گا۔''

''میں تو یہ بھی سمجھ رہی ہوں کہ میرے اور پیشوا کے متحد ہوتے ہی تم پانچوں کمزور پڑ جاؤ گے۔''

بونی نے کہا۔ ''میری ماما پلس پوائنٹ ہیں۔ جدھر جائیں گی' اسے طاقتور بنا دیں گی۔''

مادام نے کہا۔ ''ابھی میرے پاس تین سورما ہیں۔ آئندہ یہ خبر سناؤں گی کہ ایک اور سورما میرے زیرِ اثر آچکا ہے۔''

''فی الحال خبر ہی سنا رہی ہو۔ ان کی رونمائی کرو۔ یہ ثابت تو کرو کہ تمہارے پاس تین اِکّے ہیں۔''

ایسے وقت بنجامن ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آیا۔ انتھونی نے مادام اور اس کی بیٹی سے اس کا تعارف کرایا۔ مادام نکاؤلی نے بنجامن سے مصافحہ کرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ''انتھونی فورڈ! یہ چوتھا اِکّا آگیا ہے۔ میری بیٹی اس سے ہاتھ ملائے گی تو تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔''

بنجامن یہودا نے مادام نکاؤلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا تعلق تین سورماؤں سے ہے۔ اس حوالے سے آپ میرے لیے محترم ہیں۔ تمام سورماؤں کو ایک دوسرے سے ملنا چاہیے۔ کیا آپ مجھے ان سے ملائیں گی؟''

''ضرور ملاؤں گی۔ ہم کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ لازمی ہے کہ تابوت یہودا تک پہنچنے کے لیے جلد سے جلد بارہ سورما بھی یکجا ہو جائیں۔ اسی لیے میں یہاں آئی ہوں۔ پہلے اطمینان حاصل کروں گی کہ میرے تین سورما یہاں محفوظ رہ سکیں گے یا نہیں؟''

''بیشک محفوظ رہیں گے۔ آپ دیکھ رہی ہیں' میں یہاں حفاظت اور سلامتی سے ہوں۔ سولومن یہودا نے اپنی غلطیوں کے باعث خطرات مول لیے ہیں۔ پھر ایک مجرم کی طرح فرار ہو گیا ہے۔''

مادام نکاؤلی نے کہا۔ ''جبکہ اس پر لگایا ہوا کوئی الزام ثابت نہیں ہوا ہے۔ تم دونوں غلط فہمی کے باعث ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہو۔ اگر اسی طرح غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں گی تو بارہ سورما کبھی یکجا نہیں ہو سکیں گے۔''

جے کے شیرون نے کہا۔ ''ہم سولومن کی غلط فہمی دور کرنے کی کوششیں کریں گے۔ بشرطیکہ اس سے رابطہ ہوتا رہے۔''

''پیشوائے اعظم کہتے ہیں' بنجامن یہودا غلط فہمی کا شکار ہے۔''

''وہ جھوٹ کہتے ہیں۔''

''اور تمام دینی رہنماؤں کا بیان ہے کہ آپ پانچوں بینکرز جھوٹے ہیں۔ بڑی مشکل ہے' جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کیسے ہو گا؟''

بنجامن چور نظروں سے بونی نکاؤلی کے پُرکشش سراپے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر بولی۔ ''مام! آپ باتوں میں لگ گئی ہیں۔ بنجامن سے میرا تعارف تو کرائیں۔''

مادام نے کہا۔ ''تم دونوں جوان ہو۔ خود ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو جاؤ۔''

بونی نے بنجامن کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''میرا نام بونی نکاؤلی ہے۔''

اس نے بونی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''میں دونوں ماں بیٹی کو دیکھ رہا ہوں۔ بالکل ایک جیسی صورت ہے۔ ذرا سا فرق نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''ایک بہت بڑا فرق ہے۔ میں جوان ہوں' یہ بوڑھی ہیں۔'' اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ وہ بولی۔ ''ایک اور بات ہے۔ وہ کان میں بولوں گی۔''

سب نے بونی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بنجامن اس کی طرف جھک گیا۔ وہ کان میں بولی۔ ''ایک اور فرق یہ ہے کہ لوگ ماما سے رسمی طور پر مصافحہ کرتے ہیں لیکن میرا ہاتھ پکڑ کر چھوڑنا بھول جاتے ہیں۔''

بنجامن نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''تھینک یو۔ میں نے عہد کیا ہے' جو مجھے ریسلنگ میں زیر کرے گا' وہی ہمیشہ کے لیے میرا ہاتھ تھام لے گا۔''

ایک بینکر برنارڈ اوکلے نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ریسلنگ...؟ کیا تم فائٹر ہو' کشتی لڑتی ہو؟''

''ہاں۔ اب تک چھ پہلوانوں کو رنگ سے باہر پھینک چکی ہوں۔''

دوسرے بینکر ایش ٹرومین نے کہا۔ ''تعجب ہے' کیا تم نے مرد پہلوانوں سے مقابلہ کیا ہے؟''

مادام نکاؤلی نے بڑے فخر سے کہا۔ ''میری بیٹی ناقابلِ شکست ہے۔ ابھی آپ لوگوں کو یقین نہیں آئے گا۔

ہیکل کے سورما بڑے شہزور ہوتے ہیں۔ آپ بنجامن سے مقابلہ کرائیں۔ معلوم ہوجائے گا کہ میری بیٹی کتنی زبردست اور نا قابلِ شکست ہے۔"

انتھونی فورڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ بنجامن کلائی پکڑے گا تو یہ چھڑا نہیں پائے گی۔"

"جوانی میں کوئی لڑکی کلائی نہیں چھڑاتی۔ نہ کوئی لڑکا چھوڑتا ہے۔ اصل بات زیر و زبر ہونے کی ہے۔ یہ زبر رہے گی۔ بنجامن اسے زیر نہیں کر سکے گا۔"

ان پانچوں بینکرز نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا پھر انتھونی نے کہا۔ "تم میرے ہونے والے داماد کو چیلنج کر رہی ہو۔ ابھی میرے ذہن میں یہ بات آرہی ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ کرایا جائے اور بہت بڑی شرط لگائی جائے۔"

مادام نے کہا۔ "میں کوئی سی بھی شرط مان لوں گی۔"

"ویسے جب مقابلہ ہوگا اور تم شرط ہار جاؤ گی۔ تب بھی فائدے میں رہو گی۔"

"تم سوچ سمجھ کر ہی مقابلے کے لیے راضی ہو رہے ہو اور شرط لگا رہے ہو۔ یقیناً تم بھی فائدے میں رہو گے۔"

"بیشک۔ ہم کاروباری دنیا میں بینکرز ہیں۔ کبھی نقصان اٹھانے والا سودا نہیں کرتے۔"

"تو پھر بولو شرط کیا ہے؟"

"بہت آسان سی اور معمولی سی ہے۔ اگر بنجامن تمہاری بیٹی کو زیر کرلے گا تو تم پیشوائے اعظم کی نہیں ہماری حمایت کرو گی۔ ہم سے اتحاد کرو گی۔ اپنے تین سورماؤں کو ہمارے حوالے کرو گی۔"

وہ مادام کے دل کی بات کہہ رہا تھا اور وہ راضی ہونے سے پہلے بولی۔ "بہت بڑی شرط ہے۔ پھر میرے پاس کیا رہ جائے گا؟"

"ہم ہر سورما کے عوض دس کروڑ ڈالرز دیں گے۔"

"دس نہیں۔ بیس کروڑ ایک سورما کی قیمت ہوگی۔ یعنی میں ساٹھ کروڑ ڈالرز لوں گی۔"

انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر ایک بینکر گورڈن نے کہا۔ "ہم کیسے یقین کریں کہ شرط ہارنے کے بعد تم تین سورماؤں کو ہمارے حوالے کردو گی؟"

"میں کل ہی ان سورماؤں سے تمہاری بات کراؤں گی۔ سورما کبھی جھوٹ نہیں بولتے، کسی کو دھوکا نہیں دیتے۔ وہ تم سے وعدہ کریں گے کہ میں شرط ہاروں گی تو وہ بنجامن کی طرح تمہارے حامی اور اتحادی بن کر رہا کریں گے۔"

ان پانچوں نے کہا کہ انہیں منظور ہے۔ وہ کل ہی ان سورماؤں سے گفتگو کرنا چاہیں گے اور ویڈیو چیٹنگ چاہیں گے۔ تاکہ مانیٹر پر انہیں دیکھ سکیں۔

"ہاں۔ ان سے ویڈیو چیٹنگ ہوگی۔ میں تمہاری شرط مان رہی ہوں۔ اب بتاؤ اگر میں شرط جیت جاؤں گی تمہارا سورما میری بیٹی کو زیر نہیں کر سکے گا تو تم کیا ہارو گے؟"

"ہم تو تمہیں ساٹھ کروڑ دینے کا وعدہ کر رہے ہیں۔"

"یہ رقم اس وقت لوں گی جب ہارنے کے بعد تین سورماؤں کو تمہارے حوالے کروں گی۔ اب میں ہار کی نہیں اپنی جیت کی بات کر رہی ہوں۔ اگر جیت گئی تو تمہیں میری ایک شرط ماننی ہوگی۔"

"تمہاری شرط کیا ہے؟"

"جس طرح تم جیت کر میرے تین سورماؤں کو لے جاؤ گے۔ اسی طرح میں جیت کر تمہارے سورما بنجامن یہودا کو لے جاؤں گی۔"

ان پانچوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ بنجامن نے کہا۔ "میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔ نہ ہی کوئی ٹرافی یا گولڈ میڈل ہوں کہ کوئی مجھے خرید کر یا جیت کر لے جائے گا۔"

بونی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا تو وہ چپ ہوگیا۔ جب اس نے پہلی بار مصافحہ کیا تھا' تب بھی ہاتھ ملتے ہی وہ اس سے متاثر ہوگیا تھا۔ یہ تاثر صرف چند لمحات تک رہا۔ پھر وہ بھول گیا کہ ایسا کچھ ہوا تھا۔

انتھونی فورڈ نے مادام سے کہا۔ "ہم تمہارے پاس ایک سورما کو ہارنے نہیں' بلکہ تین سورماؤں کی تعداد بڑھانے آئے ہیں۔"

وہ بولی۔ "تمہارے اندر ایک سورما کو ہارنے کا حوصلہ نہیں ہے تو پھر میں تین سورماؤں کو ہارنے کی غلطی کیوں کروں؟"

پھر وہ بنجامن سے طنزیہ انداز میں بولی۔ "یہ حضرات ایک لڑکی سے ڈر گئے۔ کیا تم اس سے ہار جاؤ گے تو یہ تمہیں ہار جائیں گے؟"

بنجامن نے کہا۔ "ہم سورما ہیں۔ کسی عورت سے نہیں لڑتے۔"

"اس لیے نہیں لڑتے کہ ہار گئے تو بڑی شرمندگی ہوگی۔ کسی کو منہ نہیں دکھا سکو گے۔"

"تم خواہ مخواہ مقابلے کی بات کر رہی ہو۔ ایک بچہ بھی تمہاری بیٹی کو میرے مقابلے پر دیکھے گا تو کہہ دے گا کہ پہاڑ کے سامنے چیونٹی ہے اور میں جانتا ہوں' اس کی گردن دبوچ لوں گا تو یہ ہل نہیں پائے گی۔"

بونی طنزیہ انداز میں مسکرانے لگی۔ اس کی ماں نے کہا۔ "مرد اور عورت کا سب سے بڑا مقابلہ شادی خانہ آبادی ہے۔ شادی سے پہلے مرد بڑی ڈینگیں مارتا ہے کہ عورت کو بیوی بنا کر پیس ڈالے گا۔ شادی کے بعد پتا چلتا ہے کہ بیوی جیتتی جارہی ہے اور اسے غلام بناتی جارہی ہے۔"

گورڈن نے کہا۔ "واقعی شادی مرد اور عورت کا سب سے بڑا اور اہم مقابلہ ہے۔ اسی فیصد شہزور اپنی گھر والیوں سے ہار جاتے ہیں۔"

برنارڈ اوکلے نے کہا۔ "لیکن ہم شادی کی نہیں' باقاعدہ ریسلنگ کی بات کر رہے ہیں۔ مقابلے کی بات نہ کرو۔ اپنی بیٹی کی سلامتی چاہو۔ مقابلہ ہوگا تو بنجامن اس کی ہڈی پسلی توڑ دے گا۔"

بونی نے بنجامن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کبھی ہڈی پسلی ٹوٹتے نہیں دیکھی اور نہ ہی کبھی دیکھوں گی۔ میں تو زندگی کے ہر میدان میں جیتنے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔"

وہ بولا۔ "میں تمہاری خوش فہمی ابھی دور کروں گا۔ آؤ مجھ سے پنجہ لڑاؤ۔ میری انگلیاں موڑ دو۔ میں شکست مان لوں گا۔"

"میں یہاں نہیں کسی اسٹیڈیم میں یا ٹی وی اسکرین پر مقابلے کا پورا احوال پیش کروں گی۔ اگر یہ منظور نہیں ہے تو پھر ان پانچ بینکرز اور دینی رہنماؤں کے سامنے تم سے مقابلہ کروں گی۔"

"تم خود کو تماشا کیوں بنانا چاہتی ہو؟ لوگ کہیں گے کہ ہیکل کا ایک سورما ایک لڑکی کو پہلوانی کا زور دکھا رہا ہے۔ میں جیت جاؤں گا' تب بھی لوگ مذاق ہی اڑائیں گے۔"

مادام نکاؤلی نے کہا۔ "چلو دنیا والوں کے سامنے نہ سہی' پیشوائے اعظم اور ربیوں کی موجودگی میں مقابلہ کرو۔"

"میں کیوں خواہ مخواہ مقابلہ کروں؟"

"تو نہ کرو۔ مسٹر انتھونی فورڈ اور ان کے ساتھیوں سے یہ آخری ملاقات ہے۔ میں ان سے کسی بھی شرط پر اتحاد نہیں کروں گی۔"

وہ پانچوں بینکرز پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ مادام نکاؤلی کا فیصلہ کن انداز سمجھا رہا تھا کہ وہ ان سے منہ پھیرنے کے بعد پیشوائے اعظم سے دوستی اور اتحاد کرے گی۔ اس کے تین سورما اُدھر جائیں گے۔

تین نئے سورماؤں کے باعث پیشوائے اعظم کا پلڑا

پہلے ہی بھاری تھا۔ مادام اسے اور بھاری بھرکم بنا سکتی تھی اوران پانچوں کو یہ منظور نہیں تھا۔

گورڈن نے کہا۔ ''میڈم! پلیز اسے آخری ملاقات نہ سمجھیں۔ ابھی ہماری باتیں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ ہم تمہاری کوئی سی بھی شرط مان کر تمہیں دوست اور اتحادی ضرور بنائیں گے۔''

انتھونی فورڈ نے کہا۔ ''ہم تو تمہاری بیٹی کی بھلائی کے لیے مقابلے کی شرط سے کترا رہے تھے ورنہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بنجامن مقابلہ شروع ہوتے ہی یونی کو زیر کرلے گا۔ شرط ہم جیتیں گے۔''

''جیتنے کا پورا یقین ہے تو بحث کیوں کررہے ہو؟''

''صرف بنجامن کا خیال کررہے ہیں۔ یہ ایک لڑکی کے مقابلے پر آئے گا تو دنیا ہنسے گی۔''

یونی نے کہا۔ ''دنیا والے نہیں' صرف دینی رہنما ہنسیں گے۔ صرف ان کی موجودگی میں مقابلہ ہوگا۔''

بنجامن نے کہا۔ ''بحث ختم کریں۔ میں مقابلہ کروں گا۔''

انتھونی نے کہا۔ ''اور کل ہی ہوگا۔''

مادام نے کہا۔ ''ایسی جلدی بھی نہ کریں۔ میں کل پیشوائے اعظم سے ملاقات کروں گی۔ اس سے مطالبہ کروں گی کہ وہ تین نئے سورماؤں سے ملاقات کرائے یا ویڈیو چیٹنگ کرائے۔''

ایش ٹرومین نے کہا۔ ''ہاں۔ ہم بھی ان تین نئے سورماؤں جوزف' جیکب اور داؤد یہودا کو دیکھنا اور ان کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔''

مادام نے کہا۔ ''ان تینوں کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد میں پیشوائے اعظم کو بتاؤں گی کہ تم پانچوں سے کیا معاملات طے ہوئے ہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ تم جلد از جلد پیشوائے اعظم سے بات کرو اور ہم سے فون پر رابطہ رکھو۔''

وہ سب جانے کے لیے اٹھ گئے۔ یونی' بنجامن سے باتوں کے دوران بنگلے سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے درمیان جب مقابلہ ہوگا' تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو ہم دوست ہیں۔''

پھر وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے جانا چاہیے۔''

یونی نے اس سے مصافحہ کیا۔ یہ تیسری بار اس کے ہاتھ کا لمس ملا تھا۔ بنجامن نے پھر محسوس کیا کہ وہ اچھی ہے' متاثر کرتی ہے۔

یہ احساس چند سیکنڈ تک رہا۔ پھر اس نے یونی کے اس ہاتھ کو تھام کر پوچھا۔ ''یہ تمہاری ہتھیلی کی جلد کیسی ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہتھیلی سے کلائی تک بہت ہی باریک سی جھلی چڑھی ہوئی ہے۔ یوں سمجھو' میں دستانے پہن کر رہتی ہوں۔''

''کیا ہمیشہ پہن کر رہتی ہو؟''

''نہیں۔ جب ملنے والوں سے ملاقات کا وقت مقرر ہوتا ہے تو پہن لیتی ہوں تاکہ لوگوں سے مصافحہ کرتے وقت نادیدہ جراثیم سے محفوظ رہوں۔''

''بڑی احتیاط سے زندگی گزار رہی ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔''

وہ پانچوں بینکرز کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ ماں نے بیٹی کے ساتھ بنگلے کے اندر آکر اس کے ہاتھ کو تھام کر تپلی جھلی جیسے دستانے کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا اسے شبہ ہوا ہے؟''

''شاید ہوا ہوگا۔ میں نے بات بنائی ہے۔ وہ کبھی سمجھ نہیں پائے گا کہ اس جھلی پر کوئی لوشن لگا ہے اور وہ لوشن اس کے ہاتھ کی جلد سے لگ کر لمحاتی تاثر پیدا کرتا ہے۔''

برازیل کے جنگلات میں طرح طرح کی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ مادام نینسی نکاؤلی صرف علم نجوم کی ماہر یا پامسٹ ہی نہیں تھی' اسے جڑی بوٹیوں کے استعمال میں بھی مہارت حاصل تھی۔

برازیل کے جنگل میں ایک ایسا پودا ہے' جو ہر برس سوکھ کر پھر ہرا ہو جاتا ہے۔ مادام نے اس پودے سے ایک لوشن تیار کیا تھا۔ اس لوشن کی خاصیت یہ تھی کہ وہ انسانی جلد میں لگتے ہی دماغ کو متاثر کرتا تھا۔

جس کے ذریعے وہ لوشن لگتا تھا' دماغ اس سے متاثر ہو جاتا تھا۔ یہ تاثر عارضی ہوتا تھا۔ اس پودے کی طرح بہ ظاہر اثر ختم ہو جاتا تھا۔ پھر اپنا اثر اس وقت دکھاتا تھا' جب لوشن لگانے والا دوبارہ اس جلد کے اسی حصے کو چھو لیتا تھا۔

یونی نے تین بار بنجامن کو چھو کر اس کی جلد پر وہ لوشن لگایا تھا۔ وہ لمحاتی تاثر پیدا کرنے کے بعد زائل ہو گیا تھا۔ آئندہ ایک آدھ ہفتوں میں وہ مقابلے کے دوران بنجامن کی جلد کو چھوتی رہتی' مزید لوشن اس کی جلد کے دوسرے حصوں میں لگاتی رہتی تو وہ مسلسل متاثر ہوتا رہتا اور اس سے زیر ہوتا چلا جاتا۔

نائٹ ٹیمپلر زفنڈ کے اربوں کھربوں ڈالرز لوٹنے کے

لیے تین پارٹیاں مثلث کے تین زاویے بن گئی تھیں۔ اس مثلث کا اہم زاویہ پیشوائے اعظم تھا۔ وہ مذہب اور روحانیت کے حوالے سے تمام یہودیوں کے لیے معزز اور معتبر تھا۔ یہودی سرمایہ دار نائٹ ٹیمپلرز کی تمام رقم اس کے حوالے کرنے والے تھے۔

لیکن بارہ سورماؤں میں اس رقم کی تقسیم پانچ بینکروں کی نگرانی میں ہونے والی تھی۔ اس لیے انتھونی فورڈ اور اس کے چار ساتھی اس مثلث کے دوسرے اہم زاویے تھے۔

مادام نکاؤلی اس مثلث کا تیسرا اہم زاویہ بن رہی تھی۔ وہ دینی اور روحانی حربے نہیں جانتی تھی۔ اس کے باوجود مخالفین کے مقابلے میں بہت طاقتور تھی۔ کیونکہ تین سورما اس کے زیر اثر تھے۔

وہ بڑی ٹھوس پلاننگ پر عمل کرنے آئی تھی۔ پلاننگ کے پہلے حصے میں بنجامن کو اپنا ماتحت بنانا تھا۔ یونی اس سے مقابلہ کرکے اس غیر معمولی لوشن کے ذریعے اسے جیت سکتی تھی۔ وہ وعدے کے مطابق ہارنے کے بعد یونی کا ماتحت بن جاتا۔ لیکن اسے صرف ماتحت نہیں' اپنا محبوب اور فرمانبردار بھی بنانا تھا۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ سیلینا کو اس کی زندگی سے نکال دیا جائے۔

وہاں کرائے کے قاتل موجود تھے۔ مادام ان سے معاملات طے کرنے اور پیشگی معاوضہ ادا کرنے کے بعد وہاں آئی تھی۔ دو قاتلوں نے وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر سیلینا کو راستے سے ہٹا دیا جائے گا۔

مادام نکاؤلی سونے کے لیے بیڈ روم میں آئی۔ اسی وقت پیشوائے اعظم ہار پر ہیبر امتھ نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ ''ہیلو میڈم! مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ تم اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں آگئی ہو۔ پھر اطلاع ملی کہ انتھونی فورڈ اور اس کے حواری بینکروں نے تمہیں گھیرا ہوا ہے اور اب اطلاع ملی ہے کہ وہ لوگ جا چکے ہیں۔''

''آپ میرے معاملے میں بڑے باخبر رہتے ہیں۔''

''رہنا پڑتا ہے۔''

''پیشوائے اعظم سے صرف فون پر ہی بات کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ لیکن صبح دس بجے کی فلائٹ سے لندن جانا ضروری ہے۔ وہاں تین نئے سورما جوزف یہودا' جیکب یہودا اور داؤد یہودا سے ملاقات ہوگی۔''

وہ آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا وہ تینوں لندن میں ہیں؟''

''نہیں۔ وہ مختلف ملکوں میں رہتے ہیں۔ ان ملکوں کے پیشوا اور ربی انہیں دودنوں کے لیے لندن لارہے ہیں۔ وہاں ایک ٹی وی چینل کے ذریعے انہیں یہودی قوم کے سامنے پیش کیا جائے گا۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ وہاں جانا چاہوں گی۔''

''وہاں صرف پیشواؤں اور ربیوں کا اجتماع ہے۔''

''آپ مجھے مایوس کررہے ہیں۔ جبکہ میں اُن بینکرز کے مقابلے میں آپ کو اہمیت دے رہی ہوں۔ آپ سے اعتماد کا رشتہ اور اتحاد قائم رکھنا چاہتی ہوں۔''

''اپنے اس ارادے پر قائم رہو۔ لندن میں تمام پیشوا اور ربی تمہاری موجودگی پر تب اعتراض نہیں کریں گے' جب تم اپنے تین سورماؤں کو وہاں لاؤ گی۔''

''میں آپ کے ان نئے سورماؤں سے ملنے کے لیے اپنے سورماؤں کے ساتھ ضرور وہاں آؤں گی۔ ابھی لندن جانے والی کسی بھی فلائٹ میں سیٹیں او کے کرا رہی ہوں۔ کل صبح بات کروں گی۔''

وہ رابطہ ختم کرکے لندن جانے کے انتظامات کرنے لگی۔ اس نے یونی کو بلا کر کہا۔ ''ہمارا پروگرام اچانک بدل گیا ہے۔ ہم صبح کی فلائٹ سے لندن جارہے ہیں۔''

وہ بیٹی کو بتانے لگی۔ ''وہاں جیکب یہودا' جوزف اور داؤد یہودا سے ملاقات ہونے والی ہے۔ ہمارے سورما بھی وہاں پہنچیں گے۔''

یونی نے کہا۔ ''ہمارے اچانک وہاں جانے سے وہ پانچ بینکرز تشویش میں مبتلا ہوں گے۔ ہمارے پیچھے جاسوس لگائیں گے۔''

''ان کی فکر نہ کرو۔ میں ان سے نمٹ لوں گی۔''

مثلث کے تینوں زاویے اپنے اپنے طور پر چالیں چل رہے تھے۔ ان پانچ بینکرز کو مادام نکاؤلی کی یہ ضد کھٹک رہی تھی کہ وہ بنجامن اور اپنی بیٹی کی ریسلنگ کیوں کرانا چاہتی ہے؟

گورڈن نے پوچھا۔ ''پھر وہ اتنی بڑی شرط کیوں قبول کررہی ہے؟ وہ نادان تو نہیں ہے کہ بیٹی کو کشتی میں ہرا کر اپنے تین سورماؤں کو ہار جائے گی؟''

ایش ٹرومین نے کہا۔ ''وہ جان بوجھ کر ہار جانے والی

حماقت نہیں کر رہی ہے' کوئی ایسی چال چل رہی ہے جو ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

انتھونی فورڈ نے کہا۔ "مجھے یہ اندیشہ ہے کہ وہ کسی مکاری سے ہمارے ایک سورما کو ہم سے لے لے گی۔"

بنجامن نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم محتاط رہیں گے۔ ہم چھ مرد ہیں۔ وہ ہمیں بیوقوف نہیں بنا سکے گی۔"

چار بینکرز اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ وہ دونوں اسپتال میں سیلینا کے پاس آ گئے۔ اگرچہ وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی' لیکن محفوظ تھی۔ اسپتال کے اندر اور باہر سخت حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ صرف ایک نرس اور ایک ڈاکٹر ہی علاج کے لیے اس کے قریب جاتے تھے۔

بنجامن نے وہاں آ کر پیار کے دستور کے مطابق اسے چوما تو وہ رونے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کیا سولومن نے پھر ایس ایم ایس کے ذریعے دھمکی دی ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "ہاں۔ وہ فون پر بولتا نہیں ہے۔ صرف میسج دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے' میں تمہیں چھوڑ دوں۔ ہمیشہ کے لیے تم سے تعلق ختم کر دوں۔ تو زندہ رہوں گی۔ ورنہ لاکھ سیکیورٹی کے باوجود ماری جاؤں گی۔"

بنجامن نے اس کا فون لے کر وہ میسج پڑھا پھر سولومن کو گالیاں دینے لگا۔ جبکہ جلالت اسرار ایسی دھمکیوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ میسج اور دھمکیوں کا وہ سلسلہ پیشوا ہارپر نے جاری کر رکھا تھا۔

اس کے منصوبے کے مطابق سیلینا کو مر جانا چاہیے تھا۔ اس کے بعد بنجامن کا عشق رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ جاتا اور وہ انتھونی فورڈ کی تابعداری سے باز آ جاتا اور یہی منصوبہ مادام نکاؤلی کا تھا۔ وہ سیلینا کو اوپر پہنچا کر ہی اپنی بیٹی بونی کے لیے بنجامن کو فری پورٹ بنا سکتی تھی۔ مادام کے کرائے کے قاتلوں نے وعدہ کیا تھا کہ اسے چوبیس گھنٹوں کے اندر موت کی نیند سلا دیں گے۔

انتھونی نے اس میسج کو پڑھنے کے بعد کہا۔ "انٹیلی جنس اور آرمی والے کہہ رہے ہیں کہ سولومن بارڈر پار کر چکا ہے۔ مگر یہ فون کی دھمکیاں کہہ رہی ہیں کہ وہ یروشلم میں ہی موجود ہے۔"

سیلینا نے کہا۔ "پیشوا بہت گہری چالیں چل رہا ہے۔ اسی نے سولومن کو کہیں چھپایا ہے۔ مجھے اسپتال میں نہیں رہنا چاہیے۔ میں اپنے گھر میں محفوظ رہوں گی۔"

باپ نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ بنجامن! تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ بولا۔ "بیشک۔ سیلینا کو گھر میں زیادہ آرام ملے گا۔ میں وہاں زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکوں گا۔"

باپ بیٹی خوش ہو گئے۔ وہ بنجامن کو زیادہ سے زیادہ اپنے قریب رکھنا چاہتے تھے۔ انتھونی نے اسی وقت بیٹی کو اسپتال سے ڈسچارج کرایا۔ وہاں سے گھر تک جانے لیے سیکیورٹی کے سخت انتظامات کیے۔

بنجامن نے اسے بازوؤں میں اٹھا کر کہا۔ "یہ وہیل چیئر پر نہیں' میری دھڑکنوں سے لگ کر جائے گی۔"

سیلینا اس کے بازوؤں میں آ کر قربان ہونے لگی۔ وہ اسے پھول کی طرح اٹھا کر وہاں سے ایک گاڑی کی طرف جانے لگا۔ اس کار کے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی چھ گاڑیاں تھیں۔ وہ سب گاڑیوں سے باہر گن لیے مستعد کھڑے تھے۔

گویا وہ سب خدا کی مرضی کے خلاف گن تانے کھڑے تھے۔ تقدیر نے جس کی موت لکھ دی تھی' اس لکھائی کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ بنجامن اس فراڈ محبوبہ کو بازوؤں میں اٹھائے اسپتال کے باہر احاطے میں یوں شان سے آیا' جیسے ورلڈ کپ جیت کر اسے دنیا کو دکھاتا آ رہا ہو۔

ایسے ہی وقت گولی چل گئی۔ کہاں سے چلی' یہ پہلے معلوم نہ ہو سکا۔ پہلے کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ تقدیر کے جوتے کیسے پڑ رہے ہیں؟ بعد میں عقل آتی ہے اور تب تک وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

کرائے کے قاتلوں نے سامنے والی ایک عمارت سے سیلینا پر گولی چلائی تھی۔ وہ بنجامن کے بازوؤں میں اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی موت نہیں آئی تھی۔ نشانہ ذرا چوک گیا۔ گولی ذرا اوپر ہو کر بنجامن کی ٹھوڑی کے نیچے حلق میں گھس کر دوسری طرف سے نکل گئی۔

سیلینا اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے والی تھی۔ وہ اسے سنبھال کر زمین پر ڈالنے کے لیے ذرا جھکا' دوسری گولی پھر سیلینا کی طرف آ رہی تھی۔ لیکن جھکنے کے باعث وہ بنجامن کے سر میں گھس کر مغز کے چیتھڑے اڑاتی چلی گئی۔ وہ سیلینا کے ساتھ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

وہ خوف کے مارے چیخ رہی تھی۔ زمین پر لڑھکتی ہوئی کار کی طرف جا رہی تھی۔ انتھونی ایک کار کے پیچھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ بنجامن تھوڑی دیر تک تڑپتا رہا' پھر ایکدم سے ساکت ہو گیا۔

مادام نکاؤلی اسے نہیں' سیلینا کو اپنی بیٹی کے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی۔ لیکن مقدر کے آگے کسی کی مرضی نہیں چلتی۔ پیشوا بڑے یقین سے کہتا تھا' جب تک تابوت یہودا لایا نہیں جائے گا' تب تک کسی سورما کو موت نہیں آئے گی۔ اس کا یقین' اس کا دعویٰ غلط ہو گیا تھا۔ بارہ کی گنتی گڑبڑا گئی تھی۔ بنجامن مر چکا تھا۔

دوسری گولی اسی عمارت سے نہیں آئی تھی۔ وہ کسی دوسری سمت سے آئی تھی۔ یعنی ایک گولی پیشوا کے ریٹنڈ قاتل نے اور دوسری مادام نکاؤلی کے آدمیوں نے چلائی تھی۔ مسلح گارڈز ان عمارتوں کی طرف دوڑتے ہوئے گئے تھے۔ وہاں قاتل ان کے انتظار میں بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اپنے نقش قدم چھوڑے بغیر فرار ہو گئے تھے۔

پولیس' انٹیلی جنس اور آرمی کے مسلح سپاہی آ گئے تھے۔ تمام راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ یہ کوئی عام قتل کی واردات نہیں ہوئی تھی۔ ان کے مذہبی عقیدے کے مطابق ایک سورما مارا گیا تھا اور ایک بینکر کی بیٹی پر دوسری بار قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ پولیس' آرمی اور پوری انٹیریئر منسٹری حرکت میں آ گئی تھی۔

وہ مثلث کے تینوں زاویے مادام نکاؤلی' پیشوائے اعظم اور پانچوں بینکرز بھی بوکھلا گئے تھے۔ بارہ میں سے ایک سورما کم ہو گیا تھا۔ جبکہ وہ جلد سے جلد بارہ کی تعداد پوری کرنا چاہتے تھے۔ نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کے اربوں کھربوں ڈالرز ان کے ہاتھوں سے نکلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

پیشوا ہارپر نے اپنے کرائے کے قاتل سے رابطہ کیا۔ غصے سے بولا۔ "یہ تم نے کیا بدمعاشی کی ہے؟ میں نے سیلینا کو ہلاک کرنے کی سپاری دی تھی۔ تم نے ہمارے سورما کو ہی مار ڈالا؟"

دوسری طرف سے جواب ملا۔ "میں نے بنجامن کو ہلاک نہیں کیا ہے۔ البتہ وہ میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔ مجھے دوسری بار فائر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مجھ سے پہلے ہی کسی نے گولی چلائی تھی۔"

پیشوا نے کہا۔ "کیا بکتے ہو؟ ہمارے سورما کا دشمن کوئی نہیں ہے۔ دشمنوں کو بھی اس سے فائدہ پہنچنے والا تھا۔ وہاں کوئی اور اسے قتل کرنے نہیں آئے گا۔ تم نے اپنی غلطی سے' غلط نشانے سے سورما کو ہلاک کیا ہے اور اب باتیں بنا رہے ہو۔"

وہ بحث نہیں کر سکتا تھا اور بحث کے نتیجے میں وہ سورما پھر سے زندہ ہونے والا نہیں تھا۔ دوسری طرف مادام اپنے کرائے کے قاتلوں کو غصہ دکھا رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "ہمارا نشانہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ ہم کبھی گدھے کی جگہ گھوڑے کو نہیں مارتے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہاں کوئی دوسرا قاتل بھی موجود ہے۔ پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔ اس کے بعد ہم نے سیلینا پر گولی چلائی۔ ہمارا نشانہ درست ہوتا' لیکن اسی لمحے بنجامن گرتے گرتے ہماری گولی کی زد میں آ گیا۔"

واردات کرنے والے لاعلمی میں غلطیاں کر چکے تھے۔ مادام بھی ان سے بحث نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سر تھام کر بیٹی سے بولی۔ "بونی! سوچا تھا کیا... کیا ہو گیا؟ اینٹی فنڈز کے اربوں ڈالرز ہم سے دور ہو گئے ہیں۔ ہمارے مخالفین بھی سر پیٹ رہے ہوں گے۔"

سیلینا اور پانچوں بینکرز بھی ہائے ہائے کر رہے تھے۔ ان کے زیرِ اثر ایک ہی سورما تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ پولیس' انٹیلی جنس اور آرمی والے اسے ملک کے اندر ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ یہ بات ان یہودیوں کے دل کو لگ رہی تھی کہ جلالت اسرار مسلمان ہے۔ یروشلم میں چھپ کر رہنے والے فلسطینی مجاہدین نے اسے بھی اپنے ساتھ کہیں چھپا رکھا ہے۔ یقیناً انہوں نے ہی وہ واردات کی ہو گی۔

سولومن کو پورے یقین سے مسلمان سمجھنے کے بعد یہ گنتی سامنے آ رہی تھی کہ ایک نہیں' دو سورما کم ہو گئے ہیں۔ بنجامن مارا گیا ہے اور سولومن یہودا ایک مسلمان ہے۔ اسے ہیکل کا یہودی سورما تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

پیشوا ہارپر کو بھی یہ شبہ تھا کہ جلالت اسرار اسے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟ وہ فون پر رابطہ کر سکتا تھا۔ مگر نہیں کر رہا تھا۔ اس کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ وہ آئندہ یہودی سورما بن کر نہیں رہے گا۔

مثلث کے تینوں زاویے ایک نہیں' دو سورماؤں کا نقصان اٹھا رہے تھے۔ مادام نکاؤلی اور پیشوا ہارپر نئے سورماؤں سے ملنے کے لیے لندن جانے والے تھے لیکن رکاوٹ آ گئی تھی۔ انہیں دوسرے دن بنجامن یہودا کی تدفین تک وہاں رکنا پڑا۔ اب وہ یروشلم میں ایک اور رات گزار کر دوسری صبح وہاں جانے والے تھے۔

اس رات جلالت نے فون پر پیشوا کو مخاطب کیا۔ وہ جلالت کی آواز سنتے ہی بولا۔ "کہاں ہو تم؟"

"پیشوائے اعظم! تمہاری دوغلی پالیسی نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ یاد ہے' اس رات جب مارتھا نے وفات پائی تھی تو میں سرنگ کے راستے تمہارے پاس

آیا تھا۔ وہاں میں نے چھپ کر تمہاری اور ربیوں کی باتیں سنی تھیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ تم ہیکل کے سورماؤں کو مہرے بنا کر اربوں ڈالرز کا کھیل کھیل رہے ہو۔ جب وہ رقم تمہیں مل جائے گی تو تم ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکو گے۔"

پیشوا ذرا پریشان ہوا پھر بولا۔ "جب تمہیں حقیقت معلوم ہوئی تھی تو مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ آؤ۔ سمجھوتا کرو۔ مجھے جتنی بڑی رقم ملے گی۔ میں اس میں سے اتنا ہی بڑا شیئر تمہیں دوں گا۔"

"اور موت کی وہ اندھی گولی بھی ملے گی' جو میری لاعلمی میں کہیں سے آئے گی۔"

"مجھ پر شبہ نہ کرو۔ میں تمہیں بیٹے کی طرح چاہتا ہوں۔"

"جو دیانتداری سے محبت کرتے ہیں۔ میں کبھی انہیں دھوکا نہیں دیتا۔"

وہ بولا۔ "تم مسلمان رہو۔ میں اعتراض نہیں کروں گا۔ مگر یہودی بن کر رہو۔ اس بات کو اہمیت دو کہ ہم اربوں ڈالرز میں نہا جائیں گے۔"

"ایک معروف لیڈر نے یہاں کی دوشیزہ سے شادی کی تھی۔ اس کے بعد فلسطین کی آزادی کے لیے اس کی جدو جہد صفر ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر اسے مار ڈالا گیا۔ بعض مسلم حکمرانوں کی حرم سراؤں میں یہودی حسینائیں ہیں۔ وہ حکمران آج یہودی نواز بن گئے ہیں اور اسرائیلی فرعونیت کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔

ایک منسٹر کی بیوہ سوزانہ میرے عشق میں گرفتار ہوئی۔ اس نے میری خاطر اسلام قبول کیا۔ میرے بڑے کام آتی رہی۔ پھر میرے برے وقت میں یہودی بن گئی۔ مجھے بری طرح بلیک میل کیا۔ اس نے مجھے دھوکا دینے کے لیے اسلام قبول کیا تھا۔ آخر اپنے ہی ایک یہودی سورما بنجامن کے ہاتھوں حرام موت ماری گئی۔"

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ "میں تمام یہودی حسیناؤں کی ہسٹری جانتا ہوں۔ خود میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ آئندہ کبھی یہودی عورتیں اسلام قبول کریں گی تو میں کبھی یقین نہیں کروں گا کہ وہ گھٹی میں پڑی ہوئی صیہونیت سے باز آ گئی ہیں اور نہ ہی تمہارے جیسے پیشواؤں اور ربیوں پر اعتماد کروں گا۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اور کیسے اعتماد کروں؟ تمہاری وہ مذہبی کتاب ہیکل کے سورما سراسر فراڈ ہے۔ ہمارے علماء نے صرف اتنا اعتراف کیا ہے کہ ڈھائی ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ کا صندوق (تابوت یہودا) یروشلم لایا گیا تھا۔ اس صندوق کے محافظوں کو نائٹ ٹیمپلرز یا ہیکل کے سورما کہا جاتا ہے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "اس کے بعد کسی بھی تاریخی کتاب میں اس صندوق کا اور بارہ سورماؤں کا ذکر نہیں ہے۔ اس بات کی کوئی ٹھوس دینی شہادت نہیں ہے کہ قیامت سے پہلے بارہ سورما وہ صندوق لے کر آئیں گے۔"

پیشوا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جلالت نے سخت لہجے میں کہا۔ "چپ رہو' میری باتیں سنو۔ تم تمام پیشوا اور ربی بہت بڑے ڈراما باز ہو۔ نائٹ ٹیمپلرز فنڈ سے اربوں ڈالرز حاصل کرنے کے لیے نام نہاد ہیکل کے سورماؤں کے ذریعے اپنی ہی پوری یہودی قوم کو اُلو بنا رہے ہو۔"

وہ پھر توقف سے بولا۔ "اچھا ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں اُلو بناؤ۔ اس نیک کام میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تمہاری قوم کے سامنے ہیکل کا سورما بن کر رہوں گا۔ بولو میرے حصے میں کتنی رقم آئے گی؟"

وہ شکست خوردہ سا ہو کر بولا۔ "تم ہماری کمزوری سمجھ گئے ہو۔ ہم ہیکل کے سورماؤں کی تعداد کم نہیں ہونے دیں گے۔ بنجامن کی کمی کسی طرح پوری کریں گے اور تمہیں ہر قیمت پر حاصل کریں گے۔ تم بولو ہم سے کتنی رقم کی توقع کرتے ہو؟"

"میں رقم نہیں لوں گا' میرا مطالبہ کچھ اور ہوگا۔"

"کیا ہوگا، بتاؤ؟"

"فون پر نہیں بتاؤں گا۔ اپنے ملک سے باہر کسی بھی ملک میں ملاقات کرو۔"

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "کل تم لندن آ سکتے ہو؟"

"آ جاؤں گا۔ کہاں ملاقات ہوگی؟"

وہ جلالت کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ تین نئے سورماؤں سے ملاقات ہوگی۔ پھر وہ مادام نکاؤلی سے بھی یہ بات چھپانا چاہتا تھا کہ سولومن یہودا لندن میں ہے۔

جلالت نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو گئے؟"

"سوچ رہا ہوں' وہاں کسی کو تمہاری موجودگی کا علم نہ ہو۔ تم لندن پہنچو پھر ہم ملاقات کی کوئی جگہ مقرر کریں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ میں بھی محتاط رہنا چاہتا ہوں۔"

"ویسے تم نے یہ کہہ کر الجھا دیا ہے کہ رقم نہیں لو گے۔ جبکہ ساری دنیا دولت کے پیچھے بھاگتی ہے۔ کچھ معلوم تو ہو' چاہتے کیا ہو؟"

"میں نے کہا ناں' فون پر کہنے والی بات نہیں ہے۔"

جلالت نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ لبنان میں تھا۔ اسے وہاں کی ایک تنظیم میں پناہ مل گئی تھی۔

اس تنظیم کے مجاہدین نے مئی دو ہزار میں اسرائیلی فوج کو لبنان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

جلالت نے وہاں ٹی وی پر سیلینا اور پیشوائے اعظم کا وہ پروگرام دیکھا' جس میں اچانک ایک نئے سورما جوزف یہودا نے فون کے ذریعے پیشوا کو مخاطب کیا تھا اور اسے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ اس کے علاوہ دو اور سورما جیکب یہودا اور داؤد یہودا ہیں۔ وہ تینوں جلد ہی پیشوائے اعظم سے ملاقات کریں گے۔

جلالت نے تنظیم کے لیڈر سے کہا۔ "پیشوا ہارپر ان تین سورماؤں سے جلد از جلد ملنا چاہے گا۔ بنجامن کی کمی پوری کرنے اور بارہ کی تعداد پوری کرنے کے لیے بے چین ہوگا۔ میرا اندازہ ہے' وہ انہی تینوں سے ملنے کے لیے لندن جا رہا ہے اور یہ بات مجھ سے چھپا رہا ہے۔"

تنظیم کے لیڈر اسد اللہ نے کہا۔ "لندن میں ہمارے مخبر ہیں۔ میں ابھی اُن سے بات کرتا ہوں۔ وہ کل صبح سے رات تک کی تمام فلائٹس چیک کریں گے۔ پیشوا ہارپر جس فلائٹ سے بھی لندن پہنچے گا' ہمارے مخبر اس پر نظر رکھیں گے۔"

جلالت نے کہا۔ "میں یہی چاہتا ہوں۔ یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہاں پیشوا ہارپر کی مصروفیات کیا ہوں گی؟"

"ہمارے مخبر لندن ائرپورٹ پر تم سے ملیں گے اور دن رات تم سے رابطہ رکھیں گے۔ تمہیں پیشوا کے سلسلے میں تمام مطلوبہ معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔"

اُدھر پیشوا ہارپر نے لندن پہنچنے والے پیشواؤں اور ربیوں سے رابطہ کیا۔ انہیں اطلاع دی کہ سولومن یہودا بھی وہاں پہنچے گا۔ لیکن روپوش رہے گا۔

اس نے کہا۔ "مگر سولومن مجھ سے خفیہ ملاقات کرے گا۔ ایسے وقت ہمارے مخبر اس پر نظر رکھیں گے۔ یہ معلوم کریں گے کہ وہ مجھ سے ملنے کے بعد کہاں جائے گا اور کہاں چھپ کر رہے گا؟ ہمیں اس کی خفیہ پناہ گاہ کا علم ہونا چاہیے۔"

پھر پیشوا نے کہا۔ "مادام نکاؤلی اپنی بیٹی بونی کے ساتھ لندن آ رہی ہے۔ جب ہم اپنے ٹی وی پروگرام میں جے کوب' جوزف اور داؤد یہودا کو پیش کریں گے تو مادام نکاؤلی بھی اپنے تین سورماؤں کو متعارف کرائے گی۔ اس طرح ہم اپنی یہودی قوم کے سامنے چھ سورماؤں کو پیش کر سکیں گے۔"

پیشوائے اعظم کی رہنمائی میں تمام ممالک کے پیشوا اور ربی بنجامن کی موت کے باوجود پُرعزم تھے۔ سولومن سمیت سات سورما حاصل ہو رہے تھے۔ باقی پانچ کے متعلق بھی پُراُمید تھے کہ وہ جلد ہی آ کر بارہ کی تعداد پوری کریں گے۔

یہ بات ان کے ذہن میں تھی کہ بنجامن کی کمی پوری کرنے کے لیے جلالت کے بیٹے ایان کو بارہواں سورما بنایا جائے گا۔ اس حساب سے آٹھ سورما ان کے ہاتھوں میں تھے۔

☆☆☆

پانچ بینکروں کے پاس اب ایک سورما بھی نہیں رہا تھا۔ فی الحال ان کی طاقت یہ تھی کہ وہ نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کے اربوں ڈالرز کے نگراں تھے۔ اتنی بڑی رقم ان کی نگرانی میں بارہ سورماؤں کے درمیان تقسیم ہونے والی تھی اور ان بینکرز کو رقم کے لین دین میں اور مالیاتی معاملات کی ہیرا پھیری میں مہارت حاصل تھی۔

مہارت حاصل ہونے کے باوجود وہ دو چار سورماؤں کو اپنے زیرِ اثر رکھنا چاہتے تھے۔ پیشوائے اعظم اور اس کے حواریوں کی کمزوریوں سے کھیلتے رہنا چاہتے تھے۔

انتھونی فورڈ کے جاسوس نے اطلاع دی کہ پیشوا ہارپر دوسری صبح دس بجے کی فلائٹ سے لندن جا رہا ہے اور دوپہر دو بجے کی فلائٹ سے مادام نکاؤلی بھی اپنی بیٹی بونی کے ساتھ وہاں جا رہی ہے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ لندن کے کسی ٹی وی اسٹیشن سے نئے سورماؤں کو پیش کیا جائے گا۔

ایک بینکر گورڈن نے کہا۔ "ہم وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے ان سورماؤں کو دیکھ سکتے ہیں اور انہیں ٹریپ کر سکتے ہیں۔"

دوسرے بینکر نے کہا۔ "مادام بھی وہاں جا رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے' پیشوا ہارپر سے معاملات طے کر چکی ہے۔ ہمیں اس کے تین سورماؤں پر توجہ دینی چاہیے۔ ہم ان میں سے کسی ایک یا دو کو ٹریپ کر سکیں گے۔"

تیسرے نے کہا۔ "نہ کر سکے تو انہیں اغوا کرائیں گے۔ ان کے لیے مسائل پیدا کریں گے۔ پیشوائے اعظم کو ماننا پڑے گا کہ ہم سے سمجھوتا کیے بغیر وہ انٹی فنڈز پر بڑا ہاتھ نہیں مار سکے گا۔"

اس دنیا میں دین وایمان ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلث کے ان تین زاویوں کے درمیان دولت اور برتری کی جنگ جاری تھی اور یہ جنگی تماشا کرنے والے وہ سب کے سب لندن پہنچ گئے تھے۔

پیشوا ہارپر کے مخبر جلالت کی تاک میں تھے۔ اُردن، شام اور لبنان سے آنے والی تمام فلائٹس چیک کر رہے تھے۔ پھر ایک فلائٹ میں انہیں جلالت نظر آگیا۔ وہ ائرپورٹ سے سیدھا شیرٹن ہوٹل گیا تھا۔

تنظیم کے جاسوس نے پیشوا ہارپر کا تعاقب ائرپورٹ سے کیا۔ چندربی اس کے استقبال کے لیے آئے تھے اور اسے چیلسی کے علاقے میں لے گئے تھے۔ مادام نکاؤلی اور اس کی بیٹی بونی بھی اس کے ساتھ تھیں۔ ان سب نے فی الحال پانچ بینکرز کو نظرانداز کیا تھا۔ یہ طے کیا تھا کہ وہ لندن آئیں گے اور کسی طرح کا مسئلہ پیدا کریں گے تو ان سے نمٹ لیا جائے گا۔

دوسرے دن ایک چینل کے ذریعے تین نئے سورما جوزف، جیکب اور داؤد یہودا کو پیش کیا جانے والا تھا۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے پبلسٹی کی جارہی تھی اور یہ کہا جارہا تھا کہ مادام نینسی نکاؤلی بھی اپنے تین سورماؤں کو پیش کرنے والی ہے۔

وہ چھ سورما تقریباً بیس گھنٹے کے بعد ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والے تھے۔ اس سے پہلے رات ہی کو پیشوا ہارپر شیرٹن ہوٹل میں آیا۔ جلالت کمرا نمبر چھ سو چھ میں تھا۔

پیشوا نے اس کے بند دروازے کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر فون کے ذریعے اسے مخاطب کیا۔ ”ہیلو سولومن! میں ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

جلالت نے فون پر کہا۔ ”میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ ابھی کہاں ہوں؟ آپ کے پاس آ کر ملنا چاہوں گا۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں بھی یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے کہاں قیام کیا ہے؟“

”تو پھر ملاقات کی جگہ مقرر کریں۔“

”کوئی جگہ مقرر نہ کرو۔ میں جہاں چاہتا ہوں، پہنچ جاتا ہوں۔ ابھی تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں۔ اپنے کمرا نمبر چھ سو چھ کا دروازہ کھولو۔“

وہ چونک کر بولا۔ ”اچھا تو آپ میرے دروازے پر پہنچ گئے ہیں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ ابھی بچے ہو۔ کم آن دروازہ کھولو۔“

جلالت نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ”آپ کو مایوسی ہوگی۔ وہاں دروازہ کھولنے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ کی طرح میرا بھی یہ دعویٰ ہے کہ جہاں چاہتا ہوں، پہنچ جاتا ہوں اور میں چیلسی میں آپ کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچا ہوا ہوں۔“

وہ بڑی مایوسی سے بولا۔ ”یعنی ہم دونوں ایک دوسرے سے دھوکا کھا گئے؟“

”میں نہیں، صرف آپ دھوکا کھا گئے ہیں۔ میں صحیح جگہ پہنچا ہوں۔ آپ غلط دروازے پر کھڑے ہیں۔ میں ایک گھنٹا پہلے ہوٹل بدل چکا ہوں۔“

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”کاؤنٹر پر پوچھ لیتے تو معلوم ہوجاتا۔ لیکن آپ اپنے مخبروں پر بھروسا کرکے چھ فلور کی بلندی پر آگئے۔ نیچے اتر آئیں۔ میں زمین پر ملوں گا۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”کیا ابھی وکٹوریہ میوزیم کے گارڈن میں ملوگے؟“

”ضرور ملوں گا۔ ویسے اب ہماری ملاقات میں رازداری نہیں رہے گی۔ آپ کے مخبر میرے پیچھے اور میرے جاسوس آپ کے پیچھے رہا کریں گے۔ پھر بھی میں محتاط رہوں گا۔“

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ میوزیم کے گارڈن میں آگئے۔ پیشوا نے اس کے ساتھ ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں بنجامن کی موت کا جتنا بھی صدمہ کروں، کم ہے۔ اس کی کمی پوری کرنے کی فکر ستا رہی ہے۔ سوچتا ہوں، سورماؤں کے ہاں صرف ایک ایک بیٹا پیدا نہیں ہوتا ہوگا۔ کئی سورماؤں کے دو چار بیٹے بھی ہوں گے۔ پھر ان بیٹوں کی اولاد بھی دو چار بیٹے پیدا کرتی ہوں گی۔ اس طرح موجودہ سورما اچھی خاصی تعداد میں ہوں گے۔“

جلالت نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔ ایک گھر میں ایک سے زیادہ بیٹے پیدا ہوتے ہوں گے۔ سورماؤں کی اچھی خاصی تعداد ہوگی۔ لیکن وہ منظرِعام پر نہیں آرہے ہیں۔“

”اگر آخر میں کمی ہوگی تو ہم تمہارے بیٹے ایان کو بارھواں سورما بنائیں گے۔“

”میرے بیٹے کی بات نہ کریں۔ میں اسے کسی کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔“

”تمہیں اعتراض کیوں ہے؟ جبکہ میں منہ مانگی رقم ادا کروں گا۔“

”آپ سونے کا پہاڑ لا کر کھڑا کردیں گے، تب بھی اپنے ایان کو اس معاملے میں ملوث نہیں کروں گا۔ جانتے ہیں کیوں؟“

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”ہم، آپ سب ہی جانتے ہیں، جب بارہ سورما یکجا ہوں گے اور ہیکل میں تابوتِ یہودا لائیں گے تو وہ سب کچھ آسانی سے نہیں ہوگا۔ اربوں ڈالرز کی خاطر مثلث کے تینوں زاویے ایک دوسرے کی موت بن جائیں گے۔ جسے نہیں ملے گا، وہ بھی اور جسے تھوڑا ملے گا، وہ بھی آگ اور خون کا کھیل کھیلے گا۔ میں ایسی جگہ تابوت یہودا کو اپنے بیٹے کا تابوت نہیں بننے دوں گا۔“

”یہ بعد کا مسئلہ ہے۔ ہم اس پر پھر کسی وقت بحث کریں گے۔ ابھی اپنے بارے میں فیصلہ سناؤ؟“

”میں نے چھپ کر آپ کی باتیں سنی تھیں۔ جب سے آپ کی اصلیت معلوم ہوئی ہے، تب سے سمجھ رہا ہوں کہ آپ کاروباری پیشوائے اعظم ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اب تک وہاں کتنی رقم جمع ہوچکی ہے؟“

وہ بولا۔ ”رقم کی صحیح بیلنس شیٹ ان پانچ بینکرز کی تاریخ میں رہتی ہے۔ ہمارا ایک اندازہ ہے کہ بینک میں دو سو ارب سے زیادہ رقم جمع ہوچکی ہے۔“

”یا خدا! ایسا لگتا ہے، جیسے زمین میں گڑا ہوا خزانہ ہے جو باہر نکلنے والا ہے۔ اسے لوٹنے کے لیے آپ کے اور بینکرز کے درمیان ٹھنی ہوئی ہے۔ مادام بھی داؤ پیچ لڑانے میدان میں آگئی ہے۔ جرائم کی دنیا میں ایسی اندھی لوٹ مار شاید پہلی بار ہونے والی ہے۔“

”ہاں۔ یہ مذہب کی آڑ میں پہلی بے مثال ڈکیتی ہوگی جس میں ڈاکو کبھی پکڑے نہیں جائیں گے۔ بلکہ انہیں سر پر بٹھایا جائے گا۔ میں خود کو بھی ڈاکو کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ تم میرے کھیل کو سمجھ گئے ہو۔ بہتر ہے، اپنا فیصلہ سناؤ۔“

پھر وہ جلالت کے بولنے سے پہلے بولا۔ ”اور فیصلہ کیا سناؤ گے؟ تمہیں ہر حال میں میرے ساتھ رہنا ہے۔ تابوت یہودا لاتے وقت خون خرابا ہوگا تو تم میرے مضبوط بازو بن کر رہو گے۔ یہ خوب سمجھتا ہوں کہ فولاد ہو۔ ناقابلِ شکست ہو۔“

اس نے کہا۔ ”جو معاوضہ مانگوں گا، دے سکو گے؟“

”تم نے کہا تھا، رقم نہیں لو گے اربوں ڈالرز کو ٹھکرا دو گے۔ پھر کیا مطالبہ ہے تمہارا؟“

وہ جیسے فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”جدید اسلحہ، میزائل اور وہ ایٹمی اور جراثیم ہتھیار جو اسرائیلی فوج استعمال کرتی ہے۔“

پیشوا نے شدید حیرانی سے کہا۔ ”یہ ساری چیزیں ایک فوج کے لیے لازمی ہوتی ہیں۔ تم یہ سب لے کر کیا کرو گے؟“

”میں یہ تمام اسلحہ فلسطینیوں تک پہنچاؤں گا۔ ان کے لیے روٹی اور کپڑے سے زیادہ اسلحہ ضروری ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”آخر مسلمان ہی نکلے۔“

”الحمدللہ مسلمان ہوں۔ صاحب ایمان ہوں اور رہوں گا۔ کیا میرا مطالبہ پورا کرسکو گے؟“

”یہ مطالبہ نہیں ہے، مطالبات کا گودام ہے۔ کیا اس کی کوئی حد ہے کہ کتنا چاہتے ہو؟“

”جب تک بارہ سورما یکجا نہ ہوں۔ تابوت یہودا حاصل نہ ہوجائے، تب تک فلسطینی مجاہدین کو یہ تمام ضروری اسلحہ سپلائی کیا جائے گا۔“

”تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ غزہ کا بارڈر تین اطراف سے سیلڈ رہتا ہے۔ چوتھی سمت سمندر ہے۔ اسلحہ تو کیا دو روٹیاں بھی وہاں پہنچا نہیں سکتے۔ کیا یہ سامان تم وہاں لے جاؤ گے؟ جبکہ چھپتے پھر رہے ہو۔“

”میں نے فلسطین کو حب الوطنی اور جانبازی دی ہے۔ کبھی وہاں اسلحہ نہیں پہنچایا۔ پھر بھی اسرائیلی جارحیت کے روزِ اوّل سے مجاہدین کو اسلحہ مل رہا ہے۔ ہر سمت سے ناکا بندی کے باوجود مجاہدین جوابی حملے کیسے کرتے ہیں؟ یہ بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔“

”تو تم سمجھاؤ ناں؟“

”یہ راز ہے، راز رہے گا۔ آپ صرف اسلحہ کی خریداری کے لیے رقم دیتے رہیں گے۔“

”کیا پتا بارہ سورما کب یکجا ہوں گے؟ میں کب تک اسلحہ کے لیے کروڑوں ڈالرز دیتا رہوں گا؟“

”یہ سوچنا سمجھنا آپ کا کام ہے اور یہ ضرور سوچیں کہ اگر آپ سے پھر جاؤں گا تو وہ پانچ بینکرز بڑی آسانی سے میرا مطالبہ پورا کرتے رہیں گے۔“

”ایسا نہ کہو سولومن!“

”سولومن نہیں، جلالت اسرار۔۔۔“

”میں مانتا ہوں، تم مسلمان ہی رہو گے۔ لیکن سولومن بن کر رہنے اور میرا ساتھ دینے کی شرط بہت کٹھن ہے۔“

”آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ بنجامن مر گیا۔ یہ سمجھیں کہ میرا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ آپ کو تین نئے سورما مل رہے ہیں۔ مادام سے دوستی رکھیں گے تو آپ کے پنجرے میں چھ سورما ہوجائیں گے۔“

''پلیز۔ میرے بھروسے کو سمجھو۔ میں صرف تمہاری موجودگی میں اپنی سلامتی سمجھتا ہوں۔ جب تابوت یہودا لایا جائے گا' آگ اور بارود کا کھیل شروع ہوگا' تب تم ہی مجھے دشمنوں کے نرغے سے نکال سکو گے۔''

جلالت نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا' ایسے وقت کیا کرسکوں گا؟ آپ موجودہ حالات پر غور کریں۔ مجھے جواب دینے کی جلدی نہ کریں۔ یہ وعدہ کرتا ہوں' آپ سے مایوس ہونے کے بعد ہی ان پانچ بینکرز سے رابطہ کروں گا۔''

وہ مطمئن ہوکر بولا۔ ''شاباش! تم جتنے دلیر ہو' اُتنے ہی سمجھدار ہو۔ کل ہمارا ٹی وی پروگرام ہوجانے دو۔ اس کے بعد تمہیں جواب دوں گا۔''

''اچھا تو پھر چلتا ہوں۔''

''جسٹ آمنٹ۔ مادام نکاؤلی تم سے ملنا چاہتی ہے۔ میں اس کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ اس سے کہیں بھی تھوڑی دیر کے لیے ملاقات کرو۔ وہ عورت بہت پہنچی ہوئی ہے۔ تمہارے بہت کام آسکتی ہے۔''

''کام آنے والی عورت ہمیشہ مرد پر حاوی رہتی ہے۔ اور میں کسی کو سر نہیں چڑھاتا۔ کل اسے ٹی وی پر دیکھوں گا۔ پھر اس کے متعلق رائے قائم کروں گا۔''

وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔ ہارپر نے اس سے مصافحہ کیا۔ پھر وہ دونوں دو مختلف سمتوں میں چلے گئے۔

☆☆☆

جلالت کا مطالبہ پیشوا کے یہودی مزاج کے خلاف تھا۔ وہ مسلمان اسرائیلی فوج کے خلاف بے حساب اسلحہ طلب کر رہا تھا۔

وہ بھلا کس دل سے اس کا مطالبہ پورا کرسکتا تھا؟ کوئی اپنے ہی گھر میں آگ لگانے کے لیے کسی کو ماچس نہیں دیتا۔ وہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والا نہیں تھا اور جلالت کا پیچھا چھوڑنے والا بھی نہیں تھا۔ اگر اسے چھوڑنے کی حماقت کرتا تو وہ انتھونی فورڈ سے سودا طے کرلیتا۔ وہ پانچوں بینکرز بہت دولتمند تھے۔ مزید اربوں ڈالرز حاصل کرنے کے لیے جلالت سے اسلحہ کی خریداری کا سمجھوتا کرسکتے تھے۔

وہ پانچوں ضرورت مند تھے۔ بنجامن سے محروم ہونے کے بعد ہر شرط پر جلالت کو لپکنے والے تھے۔ پھر اس کے ذریعے مزید سورماؤں کو اپنے زیر اثر لاسکتے تھے۔

مادام اور بونی نکاؤلی لگژری ہوٹل کے ایک کمرے میں تھیں۔ پیشوا ان سے ملنے آیا تو مادام نے پوچھا۔ ''کیا سولومن سے ملاقات ہوئی؟''

وہ تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ کر بولا۔ ''ہاں۔ اسی سے مل کر آرہا ہوں۔''

''کیا آپ نے کہا تھا' میں بھی اس سے ملنا چاہتی ہوں؟''

''ہاں۔ وہ بہت اڑیل ہے۔ اپنے مزاج کے مطابق چلتا ہے۔ ابھی تم سے نہیں ملے گا۔ کل تمہیں ٹی وی اسکرین پر دیکھے گا۔ پھر ملنے نہ ملنے کا فیصلہ کرے گا۔''

بونی نے کہا۔ ''بہت مغرور ہے۔ جبکہ دربدر مارا مارا پھر رہا ہے۔ کیا وہ پھر لبنان واپس جائے گا؟''

مادام نے کہا۔ ''صرف ایک ہی تنظیم اس کی پناہ گاہ ہے۔'' پھر اس نے پیشوا سے پوچھا۔ ''وہ تو آپ کے ہاتھ سے گیا۔ کیا آئندہ اسے اپنے زیر اثر رکھ سکیں گے؟''

''وہ میرا وفادار بن کر رہنے کی بہت بڑی قیمت مانگ رہا ہے۔''

''کیا اس نے کوئی بہت بڑا مطالبہ کیا ہے؟''

پیشوا نے کہا۔ ''وہ مسلمان ہے۔ اپنی فطرت سے باز نہیں آئے گا۔ ہم یہودیوں کو نقصان پہنچانے کا کام کرتا رہے گا۔ وہ ہماری آرمی کے خلاف بے حساب اسلحہ طلب کر رہا ہے۔''

مادام حیران ہوئی پھر بولی۔ ''مجھے حیران نہیں ہونا چاہیے۔ وہ مسلمان ہے' یہ کبھی نہیں چاہے گا کہ یہودی ساری دنیا کے حکمران بن جائیں۔ تابوت یہودا کے لائے جانے سے پہلے وہ اسی طرح کی گڑبڑ کرتا رہے گا۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ''کیا وہ جانتا ہے' ہم نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کی رقم حاصل کرنے کے لیے یہ ڈراما پلے کر رہے ہیں؟''

''ہاں۔ وہ میرے' تمہارے اور اُن پانچ بینکرز کے ارادوں کو اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔''

بونی نے پیشوا سے پوچھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا' آپ اس مسلمان کو اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟ ایک سورما بنجامن مر گیا ہے۔ دوسرے کو بھی دفع کریں۔ آئندہ اور سورما آجائیں گے۔''

اس نے کہا۔ ''ہمیں مصلحت سے کام لینا ہے۔ جب تک بارہ کی تعداد پوری نہیں ہوگی۔ ہم سولومن اور اس کے بیٹے ایان کو اہمیت دیتے رہیں گے۔ جب ان باپ بیٹے کے بغیر بارہ کی تعداد مکمل ہوجائے گی تو ان مسلمانوں کو زندہ زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔''

مادام نکاؤلی نے کہا۔ ''اگر بارہ سورما ہماری زندگی میں نہ آئے تو ہمیں اپنی جدوجہد کا صلہ کیا ملے گا؟ کچھ نہیں۔ ہم خالی ہاتھ جائیں گے۔ اس کے بعد ہماری اولاد ہماری طرح مخالفین سے نہیں لڑ سکے گی۔''

وہ پیشوا کی طرف جھک کر بولی۔ ''ہم چالاکی اور مکاری کے بغیر اربوں ڈالرز ہار جائیں گے۔ بارہ سورماؤں کو آج نہیں تو کل ہی آنا ہوگا۔ اینٹی فنڈز کی رقم ہمیں حاصل کرنی ہے۔ میں اسے حاصل کیے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''تمہارا خیال منافع بخش ہے۔ ہمارے پاس چھ سورما ہیں۔ باقی چھ کو ہم پیدا کریں گے۔ دنیا کے بازار میں دو نمبر مال کیش ہوجاتا ہے۔ ہم نقلی سورماؤں کو کیش کریں گے۔''

''اس کے لیے ایک بھرپور ٹھوس پلاننگ پر عمل کرنا ہوگا۔''

''میں پوری پلاننگ کرچکا ہوں۔ کل ٹی وی پروگرام کے بعد تم میرے اپارٹمنٹ میں آؤ گی۔ وہاں میرے منصوبے پر غور کرنے کے بعد کام شروع کیا جائے گا۔''

وہ ماں بیٹی سے رخصت ہوکر اپنے اپارٹمنٹ میں آیا۔ وہاں چند پیشوا اور ربی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان تین باڈی بلڈرز تھے۔ وہ جلالت اور بنجامن کی طرح فولادی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ تینوں پیشوائے اعظم کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ پھر انہوں نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر سر جھکا لیا۔ ایک پیشوا نے ان میں سے ایک ایک کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''یہ جوزف یہودا ہے' یہ جیکب یہودا ہے اور یہ داؤد یہودا ہے۔''

پیشوا ہارپر نے دیکھا۔ انہوں نے بغیر آستین کی بنیانیں پہنی تھیں۔ ان کے سینے چٹان کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں اور ہر ایک کے دائیں بازو پر ویسا ہی پیدائشی نشان تھا' جیسا کہ جلالت اور بنجامن کے بازوؤں پر دیکھا گیا تھا۔

اس نے تینوں کے شانوں پر باری باری ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اٹھو اور آرام سے صوفوں پر بیٹھو۔ ہیکل کے سورما یہودی قوم کے نجات دہندہ میرے سامنے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔''

پھر اس نے لندن کے پیشوا سے کہا۔ ''آپ چاہتے تھے' میں کل صبح آپ کی رہائش گاہ میں آکر ان تینوں سے

ملاقات کروں لیکن آپ صبح سے پہلے ہی ابھی انہیں میرے پاس لے آئے ہیں۔"

لندن کے پیشوا نے کہا۔ "جی ہاں۔ کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں، جنہیں حل کرنے کے لیے ابھی یہاں آنا پڑا۔"

ہار پر نے کہا۔ "خداوند ہم سب پر رحم کرے۔ کیا مسائل الجھانے اور پریشان کرنے والے ہیں؟"

"جی ہاں۔ مسائل سلجھائے نہ گئے تو اور الجھ سکتے ہیں۔"

"او گاڈ! فوراً بتاؤ کیا بات ہے؟"

اس نے ایک کی سمت انگلی اٹھا کر کہا۔ "یہ جیکب یہودا ہے۔ آپ ان تینوں کی ہسٹری پڑھ چکے ہیں۔ یہ ریکارڈ کے مطابق ہیکل کا یہودی سورما ہے۔ لیکن داؤد یہودا نے آج آف دی ریکارڈ ہمیں اپنی اصلیت بتائی ہے۔ انگریزی اور عبرانی زبان میں داؤد کو ڈیوڈ کہا جاتا ہے۔ داؤد عربی زبان کا لفظ ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "میں ڈیوڈ نہیں کہلاتا۔ اسلامی ملک اُردن میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن سے داؤد کہلاتا ہوں۔ اب سے ستر برس پہلے میرے دادا نے اسلام قبول کیا تھا۔ میں اپنے باپ دادا کے زمانے سے مسلمان ہوں۔"

پیشوا ہار پر کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تمہارے بازو پر یہ پیدائشی نشان اس بات کا ثبوت ہے کہ تم ہیکل کے یہودی سورما ہو۔"

"بیشک میرا سلسلہ نسب ایک یہودی سورما سے چلا آ رہا ہے اور یہ سلسلہ ہزاروں سال سے ہے۔ میرے دادا اُردن میں پیدا ہوئے۔ وہاں انہوں نے مسلمانوں کے ماحول میں پرورش پائی۔ اسلام سے متاثر ہوتے رہے پھر یہ دین قبول کر لیا۔"

پیشوا ہار پر پریشان ہو کر دوسرے پیشواؤں اور ربیوں کو دیکھ رہا تھا۔ داؤد نے کہا۔ "آپ پریشان ہو رہے ہیں۔ میرے مسلمان ہونے سے آپ کو صدمہ پہنچ رہا ہے۔ حوصلہ کریں، کیونکہ ایک اور صدمہ بھی پہنچنے والا ہے۔"

اس نے جوزف یہودا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جوزف نہیں ہے۔ اس کا اصل نام یوسف حسن ہے۔ یہ بھی مسلمان ہے۔"

ہار پر کو پھر ایک دماغی جھٹکا پہنچا۔ وہ تلملا کر صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے ایک سینئر پیشوا سے بولا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہماری دینی کتاب ہیکل کے سورما کا مذاق اڑایا جا رہا ہے؟ کیا ہم سوچ بھی سکتے ہیں کہ ہیکل میں مسلمان سورما آئیں گے اور ہمارے لیے تابوت یہودا لائیں گے؟"

سینئر پیشوا نے کہا۔ "آپ مجھ سے بڑے عالم ہیں۔ ہم سے زیادہ دین کو سمجھتے ہیں۔ ہم سب نے ڈھائی ہزار سال پہلے لکھی ہوئی کتاب ہیکل کے سورما پڑھی ہے۔ اس کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا گیا کہ تابوت یہودا لانے والے بارہ سورما یہودی ہوں گے۔"

ایک ربی نے کہا۔ "کتاب میں یہ نہیں لکھا گیا کہ بارہ سورماؤں کی اولاد آگے چل کر یہودی ہی رہے گی۔ یہ سمجھنے کی بات ہے کہ وقت، ماحول اور حالات کے تحت مذہب تبدیل ہو سکتا ہے اور ایسا ہو رہا ہے۔ داؤد اور یوسف حسن سے پہلے ایک مسلمان سورما جلالت اسرار آپ کے سائے میں آ کر جا چکا ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "وہ آپ کا تابعدار تھا۔ اگر آپ اعتماد کریں گے تو ہم بھی آپ کے تابعدار بن کر رہیں گے۔"

یوسف حسن نے کہا۔ "آپ کی دینی کتاب کے مطابق بارہ سورماؤں کی اولاد تابوت یہودا لائے گی اور ہم ان بارہ سورماؤں کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ ہمارے خاندانی شجرے سے اور ہمارے سورما ہونے سے انکار نہیں کر سکیں گے۔"

پیشوا ہار پر نے سوال کیا۔ "ہم کیسے یقین کریں کہ تم یہودیوں کی برتری اور حکمرانی کے لیے ہمارے تابعدار بن کر رہو گے؟"

داؤد نے پوچھا۔ "آپ نے جلالت اسرار پر کیسے بھروسا کیا ہے؟ کیا وہ آپ کو مسلمان نظر نہیں آ رہا ہے؟"

"جلالت کو ہماری برتری اور حکمرانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ ایک بہت بڑی رقم کے عوض ہمارا تابعدار بن کر رہے گا۔"

یوسف حسن نے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔"

داؤد نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے، بارہ سورماؤں کو نائٹ ٹیمپلرز فنڈ سے اربوں نہ سہی، کروڑوں ڈالرز ملیں گے۔ اس لیے ہم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے آئے ہیں۔"

ایک ربی نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ہم تمہیں ہیکل کے سورما تسلیم کر لیں گے؟"

یوسف حسن نے کہا۔ "تسلیم نہیں کریں گے تو ہم

اپنے گھر واپس چلے جائیں گے۔ آپ ہماری کمی پوری کرنے کے لیے نئے سورماؤں کے انتظار میں بوڑھے ہوتے رہیں گے۔"

داؤد نے کہا۔ "کون جانتا ہے، بارہ کی گنتی کب پوری ہو گی؟ کیا تب تک آپ دنیا میں رہیں گے؟ جو تین سورما ملنے والے تھے، ان میں سے ہم دو تو گئے۔ صرف یہ جیکب یہودا آپ کے پاس رہ جائے گا۔ ہماری عقل کہتی ہے، آپ ہمیں ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔ جتنے بھی آ رہے ہیں، انہیں سمیٹ کر رکھیں گے۔"

پیشوا ہار پر، دوسرے تمام پیشوا اور ربی دل ہی دل میں تسلیم کر رہے تھے کہ جو سورما آ رہے ہیں، انہیں آنے دیں گے۔ جانے کبھی نہ دیں گے۔

ہار پر نے کہا۔ "تمہارے کروڑوں ڈالرز کے خواب پورے ہو سکیں گے۔ شرط یہ ہے کہ وفاداری کی ضمانت دو۔ مسلمان اور یہودی کبھی ایک دوسرے پر بھروسا نہیں کرتے۔ ہم تم پر کیسے کریں؟"

داؤد نے کہا۔ "یہی سوال ہمارا ہے، ہم آپ پر کیسے بھروسا کریں کہ بارہ سورماؤں کے ناٹک کے آخری سین میں ہمارے کروڑوں ڈالرز ادا کیے جائیں گے؟"

یوسف نے کہا۔ "ہم صرف پیشگی رقم لے کر کام آئیں گے۔ باقی رقم ڈوب جائے گی تو کسی کا گریبان کیسے پکڑ سکیں گے؟"

ہار پر نے کہا۔ "بے اعتمادی دونوں طرف سے ہے اور ہم ایک دوسرے کے لیے ضروری بھی ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی فوراً حل نہیں ہو گا۔ فی الحال ہم عارضی سمجھوتا کرتے ہیں۔"

انہوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "جب تک ہمارے درمیان پکا معاہدہ نہ ہو جائے، تم دونوں خود کو مسلمان نہیں کہو گے۔ کل ٹی وی اسکرین پر ہیکل کے یہودی سورما بن کر رہو گے۔"

"ہمارے درمیان ٹھوس معاہدہ کب ہو گا؟"

"آج سے دو دنوں کے بعد ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔"

داؤد نے کہا۔ "ہم دو دنوں تک سورما بن کر رہنے کے دو لاکھ ڈالرز لیں گے اور جب پکے کاغذ پر معاہدہ ہو گا تو پیشگی کے طور پر دو دو کروڑ ڈالرز ہمیں ادا کیے جائیں گے۔"

ہار پر نے کہا۔ "ہم نہیں جانتے، اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ ہمیں کس حد تک کامیابی حاصل ہو گی؟ انتھونی فورڈ اور اس کے ساتھی بینکرز ہمیں اینٹی فنڈز سے محروم کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ لہٰذا ہم ابتدا میں دو کروڑ نہیں دیں گے۔ تم دونوں کو پچاس پچاس لاکھ ادا کر سکیں گے۔"

پیشواؤں اور ربیوں نے کہا۔ "یہ مناسب ہے۔ دو دنوں تک سوچنے سمجھنے کا وقت ہے۔ لہٰذا ابھی بحث نہ کی جائے۔ ٹی وی پروگرام کے بعد دوستانہ معاہدہ کیا جائے گا۔"

بحث ختم ہو گئی۔ وہ سب وہاں سے چلے گئے لیکن پیشوا ہار پر کے مسائل ختم نہیں ہوئے تھے اور بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

ٹی وی اسٹوڈیو میں بڑی گہما گہمی تھی۔ ہیکل کے سورما وہاں آئے ہوئے تھے۔ سیکیورٹی کے سخت انتظامات کیے گئے تھے۔ شوٹنگ یونٹ کے افراد کے سوا کسی کو اسٹوڈیو کے اس حصے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ انتھونی فورڈ شوٹنگ کے دوران سیٹ پر رہنے کی خصوصی اجازت حاصل کر کے آیا تھا۔

ایک بڑے سے ہال میں کیمرا اور لائٹس ارینج کی گئی تھیں۔ درجنوں پیشوا اور ربی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بڑے سے اسٹیج پر مادام نینسی اور پیشوا ہار پر آ گئے۔

کیمرا آن ہوتے ہی پیشوا نے یہودی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے پہلے بنجامن یہودا کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور کہا۔ "یہ ہماری دینی کتابوں میں لکھا ہے کہ بارہ سورما تابوت یہودا لائیں گے اور اس میں رکھے ہوئے مقدس تبرکات کے ذریعے ہماری قوم کو عروج اور خوشحالی نصیب ہو گی۔ ہم یہودی پوری دنیا پر حکمرانی کریں گے۔ لیکن ہمارے دشمن یہ نہیں چاہتے کہ ہم سپر پاور بن جائیں۔ ان کی عداوتوں سے گزرنے کے باوجود ہمارے حوصلے بلند ہیں۔ ہم اپنی قوم کو بہت بڑی خوشخبری سنا رہے ہیں۔ ہماری خوشحالی اور ساری دنیا پر حکمرانی کے دن قریب آ گئے ہیں۔ مبارک ہو، تابوت یہودا لانے کے لیے چھ سورما آ گئے ہیں اور ابھی آپ کے سامنے پیش ہونے والے ہیں۔"

یہ سن کر وہاں بیٹھے ہوئے تمام حاضرین تالیاں بجانے لگے۔ ان کی تالیاں پیشوا ہار پر کے سینے پر ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔ وہ حقیقت جانتا تھا کہ پیش ہونے والے سورما ہاتھی کے دانت ہیں۔ صرف دکھانے کے لیے ہیں، چبانے کے لیے نہیں ہیں۔

تھوڑی دیر بعد داؤد، یوسف حسن اور جیکب یہودا باری باری اسٹیج پر آئے۔ انہوں نے یہودی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی عقیدت سے کہا کہ آئندہ وہ پیشوائے

اعظم کی سرپرستی میں رہا کریں گے اور سورماؤں کے خلاف ہونے والی سازشوں کا منہ توڑ جواب دیتے رہیں گے۔

پھر مادام نکاؤلی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''حاضرین اور ناظرین نے تین سورماؤں کو دیکھا' ان کی باتیں سنیں۔ اب مزید تین سورماؤں کو میں پیش کررہی ہوں۔''

اس نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جوڈی یہودا اور سیم سن یہودا کم آن۔ تمہاری قوم تمہیں دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔''

دو قدآور باڈی بلڈرز تالیوں کے شور میں اسٹیج پر آئے۔ ان کے بازوؤں پر سورماؤں کا وہ خاص پیدائشی نشان واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔

انہوں نے بڑے ہی جذباتی انداز میں یہودی قوم کو مخاطب کیا۔ انہیں پوری دنیا پر حکمرانی کے خواب دکھائے۔ مادام کا شکریہ ادا کیا اور کہا' مادام پُراسرار علوم جانتی ہیں۔ وہ اپنے علوم کے ذریعے انہیں تلاش کرنے کے بعد پیشوائے اعظم تک پہنچارہی ہیں۔ وہ دونوں سورما مادام کو ماں کا درجہ دیتے ہیں اور آئندہ اسی کی ہدایت پر عمل کرتے رہیں گے۔

ان دو سورماؤں نے ایسی بات کہہ کر پیشوا ہارپر کو یہ جتادیا کہ وہ ہمیشہ مادام کے تابعدار بن کر رہا کریں گے۔

پیشوا نے کہا۔ ''مادام! آپ تین سورماؤں کو پیش کرنے والی تھیں۔ وہ تیسرا کہاں ہے؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولی۔ ''میں اسے بھی پیش کررہی ہوں۔ اس سے پہلے حاضرین اور ناظرین کو یہ بتادوں کہ اس سورما کو دیکھ کر آپ سب چونک جائیں گے۔ حیران ہوں گے اور یقیناً اسے سورما تسلیم کرنے سے انکار کریں گے۔''

پیشوا نے کہا۔ ''آپ اسے پیش کرنے سے پہلے ہمارے تجسس کو بھڑکا رہی ہیں۔''

ایک اور پیشوا نے کہا۔ ''اگر وہ ناقابلِ قبول ہوگا۔ سورماؤں کے اصولوں اور معیار کے مطابق نہ ہوگا تو کوئی بھی اسے سورما تسلیم نہیں کرے گا۔''

ان کی باتوں کے دوران یونی نکاؤلی اسٹیج پر آگئی۔ انتھونی فورڈ نے مسکرا کر کہا۔ ''مادام نکاؤلی علمِ نجوم اور کئی پُراسرار علوم جانتی ہے۔ یقیناً کوئی چونکا دینے والا تماشا دکھائے گی۔''

یونی نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں مادام نینسی نکاؤلی کی بیٹی ہوں۔ میرے ڈیڈی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کا نام ہیرالڈ یہودا تھا۔ باپ کے حوالے سے میرا نام یونی یہودا ہے اور اس نسب سے میں ہیکل کی ایک سورما ہوں۔''

اس بات پر چند لمحوں کے لیے خاموشی رہی۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر یکبارگی سب ہی قہقہے لگانے لگے۔ پورا ہال قہقہوں سے گونجنے لگا۔ بعض لوگ پھبتیاں کس رہے تھے۔

پیشوا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''آپ حضرات کی طرح میں بھی اس بات سے بے خبر تھا کہ مادام نکاؤلی اس محفل میں ایسی مضحکہ خیز بات کہیں گی اور جب انہوں نے کہہ ہی دیا ہے تو آپ حضرات ذرا صبر و تحمل سے خاموش رہیں۔ میں آپ کے سامنے مادام کا محاسبہ کررہا ہوں۔''

پھر اس نے مادام سے کہا۔ ''آپ ذہین ہیں' عمر رسیدہ ہیں' کئی پُراسرار علوم کی حامل ہیں۔ یہ جانتی ہیں کہ اس لائیو پروگرام کے ذریعے ساری دنیا اس مذہبی اور روحانی اجتماع کو آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ آپ یہ بتائیں' کیا پورے ہوش و حواس میں رہ کر اپنی بیٹی کو ہیکل کا سورما کہہ رہی ہیں؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولی۔ ''بیشک۔ میں نادان نہیں ہوں۔ ساری دنیا کے سامنے اتنی بڑی بات کہہ رہی ہوں تو ضرور اسے سچ ثابت کروں گی۔''

اس نے بیٹی کو اشارہ کیا۔ یونی نے کیمرے کی طرف گھوم کر اپنی شرٹ کی دائیں آستین کو ایک جھٹکے سے پھاڑ دیا۔ اس بازو کا بگ کلوز دکھائی دینے لگا۔ وہاں ہیکل کے سورماؤں کا پیدائشی نشان صاف نظر آرہا تھا۔

اسٹوڈیو کے سیٹ پر جو حاضرین تھے' وہ سامنے دیوار پر بڑی اسکرین کو دیکھ رہے تھے۔ یونی بڑے فخر سے کہہ رہی تھی۔ ''میں ہیکل کی سورما ہوں۔ مجھے یہ پیدائشی نشان اپنے باپ کے لہو سے ملا ہے۔''

وہ اپنے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''جسے تحقیق کرنی ہے' وہ کرے۔ جدید آلات سے' محدب شیشے سے دیکھے۔ ماہرین کی رپورٹ لے۔ ایک ہی سچائی سامنے آئے گی کہ یہ نشان بناوٹی نہیں' پیدائشی ہے۔''

ایک ربی نے کہا۔ ''ہم ابھی ماہرین کو کال کررہے ہیں۔ وہ یہاں آکر پروگرام کے بعد اس نشان کا معائنہ کریں گے۔''

ایک پیشوا نے کہا۔ ''اگر یہ نشان پیدائشی ہوگا' تب بھی کیا ہم ایک عورت کو ہیکل کا سورما مان لیں گے؟

پیشوائے اعظم! آپ جواب دیں؟''

ہارپر نے کہا۔ ''عورت قدرتی طور پر کمزور ہوتی ہے۔ وہ ایک شہزور سورما نہیں بن سکتی۔''

مادام نے کہا۔ ''میری بیٹی کسی بھی سورما کی طرح شہزور اور ناقابلِ شکست ہے۔ یہ اب تک کئی پہلوانوں کو رنگ سے باہر پھینک چکی ہے۔ میں چیلنج کرتی ہوں، جو پہلوان خود کو ناقابلِ شکست سمجھتا ہے، وہ آئے اور میری بیٹی کا مقابلہ کرے۔''

جوڈی یہودا اور سیم سن یہودا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ''ہم تمام سورما شہزور ہوتے ہیں۔ ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا اور ہم یونی سے مقابلہ کرچکے ہیں۔''

سیم سن یہودا نے کہا۔ ''یہ ہمیں شکست نہ دے سکی۔''

انتھونی فورڈ نے خوش ہوکر تالی بجائی۔ سیم سن نے کہا۔ ''ہم بھی یونی کو شکست نہ دے سکے اور مان گئے کہ یہ ناقابلِ شکست سورما ہے۔''

مادام نے طنزیہ انداز میں انتھونی سے کہا۔ ''تالی بجاؤ۔ میری بیٹی سے دو سورماؤں کا مقابلہ برابر رہا۔ تم بھی مرد ہو' چلو اس سے پنجہ لڑاؤ۔ ابھی ماں کا دودھ یاد آجائے گا۔''

پروگرام کے پروڈیوسر نے اسٹیج پر آکر کہا۔ ''ناظرین! پروگرام کا وقت ختم ہورہا ہے۔ آپ نے پانچ سورماؤں کو دیکھا۔ چھٹے سورما کا معاملہ انتہائی دلچسپ اور تجسس سے بھرپور ہے۔ آئندہ یونی یہودا کے متعلق تحقیقات ہوں گی۔ ہم اس کی مکمل رپورٹ خبروں کے بلیٹن میں پیش کریں گے۔''

کیمرا آف ہوگیا۔ پروگرام ختم ہوگیا مگر انتھونی' تمام پیشوا اور ربی وہاں جم کر بیٹھ گئے۔ مادام نکاؤلی سے بحث کرنے لگے۔ ایسے وقت ماہرین آگئے اور یونی کے بازو کا معائنہ کرنے لگے۔

مادام اپنی ہسٹری بیان کررہی تھی۔ اس ہسٹری کا خلاصہ یہ تھا کہ ہیکل کے ایک سورما ہیرلڈ یہودا سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ دو برس بعد ایک بیٹا ہوا۔ وہ کچھ سانسیں لینے کے بعد مرگیا۔ دوسری تیسری بار بھی بیٹے ہوئے' وہ بھی مرگئے۔

مادام نے اپنے علوم کے ذریعے ہیرلڈ یہودا کو بتایا کہ اس کے نصیب میں بیٹا نہیں ہے۔ وہ ایک بیٹی کا باپ بننے والا ہے اور وہی بیٹی ہیکل کی سورما کہلائے گی۔

چھ برس بعد یونی پیدا ہوئی تو اس کے دائیں بازو پر سورماؤں کا وہی نشان موجود تھا۔ یونی کے بعد بھی دو لڑکیاں پیدا ہونے کے بعد مرگئیں۔ ان لڑکیوں کے بازوؤں پر وہ پیدائشی نشان نہیں تھا۔

ہیرلڈ نے کہا۔ ''صرف اسی ایک بیٹی کے بازو پر یہ نشان ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدرتی طور پر ہیکل کی سورما کہلائے جانے کی مستحق ہے۔''

پیشوا ہارپر نے کہا۔ ''یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے کہ تم مطالبہ کروگی اور اسے مان لیا جائے گا۔ یہ ایک دینی اور روحانی معاملہ ہے۔ ہم تمام پیشوا اور ربی سر جوڑ کر بیٹھیں گے۔ اس معاملے پر غور کریں گے پھر دینی احکامات کے مطابق فیصلہ سنائیں گے۔''

''میں فیصلے کا انتظار کروں گی۔ ہزاروں برس پہلے جو کتاب ہیکل کے سورما لکھی گئی تھی۔ اسے میں نے بار بار پڑھا ہے۔ کتاب میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ ہیکل کے تمام سورما مرد تھے اور ان میں کوئی عورت نہیں تھی۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ آئندہ کوئی عورت سورما بننے کی مستحق ہو' سورماؤں کی تمام صلاحیتیں اور خوبیاں رکھتی ہو تو اسے سورما نہیں بنایا جائے گا۔''

یونی نے کہا۔ ''اگر میرے ساتھ ناانصافی ہوگی تو میں اس معاملے کو کورٹ میں چیلنج کروں گی۔ دین کے حوالے سے بھی میری پوزیشن مضبوط ہے۔''

جلالت اسرار بھی اسٹوڈیو کے ایک حصے میں پہنچا ہوا تھا۔ اس نے ڈاڑھی مونچھیں لگا کر ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے لوگوں کی نظروں سے چھپنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسٹوڈیو کے وزیٹنگ ہال میں آکر نئے سورماؤں کا ٹی وی پروگرام دیکھنے لگا۔ یونی یہودا کی آمد نے اس پروگرام کو دلچسپ بنادیا تھا۔ ایک تجسس پیدا ہوگیا تھا کہ اسے ہیکل کی سورما کے طور پر قبول کیا جائے گا یا نہیں؟

فیصلہ کیا ہوگا' یہ بعد میں معلوم ہونے والا تھا۔ جلالت نہیں جانتا تھا کہ شوٹنگ ختم ہونے کے بعد پیشوا ہارپر' مادام' انتھونی فورڈ اور تمام دینی رہنماؤں کے درمیان کیسی بحث ہورہی ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے وہ پارکنگ ایریا میں آگیا۔

وہاں سے فون کے ذریعے پیشوا ہارپر کو مخاطب کرنا چاہتا تھا پھر اس نے انتھونی کی کار کو دیکھا تو ارادہ بدل دیا۔ فون کو جیب میں رکھ کر یہ طے کرلیا کہ اب انتھونی کا محاسبہ کرے گا۔ اس نے بنجامن کی حمایت میں اس سے بڑی دشمنی کی تھی۔ اب اسے دشمنی کا جواب دیا جاسکتا تھا۔

اُدھر انتھونی فورڈ سیٹ پر تھا۔ پیشوا ہارپر' مادام نکاؤلی اور دیگر پیشواؤں اور ربیوں کے درمیان گرما گرم بحث

ہو رہی تھی۔ انھونی بھی بونی یہودا کے سلسلے میں بہت کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن وہاں سے اٹھ کر سیٹ سے باہر آ گیا۔ وہ فون کے ذریعے پیشوا ہار پر اور مادام سے بات کرنے والا تھا۔

وہ پارکنگ ایریا میں آ کر کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے اسٹوڈیو کے احاطے سے باہر آ گیا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ جلالت اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان لیٹا ہوا ہے۔

اس نے مین روڈ پر آ کر فون کے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”ہیلو مادام! میں انھونی فورڈ بول رہا ہوں۔“

مادام نے پوچھا۔ ”آپ کہاں ہیں، ابھی تو یہاں سیٹ پر تھے؟“

”وہاں پیشوائے اعظم اور درجنوں دینی رہنما بہت زیادہ بول رہے ہیں۔ اس لیے چلا آیا۔ اگر یہ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی کو ہیکل کا سورما تسلیم کیا جائے تو یہ کام ہم پانچ بینکروں کی بھرپور حمایت سے ہوگا۔ عقل سے کام لیں اور جلد سے جلد کہیں ملاقات کا وقت مقرر کریں۔“

وہ بولی۔ ”میں ہوٹل جانے کے بعد آپ سے رابطہ کروں گی۔ ابھی انتظار کریں۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ انھونی نے جھنجلا کر فون بند کرتے ہوئے اسے گالیاں دیں۔ ”سالی کتیا! اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ میں اس کی بیٹی کو بازاری بنا دوں گا۔ وہ اسے سورما بنا کر بڑی سے بڑی رقم بٹورنے کے خواب دیکھتی رہ جائے گی۔“

اس نے پھر نمبر پنچ کیے۔ اس بار پیشوا ہار پر سے کہا۔ ”میں انھونی فورڈ بول رہا ہوں۔ میرے پاس ایک بھی سورما نہیں ہے۔ لیکن بینکاری کے کھیل میں مہارت رکھتا ہوں۔ ہم پانچ بینکرز جب چاہیں گے بارہ سورماؤں کے ڈرامے کا ڈراپ سین کر دیں گے۔ ہمیں کچھ نہیں ملے گا تو آپ کو بھی پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔“

ہار پر واقعی پریشان تھا۔ انھونی یہ نہیں جانتا تھا کہ نئے سورماؤں میں سے دو مسلمان ہیں۔ فی الحال جلالت کو شامل کر کے چھ سورما تھے۔ جن میں سے تین مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں سے مجبوراً کام لیا جا سکتا تھا۔ ورنہ ان پر بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

انھونی نے فون پر کہا۔ ”آپ چپ ہیں، یقیناً سنجیدگی سے سوچ رہے ہوں گے۔ میری بات مانیں، ہمارے درمیان ایک خفیہ ملاقات ضروری ہے۔ ہمیں اینٹی فنڈز حاصل کرنے کے لیے کوئی شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنا ہی ہوگا۔“

وہ سمجھوتا کرنے پر مجبور تھا۔ اگلے دن ملاقات پر آمادہ ہوگیا۔ وہ گفتگو ختم ہوتے ہی کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ ”ویل مسٹر اسمتھ! میں آپ کو خوشخبری سنانے والا تھا۔ تمام انتظامات ہو چکے ہیں۔ آپ کو جلد ہی ربی سے پیشوا بنا دیا جائے گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”تھینک یو مسٹر فورڈ! واقعی آپ کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ آپ نے اتنے اہم مذہبی معاملے کو نمٹایا ہے۔“

”ہم بینکرز آپ کو نیچے سے اوپر پہنچا رہے ہیں۔ آپ ہمارے لیے کیا کر رہے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”آپ کو ایک بہت اہم خبر سنا رہا ہوں۔ پیشوائے اعظم کا ایک ایسا راز ہے، جس کے ذریعے آپ اسے کمزور بنا سکیں گے۔“

”کیا واقعی۔۔۔؟ فوراً بتائیں کیا راز ہے؟ اگر میں نے پیشوائے اعظم کو کمزور بنا دیا تو سمجھیں، آپ کو مالا مال کر دوں گا۔“

”تو پھر سنیں، آج جو تین نئے سورما جوزف، جیکب اور داؤد یہودا پیشوائے اعظم کے تابعدار بنے آئے ہیں، ان میں سے دو مسلمان ہیں۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہے ہیں؟“

”درست کہہ رہا ہوں۔ ان نئے سورماؤں میں سے دو مسلمان ہیں۔ یعنی جیسے سولومن در پردہ مسلمان ہے۔“

اس نے فوراً ہی کار کی رفتار سست کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے روک دیا۔ اُدھر سے ربی اسمتھ نے کہا۔ ”آپ یقین کریں، پیشوائے اعظم کے صرف مجھ جیسے قابلِ اعتماد ربی ہی یہ راز جانتے ہیں۔ ان تینوں میں سے داؤد اور جوزف یہودا مسلمان ہیں۔ جوزف کا اصل نام یوسف حسن ہے۔“

اس نے خوش ہو کر ان دونوں کے نام دُہرائے۔ دو سیٹوں کے درمیان لیٹا ہوا جلالت بھی حیرانی سے سن رہا تھا۔ وہ خوشی سے جھومتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے زبردست انفارمیشن دی ہے۔ کل آپ کے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار ڈالرز جمع ہو جائیں گے۔ منی منی تھینکس۔ میں پھر کسی وقت کال کروں گا۔“

اس نے فون بند کیا۔ پھر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”وہ مارا۔۔۔ پیشوائے اعظم کو تو مارا ہی مارا۔ اب

وہ میرے آگے جھکے گا، میری باتیں سنے گا اور مجھ سے راضی رہے گا۔"

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ وہ خوشی سے گنگنا رہا تھا۔ جلالت نے سوچا کہ اب وہاں سے اٹھ کر اسے اپنا جلوہ دکھانا چاہیے۔ خوشی سے ناچتے ہوئے مور کی گردن دبوچنا چاہیے۔

وہ سیٹوں کے درمیان سے اٹھنے ہی والا تھا۔ پھر کالنگ ٹون سن کر رک گیا۔ انتھونی فون کو کان سے لگا کر چہکنے کے انداز میں بولا۔ "ہائے باپ کی جان! کیسی ہو؟ میں تو خوشی سے جھوم رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے سیلینا نے کہا۔ "آپ نے کہا ہے، ہمیں کچھ روز تک خوشی ظاہر نہیں کرنی چاہیے۔ بنجامن کی موت کا سوگ منانا چاہیے۔"

"ہاں۔ وہ تمہارا دیوانہ پاگل محافظ بن کر مارا گیا ہے۔ ہمیں دنیا والوں کو دکھانے کے لیے سوگ منانا چاہیے۔ ویسے گھر میں یا کہیں تنہائی میں خوشیاں منانے سے کوئی دیکھنے نہیں آئے گا۔"

پھر وہ سیلینا کی بات سن کر بولا۔ "بنجامن ہماری بساط کا ایک مہرہ تھا، وہ مر گیا۔ کسی کے مرنے سے دنیا خالی نہیں ہوتی۔ اس کی جگہ اور کئی پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں آج کل میں دو نئے سور ماؤں کو پھانسنے والا ہوں۔ اگر وہ پھنس گئے تو سمجھو، ان میں سے ایک تمہارے نام ہوگا۔ ایک بہت اہم خبر ملی ہے، ان نئے آنے والوں میں بھی دو سور ما مسلمان ہیں۔"

سیلینا نے پوچھا۔ "ڈیڈ! سولومن کی کوئی خبر ہے؟ وہ کہاں ہوگا؟"

"کیا بات ہے، سولومن کو یاد کر رہی ہو؟"

بیٹی نے ایک گہری سانس لی۔ باپ سے یہ کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کے دل سے گیا نہیں تھا۔ اسے باپ کے مشورے سے بھگایا گیا تھا۔ جو زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہوتا ہے، وہ کبھی دل سے نہیں جاتا۔ عداوت کے باوجود اندر ہی اندر چپ چاپ پکارتا رہتا ہے اور گرماتا رہتا ہے۔

باپ نے کہا۔ "ہمارے مخبر نے بتایا ہے، وہ یہاں لندن میں ہے۔ اس نے کل پیشوا ابار پر سے کہیں ملاقات کی تھی۔ یہ مت بھولو کہ وہ تمہارا جانی دشمن ہے۔ دو بار تمہیں قتل کرانے کی کوششیں کر چکا ہے۔"

"ڈیڈ! میرا دل نہیں مانتا کہ سولومن جیسا شہزور مرد مجھ جیسی لڑکی سے عداوت کرنے کے لیے چھپ کر میسج کے ذریعے دھمکی دے گا۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔"

"کیا آئیڈیا ہے؟"

وہ بولی۔ "سولومن یہاں سے فرار ہونے کے بعد بے گھر اور بے یار و مددگار ہو گیا ہے۔ ہم باپ بیٹی اسے پناہ دے سکتے ہیں۔ اسے پھر اپنا بنا سکتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ہم اسے مسلمان اور دشمن کا ایجنٹ کہہ کر یروشلم سے اس کے قدم اکھاڑ چکے ہیں۔ اب دوستی نہیں کر سکیں گے۔"

"کر سکتے ہیں۔ شطرنج کے مہرے آگے بڑھنے کے بعد مصلحتاً پیچھے ہٹ کر واپس آ کر پھر سے دوسری چال پر آگے بڑھتے ہیں۔ آپ سولومن کو پیشوا ابار پر کے خلاف بہت اچھی طرح استعمال کر سکیں گے۔"

انتھونی سوچنے لگا۔ پیشوا ابار پر کی کمزوریاں سامنے آ رہی تھیں۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سور ماؤں کی فہرست میں اب ایک نہیں، تین مسلمان ہیں۔ انتھونی ان مسلمانوں کو دوست اور حمایتی بنا کر پیشوائے اعظم کو اپنے آگے جھکا سکتا تھا۔

سیلینا کہہ رہی تھی۔ "ڈیڈ! ہم یہودی قوم کے سامنے آہستہ آہستہ یہ بات واضح کریں گے کہ سولومن کے معاملے میں ہم سے غلطی ہوئی تھی۔ اگر ہم اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ایک سور ما کو عزت دیں گے، اس کی کھوئی ہوئی پوزیشن کو بحال کریں گے تو ہماری سچائی اور دیانتداری کی قدر کی جائے گی۔"

"میں نے اس پہلو سے سوچا نہیں تھا کہ الٹی چال چل سکتے ہیں۔ صرف ایک غلطی کا اعتراف کر کے سولومن کا دل جیت سکتے ہیں۔ ایک مسلمان کو جیت کر باقی دو مسلمان سور ماؤں کو بھی اپنا حمایتی بنا سکتے ہیں۔ یوں پیشوائے اعظم کمزور ہوتا چلا جائے گا۔"

"تو پھر یہ معلوم کریں کہ سولومن لندن میں کہاں ہے؟ پلیز آپ دوستی کی ابتدا کریں۔"

"پہلے اپنے چاروں ساتھیوں سے مشورہ کر لوں پھر اسے دوست بنانا کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔"

"آل رائٹ۔ میں آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔"

بیٹی سے رابطہ ختم ہو گیا۔ ایسے وقت جلالت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب وہ پچھلی سیٹ پر آیا تو عقب نما آئینے میں دکھائی دیا۔ ظاہر تھا کہ ایسے وقت کیا ہوتا؟ انتھونی کے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ بہک گیا۔ اس کے دماغ کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے کار کو قابو میں کرتے ہوئے

اسے ایک طرف روکا۔ پھر پلٹ کر جلالت کو ایسے دیکھا جیسے موت کو دیکھ رہا ہو۔ "تت۔ تم۔ یا۔ یہاں۔۔۔؟"

وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ جلالت وہاں سے اٹھ کر اگلی سیٹ پر اس کے برابر آ گیا۔ پھر بولا۔ "پہلے اپنے حواس درست کرو۔ ڈرو نہیں۔ میں سولومن کا بھوت نہیں ہوں۔ جلالت اسرار ہوں۔"

اس کا دماغ بری طرح الجھ گیا تھا۔ وہ شدید حیرانی سے بولا۔ "وہ۔ تم۔ میری گاڑی میں کیسے آ گئے؟ اسے میں نے لاک کیا تھا۔"

"تمہارا وہ محل نما بنگلا بھی چاروں طرف سے مقفل تھا۔ اس کے باوجود میں نے وہاں تمام رات تمہاری بیٹی کے ساتھ گزاری تھی۔"

وہ جھینپ کر بولا۔ "ہاں۔ مگر اس گاڑی میں۔۔۔؟ اچھا جانے دو۔ میں کام کی بات کروں گا۔"

"تم نے اب تک جتنے فون اٹینڈ کیے ہیں، ان سے مجھے بڑے کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔"

"او گاڈ! تم نے سیلینا سے ہونے والی باتیں سنی ہیں؟"

"ہاں۔ معلوم ہوا ہے، تم باپ بیٹی مجھ سے دشمنی بھول کر میری دوستی پر ایمان لانے والے ہو۔"

"یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا، ہم باپ بیٹی کے ارادے تمہیں معلوم ہو گئے۔ کیا تم نہیں چاہو گے کہ ہمارے بیان بدلنے سے پوری یہودی قوم تم پر پھر سے اعتماد کرے؟ تمہیں یہودی مان کر پہلے کی طرح مان مرتبہ دے۔ کوئی تمہیں مفرور مجرم کہنے کی جرأت نہ کر سکے؟"

"بیشک میں یہی چاہتا ہوں۔ وہ جو اربوں ڈالرز کا کھیل ہو رہا ہے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ وہ کھیل یروشلم میں رہ کر کھیلنا چاہتا ہوں۔"

"پولیس، انٹیلی جنس اور آرمی والے بھی تمہارے خلاف زبان نہیں کھولیں گے۔ تم پھر سے ہیکل کے یہودی سور ما بن کر محترم اور معزز ہو جاؤ گے۔"

اس نے کہا۔ "میں یروشلم آ کر کیوں محترم اور معزز بن جاؤں؟ یہودی کون سے معزز اور محترم ہیں کہ میں ان کے درمیان رہ کر عزت حاصل کروں؟"

"تمہیں وہاں عارضی طور پر عزت اور کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ میری بات مان کر تم کروڑوں ڈالرز حاصل کر سکو گے۔"

"مجھے معلوم ہے، اربوں اور کھربوں ڈالرز کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میں بھیک کی طرح کروڑوں ڈالرز نہیں لوں گا۔ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ ان دو مسلمان سور ماؤں کو اپنا دوست اور حمایتی بنا لوں گا۔ اس طرح ہم تین مسلمانوں کی پوزیشن بہت مضبوط ہوگی۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔ "ہاں۔ تین سور ما پیشوائے اعظم کے پاس نہیں رہیں گے۔ مادام نکاؤلی کے پاس دو سور ما ہیں۔ ہم بونی کو تیسری سور ما تسلیم نہیں کریں گے۔ اس طرح تمہاری پوزیشن سب سے مضبوط ہوگی۔"

جلالت نے کہا۔ "میں اس کے بعد بھی نئے آنے والے سور ماؤں کی زندگی مختصر کر دوں گا تو اینٹی فنڈز کی تمام رقم تم لوگوں کے لیے خواب بن کر رہ جائے گی۔"

"ہم مانتے ہیں، تم زبردست ہو۔ اگر رکاوٹیں پیدا کرو گے تو بارہ سور ما بھی یکجا نہیں ہو سکیں گے۔ اس لیے میں ہر حال میں تمہیں بنجامن کی جگہ لانا چاہتا ہوں۔ کیا تم سیلینا میں اب بھی کشش محسوس کرتے ہو؟"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ "تمہیں کیا جواب دوں؟ باپ کی زبان سے پوچھ رہے ہو تو تمہاری بیٹی بہت ہی پُرکشش ہے۔ اسے بھلایا نہیں جا سکتا لیکن ایک باپ اربوں ڈالرز کی خاطر بیٹی کی دلالی کرتا آ رہا ہے۔ پہلے بنجامن کو پھنسایا گیا، وہ مر گیا تو مجھ سے سودا کیا جا رہا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ زبردست مال پیش کر رہے ہو۔ میں اسے بھلا نہ سکا۔ اب بھی مل جائے تو فریج میں بچا کر رکھی ہوئی ڈش کو دوبارہ گرم کر لوں گا۔"

جلالت اسے بیٹی کا دلال کہہ رہا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔ غصہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ بڑے صبر و ضبط سے بولا۔ "پلیز طعنے نہ دو۔ میں بیٹی کا سودا نہیں کر رہا ہوں۔ تم نے ابھی اس کے فون سے اندازہ لگایا ہوگا، وہ اب بھی تمہیں چاہتی ہے اور تمہاری چاہت میں تم پر لگائے ہوئے الزامات کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہے؟"

"اور تم اس کی چاہت کو اینٹی فنڈز کے معاملے میں کیش کرنے کے لیے بنجامن کے بعد مجھ سے سودا کر رہے ہو؟ اسی کو دلالی کہتے ہیں۔"

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر چپ رہا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ "کیا کروں؟ اس شخص کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ہر حال میں اپنا بنا کر رکھنا ہوگا۔"

جلالت نے کہا۔ "ابھی تمہیں مجھ پر غصہ آ رہا ہے۔ یہ سوچو کہ تم نے مجھ سے کیسی کمینگی کی ہے؟ مجھے ایک مسلمان

سورما کہہ کر تمام یہودیوں کو مجھ سے متنفر کردیا ہے۔ مجھ پر الزامات لگا کر مجھے قتل کرانے کی کوششیں کیں۔ اگر میں مرجاتا تو تم ابھی اس کار میں بیٹھ کر کس سے یہ معاملات طے کرتے؟"

وہ ذرا توقف سے بولا۔ "ابھی میری اہمیت ختم ہوجائے تو تم پھر کمینگی دکھاؤ گے۔ میں تم سے سمجھوتا ضرور کروں گا، لیکن کبھی بھروسا نہیں کروں گا۔"

"چلو سمجھوتا ہی کرو۔"

کار ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ وہ کار سے اترتے ہوئے بولا۔ "یہاں تم آرام سے محفوظ رہو گے۔ آؤ اندر چل کر باتیں کریں گے۔"

اس بنگلے میں آرام و آسائش کا اور ضروریاتِ زندگی کا تمام سامان موجود تھا۔ خدمت کے لیے ایک ملازمہ اور ملازم تھا۔

انتھونی نے کہا۔ "یہاں تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ تمہارا کوئی دشمن ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ میرے جاسوس اور سیکیورٹی گارڈز دن رات تمہاری نگرانی کریں گے۔"

جلالت نے کہا۔ "اپنے جاسوس اور گارڈز سے کہو، دور سے بھی میری نگرانی نہ کریں۔ ورنہ میری حفاظت کرنے والے دشمن سمجھ کر انہیں جہنم میں پہنچادیں گے۔"

"مجھے اندازہ ہے، تم یہاں تنہا نہیں ہو۔ تمہاری حفاظت کرنے والے آس پاس موجود رہتے ہوں گے۔"

"میں یہاں رہنے نہیں آیا ہوں۔ کام کی باتیں کروں گا پھر چلا جاؤں گا۔"

"کام کی بات یہی ہے کہ ہمارے دوست اور حمایتی بن جاؤ۔ پیشوا اہار پر لعنت بھیجو۔"

"میں نے ایک مطالبہ پیش کیا ہے۔ پیشوا نے سوچنے کے لیے کل تک کی مہلت لی ہے۔ تمہیں بھی وہی مطالبہ پیش کروں گا۔"

وہ ذرا چپ رہا۔ اس نے پوچھا۔ "مطالبہ کیا ہے؟"

"میں اسلحہ چاہتا ہوں۔"

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "کتنا اسلحہ...؟"

"جب تک اسرائیلی آرمی جارحیت کے مرتکب ہوتے رہیں گے، جب تک فلسطینیوں پر حملے کرتے رہیں گے، تب تک انہیں منہ توڑ جواب دینے کے لیے جدید اسلحہ کی ضرورت پیش آتی رہے گی۔ فی الحال پچاس کروڑ ڈالرز کا اسلحہ فراہم کیا جائے۔"

"یہ بہت بڑی رقم ہے۔ پھر یہ کہ اتنا زیادہ اسلحہ تمہارے لوگوں تک کیسے پہنچایا جائے گا؟"

"ہمارے کچھ خفیہ ذرائع ہیں۔ پھر یہودی آرمی اور انٹیلی جنس میں تمہارے کئی زرخرید جاسوس اور افسران ہیں۔ تم انہیں خرید کر ان کے ذریعے رازداری سے اسلحہ پہنچا سکو گے۔ وہ افسران کبھی کبھی رازداری سے چور سرحدی راستہ کھول دیا کریں گے۔ فلسطینیوں سے تعلق رکھنے والے اسمگلر وہ اسلحہ تھوڑا تھوڑا کرکے پہنچادیا کریں گے۔"

وہ بولا۔ "پچاس کروڑ ڈالرز بہت ہیں۔ پھر بھی ہم ضرور ادا کریں گے۔"

"مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے معلوم ہوا ہے، اینٹی فنڈز میں اب تک نوسو کروڑ ڈالرز سے زیادہ جمع ہوچکے ہیں۔ پچاس کروڑ ڈالرز تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ آئندہ پارٹی کو اسلحہ کی ضرورت ہوگی تو میں پھر مطالبہ کروں گا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ نوسو کروڑ ڈالرز میں سے ہم تین مسلمان سورماؤں کو کتنی رقم مل سکے گی؟"

"پیشوائے اعظم نے فوراً ہی تمہارا مطالبہ تسلیم نہیں کیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی مہلت لی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے، دنیا کے تمام پیشوا اور ربی مل کر بھی تمہیں پچاس کروڑ ڈالرز نہیں دے سکیں گے۔"

"تم اپنی بات کرو۔"

"میں اپنے چار ساتھیوں سے مشورہ کروں گا اور تمہیں جلد ہی جواب دوں گا۔"

"میں پیشوا اہار پرے، مادام نکاؤلی سے اور تم پانچ بینکروں سے بیک وقت ایک جگہ ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں پیشوا اور مادام سے ملاقات کا کوئی وقت مقرر کرنے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں جارہا ہوں۔ اپنے نگرانی کرنے والوں سے ابھی فون پر کہہ دو میرا تعاقب نہ کریں۔ ورنہ پچھتائیں گے۔"

"تم جہاں جارہے ہو، میں اپنی گاڑی میں تمہیں پہنچا دوں گا۔"

"مجھے کسی بہترین ریسٹورنٹ میں پہنچادو۔ ڈنر کے بعد وہاں سے ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

اس نے جلالت کو ایک ریسٹورنٹ میں پہنچانے کے بعد فون کے ذریعے پیشوا اہار پرے سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا۔ "میں اس وقت ایک اہم معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔ سوری کل کسی وقت کال کرو۔"

"اگر ابھی تم نے بات نہ کی تو اور زیادہ الجھ کر رہ جاؤ گے۔ یہ بتادوں کہ تمہارے تین نئے سورماؤں میں سے دو کا احوال خوب جانتا ہوں۔"

یہ بات چونکا دینے والی تھی۔ پیشوا ایکدم سے سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"وہی کہہ رہا ہوں، جسے تم خوب سمجھ رہے ہو۔ تمہارے داؤد یہودا اور جوزف یہودا مسلمان ہیں۔"

پیشوا کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ بولا۔ "یہ۔ یہ کیا بکواس کررہے ہو؟ کیا تمہارے کہہ دینے سے وہ مسلمان ہوجائیں گے؟"

"میں ثابت کردوں گا۔ تم سچائی کو زیادہ دنوں تک چھپا نہیں سکو گے۔ یہ بارہ سورماؤں کے معاملات پیچیدگیاں پیدا کررہے ہیں۔ میں اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اگر اینٹی فنڈز کی رقم اپنی زندگی میں حاصل کرنی ہے تو مجھ سے فوراً ملاقات کرو۔"

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "ہوں۔ تم سے ملاقات کرنی ہی ہوگی۔ کیا ہم ابھی کہیں مل سکتے ہیں؟"

"تم پتا بتاؤ، میں ابھی آجاؤں گا۔"

جلالت ریسٹورنٹ میں پہنچنے کے بعد کھانے کا آرڈر دینا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت فون کی کالنگ ٹون نے اسے متوجہ کیا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے ایک آواز سنائی دی۔ "ہیلو مسٹر سولومن! میں تینسی نکاؤلی بول رہی ہوں۔ تم مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتے؟ کترانے کی کوئی وجہ ہے؟"

وہ بولا۔ "ابھی ٹی وی پروگرام دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ واقعی تمہارے پاس دو ہیکل کے سورما ہیں۔ میں اب تم سے مل سکتا ہوں۔"

وہ دونوں ماں بیٹی ہوٹل کے ایک آرام دہ سوئٹ میں تھیں۔ جلالت کو دیکھ کر خوشی سے فرشِ راہ ہونے لگیں۔ مادام نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ماں ذرا الگ ہوئی تو بیٹی نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کا مصافحہ اچھے اچھے شہزوروں کا مزاج بدل دیتا تھا۔ اس نے جیسے ہی بونی سے ہاتھ ملایا تو محسوس ہوا کہ وہ پُرکشش ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ اسے بھرپور توجہ سے دیکھتے رہنا چاہیے اور آہستہ آہستہ دل میں اتار لینا چاہیے۔

جلالت یہ طے کرچکا تھا کہ یہودیوں کے ماحول سے نکل آنے کے بعد نہ تو یہودی بن کر رہے گا، نہ ہی ان کے دستور پر چلے گا اور نہ ہی کبھی گناہ کی طرف مائل ہوگا۔ لیکن اس وقت اپنے مزاج اور اپنے ارادے کے خلاف بونی کی طرف بے تحاشا کھنچا جارہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ بونی کے ہاتھ میں جو لوشن لگا ہوا ہے، وہ ایک مخصوص جڑی بوٹی سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ جڑی بوٹی اس وقت جلالت اسرار کو اس کے مزاج کے خلاف جڑ سے اکھاڑ رہی تھی۔

وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں بونی سے متاثر ہوکر سوچنے لگا۔ "مجھے ان ماں بیٹی کا ساتھ دینا چاہیے۔ پیشوائے اعظم اور پانچوں بینکرز بہت ہی مکار اور چالباز ہیں۔ کسی بھی مرحلے پر دھوکا دے سکتے ہیں۔ اگرچہ مادام کی پوزیشن ابھی مضبوط ہے لیکن یہ بھی کسی مرحلے میں ان سے دھوکا کھا سکتی ہے۔ میں انہیں فریب سے بچاؤں گا۔"

مادام نے شکایت کی۔ "تم ہم سے کترا رہے تھے۔ ملنا نہیں چاہتے تھے۔"

"پہلے میں تمہارا وزن معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تابوت یہودا کے کیمپ میں تمہارے پاس دو سورما ہیں۔ تیسری یہ بونی ہے لیکن ابھی متنازعہ ہے۔ پھر بھی تمہاری پوزیشن اچھی خاصی مضبوط ہے۔"

"میں پیشوائے اعظم کو اور تمام دینی رہنماؤں کو مجبور کردوں گی۔ وہ میری بیٹی کو ہیکل کی سورما ضرور تسلیم کریں گے پھر تم سے بھی کہتی ہوں، مجھ سے اتحاد کرو، دوستی کرو۔ میرے بیٹے بن جاؤ۔ تم اپنی توقع سے بھی زیادہ فائدے میں رہو گے۔"

جلالت نے بونی کی طرف دیکھا۔ مصافحہ کرنے کے بعد اس لوشن کا تاثر لمحاتی ہوتا تھا۔ پھر زائل ہوجاتا تھا۔ اس وقت اس نے محسوس کیا، جیسے بونی سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہے۔

ایسے ہی وقت بونی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میری ماما کی بات مان لو۔"

جلالت کو پھر محسوس ہوا کہ وہ پُرکشش ہے۔ اسے ماں کی بات مان کر بیٹی کے دل میں بیٹھ جانا چاہیے۔ اس نے مادام سے پوچھا۔ "تم کس سے اتحاد کررہی ہو؟ پیشوائے اعظم سے یا ان پانچ بینکروں سے؟"

وہ بولی۔ "پیشوائے اعظم کے پاس تین نئے سورما آگئے ہیں۔ چوتھے تم ہو۔ پھر تمہارے بیٹے کو بھی شامل کیا جائے تو اس وقت اس کی پوزیشن سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس کے پاس پانچ سورما ہیں۔"

"میرے بیٹے کی بات نہ کرو۔ میں اسے کبھی ہیکل کا

سورما بننے نہیں دوں گا۔ رہی میری بات تو ابھی میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ مجھے کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ اس طرح پیشوائے اعظم کے پاس صرف تین نئے سورما رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے بھی دو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میں اس کے دو سورماؤں کو اپنی طرف لے آؤں گا۔"

مادام نے پوچھا۔ "تمہارے اس دعوے میں کتنا وزن ہے؟"

"میں پیشوائے اعظم کی کمزوری جانتا ہوں۔ تم بھی اس کمزوری کو جان لوگی تو اس کے تین میں سے دو سورماؤں کا حساب بھی نہیں کروگی۔ اس طرح پیشوائے اعظم کے پاس صرف ایک سورما رہ جائے گا۔"

"مسٹر سولومن! تم مجھے الجھا رہے ہو۔ پلیز کھل کر بتاؤ۔ پیشوائے اعظم کی کمزوری کیا ہے؟ اور وہ دو سورما کس طرح اس سے الگ کیے جاسکتے ہیں؟"

"تم پیشوا سے اتحاد کررہی ہو۔ اس نے تمہیں اپنی یہ کمزوری نہیں بتائی ہے۔ اگر نہیں بتائی ہے تو سمجھ لو وہ تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ حقیقت مجھ سے سنو۔ اس کے تین سورماؤں میں سے جوزف اور داؤد یہودا میری طرح مسلمان ہیں۔"

دونوں ماں بیٹی آرام سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اچھل کر سیدھی ہوگئیں۔ مادام نے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں؟"

"اس سلسلے میں کوئی سوال نہ کرو۔ ابھی پیشوا سے فون پر بات کرو اور اسے چیلنج کرو کہ تم اس کے دو سورماؤں کو مسلمان ثابت کردوگی پھر وہ خود ہی حقیقت اُگل دے گا۔ اسے بتاؤ کہ جوزف کا اصل نام یوسف حسن ہے اور داؤد کو یہودی کی حیثیت سے ڈیوڈ کہلانا چاہیے۔ لیکن وہ اسلامی زبان کا لفظ داؤد استعمال کرتا ہے۔ یعنی وہ بھی مسلمان ہے۔"

وہ فون اٹھا کر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی بات کرتی ہوں۔ یہ ایسی بات ہے کہ اس کے لیے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

ادھر انتھونی فورڈ پیشوا ہارپر کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے لیکن اس وقت بڑی سنجیدگی سے ایک چھت کے نیچے اپنے موجودہ حالات پر غور کررہے تھے اور بحث کررہے تھے۔

انتھونی نے یہ بات کہہ کر اسے چونکا دیا تھا کہ اس کے دو سورما مسلمان ہیں۔ اس طرح جلالت اسرار سمیت تین مسلمان سورماؤں پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یوں سورماؤں کی تعداد بڑھتے بڑھتے گھٹ رہی تھی۔ اگر ایسا ہی ہوتا رہتا تو وہ قیامت تک بارہ سورماؤں کا انتظار کرتے رہ جاتے۔ کبھی انہیں یکجا نہ کرپاتے۔

پیشوا نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں' ہماری زندگی میں بارہ سورما یکجا ہوجائیں۔ تابوت یہودا آجائے اور اینٹی فنڈز کی رقم ہمارے درمیان تقسیم ہوجائے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں اور مادام نکاؤلی بھی یہی چاہے گی۔"

ایسے وقت مادام نے اسے فون کے ذریعے مخاطب کیا۔ اس نے بھی یہی دھماکا کیا کہ وہ اس کے دو مسلمان سورماؤں کو اچھی طرح سمجھ گئی ہے۔ اگر اس کی بیٹی بونی کو ہیکل کی سورما تسلیم نہ کیا گیا تو وہ بھی ان مسلمانوں کو تسلیم نہیں کرے گی اور یہ راز کھول دے گی کہ مسلمانوں کو یہودی بنا کر پوری یہودی قوم کو دھوکا دیا جارہا ہے۔

پیشوا ہارپر نے کہا۔ "اس طرح اختلافات پیدا ہوتے رہیں گے تو ہم کبھی اپنے ٹارگٹ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اینٹی فنڈز کے اربوں ڈالرز ہمارے لیے محض خواب بن کر رہ جائیں گے۔ میں اس نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ ہم سب کو ایک چھت کے نیچے بیٹھ کر سنجیدگی سے فیصلہ کرنا چاہیے کہ اپنی زندگی میں یہ تمام رقم حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟"

مادام نے کہا۔ "وہ پانچ بینکرز اینٹی فنڈز کے نگراں ہیں۔ ان سے اتحاد کیے بغیر انہیں اپنا رازدار بنائے بغیر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔"

"تم درست کہتی ہو۔ مسٹر انتھونی فورڈ اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہم ابھی طے کرلیں کہ کب اور کہاں یکجا ہونا چاہیے؟ ہمیں جلد سے جلد اپنے منافع بخش نتیجے تک پہنچنا ہوگا۔"

انتھونی نے کہا۔ "کل صبح دس بجے میرے بنگلے میں میٹنگ رکھی جائے۔"

پیشوا نے پوچھا۔ "کیا تم سن رہی ہو، تمہیں منظور ہے؟"

"ہاں۔ میں کل صبح دس بجے مسٹر فورڈ کے بنگلے پر پہنچ جاؤں گی۔ میرے ساتھ سولومن یہودا بھی ہوگا۔"

"کسی بھی سورما کو اپنے ساتھ نہ لاؤ۔ یہ سورما ہمارے لیے محض مہروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

مادام نے کہا۔ "اس وقت سولومن میرے سامنے بیٹھا ہے۔ یہ جانتا ہے کہ تمہارے دو سورما اس کی طرح مسلمان ہیں۔ اگر یہ گڑبڑ کرے گا' یہ راز کھولے گا تو بارہ سورماؤں کی تعداد کبھی مکمل نہیں ہوپائے گی۔"

پیشوا نے انتھونی فورڈ سے پوچھا۔ "اس سلسلے میں کیا کیا جائے؟"

"وہ درست کہہ رہی ہے۔ اگر ہم اِن تین مسلمانوں کے بغیر بارہ کی تعداد پوری کرنا چاہیں گے تو وہ تینوں مسلمان اینٹی فنڈز کے حصول کے معاملے میں رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ سولومن ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ وہ کل کی میٹنگ میں ہمارے درمیان موجود رہے گا۔"

جلالت اسرار ہوٹل میں ان ماں بیٹی کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانے کے دوران بونی سے بڑی دیر تک فاصلہ رہا تھا۔ اس نے جلالت کو پھر ہاتھ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی وہ اس سے متاثر ہورہا تھا۔ سوچ رہا تھا' ایسی کیا بات ہے' وہ قریب آتی ہے' ہاتھ لگاتی تو وہ بے حد متاثر ہوجاتا ہے؟ اس وقت کھانے کے دوران ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ ایک عام سی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

مادام نے کہا۔ "جو میری بیٹی سے ملتا ہے' وہ اس سے شادی کے لیے مچل جاتا ہے۔ شادی کے سلسلے میں اس کی ایک ہی شرط ہے کہ کوئی اس سے مقابلہ کرے اور اسے زیر کردے۔ تم بھی یقیناً اس سے متاثر ہورہے ہو؟"

"ہاں۔ کچھ عجیب سی بات دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی بیٹی سے متاثر ہوتا ہوں' پھر سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں کہ مجھے متاثر نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اسے شادی کے لیے طلب کرنا چاہیے۔"

بونی نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا ہے۔ اس طرح مجھ سے دور رہو۔ ورنہ جو بھی مقابلے پر آتا ہے' چاروں شانے چت ہوجاتا ہے۔"

اس نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ایسی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کام کی باتیں ضروری ہیں۔ کل صبح مسٹر فورڈ کے بنگلے میں ملاقات ہوگی۔"

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے حیرانی سے سوچنے لگا۔ "کیا بات ہے؟ ماں پُراسرار علوم جانتی ہے۔ بیٹی بھی کچھ ایسی ہی پُراسرار لگ رہی ہے۔ کبھی دل و دماغ کو متاثر کرکے حواس پر چھا جاتی ہے اور کبھی بالکل ہی ایک معمولی سی لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ کوئی تاثر قائم نہیں کرتی۔ مجھے ان ماں بیٹی سے ہوشیار رہنا چاہیے۔"

ایسے ہی وقت کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے موبائل فون نکال کر اسکرین پر پیشوا ہارپر کے نمبر دیکھے۔ پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔ فرمائیے؟"

پیشوا نے سوال کیا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے دو نئے سورما مسلمان ہیں؟ یہ بات تم نے مادام نکاؤلی کو بتائی ہے اور یقیناً انتھونی کو بھی تم ہی نے بتایا ہے۔"

"جی ہاں۔ بتایا ہے پھر؟"

"پھر یہ کہ تمہیں اندر کی بات کیسے معلوم ہوئی؟ تم نے میرا سارا کھیل خراب کردیا ہے۔"

"مجھ سے بے ایمانی کریں گے' دھوکا دیں گے تو یہی ہوگا۔ آپ اپنی زبان سے کہتے ہیں' میں آپ کا وفادار ہوں' تابعدار ہوں۔ اگر ہوں تو مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے تھا۔ وہ مسلمان میرے ہم مذہب ہیں تو میرا ان سے تعارف کرانا چاہیے تھا۔ اگر ہم روبرو متعارف نہ ہوتے تو آپ یہ راز کم از کم مجھے بتا تو سکتے تھے کہ میرے علاوہ سورماؤں کی فہرست میں دو مسلمان اور آگئے ہیں۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "تم آخر ہو کیا؟ تمہاری معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟ آخر یہ راز تمہیں کیسے معلوم ہوگیا؟"

"میں آپ کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔ ہم کل صبح مسٹر فورڈ کے بنگلے میں ملیں گے۔"

"کیا تم نے مسٹر فورڈ سے بھی وہی مطالبہ کیا ہے کہ کروڑوں ڈالرز کا اسلحہ باغیوں تک پہنچانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا' جب تک آپ کا جواب مجھے نہیں ملے گا' میں مسٹر فورڈ سے بات نہیں کروں گا لیکن آپ کی بے ایمانی اور دوغلی حرکتوں نے مجبور کردیا ہے۔ میں نے اس سے بھی یہی مطالبہ کیا ہے۔ دیکھتا ہوں' میرا مطالبہ کون پورا کرے گا؟"

پیشوا نے جواب نہیں دیا۔ چپ رہا۔ جلالت نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے' آپ مسٹر فورڈ سے سمجھوتا کریں' اتحاد کریں۔ پھر دونوں ہی مل کر میرا مطالبہ پورا کریں۔ ایک دوسرے سے متحد ہونے کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ جلد از جلد بارہ سورما یکجا ہوجائیں گے اور وہ تابوت یہودا آپ لوگوں کی زندگی میں آجائے گا۔"

وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "مجھے مشورہ نہ دو۔ میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

یہ کہتے ہی اس نے رابطہ ختم کردیا۔ جلالت سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ "ان یہودیوں کے ساتھ کبھی ایمانداری کا لین دین نہیں ہوسکے گا۔ یہ آگے چل کر یقیناً دھوکا دیں گے

اور یہ تو سن ہی چکا ہوں کہ جب تابوت یہودا انہیں مل جائے گا اور اینٹی فنڈز کی رقم بھی حاصل ہو جائے گی تو اس کی تقسیم سے پہلے ہی وہ بارہ سورماؤں کو ایک ایک کرکے ہلاک کردیں گے۔"

دانشمندی تو یہ ہوتی کہ جلالت ان سب پر لعنت بھیج کر وہاں سے چلا جاتا پھر ان کی طرف کبھی پلٹ کر نہ آتا لیکن ان سے لاتعلق رہنے کا وقت گزر چکا تھا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس والے اور موساد کے لوگ اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اگر وہ پیشوائے اعظم اور پانچ بینکروں کے ساتھ رہتا۔ انتھونی فورڈ اور اس کی بیٹی سیلینا اس پر لگائے ہوئے الزامات کو دھو ڈالتے' اسے پھر سے ایک کٹر یہودی ہیکل کا سورما تسلیم کرلیا جاتا تو وہ جن دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہے' انہی کے درمیان رہ کر بڑی عزت اور وقار سے زندگی گزارتا رہتا۔ انہی کی جڑوں میں رہ کر انہیں کھوکھلا کرتا رہتا۔

جہاں تک تابوت یہودا کے لائے جانے کی بات تھی تو وہ ایک معتبر پیغمبر کا صندوق اور اس میں رکھے ہوئے مقدس تبرکات ابھی محض خواب و خیال تھے۔ ان کی اپنی زندگی میں بارہ سورماؤں کے یکجا ہونے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

جلالت اسرار' مادام نکاؤلی اور پیشوائے اعظم صبح دس بجے انتھونی فورڈ کے بنگلے میں آگئے۔ وہاں دوسرا بینکر گورڈن بھی موجود تھا۔

گورڈن نے پوچھا۔ "پیشوائے اعظم! آپ محترم ہیں۔ مذہبی معاملات کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ ہمیں بتائیں' تابوت یہودا کی حقیقت کیا ہے اور وہ بارہ سورما کب یکجا ہوں گے؟ کیا ہماری زندگی میں یہ سب ہو سکے گا؟"

انتھونی نے کہا۔ "اس چھت کے نیچے اور چار دیواری کے اندر صرف آپ ہیں' مادام ہیں' جلالت اسرار ہے اور پانچ بینکرز کے ہم دو نمائندے ہیں۔ یہاں کوئی ہماری باتیں سننے نہیں آئے گا۔ ہم اور آپ جو کہیں گے' وہ تمام باتیں راز میں رہیں گی۔"

پیشوا نے کہا۔ "ہم جو کہتے ہیں' اپنی دینی کتابوں کے حوالے سے کہتے ہیں اور یہ کتابیں کہتی ہیں' ہیکل کے بارہ سورما تھے' اُن کی اولادیں آج بھی ہماری دنیا میں ہیں۔ وہ ایک دن ہیکل میں آئیں گی اور اپنے ساتھ تابوت یہودا بھی لائیں گی۔"

اس نے جلالت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال ہیکل کے سورماؤں کی نصف تعداد ہمارے پاس ہے' باقی نصف کا انتظار ہے۔"

مادام نے کہا۔ "میں آپ کے جوزف اور داؤد کو نہیں مانتی۔"

پھر وہ جلالت کو دیکھ کر بولی۔ "سوری تو سے مسٹر جلالت! میں تمہیں بھی ہیکل کا سورما تسلیم نہیں کروں گی۔ اس لیے کہ تم تینوں مسلمان ہو۔ پیشوائے اعظم نے سورماؤں کو گنتے وقت میری بیٹی یونی کو نظر انداز کیا ہے۔ میں بھی ان کے تین سورماؤں کو رد کروں گی اور دیکھوں گی کہ یہ مسلمان کیسے ہیکل کے سورما بن کر بارہ کی تعداد مکمل کرسکیں گے؟"

گورڈن نے کہا۔ "جب کسی طرح بارہ کی تعداد مکمل ہو جائے گی تو ہم صرف آپ کی بیٹی یونی کو ہی نہیں' بلکہ تین مسلمانوں کو بھی نظر انداز کریں گے لیکن عقل سمجھاتی ہے کہ بارہ سورماؤں کی تعداد پوری نہیں ہو پائے گی۔ ہر بار طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں گی۔"

انتھونی نے کہا۔ "ایک سورما بنجامن مر چکا ہے۔ دوسرا یہ سولومن مفرور ہے۔ اس کی طرح باقی دو مسلمان ہیں۔ پھر پیشوائے اعظم کے پاس کیا رہ جائے گا؟ ان کے پاس صرف ایک جیکب یہودا اور مادام کے دو سورما جوڈی اور سیم سن رہیں گے۔"

مادام نے کہا۔ "میں اپنے دونوں سورماؤں کو یہاں سے لے جاؤں گی۔ پیشوائے اعظم کے پاس صرف ایک رہ جائے گا۔ باقی گیارہ کا انتظار قیامت تک کرتے رہیں۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ واقعی جتنے سورما آئے تھے' وہ سب ایک ایک کرکے اُڑ گئے تھے۔ صرف ایک ہی رہ گیا تھا۔ انتھونی نے کہا۔ "اس طرح تو کبھی بارہ یکجا نہیں ہوں گے۔ جب تک ہمارے درمیان اختلافات رہیں گے' تب تک سورما پیچ پر کھیلنے آئیں گے اور ان کی وکٹیں اُڑتی رہیں گی۔"

گورڈن نے کہا۔ "میں سیدھی اور صاف بات کہتا ہوں' ہمیں تابوت یہودا نہیں' اینٹی فنڈز کی رقم چاہیے۔ محترم پیشوائے اعظم! یہاں بند کمرے میں کوئی آپ کو دیکھنے اور سننے نہیں آرہا ہے۔ لہٰذا پیشوا کا یہ چولا اُتار دیں اور صاف گوئی سے اینٹی فنڈز کے اربوں ڈالرز میں سے اپنا منافع حاصل کرنے کی بات کریں۔"

مادام نے کہا۔ "میں کسی جھجک کے بغیر بے باکی سے کہتی ہوں کہ مجھے اپنا حصہ چاہیے۔ ہم اس رقم کا منافع حاصل کرنے کے لیے بارہ سورماؤں کے ایک ہونے کا انتظار نہیں کریں گے۔"

پیشوائے اعظم نے کہا۔ "ہمارے بیشمار سرمایہ دار اینٹی فنڈز میں رقم جمع کرتے آرہے ہیں۔ جب تک بارہ سورماؤں کو اور تابوت یہودا کو نہیں دیکھیں گے' تب تک اس فنڈ کی رقم استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

گورڈن نے کہا۔ "بارہ سورما بھی آجائیں گے اور وہ تابوت یہودا بھی لے آئیں گے مگر وہ ہمارے پیدا کردہ جعلی سورما ہوں گے۔"

پیشوا نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ بات اس کے دل میں بھی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ہی بھاری رقم حاصل کرلینا چاہتا تھا۔ انتھونی نے کہا۔ "جلالت اسرار جیسے قد آور باڈی بلڈر لاکھوں مل جائیں گے۔ ان میں سے بارہ باڈی بلڈرز کے دائیں بازو پر سورماؤں کا پیدائشی نشان نقش کردیا جائے گا۔ جو ماہرین ان کا معائنہ کریں گے' وہ ہمارے زر خرید ہوں گے۔"

پیشوا ہارپر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اور دینی رہنماؤں کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ ان میں سے کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ ہمارے پاس ابھی چھ سورما ہیں۔ باقی چھ تیار کیے جائیں گے۔"

مادام نے کہا۔ "آپ پھر میری بیٹی کو نظر انداز کررہے ہیں۔"

انتھونی نے کہا۔ "مادام! یہ ضد نہ کریں۔ ایک لڑکی کو سورما بنانا بڑی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ ہم یہاں چار پارٹنر ہیں۔ ایک آپ ہیں' ایک پیشوائے اعظم ہیں' ایک جلالت اسرار ہے اور چوتھے ہم پانچ بینکرز ہیں۔ وہ اربوں ڈالرز ہم چاروں کے درمیان برابر تقسیم ہوں گے۔"

وہ بولی۔ "اگر یہ بات ہے تو میں ضد نہیں کروں گی۔"

جلالت نے کہا۔ "مجھے کیوں پارٹنر بنایا جارہا ہے؟ میں تو صرف ہیکل کا ایک سورما ہوں۔"

انتھونی نے کہا۔ "صرف سورما نہیں ہو' ہمارے رازدار بھی ہو۔ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ آئندہ بارہ سورماؤں میں سے تمہارے علاوہ دو مسلمان ہوں گے' جو تمہاری طرح یہودی بن کر رہیں گے۔"

گورڈن نے کہا۔ "پھر یہ کہ ہم خون خرابہ کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ ہم نے کبھی کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔ مگر تم تو ایک جنگجو جانباز کی زندگی گزارتے آرہے ہو۔ تم ہمارے لیے قتل کرو گے۔"

جلالت نے سوالیہ نظروں سے گورڈن کو دیکھا۔ پھر انتھونی پر نظر ڈالی، وہ بولا۔ "اربوں ڈالرز کے صرف ہم چار حصہ دار ہوں گے۔ وہ گیارہ سورما نہیں ہوں گے۔ انہیں تم ایک ایک کرکے راستے سے ہٹاؤ گے۔"

گورڈن نے کہا۔ "ہم کسی کرائے کے قاتل سے کام نہیں لیں گے۔ یہ کام صرف تم ہی رازداری سے کرو گے۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ مادام نے پوچھا۔ "کیا باقی چھ سورماؤں کی طرح تابوت یہودا بھی جعلی تیار کیا جائے گا؟"

گورڈن نے کہا۔ "پرانے زمانے کے صندوق کی طرح ایک خالص سونے کا صندوق بنایا جائے گا۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا' جس کا اوپری سرا سانپ کے پھن کی طرح خم کھایا ہوا ہے' بنوایا جائے گا۔"

انتھونی فورڈ نے کہا۔ "اور ہمارے پیغمبر حضرت موسیٰؑ نے خداوند کے جو دس احکامات سنے تھے' انہیں لکڑی کے تختوں پر لکھا گیا تھا۔"

انتھونی نے پیشوا ہارپر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ فرمائیں' اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟"

پیشوا نے کہا۔ "بوسیدہ اور دیمک کھائی ہوئی لکڑیوں کے تختوں پر وہ دس احکامات لکھے جائیں گے اور انہیں اس صندوق میں رکھا جائے گا۔ وہ اکثر ایک لبادہ پہنا کرتے تھے' ان کی جوتیاں بھی ہوں گی۔ یہ سب چیزیں ایسی ہوں گی' جنہیں دیکھتے ہی یقین ہو جائے گا کہ وہ سب ڈھائی ہزار برس پرانی ہیں۔"

اب سے پہلے بھی مذہب کے نام پر ہزاروں بار دھوکے دیے گئے ہیں۔ ہزاروں برس پرانی پہننے اوڑھنے کی چیزوں کو کسی نہ کسی سے منسوب کرکے انہیں عجائب گھر میں رکھا گیا ہے اور انہیں چرا کر بھاری قیمتیں لگا کر اِدھر سے اُدھر پہنچایا گیا ہے۔ وہ بھی اربوں ڈالرز حاصل کرنے کے لیے یہی کرنے والے تھے۔

جلالت نے کہا۔ "میں نے پیشوائے اعظم سے' پھر مسٹر انتھونی فورڈ سے کچھ مطالبات کیے تھے۔ اس وقت مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھے اینٹی فنڈز کی رقم میں برابر کا حصہ دار بنایا جائے گا۔ اب چونکہ میں آپ لوگوں کا پارٹنر ہوں' اس لیے اپنے مطالبات سے باز آرہا ہوں۔"

پیشوا ہارپر نے کہا۔ "ہم چاہیں گے' تم ہم سے چھپ کر نہ رہو۔ جہاں بھی رہو' ہم سے رابطے میں رہو اور ملاقات کرتے رہو۔"

انتھونی نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے' تم میرے بنگلے میں رہو۔ زیادہ باہر نہ جاؤ۔ خواہ مخواہ پولیس والوں کی نظروں میں آؤ گے۔ وہ تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ ویسے ہم بینکرز

وی آئی پی کہلاتے ہیں۔ پھر پیشوائے اعظم تو بہت ہی محترم اور معزز ہیں۔ ہم سب کی گواہی اور ضمانت کے بعد پولیس والے تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔"

پیشوا نے کہا۔ "یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں کوئی تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے دوبارہ اسرائیل کیسے جاؤ گے؟ مسٹر فورڈ اور ان کی بیٹی سیلینا نے تمہیں ایک مسلمان دشمن بنا دیا ہے۔ تمہیں گناہ گار' قاتل اور نہ جانے کیا کچھ کہہ کر وہاں سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب واپس کیسے جاؤ گے؟"

انتھونی نے کہا۔ "آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔ میری بیٹی وہاں پریس کانفرنس کر رہی ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی ہے۔ ایسے بیانات دے رہی ہے کہ جلالت پر لگائے ہوئے تمام الزامات دھل جائیں گے۔ وہاں پھر سے اس کی عزت اور مان مرتبہ بحال ہوگا۔ یہ بڑے فخر سے وہاں جائے گا۔"

جلالت نے کہا۔ "اگر اسرائیل میں میری نیک نامی بحال ہو جائے گی تو یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ اب جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آئندہ آپ حضرات جب چاہیں گے' میں آکر ملاقات کروں گا۔"

وہ دونوں ان سے مصافحہ کر کے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ملازم نے کھانا لگایا۔ وہ سب میز کے اطراف بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

انتھونی نے کہا۔ "اچھا ہوا' جلالت چلا گیا۔ ہم اس کی عدم موجودگی میں کھل کر باتیں کر سکیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے' کیا یہ جلالت ہمارے لیے ضروری ہے؟"

پیشوا ہارپر نے کہا۔ "بہت ضروری ہے۔ یہ ہمارے بہت سے راز جانتا ہے۔ اربوں ڈالرز کے گیم کو خوب سمجھ رہا ہے۔ اگر اس گیم سے اسے باہر کریں گے تو یہ ہمارے راستے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کرے گا۔"

گورڈن نے کہا۔ "دانشمندی یہی ہے کہ فی الحال اسے چوتھا پارٹنر بنا کر رکھا جائے۔ یہ بہت ہی جنگجو اور سفاک قاتل ہے۔ ہمارے گیارہ سورماؤں کو بڑی آسانی سے ٹھکانے لگا دے گا۔ اس کے بعد صرف یہ رہ جائے گا۔ اسے ہمارے کرائے کے قاتل جہنم میں پہنچا دیں گے۔"

انتھونی فورڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ دشمنوں کو اسلحہ پہنچانا چاہتا ہے۔ بے وقوف...!"

پیشوا نے مسکرا کر کہا۔ "مجھ سے بھی یہی مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے کئی معاملات میں ذہین اور حاضر دماغ پایا ہے۔ تعجب ہے کہ ایسا مطالبہ کرتے وقت اسے اپنی نادانی یا حماقت کا احساس نہیں ہوا۔ اتنی سی بات اس کے دماغ میں نہیں آئی کہ ہم یہودی ہیں اور اپنی آرمی کے دشمنوں تک کبھی اسلحہ پہنچنے نہیں دیں گے۔"

انتھونی نے کہا۔ "اب وہ ہمارے ساتھ پارٹنر بن کر مطمئن ہو گیا ہے۔ اس کے دماغ میں یہی بات ہے کہ اب تو اربوں ڈالرز حاصل کرے گا اور جدید ترین اسلحہ اپنے لوگوں تک پہنچائے گا۔"

گورڈن نے کہا۔ "اس بیچارے کو خواب دیکھنے سے نہ روکو۔ بہل رہا ہے' بہلنے دو۔"

اس بات پر وہ تینوں ہنسنے لگے۔ پھر سنجیدگی سے یہ طے کرنے لگے کہ تابوت یہودا کس طرح تیار کیا جائے گا؟ کہاں تیار کیا جائے گا؟ اور باقی چھ سورماؤں کو تلاش کرنے کے بعد انہیں کہاں ٹریننگ دی جائے گی؟

☆☆☆

سیلینا کی پریس کانفرنس نے ہلچل مچا دی تھی۔ اس نے بڑی بیباکی سے کہا تھا۔ "ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی ہو چکی ہے۔ میں نے سولومن یہودا کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ دراصل ایک بات پر میرا اس سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ جائز تھا اور میں اپنی ناجائز ضد منوانا چاہتی تھی۔ مجھے بعد میں اس غلطی کا احساس ہوا۔"

ایک اخباری رپورٹر نے پوچھا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رات وہ تمہیں جبراً نہیں لے گیا تھا' تم راضی خوشی اس کے ساتھ گئی تھیں؟"

"ہاں۔ میں راضی تھی۔ اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ اب بھی چاہتی ہوں۔ میں نے کہا نا' ہمارا ایک بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے جلانے ستانے کے لیے بنجامن سے بھرپور محبت کا اظہار کیا' اسے سولومن کا رقیب بنا دیا۔"

ایک اور اخباری رپورٹر نے سوال کیا۔ "تم نے بیان دیا تھا کہ اس رات سولومن یہودا تمہیں اغوا کر کے جس مکان میں لے گیا تھا' اس مکان میں فلسطینی مجاہدین اس سے ملنے آئے تھے؟ اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ مسلمان ہے اور درپردہ مسلمانوں کے لیے کام کر رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "یہ بات ہی شروع سے غلط ہے کہ وہ مجھے اغوا کر کے کسی مکان میں لے گیا تھا۔ میں تو اس سے راضی تھی۔ اسے اپنے بنگلے میں لے گئی تھی۔ وہاں کوئی فلسطینی مجاہد تو کیا' ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں آیا تھا۔"

ایک نے کہا۔ "تم نے جھوٹ بول کر تمام پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کو دھوکا دیا ہے۔ تمہارے بیان کے مطابق تم سے غلطی ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سولومن یہودا بے قصور ہے۔ وہ مسلمان نہیں ہے۔ ہماری طرح یہودی تھا اور یہودی ہے؟"

ایک صحافی نے کہا۔ "تم نے اپنی غلط بیانی کے ذریعے پوری یہودی قوم کو گمراہ کیا ہے۔ یہ قوم تمہیں معاف نہیں کرے گی۔ تم پر لعنت بھیجے گی۔"

وہ بولی۔ "میں نے پہلے ہی سوچ سمجھ لیا ہے کہ سچ بولوں گی تو سب مجھ پر لعنت بھیجیں گے لیکن ایک بے قصور ہیکل کے یہودی سورما سولومن یہودا کو اس کی کھوئی ہوئی عزت اور مان مرتبہ تو واپس مل جائے گا۔ میری یہودی قوم کے لیے تابوت یہودا بہت ضروری ہے اور سولومن یہودا باقی گیارہ سورماؤں کے ساتھ اس تابوت کو یہاں لائے گا۔ میں اپنی قوم کی بہتری اور برتری کے لیے خود کو ملعون اور مطعون ٹھہرا رہی ہوں۔"

اس سے طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے اور وہ طرح طرح سے باتیں بنا کر بڑی خوبی سے یوں جواب دے رہی تھی کہ جلالت اسرار پر لگے ہوئے تمام الزامات مٹ رہے تھے اور وہ خود کو نیک نیتی سے سچ بولنے والی ہستی کے طور پر پیش کر رہی تھی۔

سیلینا کے متعلق مختلف آرا قائم ہو رہی تھیں۔ لوگ اس کے خلاف غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے اور اس کی سچائی کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بھی مان رہے تھے کہ اس نے جھوٹ کے بعد پوری یہودی قوم کو سچ کا آئینہ دکھایا ہے۔ ایک سچے ہیکل کے سورما سولومن کو یروشلم واپس لانا چاہتی ہے۔ اپنی یہودی قوم کی بھلائی چاہتی ہے۔

تمام دینی رہنما قانون کے محافظوں سے ملاقات کر رہے تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ سولومن کے خلاف لگائے تمام الزامات ختم کیے جائیں۔ ایک اچھے اور پُرامن شہری کے طور پر اس کے کاغذات تیار کیے جائیں۔ کیونکہ وہ مجرم نہیں ہے۔ قابلِ احترام ہے اور ہم سب یہاں اس کا استقبال کرنے کے لیے بے چین ہیں۔

اس رات انتھونی نے جلالت سے فون پر کہا۔ "میری بیٹی سیلینا کی پریس کانفرنس بہت کامیاب رہی ہے۔ لوگ یہ سن کر خوش ہو رہے ہیں کہ تم گناہ گار اور مجرم نہیں ہو۔ تم نے میری بیٹی کو اغوا نہیں کیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں تمہارے خلاف جو نفرت اور کدورت تھی' وہ یکسر ختم ہو چکی ہے۔ اب

غلط فہمی

کنہیا لال کپور نے کسی پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔"

اس شخص نے بھی برہمی سے کہہ دیا "میں بھی آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔"

کنہیا لال کپور نے کمال عجز سے کہا۔ "آپ ٹھیک سمجھے، غلط فہمی مجھ کو ہوئی۔"

☆..........☆

وہ تمہیں مسلمان نہیں' کٹر یہودی اور ہیکل کا سورما تسلیم کر رہے ہیں۔ پولیس اور انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے تمہارے حق میں ایک بلیٹن جاری کیا جانے والا ہے۔ جس کے بعد تم پر سے تمام الزامات ختم ہو جائیں گے اور تمہیں یروشلم میں خوش آمدید کہا جائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے' میں جلد ہی اپنے وطن واپس جا سکوں گا؟"

"صرف چند گھنٹوں میں دوسری صبح تک تمہارے لیے اسرائیل کے دروازے کھل جائیں گے۔ میں نے سیلینا کو تمہارا فون نمبر دیا ہے۔ وہ ابھی تم سے بات کرنے والی ہے۔ میں پھر کسی وقت رابطہ کروں گا۔"

باپ نے رابطہ ختم کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی بیٹی نے گھنٹی بجا دی۔ جلالت نے کہا۔ "ہاں۔ بولو...؟"

وہ ذرا چپ رہی' جیسے شرمندہ سی ہو کر پھر بولی۔ "میں اپنی غلطیوں کی تلافی کر رہی ہوں۔"

جلالت نے کہا۔ "میں اس سلسلے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔ یہ خوشخبری بھی سنی ہے کہ اب میں قانون کی نظروں میں مجرم نہیں رہا ہوں۔ اپنے وطن کے دروازے میرے لیے کھل رہے ہیں۔"

"میں بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ تم یہاں آؤ گے تو میں قدموں میں گر پڑوں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جلالت نے دل ہی دل میں کہا۔ "تم ٹی وی اسکرین پر میرے خلاف بیانات دیتے وقت بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی

تھیں۔ اب یہ میری حمایت میں بہائے جارہے ہیں۔ مجھے الّو بنایا جارہا ہے۔"

جلالت دل کی یہ بات زبان پر نہیں لایا۔ اسے پچکارتے ہوئے بولا۔ "اپنے آنسو پونچھ لو۔ یہ میرے دل پر ٹپک رہے ہیں۔ تمہارے جھوٹ کے باعث مجھ پر مصیبتیں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن اب سچ بول کر واقعی تلافی کررہی ہو اور میری نیک نامی بحال ہورہی ہے۔ اب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ تم جو کہو گی' وہ کروں گا۔ تمہارے ساتھ ہی زندگی گزاروں گا۔"

وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن فون پر اندازہ ہورہا تھا کہ کتنی زبردست اداکارہ ہے؟ اپنے الفاظ سے' لہجے سے اور صداؤں کی اداؤں سے بخوبی سمجھا رہی تھی کہ کس قدر اس کی دیوانی ہے؟

جلالت سمجھ رہا تھا' اب یہ کھیل زیادہ عرصے تک کھیلا نہیں جائے گا۔ یہ طے ہوچکا تھا کہ جلد از جلد تابوت یہودا لایا جائے گا اور بارہ سورماؤں کو یکجا کیا جائے گا۔ تاکہ پیشوائے اعظم اور پانچ بینکرز کی زندگی میں ہی وہ اربوں ڈالرز آپس میں تقسیم ہوجائیں۔ پیشوائے اعظم اور پانچ بینکرز ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ وہ دشمنی یک لخت ختم ہوچکی تھی۔ چھ سورما تو پہلے سے ہی موجود تھے۔ باقی چھ باڈی بلڈر سورماؤں کو تلاش کیا جارہا تھا۔ سب ہی مل کر بڑی رازداری سے خالص سونے کا تابوت تیار کررہے تھے۔ اس تابوت کے اندر رکھنے کے لیے جعلی تبرکات کو بھی بڑی مہارت سے تیار کیا جارہا تھا۔

☆☆☆

یہ بات کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھی کہ مذہب کی آڑ لے کر اینٹی فنڈز میں گھپلا کیا جارہا ہے۔ دراصل اس بات کی تصدیق ہونی چاہیے کہ بارہ سورماؤں کا وجود ہے بھی یا نہیں؟ اور اس بات کی بھی تصدیق ہونی چاہیے تھی کہ دینی کتابوں کے حوالے سے تابوت یہودا ابھی لایا جائے گا' اس کے ذریعے یہودی قوم کی قسمت بدل جائے گی اور وہ پوری دنیا کے حکمران بن جائیں گے؟

پھر اچانک ہی اس بات کی تائید اور تردید ہونے لگی۔

روم کے ایک یہودی پیشوا نے بیان دیا کہ یہ غلط ہے۔ ڈھائی ہزار برس پہلے بارہ سورماؤں کا کہیں ذکر ملتا ہے۔ وہ تابوت یہودا کے نگراں تھے۔ پھر اچانک ہی کہیں گم ہوگئے' ہمیشہ کے لیے نابود ہوگئے۔ یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ جو صندوق لایا گیا تھا' وہ اور اس میں رکھے ہوئے تبرکات کہاں گم ہوگئے؟

ڈھائی ہزار برس کے دوران آثار قدیمہ کے ماہرین میں سے کسی نے تابوت یہودا کی ایک ذرا سی جھلک بھی نہیں دیکھی اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی بیان دیا۔ کسی بھی حوالے سے یہ بات یقینی نہیں ہے کہ قیامت کے قریب بارہ سورما وہ تابوت لے کر آئیں گے۔ روم کے یہودی پیشوا نے بڑے اعتماد سے یہ بیان دیا کہ ڈھائی ہزار برس پہلے جس ربی نے ہیکل کے سورما نامی کتاب لکھی' اس کا تعلق مذہب کے ٹھوس احکامات سے نہیں ہے۔ اس وقت کے ربی نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے' وہ اس کے اپنے ذاتی خیالات ہیں کہ کبھی بارہ سورما کی اولاد آئے گی اور تابوت یہودا کہیں سے لائے گی۔ جبکہ یہودیوں کے عقیدے کے مطابق قیامت کے قریب دجال آئے گا۔ وہ یہودی قوم کا نجات دہندہ ہوگا۔ ہماری مستند دینی کتابوں میں بارہ سورماؤں کا کہیں ذکر نہیں ہے' صرف دجال کا ذکر ہے۔ اگر پیشوائے اعظم اور دیگر ملکوں کے پیشوا یہ کہتے ہیں کہ مسیح دجال سے پہلے بارہ سورما تابوت یہودا لائیں گے تو یہ سراسر غلط ہے' اپنی یہودی قوم کو گمراہ کرنے والی بات ہے۔

یہودی پیشوا نے مزید کہا۔ "میں یروشلم کے پیشوائے اعظم ہارپر ہیمر اسمتھ کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اپنے اس عقیدے کو سچ ثابت کرے اور مستند دینی کتابوں کا حوالہ پیش کرے۔ ہمارے مذہب کو تماشا نہ بنائے' بدنام نہ کرے اور نہ ہی ہماری قوم کو گمراہ کرے۔"

اُس پیشوا کے بیانات بڑے بڑے اخبارات میں شائع ہورہے تھے۔ وہ ریڈیو کے ذریعے بھی بول رہا تھا اور ٹی وی اسکرین پر انٹرویو کے لیے بھی پیش ہورہا تھا۔

پیشوائے اعظم ہارپر نے ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے کہا۔ "سانچ کو آنچ نہیں۔ جو سچ ہے' وہ سامنے آنے والا ہے۔ روم کے پیشوا کی مخالفت میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں اپنی قوم سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی دینی کتاب ہیکل کے سورما پر یقین رکھیں۔ آپ سب دیکھ رہے ہیں' ہمارے پاس پہلے چھ سورما تھے۔ اب دو اور ہوگئے ہیں۔ یہ تعداد بتارہی ہے کہ جلد ہی بارہ سورما یکجا ہوجائیں گے اور ہماری قوم کو تابوت یہودا کا نذرانہ پیش کریں گے۔"

لوگوں کی اکثریت خواب دیکھنا چاہتی ہے۔ خوابوں سے اور بہلانے والی باتوں سے بہلنا چاہتی ہے۔ یہ بہت

بڑا خواب تھا کہ تابوت یہودا آئے گا تو یہودی قوم کی قسمت بدل جائے گی۔ اسی لیے یہودیوں کی اکثریت پیشوائے اعظم ہارپر کو سچا' دیانتدار اور محترم سمجھ رہی تھی۔

وہ پیشوائے اعظم کہتا رہا تھا کہ سولومن یہودا سچا دیانتدار یہودی سورما ہے لیکن کوئی اس کا یقین نہیں کرتا تھا۔ اب خود ہی الزام لگانے والی سیلینا نے اپنے جھوٹ کا اور سولومن کی سچائی کا اعتراف کیا تو یہ ثابت ہونے لگا کہ پیشوائے اعظم جو کہتا ہے' درست کہتا ہے۔

جلالت اسرار واپس آگیا تھا۔ تل ابیب کے ہوائی اڈے پر بیشمار دینی رہنما' پولیس اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران اس کا استقبال کرنے آئے تھے۔ پیشوائے اعظم اور پانچ بینکرز بھی تھے۔ صرف سیلینا نہ آسکی۔ کیونکہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھی۔

اس نے ائرپورٹ پر کہا۔ "مجھے سیلینا کے جھوٹ نے یہاں سے فرار ہونے پر مجبور کیا تھا اور اب اس کے سچ سے ہی میری نیک نامی بحال ہوگئی ہے۔ اس لیے میں سب سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنے جارہا ہوں۔"

وہ وہاں سے سیدھا اس کے بنگلے میں پہنچا۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ اس نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ پھر دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ سب سے پہلے اسی نے اسے پیار دیا تھا' بازوؤں میں اٹھایا تھا۔ اس کے بعد بنجامن اسے اٹھا کر کلیجے سے لگانے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جلالت پھر وہی سبق پڑھنے اور پڑھانے آگیا تھا۔

ویسے اب عشق و محبت کی راگنی کا وقت نہیں تھا۔ پیشوائے اعظم اور پانچوں بینکرز بڑی تندہی سے تابوت یہودا تیار کرنے کے سلسلے میں مصروف تھے۔ سورماؤں کی بڑھتی ہوئی تعداد بتارہی تھی کہ جلد ہی بارہ کی تعداد پوری ہوجائے گی۔

جلالت پر اب کوئی کسی طرح کا شبہ کرنے والا نہیں تھا۔ لہٰذا وہ آزادی سے گھومتا پھرتا تھا۔ یوں آزاد رہنے کے دوران اس نے موقع پاکر اپنے شناسا فلسطینی مجاہد ڈیوڈ براؤن سے ملاقات کی۔ اس سے پہلے بھی وہ اس کے جنرل اسٹور میں خریداری کے بہانے جاچکا تھا۔

اس نے ڈیوڈ براؤن سے کہا۔ "یہاں ہیکل میں جلد ہی تابوت یہودا لایا جائے گا۔ اس روز مجھے خاص قسم کے اسلحہ کی ضرورت پیش آئے گی۔ وہ اسلحہ میرے لیے تیار رکھو۔"

اس نے اسلحہ کے سلسلے میں تفصیلات بتائیں پھر وہاں سے چلا آیا۔ ایک ہفتے میں دو نئے سورماؤں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک دن کے وقفے سے دو سورماؤں کو پیش کیا گیا۔ ساری دنیا کو دکھایا جارہا تھا اور کہا جارہا تھا کہ ڈھائی ہزار سال پہلے جو کتاب لکھی گئی تھی اور جو پیشگوئی کی گئی تھی' اس کے مطابق سورماؤں کی اولاد واپس آرہی ہے۔ عنقریب تابوت یہودا حاصل ہونے والا ہے اور یہودی قوم کی قسمت بدلنے والی ہے۔

دو ماہ بعد گیارہ کی تعداد پوری ہوگئی۔ یہودی خوش ہورہے تھے' جشن منارہے تھے۔ پیشوائے اعظم اور پانچ بینکرز نے بڑی رازداری سے تمام جعلی تبرکات کے ساتھ ایک مکمل خالص سونے کا تابوت تیار کرلیا تھا۔ اب اس کی رونمائی کا مرحلہ رہ گیا تھا۔

ایسے ہی وقت اسرائیلی آرمی نے غزہ پر میزائل برسائے' ہوائی حملے کیے۔ اسلحہ اسمگل کرنے والے دو افراد بارڈر کراس کرتے وقت نظروں میں آگئے تھے۔ انہوں نے گرفتاری سے بچنے کے لیے فائرنگ کی۔ جوابی فائرنگ کے نتیجے میں وہ دونوں مارے تو گئے لیکن آرمی کا ایک افسر بھی دو سپاہیوں کے ساتھ مارا گیا۔ یہ غصہ دلانے والی بات تھی۔

اپنے افسر اور سپاہیوں کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے غزہ پر ہوائی حملے کیے' میزائل برسائے۔ جلالت بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ فلسطینی بچے' عورتیں' جوان اور بوڑھے اسرائیلی ٹینکوں' میزائلوں اور فاسفورس بموں کا مقابلہ کررہے تھے۔

تمام رات وحشیانہ بمباری کے باعث غزہ شہر جیسے کھنڈر بن گیا تھا۔ کہیں آگ لگی ہوئی تھی' کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میزائل حملوں کے باعث مساجد' اسکول اور اسپتال تباہ ہوگئے تھے۔

دوسرے دن دشمنوں نے تیل' بجلی اور پانی کی ترسیل بند کردی۔ غذا خوراک اور دوائیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اسرائیلی فوج نے انسانیت کے خلاف انتہائی مہلک خطرناک اور زہریلے ہتھیار استعمال کیے تھے۔ یہ زہریلی خبریں جلالت تک پہنچ رہی تھیں اور وہ اندر ہی اندر غصے سے تلملا رہا تھا۔ قسمیں کھا رہا تھا کہ ایک ایک یہودی سے انتقام لے گا۔

لیکن کیسے لے گا؟ ابھی تو وہ سوچ ہی سکتا تھا' کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

دشمنوں نے خوراک کے گودام پر بمباری کرکے اناج کا تمام ذخیرہ نابود کردیا تھا۔ غزہ کی گھنی آبادی میں سفید

فاسفورس کے بم گرائے تھے اور انتہائی مہلک ہتھیار dime کو تجربے کے طور پر وہاں استعمال کیا تھا۔

جلالت اسرار فی الحال تنہا' بے بس اور لاچار تھا۔ لیکن دنیا کے تقریباً ڈیڑھ ارب مسلمان تو تنہا نہیں تھے' وہ متحد ہو سکتے تھے۔ تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ممالک کے حکمران مجبور فلسطینیوں کو مالی اور عسکری امداد پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آج بھی خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ ان کی بے حسی کی انتہا ہے۔ وہ اتنے دولتمند' اتنے طاقتور' اتنے بااختیار ہیں کہ کوئی مسلمان بھی ان کے محلوں میں جا کر ان کا گریبان نہیں پکڑ سکتا۔ مسلم ممالک کے سربراہوں نے مسلمانوں کی تسلی و تشفی کے لیے ایک تنظیم قائم کی ہے۔ مسلم ممالک اس تنظیم کے مستقل ممبرز ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ارب مسلمان اس کے حامی ہیں اور جتنے وسائل ان مسلمان حکمرانوں کے پاس ہیں' اس کے پیش نظر اس اسلامی تنظیم کو اقوام متحدہ کے بعد دوسری مضبوط تنظیم بن جانا چاہیے تھا لیکن یہ آج تک کسی ایک مظلوم اسلامی ملک کو بھی اقوام متحدہ سے انصاف نہ دلا سکی۔

یہ ممالک یورپ اور امریکا کی جی حضوری سے باز آ جائیں' اپنے دینی احکامات کے مطابق حصولِ انصاف کی جنگ جاری رکھیں تو سپر پاور اور تمام بڑے ممالک فرعونیت سے باز آ جائیں گے۔

یہودی سپر پاور بن کر ابھرنے والے تھے۔ گیارہ سورما آ چکے تھے۔ پیشوائے اعظم نے اعلان کیا کہ بارہواں سورما تابوت یہودا کے ساتھ آئے گا۔ جمعہ اور ہفتے کی درمیانی شب یہاں سے گیارہ سورما ہیکل میں جائیں گے۔ ان کے ساتھ صرف پیشوائے اعظم' مادام نکاڈلی اور انتھونی فورڈ رہیں گے پھر اس ہیکل سے تابوت یہودا باہر لائیں گے۔

دنیا کے تمام یہودی سرمایہ داروں نے مطالبہ کیا کہ وہ تابوت کے لائے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہیکل کے اندر اور باہر ویڈیو ریکارڈنگ کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ اس طریقہ کار سے سب اپنے گھروں میں بیٹھ کر وہ تمام مناظر دیکھ سکیں گے۔

پھر یہ طے پایا کہ جیسے ہی وہ تابوت ٹی وی کی اسکرین پر نظر آئے تو بارہ سورماؤں کو پچاس توپوں کی سلامی دی جائے۔ اس رات پوری دنیا کے یہودی دل کھول کر جشن منائیں اور صبح تک آتش بازی کا مظاہرہ کرتے رہیں۔ اس رات پوری قوم کو ہر طرح کے مسائل اور مصائب سے نجات ملنے والی تھی۔ وہ ساری دنیا کے حکمران بننے والے تھے۔ یہ خواب صدیوں سے اس قوم کی آنکھوں میں تھا۔

اب سے پہلے یہ خواب تھا کہ آس پاس کے تمام مسلم ممالک کو زیر کیا جائے گا۔ مسلمانوں کو غلام بنائے رکھنے کا عزم اور جنون ایسا ہے کہ اسرائیل میں اپنی پارلیمنٹ کے صدر دروازے کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ کرائے ہیں۔

''اے اسرائیل! تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔''

اسرائیل کے قیام سے پہلے ان کی تاریخ پڑھی جائے تو معلوم ہوتا ہے' یہ قوم ازل سے ملعون' مطعون اور ناقابلِ اعتماد رہی ہے۔ یہ جس ملک میں گئے' انہیں بری طرح ذلیل کر کے ٹھوکریں مار کر وہاں سے نکالا گیا۔ جب ہٹلر نے لاکھوں یہودیوں کو قتل کیا' انہیں جرمن سے نکل جانے پر مجبور کیا تو امریکی کانگریس نے انہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

تاریخ کے پچھلے ادوار میں برطانیہ اور امریکا نے کبھی یہودیوں کو پناہ نہیں دی۔ اُس وقت یہ زہریلی حقیقت ان کے ذہنوں میں تھی کہ اُن یہودیوں نے ان کے پیغمبر پر ظلم و ستم کی انتہا کرنے کے بعد انہیں صلیب پر چڑھایا تھا۔

آج دنیا کے تمام عیسائی اپنے پیغمبر کا خون معاف کر کے ان یہودیوں کو سر پر بٹھا رہے ہیں۔ بڑی عجیب سی' نا سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ یہودی اس قدر عیسائیوں کے ہر دلعزیز کیوں بن گئے ہیں۔ یہ قوم پوری دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ اب امریکا اور یورپی ممالک انہیں کلیجے سے کیوں لگا رہے ہیں؟ یقیناً سیاسی مصلحت ہے کہ اسرائیل کو ایک مہرہ بنا کر مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو' بڑھتی ہوئی قوت کو روکنا اور کچلنا ہے اور اس کے لیے انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے درمیان نفاق' نفرت اور دوری پیدا کی ہے۔ آج مسلم ممالک ایک دوسرے کے پڑوسی ہونے کے باوجود ندی کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ انہیں اپنے پڑوس سے فلسطین کی چیخیں سنائی نہیں دیتیں۔ اُدھر عیسائیوں اور یہودیوں کا یہ حال ہے کہ وہ ماضی میں ایک دوسرے کے جس قدر جانی دشمن تھے' آج اُتنے ہی شیر و شکر ہو گئے ہیں اور اب چند گھڑیوں میں خواب کی تعبیر ملنے ہی والی تھی۔ جلالت اسرار سمیت گیارہ سورما ہیکل میں تھے۔ وہ سب صاف و شفاف اُجلے لبادے میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں سفید موی شمعیں روشن تھیں۔

ہیکل کے اندر اور باہر یہودیوں کے گلی گلی' گھر گھر رنگ برنگے' جلتے بجھتے قمقموں سے روشن تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد جشن منانے والے تھے۔

انتھونی فورڈ' مادام نکاڈلی اور پیشوائے اعظم بھی گیارہ سورماؤں کے پیچھے چلتے ہوئے بڑے ترنم سے دعائیں پڑھتے جا رہے تھے۔ دو کیمروں اور لائٹس کے ذریعے ان تمام مناظر کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔

وہ آگے پیچھے ایک ترتیب سے چلتے ہوئے اس تہ خانے میں آئے' جہاں سے ایک بار جلالت اسرار فرار ہوا تھا۔ اب وہاں فرش پر خالص سونے کا ایک بڑا سا صندوق درجنوں موم بتیوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

وہ تابوتِ یہودا تھا۔ اس کے پیچھے بارہواں سورما کھڑا ہوا دونوں ہاتھ اٹھائے عبرانی زبان میں کچھ بول رہا تھا۔ تمام یہودی سرمایہ دار ریکارڈنگ کے ذریعے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ وہ اسکرین پر تابوت یہودا کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑی عقیدت سے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر منظوم دعائیں پڑھنے لگے۔

ایسے وقت توپوں کی گھن گرج دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ پچاس توپوں کی سلامی دی جا رہی تھی۔ آتش بازی کی بہتات سے آسمان روشن ہو رہا تھا۔ پوری قوم جیسے پاگل ہو گئی تھی وہ لائیو پروگرام تھا۔ ساری دنیا کے چینلز کے ذریعے تابوت یہودا کو دیکھا جا رہا تھا۔ پیشوائے اعظم بڑے جوش و جذبے سے یہودی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں عروج حاصل کرنے اور سپر پاور بننے کی پیشگی مبارکباد دے رہا تھا۔ پھر اس نے تمام سورماؤں سے کہا۔ ''تم سب نے اپنے آبا و اجداد کی روایات کو قائم رکھا ہے۔ ہزاروں سال سے نسل در نسل تابوت یہودا کی حفاظت کرتے آئے ہو۔ اب آگے بڑھو اور اسے کھول کر مقدس تبرکات نکالو۔ ان لمحات میں ساری دنیا دیکھ رہی ہے' آج دوسرے مذاہب کے لوگوں کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری دینی کتابیں درست کہتی ہیں۔ ہماری قوم کے عروج اور برتری کے لیے جو پیشگوئی کی گئی تھی' آج وہ درست ثابت ہو رہی ہے۔''

جلالت اسرار ان سورماؤں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ وہ سب صندوق کھول کر مقدس تبرکات کو ایک ایک کر کے باہر نکالتے ہوئے انہیں کیمرے کو دکھانے لگے۔ اس طرح تمام ٹی وی ناظرین انہیں دیکھ رہے تھے۔

ایسے وقت جلالت نے کہا۔ ''میں یہودی قوم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ پلیز۔ میری طرف توجہ دیں۔''

پیشوائے اعظم اور دوسرے تمام لوگ اسے دیکھنے لگے۔ وہ بولا۔ ''آپ برتری اور حکمرانی کے خواب نہ دیکھیں۔ یہ خواب کبھی پورے نہیں ہوں گے۔ پتا نہیں' وہ بارہ سورما ڈھائی ہزار سال پہلے تابوت یہودا کے ساتھ کہاں فنا ہو گئے؟ اور فنا کے بعد کوئی دنیا میں واپس نہیں آتا۔''

پیشوا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیا بول رہے ہو؟''

''وہی بول رہا ہوں' جو ہم اور آپ جانتے ہیں۔ یہاں چھ سورما اصلی ہیں۔ یہ نسل در نسل آئے ہیں۔ ان میں سے ایک میں ہوں۔ باقی چھ جعلی ہیں۔''

انتھونی فورڈ نے پریشان ہو کر کہا۔ ''سولومن یہودا! ہوش میں رہو۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اپنے چھ ساتھی سورماؤں کو نقلی کیوں کہہ رہے ہو؟''

''صرف سورما ہی نہیں' یہ خالص سونے کا صندوق بھی جعلی ہے۔ یہ تابوت یہودا نہیں ہے۔ یہ جو تبرکات دکھائے جا رہے ہیں' یہ بھی جعلی ہیں۔''

مادام نکاڈلی نے کہا۔ ''تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ آج ہماری یہودی قوم کو ساری دنیا میں برتری حاصل ہو رہی ہے اور تم اسے جھٹلا رہے ہو۔ پوری قوم کو مایوس کر رہے ہو۔''

پیشوا نے غصے سے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آج بھی در پردہ مسلمان ہو۔ ہمارے دین کی سچائی آنکھوں کے سامنے ہے اور تم انکار کر رہے ہو۔ ہم یہودیوں کو پنپتے ہوئے اور روحانی قوتیں حاصل کرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتے۔''

انتھونی نے اچانک ہی لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم نیک نام بینکرز ہیں۔ پیشوائے اعظم معزز اور محترم ہیں۔ ہمیں جھوٹا' فریبی اور جعلساز نہ کہو۔ اپنے الفاظ واپس لو۔''

جلالت نے مسکرا کر کہا۔ ''میں جانتا تھا' ایسا ہی ہو گا۔ تم لوگ اپنے جھوٹ اور فریب کے چشم دید گواہ کو زندہ نہیں رہنے دو گے۔ میری موت کے بعد اپنی دولت اور مستحکم ذرائع سے اس تابوت کو اصلی ثابت کرتے رہو گے۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے پوری تیاری سے آیا ہوں۔''

اس نے یہ کہتے ہی اپنے لبادے کے گریبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے چیر ڈالا۔ وہ ایسا منظر تھا کہ سب ہی دیکھنے والوں کے دماغوں کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے اندر ایک بارودی بیلٹ پہنی ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ اگر کوئی میرے قریب آئے گا تو میں یہ پن یہاں سے ہٹا دوں گا۔ پھر انجام سوچ لو! یہ تہ خانہ ہمارا مدفن بن جائے گا۔''

پھر اس نے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"باہر سے کوئی یہاں آنے کی نادانی نہ کرے۔ ورنہ اس کے وجود کے بھی چیتھڑے اڑ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے' ایسے وقت سب ہی میری چند باتیں توجہ سے سنیں گے۔"

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ "یہ گیارہ سورما اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ پوری قوم کو دھوکا دینے کے لیے یہ جعلی سامان تیار کرایا گیا ہے۔"

وہ کیمرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "نائٹ ٹیمپلرز فنڈ سے تعلق رکھنے والے تمام سرمایہ دار جانتے ہیں کہ دو سو ارب ڈالرز سے زیادہ رقم بارہ سورماؤں میں تقسیم کی جانے والی تھی۔ پیشوائے اعظم' مادام نکاؤلی اور انتھونی فورڈ سمیت اس کے چار بینکرز یہ تمام رقم غبن کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ رقم حاصل کرنے کے بعد تمام سورماؤں کو اس طرح ہلاک کرنا چاہتے تھے کہ بعد میں ان کی لاشیں کسی کو نہ ملتیں۔ کوئی سمجھ نہ پاتا کہ تاریخ کے اندھیرے سے آنے والے تمام سورما کن اندھیروں میں نابود ہو گئے ہیں؟"

مادام نے کہا۔ "تم بکواس کر رہے ہو۔ ہمیں خوامخواہ بدنام کر رہے ہو۔"

جلالت نے کہا۔ "میں گیارہ سورماؤں سے کہتا ہوں' وہ اس صندوق کو تمام سامان سمیت اٹھا کر تہ خانے سے باہر لے جائیں۔ ہیکل کے باہر نائٹ ٹیمپلرز فنڈ کے نگراں ڈائریکٹر اپنے عملے کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ سامان ان کے حوالے کریں۔ وہ ماہرین سے تصدیق کرائیں گے کہ یہ صندوق اور اس میں رکھے ہوئے تبرکات اصلی اور ڈھائی ہزار برس پرانے ہیں یا نہیں۔"

انتھونی فورڈ اور پیشوا نے کہا کہ وہ تمام سامان ان کی موجودگی میں چیک کیا جائے گا۔ وہ بھی تہ خانے سے باہر جائیں گے۔

جلالت نے کہا۔ "صرف گیارہ سورما جا رہے ہیں۔ کوئی اور جبراً جانا چاہے گا تو میرے ساتھ حرام موت مرے گا۔"

وہ سب دیکھ رہے تھے۔ اس کا ہاتھ پن کے پاس تھا۔ وہ چشم زدن میں موت کا دھماکا کر سکتا تھا۔ گیارہ سورما وہ صندوق تمام سامان سمیت لے جا رہے تھے۔ جلالت نے کہا۔ "جلد ہی معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ فراڈ ہے۔ اٹلی کے پیشوا جان اسٹرانگ موسں نے کہا تھا کہ ہمارے یہودی مذہب کو تماشا نہ بنایا جائے۔ بارہ سورما اور تابوت یہوداتہ اس دنیا میں ہیں' نہ کبھی کہیں سے آئیں گے۔ یہودی قوم تسلیم کرے گی کہ ان کے ایک پیشوا نے درست کہا ہے اور میں سچ کو سچ ثابت کر رہا ہوں۔ پوری قوم کو اس پیشوائے اعظم کے جھوٹ اور فریب سے بچا رہا ہوں۔

اگر میں ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہوں تو مجھے کیا صلہ ملے گا؟ یہ بھی سچ کہہ دوں کہ میں الحمدللہ مسلمان ہوں اور مسلمان رہوں گا۔ ایک مسلمان نے تم سے نیکی کی ہے۔ کیا تم بھی مسلمان قوم کو تحفظ دو گے؟ تمام دنیا کے مسلمانوں کو نہ سہی' کیا صرف فلسطینی مسلمانوں کو اپنے ہی ملک کے ایک گوشے میں امن و سلامتی سے رہنے دو گے؟"

اس نے پیشوا ہارپر اور انتھونی فورڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں خوب سمجھتا ہوں' اپنے اس دینی رہنما اور اس ان داتا کہلانے والے بینکر کو بچانے کے لیے فلسطینی عوام کو سلامتی دینے کا وعدہ کیا جائے گا۔ پھر اپنے یہودی مزاج اور سیاسی مصلحت کے مطابق وعدہ کبھی پورا نہیں کیا جائے گا۔

میں جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ان لمحات میں دنیا والے میری باتیں سن رہے ہیں اور مسلم ممالک کے حکمران بھی سن رہے ہوں گے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ ابھی ایک مسلمان یہاں یہودیوں سے فلسطینیوں کی سلامتی کی بھیک کیوں مانگ رہا ہے؟

میں تو موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ کسی بھی لمحے میں میری آنکھ بند ہو جائے گی۔ تم لوگوں کی آنکھیں کب کھلیں گی؟ دنیا کہتی ہے' امریکا کی چھپر چھایا میں رہو گے تو بھی تمہارا ضمیر نہیں جاگے گا۔ یہ تو صرف خدا ہی جانتا ہے کہ تمہاری بے ضمیری اور غلامی کب تک رہے گی؟"

پیشوا نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے جانے دو۔ ہم فلسطینیوں کو سلامتی دیں گے۔"

جلالت نے کہا۔ "تم دینی اور روحانی رہنما ہو کر ابھی اپنی قوم کو دھوکا دے رہے تھے۔ کوئی احمق بھی تمہارے جیسے بے ایمان کی زبان پر بھروسا نہیں کرے گا۔"

انتھونی نے دیکھا' جلالت کا ہاتھ پن سے ذرا دور ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی گولی داغ دی۔ وہ گولی جلالت کے شانے میں لگی۔ وہ جھٹکا کھا کر ذرا پیچھے گیا۔ دوسری گولی اس کے حلق کے نیچے آ کر پیوست ہو گئی۔

وہ گرتے گرتے پھر سنبھل کر کھڑا ہوا۔ اس نے دو انگلیوں سے پن کو تھام کر مسکراتے ہوئے پہلے پیشوا ہارپر کو پھر انتھونی فورڈ کو دیکھا۔ ان کی اوپر کی سانسیں اوپر ہی رہ گئیں۔

زندگی میں ہونے والے دھماکے سب ہی سنتے ہیں۔ موت کا دھماکا خاموشی ہے۔ وہ جانے والے بڑے ہنگامے برپا کرنے کے بعد خاموشی سے چلے گئے۔